تنقیدِ نعت: نیا تناظر، نئی تفہیم

('نعت رنگ' کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر ابرار عبدالسّلام

تنقیدِ نعت: نیا تناظر، نئی تفہیم
('نعت رنگ' کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)
ڈاکٹر ابرار عبدالسّلام

تنقیدِ نعت : نیا تناظر، نئی تفہیم

(’نعت رنگ‘ کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

نعت ریسرچ سینٹر

ہمارا نصب العین ! نعتیہ ادب کا فروغ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : تنقیدِ نعت: نیا تناظر، نئی تفہیم
(نعت رنگ کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)

تہذیب و ترتیب : ڈاکٹر ابرار عبد السّلام

اشاعت : 2023ء

صفحات : 428

قیمت : 1400 روپے

9789698918859

شائع کردہ

B-306، بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی۔
Phone: +92-332-2668266
SabeehRehmani@gmail.com
www.Sabih-Rehmani.com

نعت ریسرچ سینٹر

ہمارا نصب العین ! نعتیہ ادب کا فروغ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : تنقیدِ نعت: نیا تناظر، نئی تفہیم
(نعت رنگ کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)

تہذیب و ترتیب : ڈاکٹر ابرار عبد السّلام

اشاعت : 2023ء

صفحات : 428

قیمت : 1400 روپے

9789698918859

شائع کردہ

B-306، بلاک 14، گلستانِ جوہر، کراچی۔
Phone: +92-332-2668266
SabeehRehmani@gmail.com
www.Sabih-Rehmani.com

انتساب

استادِ محترم

مفتی محمد حفیظ اللہ نقشبندی کے نام

جن کی علم دوستی نے عربی اور فارسی زبان وادب کی تفہیم سے آشنا کیا

حُسنِ ترتیب

کاوش

ادبی حلقوں میں صبیح رحمانی کو بطور شاعر (نعت گو) کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر شمع افروز کی مرتبہ تصنیف 'صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری فکری وتنقیدی تناظر' شائع ہو چکی ہے۔اس سے قبل 'سفیرِ نعت' کا صبیح رحمانی نمبر شائع ہو چکا تھا جس میں صبیح رحمانی کے تخلیقی پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا۔ڈاکٹر تحسین بی بی کی تصنیف 'صبیح رحمانی: شخص و عکس' میں صبیح رحمانی کے مجموعی ادبی پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا گیا ہے۔اسی طرح ان کی ایک حیثیت مدیر کی بھی ہے۔بطور مدیر انھوں نے 'لیلۃ النعت'، 'ایقان'، 'سفیرِ نعت' اور 'نعت رنگ' کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور اپنی شناخت کے معتبر حوالے پیدا کیے۔ان میں ''نعت رنگ'' وہ ادبی رسالہ ہے جو کم و بیش تیس سال سے بغیر کسی تعطّل کے شائع ہو رہا ہے۔اس حوالے سے بھی ان کا تذکرہ زیادہ تر مرتب یا ادبی صحافی کے کیا جاتا رہا ہے۔ ان کا ایک حوالہ نعت خواں کا بھی ہے۔عوام میں وہ اسی حوالے سے مقبول و معروف ہیں۔

ان کا ایک حوالہ نقاد کا بھی ہے جو بالعموم ہمارے لکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں ان کا یہ حوالہ دیگر تمام حوالوں سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہے اور یہی ان کی ادبی شناخت کا بنیادی حوالہ کہا جا سکتا ہے۔ان کی تمام ادبی کاوشوں کا مرکزِ ثقل یہی پہلو ہے۔ان کی تمام فکری اور عملی کوششوں کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں۔ان کی شخصیت کے تمام گوشے یہیں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔تنقیدِ نعت وہ حقیقی جوہر ہے جس کے بغیر صبیح رحمانی کی شخصیت، کردار، ادبی کارکردگی اور کارگزاری کی تفہیم اور تعین ممکن نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان کے تنقیدی خیالات کسی مخصوص مکتبۂ فکر یا گروہ کے فکری سرچشموں

سے مستعار نہیں بلکہ ان کے اپنے ذہنی و فکری رویوں اور شخصی مزاج سے پھوٹتے ہیں جس کی تشکیل و تعمیر میں ان کی شخصیت، مطالعے اور مشاہدے نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ میرے خیال میں صبیح رحمانی کی ادبی انفرادیت کا بنیادی حوالہ تنقید ہے نہ کہ شاعری۔ ان کا اصل کارنامہ وہ تنقیدی خیالات ہیں جو وقتاً فوقتاً احاطۂ تحریر میں آئے ہیں اور ان کی تصانیف، تالیفات، دیباچوں اور تبصروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ خیالات بکھری ہوئی صورتوں میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور مربوط صورتیں رحوالے 'نعت رنگ' کے اداریوں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ فروغ نعت اور تنقید نعت کے حوالے سے ان کا کردار مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ صبیح رحمانی نے اصلاح نعت رتنقید نعت کی کوششیں ایک مشن کی طرح انجام دیں۔ ان سے قبل بھی یہ کوششیں کی جاتی رہیں چونکہ ان کوششوں کا محور انفرادی رہا اس لیے اس کے مطلوبہ اثرات حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ صبیح رحمانی نے ان کوششوں کو 'نعت رنگ' کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اسے ایک تحریک کی صورت دی جس سے یہ کوششیں انفرادی نہ رہیں بلکہ اجتماعی عمل بن گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں شعلۂ مستعجل میں تبدیل ہو گئیں جس کی حرارت اور روشنی سے نعت اور تنقید نعت فیض یاب ہو رہی ہے۔ بالخصوص 'نعت رنگ' کا اجرا نعت کی ادبی تاریخ میں ایسا خوشگوار واقعہ بن کر نمودار ہوا جس نے نعت کی ادبی تاریخ اور روایت کو نہ صرف اہم موڑ دیا بلکہ اسے ایک ایسی ڈگر پر بھی ڈال دیا جس سے صنف نعت کو شناخت اور اعتبار و افتخار کے وسیلے دستیاب ہوئے۔ یہ سب کچھ ان کی تنقیدی کوششوں کا ہی ثمر ہے۔ صبیح رحمانی کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین ان کی تنقید اور تنقیدی کوششوں کو احاطۂ تحریر میں لائے بغیر ممکن نہ ہو گا۔ یہ امر بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ صبیح رحمانی کے تذکرے اور کارگزاریوں کو زیر بحث لائے بغیر نعتیہ ادب کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

اس کتاب کو پرکھتے ہوئے قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اداریوں کو مرتب کرنے کے لیے 'نعت رنگ' کا انتخاب ہی کیوں کیا گیا؟ اردو کے ممتاز اور عہد ساز رسائل کے اداریوں کو موضوع کیوں نہ بنایا گیا؟ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ کہ اہم اور ممتاز رسائل و جرائد پر مختلف حوالوں سے کام ہو چکا ہے اور ہو بھی رہا ہے لیکن 'نعت رنگ' وہ واحد موضوعی جریدہ ہے جو دیگر موضوعاتی جرائد میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اہمیت کا حامل بھی ہے۔ یہ رسالہ اپنے بطن میں تنقید نعت کے ایسے گہر ہائے آبدار رکھتا ہے جس کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ دوسری بات یہ کہ 'نعت رنگ' کے اداریوں کا

ایک انتخاب مارچ ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر افضال احمد انور نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔اس انتخاب کو مرتب ہوئے بارہ سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔اس وقت سے آج تک اداریوں کی تعداد اور ضخامت میں تقریباً دوگنا اضافہ ہو چکا ہے۔پچھلی دہائی میں ادبی فضاؤں کا حصہ بننے والے یا برآمد کیے جانے والے خیالات،افکار اور نظریات نے غیر محسوس انداز میں ہماری سماجی اور ادبی زندگی میں اپنے لیے جگہ بنائی ہے۔جس نے بڑے پیمانے پر معاشرتی،تہذیبی،سیاسی اور فکری تغیّرات اور تبدیلیوں کو جنم دیا ہے۔ ہمارے ذہنی رویے،فکری دھارے اور ادبی سانچے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔نعتیہ ادب میں بھی اس کی اثر پذیری کے بڑے واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔'نعت رنگ' کے مضامین،اداریوں اور دیگر مشمولات میں ان نقوش کے متنوع رنگ دیکھے جاسکتے ہیں بالخصوص 'نعت رنگ' کے اداریوں میں جدید نعتیہ تنقید اور ادبی مسائل و مباحث کا ایک وسیع منظر نامہ موجود ہے۔ادبی تحقیق اور تنقید کے طالب علم کو نہ صرف ان سے واقفیت ضروری ہے بلکہ اسے مربوط انداز میں دیکھنے کی ضرورت بھی ہے۔

میرے خیال میں یہ دو مثالیں کافی ہیں ورنہ اردو کا استاد بات بڑھانے اور پھیلانے کا جو ہنر رکھتا ہے اس کا شکوہ تو شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کیا ہے۔ ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے کہ اُردو کے استاد کو سلام کیا جائے تو جواب میں وہ ایک لمبی تقریر کر ڈالتا ہے۔یہاں میرا مقصد لمبی تقریر کرنا نہیں کہ مقدمہ بجائے خود طوالت کی حدود کو چھو چکا ہے۔بہر حال یہ فیصلہ قارئین نے کرنا ہے کہ اس میں رطب کتنا ہے اور یابس کتنا۔

ہمارے ہاں کتابوں کی ترتیب و تالیف کا ابتدائیہ لکھتے ہوئے مفصّل تجزیاتی مطالعات کو غیر ضروری سمجھ کر اختصار سے کام لیا جاتا ہے بالعموم تعارفی مضامین کے ذریعے حق تالیف ادا کر کے جان چھڑوالی جاتی ہے۔کم و بیش یہی کچھ تدوین کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔جس کے سبب ترتیب و تدوین کو بے توقیری کا سامنا رہتا ہے۔راقم الحروف کی کوشش رہتی ہے کہ اس قسم کے رویے سے گریز کیا جائے تاکہ ترتیب و تدوین کی بے اعتباری کو اعتبار ملتا رہے اور نو آموز طالب علموں کو سیکھنے کے مواقع میسر آتے رہیں۔اس کتاب میں 'نعت رنگ' کے اداریوں کا کم و بیش ہر پہلو اور ہر زاویے سے تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سلیم احمد نے کسی مقام پر لکھا ہے کہ ''اقبال پر زیادہ تر لکھنے والے ایسے لوگ رہے ہیں جنھیں اردو ادب کچھ زیادہ عزت اور وقعت کے ساتھ نہیں پہچانتا ہے۔'اس سے ملتی جلتی صورتِ حال

تنقیدِ نعت / ناقدین نعت کی بھی رہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صبیح رحمانی کی کوششوں سے اس صورتِ حال میں بہتری آئی ہے۔ اب نعت اور تنقیدِ نعت پر لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ مقدار ہی میں نہیں معیار کے حوالے سے بھی سامنے آیا ہے۔ نعت کے موضوعات یکسانیت کا شکار نہیں رہے، تنوع اور وسعت سے ہم کنار بھی ہوئے ہیں۔ نعت کے حوالے سے معذرت خواہانہ اور نعت گریز رویوں میں بھی کمی آئی ہے۔ یہ خیال نہیں حقیقت ہے اور یہ کتاب اس حقیقت کی عکاس ہے۔ نعتیہ سلسلے کی یہ میری دوسری تصنیف ہے۔ اگر حالات اور وقت نے مواقع فراہم کیے تو دو چار سال میں تحقیق و تنقیدِ نعت کے چند چراغ اور روشن ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر ابرار عبدالسّلام

صدر شعبۂ اردو

ایمرسن یونیورسٹی، ملتان

برقی رابطہ: ۰۳۳۳-۶۱۰۲۹۸۵

drabrarabdulsalam@gmail.com

تنقیدِ نعت کی ضرورت واہمیت اور
'نعت رنگ' کے اداریے

دُنیا بھر میں کان کھلے ہیں ÷ آپ کہیں تو کوئی بات!

ممبئ میں ایک اچھے شاعر تھے ممتاز راشد، دوسال قبل وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، مرحوم سے آخری ملاقات پر سوال کیا گیا کہ ممتاز راشد صاحب! آپ نئے شعرا کو سنتے ہیں؟

جواب ملا: جی ہاں

سوال: اُنھیں جب سنتے ہیں تو آپ کے ہاں کیا تاثر مرتب ہوتا ہے؟

جواب: ایسا لگتا ہے کہ یہ جو کچھ سنا رہے ہیں، وہ پہلے کہیں سنا ہوا ہے۔

ہم نے ممتاز راشد صاحب کی بات پر سوچا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ''کچھ نیا محسوس نہیں ہوتا۔''

اور یہ بھی عجب بات ہے کہ ہمارے لکھنے لکھانے والے اکثر اس گمان میں رہتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ نیا ہے اس سے پہلے کسی نے نہیں کہا۔

دراصل یہ سارا معاملہ 'خوش فہمی' اور 'انفراد' کا ہے۔ بات تو سبھی کرتے ہیں مگر جسے 'منفرد' کہتے ہیں وہ کسی کسی کے حصّے میں آتا ہے۔ یہ مسئلہ صرف شعر و ادب میں درپیش نہیں، بلکہ ہر شعبۂ حیات میں ملتا ہے۔ ہر دَور میں شاعر و ادیب پیدا ہوتے رہے ہیں اور لوگ سنتے، پڑھتے رہتے ہیں، انفراد سب کے ہاں نہیں ہوتا۔۔۔مگر ہوتا ہے۔ یہ ہمارے برادر سید صبیح رحمانی بھی انھی لکھنے پڑھنے والوں ہی میں ہیں، وہ جو ہمارے بزرگ سردار جوہر کہہ گئے ہیں:

عشق اوصافِ نبوت نہیں دیتا سب کو
منفرد ہوتے ہیں کچھ لوگ سخن کے فن میں

اس سیدزادے کو اُس کے عشق نے اسے ایک نئی راہ دِکھائی، عمومی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ راہ کوئی نئی بھی نہیں تھی مگر وہ لوگ جو نت نئی کی جستجو اور سعی کے خوگر ہوتے ہیں انھیں عام راستے میں بھی 'راہِ نو' مل جاتی ہے۔ صبیح رحمانی نے نعت اور اپنے مجلّے 'نعت رنگ' کا علَم اُٹھایا اور وہ علَم ایسا لہرایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ''نعت رنگ'' اپنے ظاہری اور باطنی معنیٰ کے ساتھ ایک عالَم پر چھا گیا، محفلوں میں اُن کی نعت خوانی نے جہاں انھیں نوازا وہیں ''نعت رنگ'' نے اُن کے تشخّص کو موقر و معتبر کر دیا۔ ادبی صحافت میں ایک سے ایک جیدّ شخص گزرا ہے، مگر دورِ حاضر کے سنجیدہ حلقوں میں جب جب اور جہاں جہاں نعتیہ ادب کے تعلّق سے گفتگو ہوگی وہاں وہاں سید صبیح رحمانی کا نام بہرطور نمایاں ہی نہیں بلکہ ایک عزت و وقار کے ساتھ لیا جائے گا۔ اس عز و وقار کی بنیاد اُن کی نعت گوئی اور 'نعت رنگ' ہی ہے۔ انہوں نے نعت اور نقدِ نعت کے سلسلے میں سنجیدہ اور تواتر سے جو مساعی کی ہیں اس کا معترف ایک زمانہ ہے اور یہ اعتراف ہر زمانہ کرتا رہے گا، سچ پوچھیے تو یہ اعتراف ہی نہیں بلکہ ایک اعزاز ہے اور وہ اعزاز جس کی اہمیت وحرمت دونوں جہان میں باقی رہے گی۔

'نعت رنگ' اپنے آپ میں ایک منفرد مجلّہ تو ہے ہی مگر اس کا انفراد، یہ بھی ہے کہ اس مجلّے کے تعلّق سے کئی کتابیں بھی وجود پا گئیں اور کیوں نہ وجود پاتیں کہ جن کے نام (ﷺ) کو بلند و بالا ہی نہیں کیا گیا بلکہ دوام حاصل ہے، ظاہر ہے اس نام سے جو بھی عمل وابستہ ہوگا اسے بھی دوام ملنا عجب نہیں، جو ایک فطری امر ہے۔ اخبار و جراید میں 'اداریے' کو ایک اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس وقت ہمارے پیشِ نظر 'نعت رنگ' کے اداریوں سے متعلّق فکری و تجزیاتی مطالعے پر مبنی عزیزم ڈاکٹر ابرارعبدالسّلام کی کتاب کا مسودہ ہے جس میں سیدِ ابرار سے متعلّق موضوع پر جواں سال صاحبِ ابرار نے خاصی علمی مساعی کی ہیں جن کی طرف نہ صرف توجہ مبذول ہوتی ہے بلکہ غور وفکر کے چراغ بھی روشن ہوتے ہیں۔

رسول سے (حقیقی) نسبت، محض نسبت نہیں رہتی بلکہ اس نسبت میں ایک زندگی نمو پاتی ہے۔ پیشِ نظر مسودے میں شاہ انصار الہ آبادی کے ایک مصرع (اُنؐ پہ مرتے ہیں تو مرتے نہیں مرنے والے) نے محمد ابراہیم ذوقؔ اور داغؔ اسکول کے قابلِ احترام اُستاد (حضرتِ طرؔفہ قریشی) کا

ایک غیر معمولی شعر یاد دِلا دِیا:

درِ رسولؐ پہ مرنے کی آرزو کیسی!!
حیات مانگ کے لائیں گے ہم مدینے سے

دیکھیے اس شعر میں بھی شاعر نے ایک انفرادیت پیدا کرلیا ورنہ تو نعت کہنے والوں میں اکثر شعرا نے درِ رسولؐ پہ مرنے ہی کی تمنّا اور آرزو کی ہے مگر جنابِ طرفہ نے ان تمام تمناؤں اور آرزوؤں کی کیسی نفی کردی اور کس سلیقے سے، جس کی داد بے ساختہ زبان پر آجاتی ہے۔

دراصل 'حیات' ایک وسیع اور بلیغ معنیٰ کا حامل لفظ ہے، اسے اس عمومی لفظ 'زندگی' سے موسوم نہیں کرنا چاہیے۔ عوام جسے زندگی کہتے یا سمجھتے ہیں دراصل وہ ایک 'عمر گزاری' کا عمل ہے، 'حیات' تو کبھی نہ ختم ہونے کا ایک نام ہے، جو لوگ اس عمر گزاری میں سنجیدہ ہوتے ہیں وہی 'زندگی' کی راہ پاتے ہیں اور جو لوگ اس راہ پر استقلال سے گامزن رہتے ہیں وہ زندگی کی منزل تک پہنچ بھی جاتے ہیں ورنہ تو اس راہ کے بہت سے مسافر منزل سے پہلے ہی Suffered ہو جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں کئی شخص گزرے ہیں جن کے کردار پر زندگی خود نچھاور ہوگئی اور موت اُن پر روتی رہی، یہ خاک کا پیکر تو بہرحال خاک میں ملنا ہے مگر کچھ لوگ خاک میں مل کر بھی 'خاک' نہیں ہوتے۔ بات اُن (ﷺ) کی اور انؐ سے نسبت کی ہو رہی ہے۔ 'نعت رنگ' جیسے مجلّے نے ہمارے نزدیک اُس جیسے کام کا بیڑا اُٹھایا تھا جو کام برسوں پہلے روضۂ رسول کی طرف بننے والی سرنگ کے خلاف کیا گیا تھا، یعنی ایک حفظِ ماتقدم۔ ہر وہ فن جو کسی طور انسان سے متعلّق ہے اُس پر نقد و نظر فطری امر ہوگا یہ اور بات ہے کہ کہیں محسوس تو کیا جاتا ہے مگر اظہار راہ نہیں پاتا۔ نعت کی کونپل بیشک عقیدت و محبّت ہی کی زمین پر نمو پاتی ہے مگر ہر وہ کونپل جس کا باغباں اپنی کونپل سے محبّت کرتا ہو (اور کرتا ہے) تو اسے اس کی 'زندگی' اور 'حسنِ زندگی' دونوں عزیز ہوگی۔ اچھے اور سچّے باغباں اپنی کونپل کے ساتھ بعض ایسے عمل بھی کرتے ہیں کہ جو بظاہر ایک وقت میں جراحی جیسے ہوتے ہیں مگر وہی عمل طویل مدت میں اس کونپل کے لیے صحت اور زندگی کا سبب بن جاتے ہیں، تنقید بھی ہمارے نزدیک ایک ایسے ہی عمل کا نام ہے۔ البتہ جس طرح بچّے دوا یا انجکشن کے نام پر چیخ و پکار کرتے ہیں مگر اُن کے سرپرست یا والدین اُن پر جبر کر کے دوا یا انجکشن اُن کے جسد میں داخل کرواتے ہیں، یہ چیخ و پکار چند لمحے کی ہوتی ہے وقت گزرنے کے بعد تو جس نے چیخ و پکار کی تھی وہ خود اس عمل کو بھول جاتا ہے لیکن اسی زمین پر اسی

آسمان کے نیچے بعض سِن رسیدہ بچّے بھی ہوتے ہیں جو دوا یا انجکشن کے عمل یعنی تنقید کو تا دیر بلکہ عمر بھر مسموم سمجھتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ صحت سے دور ہوتے جاتے ہیں، یوں کسی اور کا نہیں بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ہمارے علم میں ایسے کئی سِن رسیدہ طفل ہیں جو نعت کے معاملے میں بہت نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، وہ جو کہا گیا ہے کہ عقیدت اندھی ہوتی ہے تو اِن سِن رسیدہ اطفال کی عقیدت ایسی ہی نابینا ہے۔

ایک واقعہ یہاں مذکور ہوا چاہتا ہے، رائے پور (چھتیس گڑھ۔ انڈیا) کے ایک نعتیہ مشاعرے میں جس کی صدارت ایک پیر صاحب کر رہے تھے، جن کی پیری مریدی کے سلسلے سے ہم ناواقف نہیں تھے۔ مشاعرے کے آخری حصّے میں اِس خاکسار کو پڑھایا گیا۔ ہم نے اپنی دانست میں اپنی ایک مشکل زمین میں نعت سنائی اور خوب واہ واہی پائی۔ نعت کے اِس شعر پر تو سننے والوں نے محاورتاً مشاعرے گاہ کی چھت اُڑائی:

پہلے دل و نگاہ کی تطہیر تو کرو
پھر چاہو جب حضورﷺ کے انوار دیکھ لو

ہم بھی عام شعرا کی طرح سینہ پھلائے، چہرے مہرے پر فتح کی اکڑ سجائے اپنی جگہ پر لوٹے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم ہی پر مشاعرہ تمام ہو گیا، مگر ناظم مشاعرہ نے اعلان کیا کہ اب صدرِ مشاعرہ اپنے کلامِ بلاغت نظام سے ہم سب کو نوازیں، صدرِ مشاعرہ مائیک کے سامنے آن بیٹھے اور انھوں نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

میاں ندیم! ہمارے بھی ''۔۔۔افکار دیکھ لو''۔۔۔

ہم نے یہ سوچ کر کہ یہ پیر ہیں زیادہ سے زیادہ یہی سنائیں گے:

'میرے مولا! بلا لو مدینے مجھے'

اپنی شاعرانہ مکّاری سے کام لیتے ہوئے ہم نے کہا:

''حضور! عطا فرمائیں''

اُس دن ہم پر کھلا کہ بسا اوقات اپنے ہی لفظ اپنی ذات پر ''پھبتی'' بن جاتے ہیں۔ اُن پیر صاحب نے غیر مردّف ایک ایسی نعت شروع کی جس کے ہر شعر کے قافیے سے دوسرا شعر شروع ہو رہا تھا، ظاہر ہے ہم نے چند ساعت پہلے مشاعرے کی جو زمین فتح کی تھی، ان پیر صاحب نے آن

کی آن اُس زمین پر اپنے جھنڈے گاڑ دِیے اور ہم بھی اُن کی اس فتح پر داد پر داد دیتے رہے۔ جب وہ اپنی نعت تمام کر کے مائیک سے لَوٹ رہے تھے تو ہم نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ ہار پھول جو ہماری گردن میں ڈالے گئے تھے پیر صاحب کی نذر کرتے ہوئے (نہایت شاعرانہ غرور میں مبتلا ہوتے ہوئے کہ اس صنعت میں کوئی ایک نعت انھوں نے کہہ لی ہوگی!!) دست بستہ عرض کیا کہ حضورِ والا! ایک نعت اور مرحمت فرمائیں، ہماری عرض سے عام سامعین کو بھی تحریک ملی اور انہوں نے بھی بہ یک زبان 'ایک اور ایک اور' کی صدا بلند کی۔ حضورِ پُر نور پھر مائیک کے سامنے بیٹھ گئے اور دوبارہ اسی صنعتِ نایاب میں انہوں نے ایک اور نعت نذرِ حاضرین کی تو ہمارے ضمیر نے ہم پر خوب لعنت ملامت کے ساتھ متنبّہ کیا:

میاں! دیکھو، محفل کی واہ واہی پر اُڑا مت کرو، بظاہر چھت تو یہ اُڑاتی ہیں مگر آپ کو ملنے والی یہ تمام داد و تحسین کب کافور کی طرح اُڑ جاتی ہیں!؟ کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔''

مشاعرے کی شب جب صبح میں تبدیل ہوئی اور ناشتے کی میز پر میرِ مشاعرہ، واقعتاً پیرِ ساخرہ سید حسن مثنیٰ (ابنِ سید محمد اشرفِ محدث اعظم۔ کچھوچھوی) سے ملاقات ہوئی تو عرض کیا کہ حضور والا! آپ نے گزشتہ رات واقعتاً اپنے کلام سے ہمارے قلب کو مسخر کر لیا، آپ وہ دونوں نعتیں ہمیں لکھ کر دے دیں تا کہ ہم اپنے روزنامے (انقلاب) کے قارئین کے دلوں کو بھی اس نورانی کلام سے روشن کر سکیں۔

جواب ملا: ارے میاں ندیم! مَیں اگلے ہفتے ممبئ آ رہا ہوں، ان شا اللہ ملاقات ہوگی تو وہیں لکھ کر دوں گا۔ اس واقعے کو کوئی تین دہے کی مدت گزر گئی، وہ اگلے ہفتے ممبئ آئے بھی مگر انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی اور ہم جیسے 'اخبار چی' بھی اُن کی آمد سے بے خبر رہے اور پھر دُنیا کی ہاؤ ہُو سے حضرتِ والا کب پردہ کر گئے، ہمیں اس کی بھی خبر نہ ہونے پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ البتہ ایک مدت بعد ان پیرِ روشن ضمیر کے دیار کے ایک صاحب سے اُن کے وصال کی خبر ملی تو مرحوم کی نعت نگاری اور اس فن سے داد و تحسین سے بے نیازی پر ایک اور حضرتِ والا (رشید کوثر فاروقی) یاد آ گئے جو ہم جیسے طالبانِ شہرت اور مریضانِ نام وَری کو اپنے ایک شعر میں 'آئینہ' دِکھا گئے ہیں:

نعت کہی تو خواہش یہ تھی 'سب میری تعریف کریں'
آپؐ کے نام پہ اپنا ڈھنڈورا!؟ مَیں بے حد شرمندہ ہوں

ایک اہم بات تو رہی جاتی ہے کہ مذکورہ پیرِ روشن ضمیر سے صبح جب ملاقات کے بعد ہم رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے ہمیں آنکھ کے اشارے سے اپنے قریب آنے کو کہا اور پھر سرگوشی کی:

میاں! رات آپ نے ایک مشکل زمین میں نعت کے شعر تو ہم سب کو خوب ۔۔۔ 'دِکھائے'۔۔۔ دل و نگاہ کی تطہیر بھی خوب کی مگر وہ جو آپ نے اپنے آپ سے کہا ہے کہ ''پھر چاہو جب حضورﷺ کے انوار دیکھ لو'۔۔۔ تو صاحبزادے! آپ کس مقامِ ارفع و اعلیٰ پر پہنچ چکے ہیں کہ جب چاہیں گے آپ 'حضورﷺ' کے انوار دیکھ لیں گے ۔۔۔! ندیم میاں توجہ توجہ ۔۔۔''

یہ کہہ کر وہ یک دم اپنے میزبان سے کہنے لگے کہ ''میاں! آپ نے آج ناشتے میں کس قدر عمدہ پائے کھلائے ۔ اللہ آپ کے دستر خوان کو یوں ہی بابرکت اور وسیع رکھے ۔ آمین'' اور ادھر ہم اپنے اُس مصرع (پھر چاہو جب ۔۔۔) کی تنگی پر شرمندہ ہو رہے تھے مگر ضمیر زندہ ہو تو بعض ٹھوکریں بھی 'سعادت' کا سبب بن جاتی ہیں ۔ پیرِ روشن ضمیر کی 'نقدِ نظر' کا اسے اعجاز ہی کہیے کہ ہم فوراً اللہ سے رجوع ہوئے اور درخواست کی کہ تیرے ہی کرم سے 'دل و نگاہ' کی تطہیر تک پہنچے ہیں اب تُو چاہے تو اس مصرع کو اظہار کی 'طہارت' بھی دے دے اور پھر آن کی آن اُس کا کرم ہوا تو وہ مصرع یوں تبدیل ہو گیا:

(پہلے دل و نگاہ کی تطہیر تو کرو)
ممکن ہے پھر حضورؐ کے انوار دیکھ لو

ہوسکتا ہے کوئی شخص اس واقعے کو خودستائی سے تعبیر کرے مگر ایسا ہے نہیں اس میں دراصل 'تنقید' کے انوار کو ہم نے اپنے پڑھنے والوں تک پہچانے کی سعی کی ہے ۔

ڈاکٹر ابرار (عبدالسّلام) صاحب نے ('نعت رنگ' کے اداریوں کے تعلّق سے) اس فکری و تجزیاتی مطالعے کے ساتھ خاصا مواد اپنے قارئین کے لیے یکجا کر دیا ہے جو سنجیدہ پڑھنے والوں کے لیے یقیناً غور و فکر کی راہ منوّر کرے گا ۔

'نعت رنگ' کی جملہ مساعی میں یہ وصف نمایاں ہے کہ اس نے نعت کے تقدس کے نام پر جو روڑے پڑے ہوئے تھے انھیں نہ صرف دور کرنے کی سعی کی بلکہ اس ضمن میں جو کچھ کیا اس کے مثبت نتائج بھی (پاکستان کی حد تک سہی) سامنے آئے اور یہ امر 'نعت رنگ' کے ساتھ اس کے مدیر کی صرف کامیابی نہیں بلکہ سعادتِ عظمیٰ سمجھا جانا چاہیے ۔ نعت کی نازک اور دھار دار و پُر خار راہ سے صحیح سلامت گزرنا بھی کمال ہی کی ایک منزل ہے ورنہ تو لوگ باگ 'گزر' ہی جاتے ہیں ۔

سید صبیح رحمانی کے چند اداریوں کے اقتباس یوں سمجھیے کہ انھیں مبارک باد دینے کے لیے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

☆ ادب وفکر میں اظہار پانے والے خیالات وافکار دراصل اُس شعور کے مظاہر ہوتے ہیں جو کسی قوم کے اجتماعی طرزِ احساس کی تشکیل اور اُس کی تہذیب کی تعمیر واستحکام کی بنیاد بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر معاشرے میں اہلِ دانش اپنے ادب وفکر کے دھاروں پر مسلسل نظر رکھتے ہیں۔
☆ انتقادِ نعت کے جس سلسلے کو ہم نے 'نعت رنگ' کے ذریعے اپنے آغازِ کار ہی سے فروغ دینے کی کوشش کی تھی، اس میں اب 'نقدالانتقاد' کا مرحلہ آن پہنچا ہے۔
☆ ادب کی کسی بھی صنف اور اس کے موضوعات کے حوالے سے یہ مرحلہ اُس وقت آتا ہے جب انھیں ادب وفکر کے مرکزی دھارے میں جگہ مل جاتی ہے۔ الحمدللہ، اُردو نعت آج یہ مقام حاصل کر چکی ہے۔

اسی اداریے میں ایک جگہ سید صبیح رحمانی نے (ڈاکٹر طارق ہاشمی کے ایک مضمون کے حوالے سے) بہت اہم نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے:

☆ (ڈاکٹر طارق ہاشمی کا مضمون) رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے بارے میں بعض سماجی تصورات کو پیش کرتے ہوئے ایک بڑا اہم سوال اُٹھاتا ہے یہ کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتکریم اور قدر ومنزلت کے بیان کے لیے اُن حوالوں، کنایوں اور استعاروں کا استعمال درست ہے جو اہلِ دُنیا کی عظمت کے اظہار وبیاں کے لیے رائج ہو چکے ہیں۔ اس حوالے سے یہ سوال بھی اہمیت کا حامل اور توجہ کا طالب ہے کہ ایک جمہوری دَور اور ٹیکنالوجی کے عہد میں ملوکیت کے استعاروں سے ہمارا نعت گو کس طرح باہر آسکتا ہے؟ یہ سوال اس عہد میں نعت کے نئے ڈِکشن پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

ڈاکٹر ابرار (عبدالسّلام) صاحب کی یہ سعی اپنے موضوع پر کئی لحاظ سے علمی حیثیت کی حامل ہے، اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اسے علم وادب سے متعلّق اشخاص نہ صرف پڑھیں بلکہ اس پر غور وفکر کے ساتھ اس کے 'اصل' موضوع پر کلام کریں تا کہ نعت کے وہ مخفی گوشے بھی سامنے آئیں جو ہم جیسے کم نظروں سے مخفی ہیں۔

اس کتاب میں حمایت علی شاؔعر کا، ایک اداریے میں ذکر ہی نہیں بلکہ نعت کے انتقاد کے پس منظر میں ان کی فکرِ مدحِ رسول بھی ہم پر روشن ہوئی، ہوسکتا ہے کہ 'نعت رنگ' میں ہم یہ سب پڑھ چکے ہوں مگر پیرانہ سالی اور ذہنی پریشاں حالی نے اسے فراموش کر دیا ہو ہر چند کہ بزرگوار شاؔعر کی یہ تحریر ایسی ہے کہ اس کا فراموش ہونا بھی ایک طرح کی جہل کی چادر اوڑھنے کے مصداق ہے مگر اُف

ہم کمزور تر لوگ۔۔۔!

رسولِ کریم ﷺ کا وجود نہ صرف مبارک ہے بلکہ اس میں ہمارے وجود ہی نہیں بلکہ انسانی فکر و خیال کی تمام تر اساس پائی جاتی ہیں۔ کبھی خدا نے ہم سے کہلا لیا تھا:

اگر کچھ علم ہے تو بس یہی ہے
محمد ﷺ کو سمجھنا آگہی ہے

یہ صرف ایک خیال یا تصوراتی عمل نہیں بلکہ اس 'آگہی' ہی کی زمین میں ہماری عقل وفہم کے تمام چشمے پھوٹتے ہیں اور ان چشموں کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے جن میں سے کچھ ہم سے پہلے کے لوگوں کو، کچھ ہمارے دَور کے اصحاب کو، اور بہت سے چشمے آنے والوں کو سیراب کریں گے مگر 'کرم' کے یہ چشمے انھی ذہنوں پر پھوٹتے ہیں جو اِن چشموں کے لیے فکر و خیال کی سنگلاخ زمینوں سے نہ صرف گزرتے ہیں بلکہ ان کے لیے بہ انکسار اپنے فکر کی ایڑیاں رگڑتے ہیں اور ایسے لوگ کبھی محروم بھی نہیں رہتے جس کی سامنے کی مثال سید صبیح رحمانی ہیں اور پھر ڈاکٹر ابرار (عبدالسّلام) جیسے بھی۔

اس کتاب کا بنیادی حوالہ 'نعت رنگ' کے اداریے ہیں، ہمیں اس وقت نجانے کیوں روزنامہ انقلاب (ممبئی) کا وہ اداریہ یاد آتا ہے، جو ڈاکٹر ظ انصاری نے روزنامہ انقلاب کے اپنے ادارتی دَور میں تین دہے قبل لکھا تھا اس کا بھی ایک ٹکڑا ہماری اس معمولی سی تحریر کا حصہ کیوں نہ بنے، پہلے ہمارا یہ نوٹ جگر کے شعر کے اس ٹکڑے کے ساتھ ''اللہ اگر توفیق نہ دے'' پڑھیے اور پھر مذکورہ اداریے کا اقتباس:

''ظ انصاری کی کمیونسٹی ایک دُنیا میں بدنام رہی وہ جو کہا جاتا ہے کہ 'بڈا اچھا بدنام بُرا۔۔۔تو یہ شخص کیسا کمیونسٹ رہا ہوگا کہ چھوٹی بہن طاہرہ، کراچی سے اپنے بیمار بھائی کی عیادت کرنے ممبئی آئیں، ایک صبح وہ تلاوتِ قرآن کر رہی تھیں، سورۂ رحمان پڑھ رہی تھیں کہ ظ انصاری بول پڑے کہ کچھ سمجھ میں بھی آرہا ہے یا بس رَٹے جا رہی ہو۔۔۔!؟''

اور پھر بلند آواز سے انھوں نے سورۂ رحمان کی تفسیر بیان کرنی شروع کر دی۔

راوی لکھتا ہے کہ خود ظ انصاری نے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ:

''جب طاہرہ سورۂ رحمان پڑھ رہی تھی تو (ایسا لگا کہ) منہ اور دِل میں برسوں کی جمع غلاظت دُھل رہی ہو اور جب بولتے بولتے تھک چکے تو رُک رُک کر جگر کا مصرع اُن کی زبان پر تھا کہ اللہ اگر توفیق نہ دے۔۔۔!''

☆☆☆

1986ء (ستمبر) میں جنوبی ہند (کرناٹک) کے فتنہ انگیز واقعے پر ظ انصاری نے روزنامہ انقلاب کا اداریہ بعنوان: 'ایڈیٹ.... The Idiot' لکھا، جس کا اقتباس ہم یہاں نقل کرتے ہیں، جس سے پیغمبرِ اسلامؐ کے تئیں ظ انصاری کا اندرون صاف وشفاف اور مطہّر نظر آرہا ہے۔

''(1) کیرالا کے ایک ملیالی رسالے میں ایک کہانی کبھی چھپی تھی، ہلکی پھلکی دل چسپ سی، لیکن اس کے ہیرو کا نام تھا محمد، جنوب (ہند) میں تو نام کے ساتھ 'صاحب' (صاب) بھی لگانے کا رواج ہے، چور' جیب کترے، اسمگلر، بے ٹکٹ، مجرم پکڑے جائیں تو اخبار میں یہ نام اور صاحب لکھا ہوگا۔۔۔ نام پڑھ کر ہمیں بھی شرم آتی ہے، دِل دُکھتا ہے کہ اگر اس نام کے ساتھ صاحب کا لفظ نہ ہوتا تو غنیمت تھا، وہی کہانی انگریزی میں ترجمہ ہوکر اتوار (7 دسمبر) کے 'دکن کرانیکل' یا 'سنڈے ہیرالڈ' (بنگلور) میں چھپ گئی، جس نے ترجمہ کیا اور سنڈے ایڈیشن میں جوڑ دیا اس کے دِل میں شرارت ضرور ہوگی، اس 'ایڈیٹ' نے کہانی کو ایسے لفظوں پر ختم کیا، جن لفظوں کے کہنے والے کو واقعی دِن میں تارے دِکھا دِیے جائیں تو کچھ اندھیر نہ ہوگا (ہم وہ لفظ دُہرا کر اشتعال انگیزی کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے۔)

(2) کہانی کے ڈبل صفحے کے درمیان تین اسکیچ ہیں، ایک عورت، سیتا نام، ایک ہیرو، ایک مسلم شریف زادہ ....بدقسمتی سے مصنّف نے (جسے کہانی کے ہیرو محمؐد سے ہمدردی بھی ہے۔) اس کا پورا نام محمؐد بن عبداللہ دے دیا، تبھی کوئی ٹوک دیتا تو نام بدلا جاسکتا تھا، پر یہ کیریکٹر خَلوَت پسند اور غور وفکر کا عادی ہوجاتا ہے، مراقبے کی کیفیت میں جاتا ہے، کہانی کے مصنّف پی۔کے۔نمبو دری نے یہ کردار ہمدردی سے تراشا لیکن بے احتیاطی برتی، باپ کا نام عبداللّٰہ۔۔۔ اور ایک خاتون ہے آمنہؓ۔۔۔ تینوں ناموں کا یکجا ہونا کیا معنیٰ!

آدمی خدا کے بارے میں بے احتیاطی برتے تو خدا اُس سے خود سمجھ لے گا لیکن محمؐد کے نام پر مٹنے والے ابھی نہ مَر چکے ہیں، نہ مِٹ چکے ہیں.... 'با محمد ہوشیار''

حضورِ اکرم ﷺ کے نام پر اختر شیرانی کا بوقتِ مےنوشی والہانہ شعلہ ہوجانا ہر ادب دوست کو یاد ہے۔ بیشک عقیدت کی ایسی چنگاریاں یا ایسے شعلے کبھی مدھم نہیں پڑنے چاہئیں مگر انتقاد کا دَر بھی ہمیشہ وا رہنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ہم سب کو یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ دورِ حاضر علم کے عروج کا ایک مثالی زمانہ ہے اب قرآن کریم کے رمز اور قولِ رسول کے مخفی پہلو بھی ایک دُنیا پر کُھل چکے ہیں، کُھل رہے ہیں مگر قرآن اور صاحبِ قرآن کو صرف اُن کی فہم وادراک ہی مطلوب نہیں، اُنھیں جو مطلوب ہے ہم اس کے حصول کی طرف بھی بڑھیں ورنہ تو لفاظی کے دفتر تو ہر میدان میں مل جاتے ہیں تو جنابِ والا!

اُنؐ کے اقوال عام ہیں لیکن
اُنؐ کے کردار کی ضرورت ہے

☆☆☆

ہم نے ابرار صاحب کی تحریر کو جہاں جہاں سے پڑھا اور سمجھا وہ توجہ طلب ہی نہیں بلکہ غور وفکر کی بھی سمت دِکھاتے ہیں:

''۔۔۔مدیر کے نام موصول ہونے والے خطوط سے بھی (وہ) اداریوں کے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے، اداریوں کے انتخاب کا تعین خاص اہمیت اور ہنگامی نوعیت کے حامل موضوعات سے ہوتا ہے، اسی طرح رسالے کا مدیر بھی ادب میں رونما ہونے والے واقعات، تجربات، نظریات اور افکار سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔''

ہمیں یاد آتا ہے کہ 'نعت رنگ' میں تنقیدی مباحث پر مبنی ایسے خط بھی پڑھے ہیں جن کی تفصیل سَو سَو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی، ان خطوط کے متن سے اختلاف و اتفاق اپنی جگہ مگر ان کی بحث ذہن میں اک دِیا تو روشن کرتی ہی تھی اور اس کی روشنی سے سب سے پہلے رسالے کا مدیر ہی مستفید ہوتا ہے اور پھر وہ اس روشنی کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

روز نامہ انقلاب (ممبئی) کے مدیر فضیل جعفری نے ایک بار بہت اہم نکتے کی طرف ہمیں متوجہ کیا تھا:

''میاں! مدیر ڈاکیہ نہیں ہوتا کہ اِدھر سے کچھ آیا اور اُدھر اُس نے پہنچا دیا، دراصل مدیر کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی تحریر کو پرکھے اور جانچے کہ یہ اُس کے قاری کے لیے کتنی مفید ہے بھی یا نہیں ہے اور پھر اس کی اشاعت یا عدم اشاعت کا فیصلہ کرے۔''

جس زمانے میں ہم روز نامہ انقلاب (ممبئی) کا 'جمعہ ایڈیشن ایڈیٹ کرتے تھے تو اُس وقت ہمارے ایک ساتھی نے صلح حدیبیہ کے تناظر میں ایک مضمون لا کر دِیا جب ہم نے اسے پڑھا تو اُس میں ہمیں ایک فتنے کی بُو محسوس ہوئی اور ہم نے اس کی اشاعت سے انکار کر دیا لیکن ہمارے رفیقِ کار نے اس کی اشاعت پر اصرار کیا، تو ہم نے ردوکد کے بعد اخبار کے خصوصی 'عید ایڈیشن' میں یہ سوچ کر اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا کہ اگر اس مضمون کے موضوع سے متعلق کوئی اختلافی تحریر آئی تو اسے بھی شائع کیا جائے گا لیکن اشاعت کے بعد ہمیں اُس وقت افسوس ہی نہیں ہوا بلکہ یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے قاری اب کس قدر بے نیاز ہو چکے ہیں ان کے ہاں مطالعے اور گہرے مطالعے کا فقدان ہوتا جا رہا ہے ورنہ اُس مضمون کا موضوع ایسا تھا کہ اس پر اخبار میں تا دیر بحث ہی نہیں ہوتی بلکہ اندیشہ

تھا کہ کوئی تنازعہ سَر اٹھاتا بلکہ فتنہ بھی بن سکتا تھا، یہ بھی خیال گزرا کہ،خصوصی اور ضخیم 'عید ایڈیشن' کے سبب یا تو قاری کی اس پر نظر ہی نہیں گئی یا پھر اسے قابلِ بحث سمجھا ہی نہیں گیا۔ایک طویل مدت بعد اس موضوع پر سوچا تو خیال گزرا کہ اس حساس مضمون کی اشاعت سے ہمیں مجتنب ہی رہنا چاہیے تھا۔

اسی طرح کسی بھی رسالے یا اخبار کے اداریے کے مندرجات میں مدیر کو بہت حساس اور محتاط رہنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات ایک لفظ اداریے کے سیاق وسباق کو کچھ سے کچھ ہی نہیں کر دیتا بلکہ اثبات سے نفی کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔انقلاب ہی کے ایک اداریے میں ایک لفظ نے ایک عجب تماشہ 'بپا' کیا تھا،مشہور ادیب ڈاکٹر ظ انصاری اُس وقت روزنامہ انقلاب (ممبئی) کے مدیر تھے جن کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی تعلیم کی ابتدا اور بنیاد میں عَربی کا درس کارفرما ہے،ممبئی میں علما کا ایک بڑا اجتماع تھا جس میں بعض اہم اور حساس مسائل موضوع بننے والے تھے،ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنے اداریے میں 'علمائے فحول' جیسے ایک مُرکّب لفظ سے شرکائے اجتماع کو مخاطب کیا، یہاں ایک بات اور مذکور ہوا چاہتی ہے کہ ہمارے اکابر اور قدیم ادیب وشاعر،اساتذہ نیز مدیر حضرات خطِ کشیدہ کے لیے 'مشہور' تھے اور خطِ کشیدہ کا پڑھنا کچھ مشکل ضرور تھا مگر اُس زمانے میں مشکل سے مشکل عبارت کو پڑھنا پڑھانا ایک عام سی بات تھی،عوام میں بھی 'مشکل' کو آسان بنانے والے موجود تھے،مشہور ہے کہ 'صدقِ جدید' کے مدیر اپنی ادارتی تحریروں وغیرہ میں نقطے وغیرہ سے مجتنب رہتے تھے مگر کاتبوں میں چونکہ اکثر اصحاب مدرسوں کے پڑھے ہوئے ہوتے تھے تو وہ مضمون اور موضوع کے سیاق وسباق کو سمجھتے ہوئے،کس نقطے کی کہاں ضرورت ہے؟ واقف ہوتے تھے اور صحیح جگہ ہی پر نقطے لگانے پر قادر تھے مگر کاتب بھی ابنِ آدم ہی تھے،تو ہوا یوں کہ 'انقلاب' کے کاتب نے علمائے فحول کے 'ف' کا نقطہ 'ح' کے سَر پر لگا دِیا یعنی اب علمائے فحول،علمائے فحول نہیں صبح،اخبار میں 'علمائے مخول' پڑھے گئے، اس سہوِ کاتب نے اخبار اور اخبار کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دِیا۔

اداریہ،اخبار یا رسالے کا مرکزی 'نکتہ' ہوتا ہے، دورِ گزشتہ میں یہ اخبار یا رسالے کے معیار اور اس کے وقار کا سبب بھی ہوتا تھا،ہم نے اپنی صحافتی زندگی میں ڈاکٹر ظ انصاری ہی کو ایسا مدیر پایا کہ ان کے اداریے بہت ہی ذوق وشوق اور انہماک سے لوگوں کو پڑھتے ہوئے دیکھا،اور ان کے اداریے ڈاکٹر ظ انصاری کی حیات ہی میں 'کانٹوں کی زبان' کے نام سے کتابی شکل میں یکجا ہو کر آئندگان کے لیے ایک سبق بن گئے۔

مدیر کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ موصولہ مضامین سے اپنے جریدے کو پُر رونق کر دے بلکہ ایک اچھے مدیر کا یہ وصف بھی ہوتا ہے کہ اس کی طرف، اچھی اور فکر صادق کے حامل لکھنے والے متوجہ ہی نہ ہوں بلکہ اس کے جریدے میں اپنی تحریر کی اشاعت کو اپنے لیے ایک اعزاز بھی سمجھیں، ہمارا صحافتی ماضی ایسی مثالوں سے روشن ہے۔

ہمیں (کامٹی۔ ناگپور کے) ایک بزرگ شاعر نظر رشیدی یاد آتے ہیں، وہ ایک میدان میں اپنے آس پاس کے گزرنے والوں سے بے نیاز نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے دوست نے بتایا کہ ندیم! جانتے ہو، اُن کی اِس بے نیازی اور اطمینان کی کیا وجہ ہے؟ ہم نے اپنے دوست کی طرف تجسّس بھری نگاہ سے دیکھا تو جواب ملا کہ انھیں یہ بے نیازی اور اطمینان علامہ نیاؔز فتح پوری کے مجلّے 'نگار' میں ان کے کلام کی اشاعت نے عطا کی ہے۔ بیشک ہماری زبان میں ایسے مجلّے اور جرائد اپنے مدیر روشن ضمیر کے سبب ایک وقار و اعتبار کا منبع تھے کہ جن کی ادارت میں چھپ جانا بھی ایک وقار کی بات تھی۔

'نعت رنگ' اپنے موضوع اور متن کے لحاظ سے ایک منفرد جریدہ ہی نہیں بلکہ ایک حساس رسالہ بھی ہے اس کے ادارتی شذرات کا اہم ہونا لازم ہے۔ سید صبیح رحمانی 'نعت رنگ' جیسے جریدے کے صرف مدیر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اُن کا تشخّص مستند ہے تو ایک شاعر کا مدیر ہوتے ہوئے یہ لکھنا ضروری تھا:

> ''ہمیں تخلیق کاروں (اور بالخصوص نعت نگاروں) کی حساس طبیعت کا علم ہے، اپنے فن پر تنقیدی گفتگو یقیناً اُن پر گراں گزرتی ہوگی، ہم بھی ان آبگینوں کی نزاکت سے بیخبر نہیں مگر تنقید کی آنچ وہ آنچ ہے جو شیشے کو توڑتی نہیں بلکہ پختہ کرتی ہے، وہ شیشہ جو بھٹّی سے مسکراتا ہوا نکلتا ہے اور شیشے کی آبرو بن جاتا ہے۔''

اکثر مدیروں کے ہاں ایک تمکنت اور غرور محسوس ہوتا ہے مگر جو اشخاص فطری شرافت کے حامل ہوتے ہیں وہ بہرحال اس مرض سے بچے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ابرار عبدالسّلام نے صبیح رحمانی کے اداریوں میں سے ایک اقتباس کے ذریعے ان کی مذکورہ صفتِ عالیہ کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے:

> ''کئی احباب نے اپنے خطوط میں ان مضامین کی اشاعت پر 'تعجّب' کا اظہار کیا ہے، جن کے مندرجات سے انہیں اتفاق نہیں، ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مقالہ نگاروں سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں، علاوہ ازیں اگر علم و ادب اور فنون کی دُنیا میں یہ

اختلاف نہ ہوتے تو فکر ونظر کے بہت سے گوشے اپنے امکانات کے ساتھ ہمارے سامنے
نہ آپاتے، ہم نے کوشش کی ہے کہ فکری اختلاف شخصی مخالفت نہ بننے پائے اور اختلاف
کرتے ہوئے لہجے کی متانت اور اسلوب کی شرافت برقرار رہے۔''

مدیرِ سیّد نے نعت اور نعتیہ ادب کے تناظر میں ایک حقیقت پر بجا فوکس کیا ہے:

''جہاں تک نعتیہ ادب کی بات ہے تو اس کی صورتِ حال اس لحاظ سے اور بھی ابتر ہے کہ
اسے کسی بھی عہد میں با قاعدہ تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نتیجتاً اربابِ نقد ونظر نے اسے
'شعرِ عقیدت' کا نام دے کر عام ادبی فضا سے دور کر دیا اور یہ تکلیف دِہ صورتِ حال کسی حد
تک اب بھی برقرار ہے۔''

ایسے حالات میں 'نعت رنگ' جیسے جریدے کی اشاعت اور نعتیہ ادب کے تئیں اس کی
تنقیدی مساعی اس کی اہمیت پر دال ہیں۔

صبیح رحمانی کے اداریے ہم نے 'نعت رنگ' کے ہر شمارے میں پڑھے ہیں مگر کبر سنی کے
سبب نجانے اب کیا کیا بھول رہے ہیں، ڈاکٹر ابرار عبد السّلام کی اس کتاب نے اُن اداریوں کا نہ
صرف آموختہ کرادِیا بلکہ اُن پر ایک نئے انداز سے سوچنے کی راہ بھی منور کر دی، ڈاکٹر ابرار عبد السّلام
نے 'نعت رنگ' کے اداریوں کو موضوع بنا کر جس طرح کام کیا ہے وہ نہ صرف ایک حرمت کا حامل ہے
بلکہ نعتیہ ادب کی اہمیت و تقدیس کو اُجاگر کرتا ہے اور جس کی ضرورت بہر حال مسلمہ ہے۔ ایسے کام ہر
چند کہ غیر معمولی سنجیدگی اور محنت کے طالب ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں یہ کام ہوتے رہنے چاہئیں۔

ڈاکٹر ابرار عبد السّلام نے اس کتاب میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر موضوع پر کام کیا جا سکتا
ہے، شرط گہری توجہ اور انہماک کے ساتھ 'موضوع' سے شوق اور ذوق بھی لازم ہے ہمیں ڈاکٹر ابرار
عبد السّلام جیسے لوگوں کی نہ صرف تحسین کرنی چاہیے بلکہ ان کا احترام بھی لازم ہے، یہ احترام عام
احترام نہیں چاہتا بلکہ یہاں احترام کے معنیٰ ہیں کہ اُن کے کام پر گہری توجہ دی جائے اور اسے فروغ
دِیا جائے۔

ندیم صدیقی
ممبئی۔ انڈیا
(شاعر و ادیب اور صحافی)
رابطہ: 9323786610

تنقیدِ نعت: نیا تناظر، نئی تفہیم

(’نعت رنگ‘ کے اداریے اور ان کا فکری و تجزیاتی مطالعہ)

ا۔ نعت کا تنقیدی تناظر اور ’نعت رنگ‘ کے اداریے

’اقبال کے بارے میں ہماری تنقید دل میں چور رکھ کر بات کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ کچھ اقبال میں ہے، کچھ ہمارے ماحول میں اور کچھ خود ہمارے اندر‘‘(۱) سلیم احمد کی اس رائے کا انطباق اگر تنقیدِ نعت پر بھی کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ مسائل تو نعت کے حصے میں آتے ہیں اور باقی ماحول/ادبی صورتِ حال اور ناقدین کے۔ شاید اسی وجہ سے تنقیدِ نعت اردو کی ادبی تنقید سے قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکی۔

پچھلی صدی کی اسّی، نوّے کی دہائی تک اردو کی ادبی اور تنقیدی روایت میں تنقیدِ نعت ایک الگ جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نعت سے متعلّق لکھنا یا لکھوانا اسی طرح تھا جس طرح رندانِ مے کدہ کی مسجد میں حاضری، جس کے لیے پورے اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر مُلّا کی طرف سے باطنی طہارت کے مطالبے کا خوف، الگ دامن گیر رہتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ فرض کی ادائیگی کے بعد اس کی حالت مومن کے اس شعر کی سی ہوتی تھی جس میں کسی شب مسجد میں جا پھنسنے اور رات کے خدا خدا کر کے کاٹنے کا ذکر موجود ہے۔ یہی حال تنقیدِ نعت کا بھی رہا ہے۔ اول تو اس طرف کوئی متوجہ ہوتا نہیں تھا اور اگر دلی رغبت یا بے دلی سے اس طرف توجہ کرنا بھی پڑ جاتی تو اس میدان میں اترتے ہوئے متعدد اندیشے ذہن میں ہوتے تھے اور گستاخی، کفر، خطرۂ ایمان، اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے (کے فتووں) کا خوف، دامن گیر رہتا گویا دودھاری تلوار اس کا تعاقب کرتی رہتی۔ اس لیے

ادبی ناقدین اسے مصحفِ قرآنی کی طرح چوم چاٹ کر عقیدت کے طاقچے میں سجانے پر ہی اِکتفا کرتے اور کبھی یہ ہفت خواں طے کرنا بھی پڑتا تو عقیدت اور دل جوئی کے رسمی جملے ادا کر کے ہی گزر جانے میں عافیت سمجھی جاتی تھی۔

دوسرا مسئلہ تنقیدِ نعت کا ادبی تنقید سے دوری کا رہا۔ تنقیدِ نعت کو ادبی تنقید میں شمار ہی نہیں کیا جاتا تھا یا یوں کہہ لیجیے کہ دل کا چور کہیں نہ کہیں واردات کر جاتا تھا۔ اس میں ادبی ناقدین کو ہی قصوروار نہیں سمجھنا چاہیے، اس صنف سے وابستہ ادیب اور شعرا بھی اس میں برابر کے شریک رہے۔ یہ لوگ نعت پر سوچنے، گفتگو کرنے اور تجزیہ کرنے کا حق بھی اپنے تصرف میں رکھتے کیونکہ تنقیدِ نعت کوئی شارعِ عام تو تھی نہیں کہ جس کا جی چاہے، اس میں راستہ بنا لے چنانچہ ادبی تنقید کو دور کا سلام ہی روا رکھا گیا۔ نعت کے گرد عقیدت اور تقدس کا ایسا دائرہ کھینچ دیا گیا جس میں ادبی تنقید کو دخل اندازی کی اجازت نہ تھی البتہ کبھی کبھار اس دائرے کے اندر ہی سے کوئی تازہ ہوا کا جھونکا نمودار ہو جاتا تو اسے اپنے مزعومات کے صداقت ہونے کی روشن دلیل اور رحمتِ خداوندی سے تعبیر کر کے محفلِ سماع کے انعقاد کو ہی خدمتِ نعت کے وہم میں مبتلا رہنے یا سراب میں غلطاں و پیچاں ہونے کو ہی فرض کی ادائیگی سے تعبیر کر لیا جاتا۔

ایسی صورتِ حال میں کسی مذہبی صنف سے متعلّق رسالے کا اجرا کرنا، جس کا مقصد تنقید کو اہمیت ہی نہیں اولیت اور فوقیت دینا بھی ہو، آسان کام نہ تھا لیکن صبیح رحمانی نے اس جوئے شیر کو نکالنے اور ہفت خواں کو طے کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک دو ہم راہیوں کے ساتھ اس کٹھن سفر کا آغاز کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سفروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور سفر بھی آسان تر ہوتا گیا اور اب تک اس کی اکتیس منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ 'نعت رنگ' کے اکتیس شماروں کے علاوہ نعت ریسرچ سنٹر سے سو سے زائد کتابوں کی اشاعت اس پر مستزاد ہے۔

'نعت رنگ' کی ادبی اور عصری اہمیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اردو کے ادبی رسائل کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اردو رسائل و جرائد کو دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی خاص صنف سے تعلّق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی ترتیب و تشکیل میں اس طرح کی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی۔ اول الذکر قسم کے رسائل کی تعداد نہایت کم رہی ہے جنھیں اُنگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ثانی الذکر رسائل و جرائد میں بالعموم دو طرح کے رسائل سامنے آتے ہیں۔ ایک خالصتاً

تحقیقی اور دوسرے خالصتاً تنقیدی نوعیت کے حامل۔ان کی تعداد سیکڑوں میں پہنچتی ہے۔تیسری قسم کے رسائل بھی نظر سے گزر جاتے ہیں جن کا تعلّق تخلیق سے ہوتا ہے لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک موضوعاتی رسائل و جرائد کی تعداد کا تعلّق ہے ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ان موضوعاتی رسائل میں مرثیہ اور نعت کے موضوع پر رسائل اہمیت کے حامل ہیں۔وہ رسائل جو تحقیقی یا تنقیدی رہے ہیں ان میں تحقیقی یا تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ تخلیقات بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔بعض رسائل کا غالب رجحان شاعری اور بعض کا فکشن کی طرف رہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رسائل کی اشاعت و چلت کا دارومدار قارئین کی پسند پر ہوتا ہے چنانچہ قارئین کے ذوق اور مزاج کو دیکھتے ہوئے رسائل ترتیب دیے جاتے ہیں۔'نعت رنگ' نے یہی رنگ اختیار کیا۔ چنانچہ اس رسالے میں نعت کی تخلیق کے ساتھ ساتھ نعت کی تحقیق اور تنقید کو بھی رسالے کا جزو بنایا گیا۔اس میں بھی زیادہ زور نعت کی تنقید پر رہا کہ اس کے پہلے شمارے ہی سے مدیر نے اس رسالے کو تنقید کے رنگ میں رنگنے کی شعوری کوشش کی۔یہی وجہ ہے کہ 'نعت رنگ' کا پہلا شمارہ ہی تنقید نمبر شائع ہوا۔اس رسالے کے اجرا کا مقصدِ اولین ہی نعت کے تنقیدی آفاق کو روشن کرنا تھا تا کہ زمانوں سے نعت کے حوالے سے جو خیالات، قارئین و ناقدین کے ذہنوں میں جاگزیں ہو چکے تھے انھیں اس طرح سے دھویا جائے کہ نعت کا حقیقی روپ سامنے آسکے۔ چنانچہ صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' میں ایک طرف شعرا کی نعتیں شائع کیں تو دوسری طرف نعت پر تحقیق و تنقید کا دروازہ بھی کھلا رکھا تا کہ نعت اپنے حقیقی منصب سے آشنا ہو سکے۔اس کے ساتھ ہی 'نعت رنگ' کا ایک حصہ، گوشہ خطوط کے لیے بھی مختص رکھا گیا تا کہ جو شخصیات اپنی مصروفیات کے باعث یا کسی ایک موضوع یا خیال یا مختلف موضوعات پر اختصار کے ساتھ یا تفصیل سے اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہوں اور انھیں مضامین و مقالات کے رنگ ڈھنگ یا پیٹرن میں پیش کرنے کی فرصت/صلاحیت/مزاج یا وقت نہ پاتے ہوں، وہ خطوط کے ذریعے بھی اپنی آراء سے مدیر یا 'نعت رنگ' کے لکھاریوں کو اپنی آراء سے آگاہ کر سکتے ہیں۔یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ یہی 'نعت رنگ' کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اور توجہ حاصل کرنے والا حصہ بنا۔ 'نعت رنگ' کے قارئین تازہ شمارے میں سب سے پہلے اسی حصے پر نظر ڈالتے رہے ہیں۔ان خطوط کو پڑھ کر رسالہ ''نگار'' یاد آجاتا ہے۔ایک زمانے میں نیاز فتح پوری کے علمی جوابات جس شمارے میں موجود نہ ہوتے تو قارئین کو سخت مایوسی ہوتی تھی۔گویا قارئین کو نیاز صاحب کے جوابات کی ایسی چاٹ لگ گئی تھی کہ وہ استفسارات کے جوابات کو دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔یہی حال 'نعت رنگ' کے خطوط

کا ہوتا ہے کہ 'نعت رنگ' کے قارئین سب سے پہلے خطوط کا گوشہ پڑھتے ہیں پھر اس کے دیگر حصوں کا رخ کرتے ہیں۔ بہر حال متذکرہ تینوں (تخلیقی، تحقیقی وتنقیدی اور مراسلاتی) پہلوؤں نے 'نعت رنگ' کو ایک معیاری اور پڑھا جانے والا مجلّہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن جس گوشے / حصے کو 'نعت رنگ' کا حاصل کہا جا سکتا ہے وہ تحقیق وتنقید کا گوشہ ہے۔ جس کے مفید اثرات نعت کی تخلیقی جہت پر بڑے گہرے مرتسم ہوئے۔ اس حوالے سے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''نعت رنگ' نے فکر وتنقید اور تخلیق دونوں کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نئے موضوعات اور زاویوں پر مقالے اور مضامین شائع کیے ہیں، جس سے غور وفکر اور بحث کے نئے دریچے کھل رہے ہیں اور نعت کے ادبی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے ہماری خواہش ہے کہ نعت کے اسالیب میں رفعت، عقیدت اور ادبی محاسن اس طرح یک جا ہو جائیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے راستے جگمگا اٹھیں'' (اداریہ نمبر ۵)

''یہ 'نعت رنگ' کی کامیابی ہی تھی کہ بارھویں شمارے میں مدیرِ نعت کو لکھنا پڑا کہ ''یہ سفر جو صرف عقیدت اور محبّت کی ایک کیفیت میں شروع کیا گیا تھا، آج معنویت کی کئی منزلوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے جاری وساری ہے۔'' (اداریہ نمبر ۱۲)

'نعت رنگ' واحد موضوعی ادبی رسالہ ہے جو نہ صرف باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے بلکہ اپنے جلو میں متنوع اقسام کے نثر ونظم کے نمونے لیے قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ فکری آبیاری کا کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ ہندو پاک میں کثیر تعداد میں ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان کا رنگ وآہنگ، موضوعات اور مشمولات معاصر ادبی رسائل کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے عالم میں ایک ایسی صنف سے متعلّق رسالے کا سامنے آنا جس کا موضوع اور امکانات محدود نظر آتے ہوں اور جس کے قارئین کی تعداد معاصر رسائل کے قارئین کی نسبت نہایت مختصر ہو۔ رسالے کا منشور بھی اختلافی / نزاعی نوعیت کا ہو۔ ایسے رسالے کا معاصر ادبی رسائل اور ادبی صورتِ حال میں جگہ بنا لینا اور اپنی شناخت کے معتبر حوالے قائم کر لینا، کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

مدیرِ نعت رنگ کی کوششوں سے یہ رسالہ ہر لحاظ سے ایک معیاری رسالے کی صورت معاصر ادبی رسائل میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس میں شائع ہونے والے اداریے، تنقیدی اور تحقیقی مقالات، تخلیقات، خطوط، انٹرویوز، تبصرے، وغیرہ اپنی اہمیت اور نوعیت کے لحاظ سے معاصر ادبی

رسائل کے مشمولات اور معیار سے کسی طور بھی کمتر حیثیت کے حامل نہیں۔ اس کا ہر گوشہ انفرادیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان میں ایک اہم حصہ ان اداریوں کا بھی ہے جو مدیر ''نعت رنگ'' نے تحریر کیے ہیں۔ یہ اداریے کم و بیش تین دہائیوں کی نعتیہ کارگزاریوں، خیالات، افکار، زمانی اور ذہنی تغیّرات کی تاریخ کے شاہد ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں نعت کے مباحث، تحقیق، تنقید اور تخلیق کی جہتوں میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ عالمی ادبی صورتِ حال ہی نہیں اردو کی ادبی صورتِ حال بھی یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ ادبی تنقید اور تحقیق کے دائرے وسیع ہو چکے ہیں۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، جدید الیکٹرانک میڈیا اور اس کے جملہ ذرائع نے ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ ادبی صورتِ حال کو بھی یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ اس نئی صورتِ حال میں جب کہ سیاسی، معاشرتی، تاریخی حوالے تیزی سے بدل رہے ہیں، ادب اور ادیب کی ذمہ داریاں بھی ایک نئے موڑ پر آ کھڑی ہوئی ہیں۔ ایسے موقع پر ''نعت رنگ'' کے اداریوں کی اشاعت کا جواز بھرپور جواب کا متقاضی ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریے ڈاکٹر افضال احمد انور کی کتاب ''فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ'' کے عنوان سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں، پھر ان اداریوں کی مکرر اشاعت کا جواز کیا بنتا ہے؟ ذیل میں ان دو سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

ان اداریوں کی بارِ دیگر اشاعت کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو مقدار کا ہے کہ اوّلین اشاعت میں اداریوں کی تعداد نہایت کم تھی اور یہ اداریے اپنے دامن میں ایک دہائی کے آس پاس کا ادبی سامان سمیٹے ہوئے تھے۔ اب جب کہ 'نعت رنگ' تقریباً تین دہائیوں کا سفر طے کر کے اکتیس اداریوں کی سوغات لیے شعور و فکر کی نئی روشنی کے ساتھ ادبی افق پر نمایاں ہو رہا ہے تو آپ ملاحظہ کریں گے کہ 'نعت رنگ' کی یہ نئی اشاعت، پہلی اشاعت سے زیادہ اعتماد اور علمی و ادبی وقار کے ساتھ قارئین کی نذر کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر افضال احمد انور کی کتاب ''نعت رنگ کے اداریے'' تیرہ برسوں (۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۸ء) میں شائع ہونے والے بیس شماروں کی ادبی داستان سنا رہے تھے، اب اس اشاعت میں کم و بیش ستائیس سالوں کی طویل، کٹھن اور صبر آزما ادبی مسافت کی سرگزشت مخفی ہے۔ پچھلے چودہ سالوں کے 'نعت رنگ' میں تحریر کیے گئے اداریے اپنے فکری و فنی معیارات میں اول الذکر دور کے اداریوں سے ایک قدم آگے دکھائی دیں گے۔ پچھلی ایک دہائی میں شائع ہونے والے ''نعت رنگ'' کے اداریوں کا مطالعہ کیجیے، ان اداریوں میں سابقہ شماروں کے اداریوں کے مقابلے میں موضوعاتی تنوع، فکری ارتقاء

اور ذہنی پختگی کا مشاہدہ نمایاں انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی اداریوں میں مدیر کے خیالات، احساسات، افکاراور اسالیب کی وہ پختگی نظرنہیں آتی جواواخراداریوں کی خوبی نظر آتی ہے۔اس وقت مدیراپنے علمی اور ذہنی ارتقاع کے اس دور سے گزر رہا ہے جسے ایک مشاق اور پختہ ادیب سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔پچھلے دور کے اداریوں میں فکری اظہار کی جوصورتیں چنگاریوں کی صورت میں نظر آ رہی تھی، اب وہ شعلۂ جوالہ بن کر سامنے آرہی ہیں گویا اس وقت مدیرِ'نعت رنگ' نصف النہار کے وقت پورے آب وتاب سے چمکتے اور روشنی بکھیرتے آفتاب کی مانند نعت کے فروغ کا خورشید بن کر دنیائے ادب کوروشن کررہا ہے۔

گذشتہ دودہائیوں میں دنیا ہی میں تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں، ادب کے راستے پر فکرافروزی کا سفر بھی متنوع سمتوں میں جاری وساری ہے۔ نئے نئے نظریات کی درآمد اور عالمی صورتِ حال نے ہماری سماجی ومعاشرتی زندگی اورادبی صورتِ حال دونوں کو یکسر بدل کررکھ دیا ہے۔ تخلیق، تحقیق اورسب سے بڑھ کرتنقید نئے نئے رویوں، جدیدنظریات سے آشنااور نئے زمانوں سے ہم آہنگ ہوچکی ہے۔پچھلی صدی کے تنقیدی نظریات اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ نئے نئے ادبی رجحانات، رویےاورسوچ کے نئے زاویےاس تیزی سے سامنے آرہے ہیں کہ ہرنیادن ایک نئی سوچ اورنئی فکر کے ساتھ طلوع ہورہا ہے۔قدیم تنقیدی نظریات یا تودم توڑ گئے ہیں یاان کی بنیادوں پر نئے نظام افکار کی عمارت تعمیر ہوچکی ہے۔ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور مابعدجدیدصورتِ حال جیسے جدیدتنقیدی نظریات، تھیوریز، افکاراور خیالات کا ایک سیلِ رواں اپنے جلو میں تازہ ترامکانات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ان نظریات وافکارنے عالمی ادبی تنقید کوتو نئے رنگ، نئے رُخ، نئے زاویےاورنئی کروٹوں سے ہم کنارکیا ہی ہے، اردو کی ادبی تنقید بھی اپنے اندراس کے ہلکے یا گہرے اثرات محسوس کررہی ہے۔اس صورتِ حال میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیانعت جیسی صنف سخن ان اثرات سے آشنا ہوئی بھی ہے یانہیں؟ اور نئے موسموں کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والی نعت اورنئی سماجی صورتِ حال میں جنم لینے والی تنقیدِنعت نے نعت کی صنف میں موضوعاتی تنوّع پیدا کر کے اسے گہرائی اور گیرائی سے ہم کنارکیا بھی ہے یانہیں؟ متذکرہ بالاصورتِ حال میں 'نعت رنگ' کے گذشتہ بیس سال کے شماروں میں نعت کی تنقیدی، تحقیقی اورتخلیقی صورتِ حال کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔اسی طرح ادب کےفروغ، ادبی فضا کی تشکیل سازی، اور'نعت رنگ' کے فروغ میں مدیر

کے کردار کا مطالعہ بھی ضروری ہے اور 'نعت رنگ' کے تیس شماروں تک پہنچتے پہنچتے مدیر کے خیالات، افکار، رویوں، رُجحانات اور اسالیب میں رونما ہونے والے فکری اور فنی تغیّرات اور ارتقاء کو دیکھا جانا بھی ضروری ہے۔ان سوالات کے جواب بھی ذیل میں تلاشنے کی ضرورت ہے۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ ادب کے قاری اور بالخصوص نعتیہ ادب کے قاری کو ان اداریوں کی اشاعت سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ مزید یہ کہ کیا یہ اداریے، فقط جذباتی اظہار، نری عقیدت کے مظہر، وقتی صورتِ حال کے عکاس اور ہیجانی کیفیت کے غماز ہیں؟ یا یہ اداریے فکری وفنی اعتبار سے ادبیت اور افادیت کے حامل ہیں؟ یہ سوالات نہایت اہمیت کے حامل بھی ہیں اور اس کتاب کا جواز فراہم کرنے میں مددگار بھی ہوسکتے ہیں۔ان سوالات کے جوابات اگلے صفحات میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اس سے قبل رسالے کی ادارت اور مدیر کی ذمہ داریوں سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں متذکرہ بالا سوالات کے جواب تلاش کیے جاسکیں۔

رسائل کی ادارت اور مدیر کی ذمہ داریاں

متذکرہ بالا سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں کسی بھی ادبی اخبار یا رسالے کے مدیر کے فرائض اور خصوصیات سے آگاہی کی ضرورت ہوگی۔سب پہلے تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ کوئی بھی اخبار یا رسالہ جب کسی خاص مقصد کے لیے جاری کیا جاتا ہے تو اس کے خاص اہداف اور مقاصد ہوتے ہیں جنھیں پورا کرنے کا ایک منصوبہ مدیر کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔اگر وہ مقصد پہلی بار سامنے آرہا ہو تو رسالے کا مدیر اس مقصد کا بنیاد گزار، شارح اور تعبیر کنندہ بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسالے کا مدیر رسالے کی کشتی کا ناخدا ہوتا ہے۔وہ کشتی، اس میں سوار عملے اور سواریوں کو منزل مقصود پر پہنچانے کا ضامن ہوتا ہے۔مدیر کی کئی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ بطور رہنما، وہ رسالے کو ایک فکری سمت عطا کرتا ہے اور پھر اس کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لاتا ہے۔وہ ایک استاد کی حیثیت سے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں اپنے قارئین کی ادبی تربیت کرتا ہے اور ایک خلاق فنکار کی حیثیت سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال سے رسالے میں قوسِ قزح کے سے متنوع رنگ بھرتا ہے۔اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی سحر انگیزی ہوتی ہے جو قارئین کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں مقیّد کرنے کا ہنر رکھتی ہے۔غرض یہ کہ وہ

اپنی ذات میں متنوع خصائص کا مرکب ہوتا ہے۔

ایک اچھا مدیر پہلے اپنے گرد باذوق قارئین اور اہل قلم کاروں کا ایک حلقہ جمع کرتا ہے پھر وہ ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی تحریروں کے ذریعے انھیں جھنجھوڑتا ہے۔ انھیں سوچنے اور غور وفکر کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ان کے منجمد فکر وخیال میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انھیں اپنا ہم نوا بنانے کی تدبیر کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اسے اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کی کوششیں بارآور نہ ہو پائیں گی۔

رسالے کے معیار کو بلندتر کرنے میں دوسرا اہم کردار اس کے لکھاریوں کا ہوتا ہے۔ لکھاری مدیر کے طے کردہ خطوط اور رسالے کے منشور کی روشنی میں سفر کرتے ہیں۔ کسی بھی رسالے کے معیار کے تعین میں اس کے لکھاریوں کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ رسالے کا معیار بڑھانے اور اسے متعیّنہ سمت کی طرف لے جانے میں لکھاری اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنی تحریروں کی اہمیت، وقعت اور دلچسپی کی بنا پر قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ جس سے بالواسطہ طور پر رسالے کے قارئین میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو رسالے کے معیار اور قدر میں بھی اضافے کا باعث بنتا ہے۔ ہمارے عہد میں متعدد رسائل نکل رہے ہیں لیکن ان میں سے چند رسائل ہی معیاری رسائل کہلائے جانے کے مستحق کہلائے جاسکتے ہیں۔ اس میں دورائے نہیں کہ اردو کے بڑے ادبی رسائل کو قبولیت اور اعتبار کا درجہ دلانے میں دو چار ادیب، نقاد اور محقق حضرات کا ہاتھ رہا ہے۔ 'معاصر' پٹنہ کو بڑا بنانے میں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد وغیرہ کا ہاتھ رہا، 'معیار' کو اعلیٰ معیار بنانے میں قاضی عبدالودود کی تحریریں رہیں۔ 'زبان وادب' پٹنہ کو اہم بنانے میں عطاالرحمٰن کاکوی کا کردار رہا۔ 'اورینٹل کالج میگزین' میں مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد باقر اور حافظ محمود شیرانی جیسے اہلِ قلم کا تعاون رہا۔ 'ادبی دنیا' کی ترقی میں مولانا صلاح الدین احمد کی ادارت کے ساتھ ان کی تحریروں کا بڑا ہاتھ رہا۔ 'نگار' کو 'نگار' بنانے میں جہاں دیگر مصنّفین کا ہاتھ رہا وہاں نیاز فتح پوری کے 'باب الاستفسار'، مالہ وماعلیہ' اور 'باب الانتقاد' نے اہم کردار ادا کیا۔ سید اعظم حسین کے مجلّے 'ادب' کو مقبول ومعروف بنانے میں مسعود حسن رضوی ادیب کے گوشے ''آثار ادبیہ'' نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

کسی بھی رسالے کو ترقی دینے، اعتبار بخشنے اور معیار دلانے میں تیسرا کردار اس کے قارئین کا ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ رسالے کے نشیب وفراز کے تعین میں بھی اسی طبقے کو پیش نظر رکھا جاتا

ہے۔ یہ حلقہ رسالے کے معیار کے تعین میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یعنی یہ حلقہ ادب پیما کا کام کرتا ہے۔ باذوق اور ذہنی تہذیب کے حامل قارئین رسالے کا اعتبار قائم کرتے ہیں اور بے ذوق اور ذہنی تہذیب سے عاری قارئین رسالے کے سطحی معیار کی علامت ہوتے ہیں۔ متذکرہ تینوں کرداروں کا اپنی اپنی سطح پر اپنا اپنا کردار ہوتا ہے لیکن ان میں سب سے اہم کردار مدیر ہی ادا کرتا ہے کیونکہ رسالے کا مرکزِ ثقل وہی ہوتا ہے۔ وہ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں، دونوں کو اپنے گرد جمع کرتا بھی ہے اور جمع رکھتا بھی ہے۔ لکھنے والوں کو لکھنے پر آمادہ کرتا ہے اور پڑھنے والوں کو پڑھنے کی ترغیب دلاتا ہے گویا یہ ایک مقناطیسی کردار کا حامل فرد ہوتا ہے جو اپنی کشش سے لکھاری اور قاری دونوں کو اپنی جانب کھینچے رکھتا ہے۔

کسی بھی رسالے کے معیار کی بقا کا انحصار اس کے مدیر، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر ہوتا ہے گویا یہ رسالے کی تکون ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے پر اثرات مرتب کرتے بھی ہیں اور اثرات قبول کرتے بھی ہیں۔ قاری، لکھاری اور مدیر کی تکون ہی کسی رسالے کی بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک ستون کی کمی رکمزوری رسالے کی عمارت کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ جب تک قاری اور لکھاری کا مدیر سے مضبوط رابطہ استوار نہ ہوگا، تب تک رسالے کی بقا اور ترقی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ہے۔ تینوں فریقین کے روابط کی کمزور صورتوں کے عبرت ناک نتائج کی مثالیں اردو رسائل کی ادبی تاریخ کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم کردار مدیر کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے لکھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ تشکیل دیتا ہے جو اس کے وژن کے مطابق تحریریں رسالے کے لیے لکھتے ہیں اور قارئین کی ذہنی تربیت بھی کرتے ہیں اور قارئین کے حلقے کو وسیع تر کرنے میں اپنا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے لیے دو چار روز یا دو چار مہینے درکار نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے ایک طویل اور صبر آزما عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ عرصہ دو چار سالوں پر بھی محیط ہوسکتا ہے اور دو چار دہائیوں پر بھی۔ بہر حال مدیر کو ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اس سفر کو طے کرنا ہوتا ہے۔

مدیر رسالہ، سازگار ادبی ماحول کی تشکیل اور معیاری ادبی صورتِ حال کی تیار میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر اوقات دونوں انھی کے پروردہ بھی ہوتے ہیں۔ اردو رسائل کی تاریخ اور روایت پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے ہندوستان میں معاصر، تحریر، زبان و ادب، نیا دور، اُردو ادب، غالب نامہ، شب خون، سوغات، عصری ادب اور شاعر وغیرہ رسائل نے اور پاکستان میں

اورینٹل کالج میگزین،نقوش،فنون،اوراق،افکار،ساقی،سیپ،سویرا اور غالب نے تحقیقی اور تنقیدی فضا ساز گار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب کہ معاصر ادبی صورتِ حال ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں حوصلہ افزا نہیں۔ نہ ادبی رسائل ماضی کے معیار کے مطابق ہیں نہ مدیر اس قابلیت یا صلاحیت کے حامل ہیں، نہ لکھاری اس معیار کے اور نہ ہی قاری اس سطح کے۔ لیکن گردو پیش میں نکلنے والے ادبی پرچوں کی تعداد/مقدار پر نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ادبی صورتِ حال اپنے خوشگوار اور ترقی یافتہ دور سے گزر رہی ہو لیکن حقیقت اس کا برعکس روپ پیش کرتی ہے۔

موجودہ عہد میں رسائل کی کثرت سابقہ ادوار کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ معاصر عہد میں ادبی رسائل تو بے شمار نکالے جا رہے ہیں لیکن ماضی کی طرح باشعور، منصوبہ ساز اور محنتی مدیران، رسائل کو میسر نہیں آ رہے جس کی وجہ سے رسائل و جرائد ماضی کے رسائل و جرائد کی طرح شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کر پا رہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر رسالہ اپنے عہد پر اثرات مرتب نہیں کرتا اور اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ہر کامیاب رسالہ بھی زیادہ دیر جاری نہیں رہتا۔ کامیابی کا تعلّق عرصے پر محیط نہیں بلکہ اس کے قارئین، لکھاریوں اور سب سے بڑھ کر اس کے مدیر پر ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے مدیر کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑے پتے کی باتیں تحریر کی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ادارت، بہ ظاہر کسی بھی تخلیقی اور تنقیدی کام سے کم تر درجے کی چیز معلوم ہوتی ہے مگر آپ اپنے تجربات کی روشنی میں غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بادی النظر میں بہت حقیر اور سہل العمل نظر آنے والی ادارت کی ذمہ داری آپ سے بے پناہ تنقیدی اور تخلیقی صلاحیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ادب کے سارے اصناف سے کماحقہٗ واقفیت اور ساری اصناف کے اسرار و رموز پر مکمّل دست رس کے بغیر اس میں دو قدم بھی چلنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مدیر کے لیے ہمہ جہت لسانی و ادبی روایت سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی تخلیقی سرگرمیوں کا بالغ نظر ناقد اور ادبی سفر میں شریکِ سفر کی حیثیت کا مالک ہونا بہت بنیادی شرط ہے۔''[۲]

متذکرہ بالا اقتباس اس حقیقت کا انکشاف بھی کر رہا ہے کہ ادارت اور مدیرانہ ذمہ داریاں کم تر درجے کی چیز سمجھی جاتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسی وجہ سے ادبی رسائل زوال کا شکار ہوئے ہیں۔ مدیر کے لیے کسی بھی بڑے تخلیق کار، نقاد اور محقق سے کم صلاحیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بڑے تخلیق کار، محقق اور نقاد کا مرکب ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تخلیق کار، نقاد، اور ادیب

ہوتے ہوئے بھی غیر معروف رہتا ہے اور کم اعتبار بھی۔ ایک مدیر کو جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، وہ اوصاف معاصر عہد کے مدیروں میں مفقود ہیں۔

اداریے کسی بھی رسالے کا دروازہ، چہرہ یا مطلع ومنبع ہوتے ہیں کہ اسی سے رسالے کی جہت، معیار اور مزاج کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اداریے کسی بھی رسالے کی عمارت میں نظریاتی بنیاد کا کام کرتے ہیں۔ اسی کی بنیادوں پر رسالے کی علمی وفکری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ بنیاد کا دارومدار اس کے معمار، خالق پر ہوتا ہے اور اداریے کا معمار اور خالق، مدیر ہوتا ہے۔ رسالے میں شائع ہونے والے اداریے مدیر کے نظریات، افکار، خیالات، احساسات، جذبات اور طرزِ عمل کے ترجمان اور عکاس ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اداریے مدیر کے ذہنی وفکری رویوں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ انھی سے مدیر کی سوچ اور رسالے کی پالیسی یا مقاصد کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

اداریہ تحریر کرتے ہوئے ایک قابل مدیر اپنے معاصر ادبی رجحانات، مسائل ومباحث کے کسی قابلِ ذکر پہلو، گوشے یا رویوں کو منتخب کرتا ہے اور اسے اپنے نقطۂ نظر کی کٹھالی میں تجربات کی لو سے اس طرح گلاتا ہے کہ فکر وخیال کی ایک نئی صورت متشکل ہو کر صفحۂ قرطاس پر سیم وزر کی مثل بکھر جاتی ہے۔ عام قارئین کے لیے یہ بات بہت اہمیت کی حامل نہیں ہوتی لیکن صاحبانِ فکر ونظر ان خوبیوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن عمومی طور پر مدیر حضرات اپنے اداریوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وقت گزاری کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا ہر اداریہ ایک الگ جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے جس کا رسالے کی مجموعی کارکردگی سے سروکار نہیں ہوتا۔

کسی بھی ادبی رسالے کی بقا کی ضمانت فکر وخیال کے اس تازہ اور نئے خون میں مضمر ہوتی ہے جو لحظہ بہ لحظہ اسے ملتا رہتا ہے۔ یہ نیا خون رسالے یا مدیر کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن رسالے کی زندگی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر یہ نیا خون فاسد مادوں پر مشتمل ہو تو رسالے کا مدافعتی نظام (اگر اس میں یہ نظام موجود ہو تو) جلد ہی اس پر قابو پا کر اس کے مہلک اثر کو ختم کر دیتا ہے اور اگر یہ رسالے کی ادبی زندگی کے لیے مفید ہے تو اس کا جزوِ لاینفک بن کر اسے طویل اور صحت مند زندگی فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی مثال اردو میں جنم لینے والے ان تجربات سے لگا لیجیے جو آزاد غزل، آزاد نظم، ہائیکو، افسانچہ، ناولٹ وغیرہ کی صورت میں سامنے آئے۔ وقت ایک بے رحم پیمانہ ہے جو اپنے دائرے میں صرف زرِ خالص کو ہی جگہ دیتا ہے۔ کھوٹ یا ناقص شے کو نکال باہر کرتا ہے۔

ادبی رسالے کے مدیر کے پاس کہنے کے لیے بڑا کینوس ہوتا ہے کبھی وہ نثر پر گفتگو کرتا ہے کبھی شاعری پر کبھی کسی ایک صنف پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو کبھی دوسری صنف پر، کبھی ایک نظریے کو اداریوں کا موضوع بناتا ہے تو کبھی دوسرے موضوع کو لے کر چل پڑتا ہے۔ کبھی ادبی اکیڈمیوں کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے تو کبھی غم و غصے کی تان ادبی مجلسوں پر توڑتا ہے۔ کبھی ادبی تجربات اس کے اداریوں کا موضوع بنتے ہیں اور کبھی ادبی نظریات، کبھی ادب میں درآمد شدہ نظریات پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو کبھی نئے تجربات پر رائے زنی کرتا ہے۔ کبھی وہ معاشرتی صورتِ حال پر اظہار رائے دیتا ہے تو کبھی مذہبی یا سیاسی صورتِ حال کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کے پاس کہنے کے لیے ایک وسیع میدان ہوتا ہے لیکن ایک ایسے مدیر کے لیے جس کی توجہ کا محور صرف اور صرف ایک صنف ہو اور وہ بھی ایسی صنف جسے ادبی صنف تسلیم کروانے میں ہی بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں یا اس پر لکھنے والے محدود ہوں، اس پر سوچنے والوں کا کال پڑا ہوا ہو، اس نے صنف نعت کی ادبی حیثیت منوانے کے لیے تیس سال تک ایسے اداریے لکھے ہوں جس میں اس صنف کی اردو ادب کو پرثروت کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ امکانات و مسائل پر بھی متواتر اداریے تحریر کیے ہوں اس کی تحریریں صنف نعت کے حوالے سے مجموعی فضا بدلنے اور اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنی ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ہر اداریہ رسالے کے منشور اور نصب العین سے جڑا بھی رہے کوئی آسان کام نہیں۔

'نعت رنگ' کی ادارت اور صبیح رحمانی

'نعت رنگ' وہ پہلا رسالہ نہیں جس کی ادارت کے فرائض صبیح رحمانی نے ادا کیے۔ اس سے قبل بھی وہ تین رسائل 'ایقان'، 'لیلۃ النعت' اور 'سفیرِ نعت' کی ادارت، ترتیب اور سرپرستی کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ جس سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ انھیں 'نعت رنگ' کے اجرا سے قبل بھی رسائل و جرائد کی ادارت کا تجربہ رہا تھا اور یہ سابقہ تجربات کا نتیجہ/سبب ہی تھا جس نے 'نعت رنگ' کو مقبول و معروف اور معاصر ادبی رسائل میں جگہ بنانے اور قابلِ اعتبار درجہ دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 'نعت رنگ' کو ترقی دینے اور معیار دلانے میں سابقہ رسائل کے حسنِ انتظام، کاوشوں اور تربیت کے علاوہ ان کے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے، تحقیقی و تنقیدی صلاحیت اور تخلیقی اُپج بھی شامل رہی ہے۔

صبیح رحمانی ایک بالغ نظر نقاد، ایک محقق، ایک صاحب الرائے شخصیت، پختہ مشق شاعر

اورمنفرد اسلوب کے حامل ادیب ہیں۔ برعظیم کی تاریخ، تہذیب، نفسیات، معاشرت سے بھی واقف ہیں اورادب کی جملہ اصناف پرایک سنجیدہ طالبِ علم کی طرح گہری نظربھی رکھتے ہیں۔اس کی شہادت ان کی مختلف تحریریں بھی پیش کرتی ہیں اور'نعت رنگ' کےاداریےبھی۔ایک ذمہ دار ادیب حیات افروز رویوں، خیالات اورافکار کی تشکیل اورنشو ونما میں اہم کرداراداکرتا ہے۔ یہ کردار وہ ادب تخلیق کر کے بھی ادا کرسکتا ہے اور تنقید لکھ کربھی۔ میرے خیال میں صبیح رحمانی کے اداریے ثانی الذکر کردارادا کر رہے ہیں اور'نعت رنگ' کی تشکیل اول الذکر۔

مدیر رسالے کو قارئین کے لیے دلچسپی کا حامل بنانے کے لیے مفید اقدامات کرتا ہے۔ غوروفکر کی دعوت دیتا ہےاورقارئین سےاپنے رسالےکوجڑا رکھتا ہے۔ صبیح رحمانی متذکرہ تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف دکھائی دیتے ہیں۔ زوال آمادہ صورتوں پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے قارئین کی توجہ سمیٹنے، مجتمع کرنے اور مرتکز رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔اس کے لیے وہ رسالے ہی میں دلچسپی کا سامان مہیا نہیں کرتے بلکہ اداریوں میں بھی توجہ طلب مواد اورامور شامل کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہراداریے میں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو بڑے تخلیق کار کی طرح اپنے پڑھنے والوں کوجھنجھوڑتی، سوچنے پر مجبور کرتی اورانھیں عمل پر اکساتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں مدیر کوایک رہنما سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ مدیر ایک رہنما کی طرح اپنے معتقدین، مصنّفین اور قارئین کوساتھ لے کر چلتا ہے۔ان کے ادبی ذوق کی تشکیل بھی کرتا ہے، تربیت بھی اور ذہن سازی بھی اور رفتہ رفتہ ان کی ذہنی سطح بلند کرتے ہوئے اس مقام تک لے جاتا ہے جس کا خواب وہ دیکھ چکا ہوتا ہے۔'نعت رنگ' کو دیکھ لیجیے۔ مدیر نعت رنگ نے تقریباً تین دہائیوں کے سفر میں نعت کے حوالے سے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ''نعت رنگ'' کے گرد جمع کیا اور غیرمحسوس طریقے سے ان کی ذہن سازی اور ادبی تربیت کے فرائض بھی انجام دیے۔ یہ تربیت'نعت رنگ' میں شائع کی جانے والی تحریروں، تخلیقات اور خطوط کے ذریعے بھی ہوئی اوراداریوں کے ذریعے بھی گویا'نعت رنگ' ایک ایسے پلیٹ فارم کے طور پر سامنے آیا جہاں سے فکر و خیال اور نظریات وافکار کے سوتے پھوٹتے رہے۔ان سے لکھاری بھی اور قارئین بھی فیض یاب ہوتے رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نعت کے قارئین اونگھنے لگتے تو یہ نئے فکری سوالات کی تان بڑھا دیتے اور جب ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تو سروں کی سطح دھیمی کر دیتے تا کہ قارئین بھرپور لطف لے سکیں۔

’نعت رنگ‘ کی ترتیب وتدوین میں مدیر کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ رسالے کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر یکساں غور وفکر کرتے ہیں اور نعت اور ادب سے جڑے تمام امکانات پر توجہ دیتے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے اداریوں میں کبھی وہ ادبی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ادیبوں کی صورتِ حال پر، کبھی نعت کی تخلیقی صورتِ حال کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو کبھی تنقیدِ نعت کے مسائل ومباحث پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی مرحوم نعت کاروں کا نوحہ لکھتے ہیں تو کسی اداریے میں کسی نئے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ’نعت رنگ‘ میں شمولیت پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور کبھی فروغ نعت میں حائل رکاوٹوں اور رکاوٹیں ڈالنے والوں کے رویوں کے سدباب کے لیے غور وفکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ مدیر کو جو کبھی لڑائی لڑنا پڑتی ہے اور ’نعت رنگ‘ کے صفحات بالخصوص اداریوں میں مدیر کو یہ معرکہ سر کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

کسی بھی رسالے کی اشاعت یا طویل اشاعتی سفر کے پس منظر میں مدیر کی محنت، مشقّت، قربانیاں اور آنکھوں میں کٹی راتوں کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے یہ منصب سنبھالا ہو یا اس نے ادارتی عمل یا مدیرانہ ذمہ داریوں کو قریب سے دیکھا ہو۔ رسائل کی تاریخ یا جراید کے مدیروں کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے بھی اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل مدیر ہی رسالے کا روحِ رواں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایک ڈرائیور کی سی ہوتی ہے کہ وہ سٹیئرنگ کو جس سمت چاہے موڑ دے، عوامی شاہراہ پر لے جائے یا مخصوص گزرگاہوں پر ہی دوڑاتا رہے۔ کچے میں اتار دے یا پتھریلے راستوں سے گزارے یا یوں کہہ لیجیے کہ مدیر اپنے رسالے کا باغبان ہوتا ہے وہ اس رسالے کی کیاریوں میں رنگ رنگ کے اور نایاب ونوادر تحریروں کے گل بوٹے لگاتا ہے اور اپنی آنکھوں کے تیل اور محنت کے پسینے سے ان کیاریوں کو سیراب کرتا ہے اور انھیں پھلتا پھولتا دیکھنے کے لیے عملی کاوشیں کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے لکھنے والوں کی ایک باصلاحیت جماعت درکار ہوتی ہے۔ انھی کے قلمی تعاون کے سہارے وہ رسالے کو کامیاب، معیاری اور قابل مطالعہ بناتا ہے۔

اُردو رسائل کی تاریخ پر نظر دوڑائیے، تمام مدیر حضرات اچھے لکھاریوں کی تلاش میں رہے ہیں اور جب کوئی اچھا لکھاری یا نامور شخصیت اس رسالے سے وابستہ ہو جاتی تو اس کا اظہار بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں اقبال اور اکبر کی تحریریں رسائل بڑے فخر سے شائع کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات دو شعر ہی دستیاب ہوتے تو انھیں بھی بڑے افتخار سے شائع کیا جاتا تھا۔ ’تہذیب الاخلاق‘

میں اگر مولوی ذکاء اللہ، منشی مشتاق حسین، سید مہدی علی، الطاف حسین حالی اور خود سر سید کی تحریریں شائع نہ ہوتیں تو 'تہذیب الاخلاق' وہ اہمیت حاصل نہ کر پاتا جو اسے حاصل ہوئی۔ سر سید احمد خان نے ہندوستان کے نامور دانشوروں کو 'تہذیب الاخلاق' کے لیے لکھنے پر آمادہ کیا۔ شیخ عبدالقادر کے بعد مخزن کی ذمہ داری شیخ محمد اکرام، مولوی غلام رسول اور تاجور نجیب آبادی کے حصے میں آئی ایک عرصے بعد شیخ عبدالقادر کا مضمون مخزن کو موصول ہوا تو مدیر نے اسے بڑے فخر سے شائع کیا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مولوی ذکاء اللہ کے مضامین کو رسائل بڑے افتخار سے شائع کرتے تھے اور جب کبھی کسی رسالے کو ان کا مقالہ موصول ہوتا وہ اسے بڑے افتخار سے شائع کرتا۔ یہاں تک کہ مدیر حضرات اپنے اداریوں میں بھی بڑے لکھاریوں کو ان کے رسالے کی جانب لکھنے کے لیے متوجہ کرتے۔ اس کے لیے خطوط لکھتے اور بذاتِ خود بھی ان سے درخواست کرتے۔ اس کی شہادتیں قدیم رسائل یا موجودہ دور کے رسائل و جرائد سے بآسانی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ آج بھی معیاری جرائد اچھے لکھاریوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بہرحال مدیر کو معیاری لکھنے والوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔

صبیح رحمانی نے بھی 'نعت رنگ' کے لیے لکھنے والے ہی نہیں معیاری اور قد آور لکھاری تلاش کیے۔ یہ تلاش کم و بیش تین دہائیوں پر محیط ہے۔ نوّے کی دہائی تک نعت پر لکھنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور آج بھی یہ تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن صبیح رحمانی کا کمال ہے کہ انھوں نے ملک کے طول و عرض سے ہی نہیں بیرون ملک سے بھی 'نعت رنگ' کے لیے ذہین اور ذہنی وابستگی رکھنے والے لکھاریوں کا ایک کثیر حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ اب انھیں 'نعت رنگ' کے مواد کے حصول کے لیے دیگر رسائل کی طرح سخت مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور نہ ہی رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے وہ رطب و یابس کا سہارا لیتے ہیں۔ رسالے کا معیار اس وقت ترقی کے راستے پر گامزن ہوتا ہے جب مدیر کے گرد و پیش میں لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہو اور ان کی دسترس میں موضوعات کی کثرت اور تنوع بھی موجود ہو۔ اس طرح رسالہ تکرار سے بھی محفوظ رہتا ہے اور غیر معیاری مواد کی شمولیت سے بھی اور معیاری موضوعات کی کمی سے بھی سامنا نہیں پڑتا۔ اس بات کا احساس مدیر نعت رنگ کو بخوبی ہے۔ وہ ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''نعت رنگ ۲۴ پیشِ خدمت ہے۔ کسی بھی جریدے کے مدیر یا مرتب کی ادارتی ذمہ داریوں

میں یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اپنے لکھنے والوں سے کس طرح رابطے میں رہتا ہے اور انھیں اپنی ضرورت کے مطابق اور منصوبوں کے تحت مقالات کی تکمیل پر کس طرح آمادہ کرتا ہے۔ اس عمل میں مدیر کی گرفت جہاں ذرا ڈھیلی پڑتی ہے، جریدے کا معیار اور اشاعتی رفتار دونوں متاثر ہوتے ہیں۔'' (اداریہ نمبر ۲۴)

صبیح رحمانی نے نئے قلم کاروں کی دریافت کے ساتھ ساتھ نئے قاری بھی تلاشنے کی سعی کی ہے۔ کم و بیش تین دہائیوں کی مسلسل اشاعت اس کی کامیابی کا ثبوت بھی فراہم کر رہا ہے کیونکہ رسالوں کے لکھاریوں میں اسی وقت اضافہ ہوتا ہے جب اس کے مطالعے کا حلقہ وسیع ہو۔ مصنّفین کے ساتھ ساتھ قارئین کا حلقہ بھی وسیع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس کی اشاعت میں کوئی وقفہ آیا اور نہ ہی اس کی ضخامت میں کوئی کمی دیکھنے میں آئی بلکہ ہر نیا شمارہ سابق شمارے سے اپنے معیار اور مقدار سے بہتر شائع ہو رہا ہے۔ اس کا موازنہ معاصر عہد میں شائع ہونے والے بیشتر رسائل سے کیا جاسکتا ہے۔ 'نعت رنگ' کا مقام و مرتبہ بیشتر معاصر ادبی رسائل سے اپنے معیار اور مقدار کے لحاظ سے یقیناً بہتر ہے۔ اس میں شائع ہونے والے اکثر مقالات بیشتر تحقیقی مجلّات میں شائع ہونے والے مقالات معیار اور مواد کے لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں اور اب ایچ۔ ای۔ سی کے زیرِ سرپرستی شائع ہونے والے مجلّات سے اس کا موازنہ کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ جو کچھ اور جس طرح اس میں شائع ہو رہا ہے وہ اہلِ فکر و نظر سے پوشیدہ بھی نہیں۔

رسالہ 'فنون' اور 'اوراق' ایک عرصہ تک معیاری ادب کی تخلیق کرتے رہے اور تنقید، تحقیق اور تخلیق کے فروغ کے لیے سازگار ماحول بھی فراہم کرتے رہے۔ دونوں ادبی رسائل سے معاصر عہد کے نامور اور بسیار نویس قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد وابستہ رہی۔ دونوں رسائل کے پاس اپنے اپنے ہم مزاج اور ہم خیال قلم کاروں کا ایک وسیع حلقہ موجود تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ یہ رسائل صرف اپنے ہم خیال لکھاریوں کی خوشنودی اور تشہیر کے لیے شائع کیے جا رہے تھے۔ قارئین کی دلچسپیوں اور ذوق کی آبیاریوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ کوئی بھی رسالہ قارئین کی پسندیدگی کی بنیادوں پر تو دیر تک کھڑا رہ سکتا ہے لیکن صرف اپنی انا کی ضد یا ہم خیال مصنّفوں کی محض پسندیدگی کی بنا پر قائم نہیں رہ سکتا۔ قارئین کو الوداع کہہ کر کوئی رسالہ ایک دہائی کا فاصلہ بھی طے نہیں کرسکتا۔ جس طرح ادب معاشرے کے لیے لکھا جاتا ہے کسی چڑیوں کو سنانے کے

لیے نہیں بعینہٖ رسالہ بھی ذہین اور غیر جانبدار قاری کے لیے مرتب کیا جاتا ہے، اپنی ذات یا ہم خیال افراد کی تشہیر کے لیے نہیں۔

اردو رسائل کی پچھلی ایک صدی میں جاری ہونے والے رسائل و جرائد کی تاریخ پر نظر دوڑائیے، معاصر، معیار، زبان وادب، ہندستانی، مجلّہ عثمانیہ، دکن ریویو، تحریر، نگار جیسے معروف اور مؤقر رسائل و جرائد اس آب و تاب کے ساتھ نکلتے رہے کہ حاسدین کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں لیکن جب وہ اپنی وابستگی قارئین کے ساتھ نہ رکھ سکے یا اپنے لیے نئے قاری تلاش نہیں کر سکے یا ہوا کا رخ نہیں پہچان سکے تو وہ اپنی موت آپ مر گئے۔ 'نگار' ہمارے سامنے کی مثال ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب شعبۂ اُردو جامعہ زکریا پر بڑے مہربان رہے۔ وہ عمر کے آخری دور میں شعبۂ اُردو کو 'نگار' کی مکمّل فائل دینے اور مستقبل میں اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار کرتے رہے۔ 'نگار' کے آخری دور میں کم یاب اور نایاب کتب کا عکس شائع کر کے اسے زندہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ لیکن وہ اسے اپنی موت مرنے سے نہ بچا سکے۔ غالباً 'شاعر' واحد رسالہ ہے جو نصف صدی کا عرصہ طے کر چکا ہے لیکن اس کی سانسیں پھولی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے قارئین سے اپنا ربط استوار بھی رکھا اور ان کی دلچسپیوں سے اپنا منہ بھی نہیں موڑا۔ جدید دور کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا اور نئے نظریات، خیالات اور افکار کے داخلے کے لیے دل اور دروازہ دونوں کھلے رکھے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے لیے قاری پیدا کیے ہیں۔ پیدا ہی نہیں کیے۔ ان کے ادبی ذوق کی تربیت کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'شاعر' معیاری مضامین کے ساتھ باقاعدگی سے شائع بھی ہو رہا ہے اور ہر دور میں اپنے قارئین پیدا بھی کر رہا ہے۔

یہی حال 'نعت رنگ' کا بھی ہے کہ اس نے دنیائے اردو کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے قارئین میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ نئے نئے قارئین تلاش کر کے نعت کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں ان کے ذوق کی آبیاری کا سامان فراہم کیا۔ ان کے ادبی ذوق کی تربیت کی، ان میں نعت کے حوالے سے غور و فکر کرنے کی عادت پیدا کی۔ صرف ترغیب نہیں دی بلکہ انھیں اپنے مقالے، مضمون، تبصرے، مراسلے یا کسی اہم رمنفرد خیال کو کسی بھی ہیئت یا فارم میں 'نعت رنگ' کے لیے بھیجنے کی دعوت عام دی۔ راقم الحروف اس حقیقت کا عینی شاہد بھی ہے۔ کئی سال تک صبیح رحمانی مجھے 'نعت رنگ' بھیجتے رہے اور صلے میں رسالے کے مشمولات پر ایک تجزیاتی خط کی فرمائش کرتے رہے۔، میری طرف سے ایک

عرصہ تک ان کی اس خواہش کا جواب لفظی جمع خرچ سے زیادہ کبھی دیا بھی نہیں گیا۔

ہماری طالبِ علمی کے زمانے میں 'قومی زبان'، 'صریر' اور 'شام وسحر' جیسے رسائل ہماری کج مج تحریریں شائع کر کے ہمارے لکھنے کا سامان فراہم کرتے رہے اور آج اگر ہم سے دو چار کام کے جملے تحریری وجود میں متشکل ہو جاتے ہیں تو اس کا ایک سبب متذکرہ رسائل ہی رہے ہیں۔ یہی ذمہ داری اب 'نعت رنگ' نبھار ہا ہے۔ یہ قارئین کو صلائے عام دیتا رہا ہے کہ وہ آئیں اور اپنی تحریروں، خیالات، افکار اور تصورات کے رنگوں سے 'نعت رنگ' کو مزین کریں۔ آسمان پر لمحہ بھر کے لیے چمکتا ہوا ستارہ بھی آسمان کو خوبصورت بنانے اور روشن کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بعینہٖ مدیر نعت رنگ کا خیال ہے کہ نعت کے حوالے سے کسی کی کوئی ایک چھوٹی سی فکر افروز بات بھی راکھ میں پڑی ہوئی اس چنگاری کی مثل ہو سکتی ہے جس سے الاؤ کو روشن کیا جا سکتا ہے۔

''نعت رنگ''، اگر مؤقر جرائد کی طرح محض ناموراور ثقہ مصنّفین کی تلاش میں لگا رہتا اور ٹھوس مقالات کی راہ تکتا رہتا یا دو چار ہم خیال لکھنے والوں پر ہی تکیہ کرتا رہتا تو اس کا مستقبل بھی ان مقبول ومعروف جرائد سے مختلف نہ ہوتا، جو اب گوشۂ گمنامی میں مستور ہو چکے ہیں کیونکہ ادب کے وسیع کینوس کو لے کر چلنے والے رسائل و جرائد جب اپنے وجود کی بقا، زمانے کی گردشوں سے محفوظ نہیں رکھ سکے تو 'نعت رنگ' جیسے موضوعی رسالے کو تو کس شمار میں رکھا جا سکتا ہے۔

مدیر نعت رنگ نے رسالے کے اجرا کے مقاصد اور نصب العین کے تعیّن کے بعد 'نعت رنگ' کا اجرا کیا۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۵ کے اداریے میں رسالے کے نصب العین کا تعیّن کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تقریباً بیس سال پہلے نعت کی تخلیقی رو کو نئے شعور سے ہم آہنگ کرنے، نعتیہ ادب کو ادب کے مرکزی دھارے سے ملانے اور اس کی فکری اور تنقیدی جہتوں کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ادب کے بامعنی سرمائے کا حصہ بنانے کے لیے جو سفر آغاز کیا گیا تھا۔''

''نعت رنگ''، شمارہ نمبر ۲۹ کے اداریے میں رسالے کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اپنی بساط کی حد تک تو میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ نعت کو ادبی پہلوؤں سے دیکھنے اور اس کی فنی اور فکری پرکھ کی طرف اہلِ نقد کو متوجہ کروانا اور خوش وقتی مطالعات کی رسمی و روایتی فضا میں کوئی نئی بات کہنے کی کوشش، کسی گہری بات کو سامنے لانے اور کوئی نیا سوال اٹھانے اور کوئی تازہ مقدمہ قائم کرنے اور کوئی نئی بحث چھیڑنے کی خواہش ہی تو

دراصل ''نعت رنگ'' کی اشاعت کا جواز بنی تھی۔''

اداریہ کسی بھی رسالے کا دروازہ، چہرہ یا مطلع ہوا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے رسالے کی بنیاد بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسی پر رسالے کی عمارت کی ہیئت، ساخت، تعمیر و تشکیل کا دارومدار ہوا کرتا ہے۔ بنیاد میں کجی ہو تو ثریا تک اٹھائی جانے والی عمارت کج ہی رہتی ہے خواہ اس کو خوش نما بنانے کے ہر ممکن وسائل فراہم ہی کیوں نہ کر دیے گئے ہوں۔ رسالے کی بنیاد، عمارت کا خالق اس کا مدیر ہوا کرتا ہے اور رسالے کے اداریے مدیر کے ذہنی و فکری رویوں کا آئینہ۔ انھی سے مدیر کے خیالات، رجحانات، مقاصد اور منصوبوں سے جانکاری اور رسالے کے مقاصد اور راہِ عمل کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی رسالے کے اجرا اور درست خطوط پر استوار کرنے کے لیے کچھ رہنما اصول ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو اس کی پالیسی، نصب العین اور مقاصد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی منشور یا نصب العین کو سامنے رکھ کر مدیر، رسالے کو مرتب کرتا ہے گویا یہ ایک ٹارگٹ ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ شب و روز کوشش میں لگا رہتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی بڑے مقصد کا حصول، بالغ نظر شخصیت، اپنے شعور اور ادراک کی مدد سے انجام دے پاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اداریے مدیر کے ذہنی و فکری رویوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انھی سے مدیر کی سوچ اور رسالے کی پالیسی یا مقاصد کا تعین کیا جاتا ہے۔

چونکہ مدیر رسالے کا پالیسی ساز ہوتا ہے۔ لہٰذا رسالے میں شائع ہونے والے مضامین و مقالات اور خیالات و افکار رسالے کی پالیسیوں کو سامنے رکھتے ہوئے شائع کیے جاتے ہیں۔ رسالے کی پالیسی کے خلاف یا عدم مطابقت رکھنے والے خیالات، افکار، مضامین، مقالات اور تخلیقات وغیرہ کو اس میں شائع کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات معروف اور مقبول ادیب کی تحریر بھی رسالے میں اس لیے شائع نہیں ہو پاتی کہ وہ رسالے کی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سعادت حسن منٹو جیسے خلاق فن کار کا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت'، 'نقوش' میں اس لیے شائع نہیں ہوسکا کہ وہ اس رسالے کی پالیسی سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اسی طرح 'نظام' بمبئی میں منٹو کی تحریریں اس لیے نہ شائع ہوسکیں کہ منٹو کو یہ شکایت تھی کہ اس میں مضامین اور افسانے ترقی پسند ادیبوں کی سفارش پر شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ منٹو اس وقت بمبئی میں ہی مقیم تھے۔[۳]

'نعت رنگ' میں شائع ہونے والی تحریریں مدیر کی طے کردہ پالیسیوں اور منشور کے مطابق شائع ہوتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے پالیسیوں کا دائرہ وسیع بھی رکھا ہے اور لچک دار

بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ’نعت رنگ‘ میں بعض ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں جو اس رسالے کی پالیسیوں سے بظاہر میل نہیں کھاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر مکتبۂ فکر اور گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی تحریروں کو شائع کیا جاتا ہے۔ صبیح رحمانی نے ’نعت رنگ‘ کے شمارہ نمبر ۱۷ کے اداریے میں اس رسالے کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ’نعت رنگ‘ کے فروغ اور معاصر ادبی رسائل میں مقام دلانے کے لیے کسی ایک مکتبۂ فکر یا ہم خیال دانشوروں کو ہی اپنا ہم نوا نہیں بنایا بلکہ ہر اس ترقی پسند فکر یا نقطۂ نظر کے لیے اپنے دل اور رسالے کے در کھول رکھے ہیں جو اس رسالے کی زمین میں اپنی فکر و خیال کے بیج ڈال کر اسے ثمر بار بنا سکیں۔ چنانچہ انھوں نے ہر مکتبۂ فکر کے حامل دانشوروں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور اپنے خیالات اور افکار سے ’نعت رنگ‘ کو نئی راہوں سے آشنا کرنے میں دستِ تعاون دراز کریں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ’’نعت رنگ‘‘ کے اجرا کے وقت سے لے کر آج تک میں نے ’’نعت رنگ‘‘ کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کے نمائندہ رسالے کے مروّجہ اصول وضوابط کا پابند نہیں رکھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس انداز اور مزاج کے حامل نعت پر کئی جریدے شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ’’نعت رنگ‘‘ کو ایک ایسی محفل بنانے کی کوشش کی ہے جہاں مختلف الخیال احباب اپنے اپنے مکتبِ فکر و اندازِ نظر کے ساتھ شریک ہو کر ذکرِ نبی کریم ﷺ کے فکری، مذہبی، ادبی اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کر سکیں، یہی نہیں بلکہ ادب کا عام مگر باشعور قاری بھی اس گفتگو میں اسی اہمیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے جس کا حق ہم صرف لکھنے والوں کو دیتے رہے ہیں۔ ایک ایسے فورم پر جہاں اظہارِ رائے کی آزادی ہو وہاں مباحث کا دائرہ صرف فکری، ادبی، اور فنی نہیں رہتا بلکہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی مسلکی اور فقہی بھی ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے لیے معنی رکھتی ہیں اور ہم اپنے نظریات کو اسی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اختلافِ رائے بری چیز نہیں مگر شائستگی ضروری ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اس کا خیال رکھتے ہیں مگر کچھ احباب اپنی تحریروں پر اُٹھنے والے سوالات سے خاصی حد تک آزردہ نظر آتے ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ’’نعت رنگ‘‘ کے معماروں میں ان عظیم ناموں کو دیکھیں جو ادب و مذہب کے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے نعت پر بے لاگ گفتگو کے دروا

کرنے کے لیے اپنی تحریروں پر اعتراضات اور سوالات کشادہ دلی سے برداشت کیے اور مسلسل ''نعت رنگ'' میں لکھتے رہے کہ ہم سب نعت پر ایسی تنقیدی گفتگو کو فروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔(اداریہ نمبر۱۷)

'نعت رنگ' کی لچک دار پالیسی کا سبب ہی تھا کہ اس رسالے میں نعت سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی تعریف وتحسین سے مملو تحریریں بھی شائع ہوئیں اور نعت کا کڑا محاسبہ کرنے والے ناقدین کی تحریریں بھی۔ یہاں تک کہ مدیر نعت رنگ نے اپنے خلاف شائع ہونے والی تحریروں کو بھی کشادہ دلی سے شائع کر دیا۔ ڈاکٹر افضال احمد انور لکھتے ہیں:

''مدیر نعت رنگ کے اس حوصلے کی داد نہ دینا ادبی بد دیانتی ہوگی کہ انھوں نے 'نعت رنگ' میں ایسا مضمون بھی شائع کیا جس کے بعض مندرجات مدیر 'نعت رنگ' پر معترض تھے۔ ایسی حالت میں شاید کوئی دوسرا مدیر اسے اپنے رسالے میں شائع نہ کرتا۔''[۴]

'نعت رنگ' کا مقصد نعت کا فروغ تھا۔ اس سلسلے میں ہر اس تحریر کو شائع کیا گیا جو فروغ نعت کا باعث بنی۔ مضامین، مقالات، انٹرویوز، مذاکرے، ادبی گوشے، شاعری، خاکے، ریڈیائی فیچر، خطوط، غرض یہ کہ ہر صنف، ہر رجحان کو فروغ نعت کا موقع فراہم کیا گیا اور ہر مکتبۂ فکر کے لکھنے والے کو مہذب انداز میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی آزادی فراہم کی گئی۔ چنانچہ 'نعت رنگ' کے مشمولات پر قارئین اور مصنّفین کا سب سے زیادہ ردِعمل خطوط میں ظاہر ہوا۔ مدیر کو موصول ہونے والے ہر مضمون و مقالہ اور خط کو قطع برید کے بغیر رسالے میں شائع کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مدیر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اختلاف کوئی برا عمل نہیں۔ یہ فرد کا حق ہے۔ اگر کوئی فرد کسی رائے سے اختلاف رکھتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دلائل و براہین کے ذریعے اسے رد کر دے لیکن اسے مخالفت کے زمرے میں نہ ڈالا جائے۔ اختلاف و اتفاق پر بھی آرا کا اظہار بڑی شدت سے گوشۂ خطوط میں سامنے آیا۔ 'نعت رنگ' کے خطوط کے علاوہ مدیر نعت رنگ کی نظر دیگر نعتیہ جرائد پر بھی گہری تھی۔ ماہنامہ 'حمد و نعت' کراچی میں ایک بزرگ شاعر نے اپنے مجامین میں نقد و نظر کا سلسلہ شروع کیا تو اشعار پر یک لفظی رائے لکھنے پر اکتفا کیا جس پر مدیر نعت رنگ نے اپنے اداریے میں کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا:

''ایک اور اہم نکتہ جس کی طرف نعت کاروں کی توجہ مبذول کروانا از حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ 'نعت رنگ' کے حوالے سے جو تنقیدی تحریریں سامنے آئی ہیں ان کی پسندیدگی اور مقبولیت

سے متاثر ہوکر ہمارے کچھ اور نئے نقاد بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں، یہ نہایت خوش آئند بات ہے لیکن ان کی آمد سے نعت کے فکری وفنی پہلوؤں پر گفتگو کا دائرہ وسیع ہونے کے بجائے یک لفظی رائے تک گھٹ کر رہ گیا ہے اور یہ یک لفظی رائے شائع بھی نعت کے ایک ماہانہ رسالے میں ہوئی۔ میرے خیال میں یہ انداز نہ تنقید وادب کے شایانِ شان ہے اور نہ نعت کا تقدس ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے۔ شاعر کے اسلوب، لفظی کوتاہیوں یا خیالات پر تنقیدی رائے ضرور دیجیے لیکن سنجیدگی، متانت اور استدلال کے ساتھ۔'' (اداریہ نمبر۳)

مدیر 'نعت رنگ' نے 'نعت رنگ' کے مختلف اداریوں میں 'نعت رنگ' کے مقاصد اور نصب العین پر روشنی ڈالی ہے۔ تین اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

(۱) '' آج 'نعت رنگ' کو علمی وادبی دنیا میں جو اعتبار حاصل ہوا ہے وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ یہ جریدہ ایک خاص موضوع سے متعلّق ہے یا اس کا مقصد حُبِ رسالت ﷺ کی تبلیغ وترویج ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نعتیہ ادب میں موجود برسوں کے تنقیدی جمود کو توڑنے اور اس پر ہونے والی گفتگو کو ایک خاص روایتی فضا سے نکال کر خالص ادبی وشعری معیارات کے تناظر اور شرعی مسلمات کی روشنی میں پرکھنے اور نعت کو ادبی سطح پر عام کرنے کی کوششوں کے سبب ہے۔'' (اداریہ نمبر۱۰)

(۲) ''ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والے تبصرے کسی ذات پر نہ ہوں بلکہ بات فن تک محدود ہے کہ فن کو پرکھنے والے تکریم فن کار کے بھی قائل ہوتے ہیں۔'' (اداریہ نمبر۴)

(۳) ''نعت رنگ کا یہ آٹھواں شمارہ بھی نعت کی تخلیق، تنقید، تحقیق اور تدوین کے مختلف علمی وادبی پہلوؤں کو ہمارے سامنے لا رہا ہے جس سے نعت پر ادبی گفتگو کے مزید در وا ہوسکیں گے کہ یہی ہمارا نصب العین ہے۔'' (اداریہ نمبر۸)

مدیر 'نعت رنگ' کی اسی پالیسی کا اثر تھا کہ مختلف الخیال اور مزاج کی حامل شخصیات 'نعت رنگ' کی اس وسیع برادری کا حصہ بنتی گئیں، جس کا خواب مدیر نعت رنگ نے رسالے کو شروع کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ جو رسالہ اپنے آغاز میں ایک جوئے کم آب کی حیثیت رکھتا تھا، اب اپنے معیار، مقدار، مضامین اور مشمولات کے تنوع اور وسعت کے سبب ایک بحرِ بے کنار بننے جا رہا تھا۔ اس رسالے نے ایک فراموش صنفِ سخن کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ادب کی مرکزی رو میں شامل کیا۔ اسے اعتبار اور افتخار بخشا۔ معذرت خواہانہ رویوں سے باہر نکالا اور اس کے فکر وخیال کے خشک سوتوں

کو روشن خیال اور سیرابی سے ہرا بھرا اور بار آور بنایا۔ درج ذیل پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ''نعت رنگ'' کے قارئین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور عالمی سطح پر اسے حاصل ہونے والی پذیرائی ہمارے اس یقین کو تقویت عطا کرتی ہے کہ ہمارے قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہماری اس پالیسی کو پسند کرتا ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے اور اس پر ادب، مذہب اور عصرِ حاضر کے تناظرات میں ہونے والی گفتگو کو بڑی توجہ سے پڑھ اور سن رہا ہے۔ مختلف نکتہ ہائے نظر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ کئی لسانی مباحث ہماری آگہی میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ کئی ادق فکری، فقہی اور ادبی مسائل پر پہلی بار ''نعت رنگ'' نے ایسا مواد پیش کیا ہے جس نے نعت کی رسمیات سے بلند ہو کر ہمارے اذہان کو منور کیا اور اس پر بات کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔'' (اداریہ نمبر ۱۷)

(۲) ''نعت رنگ'' کے خدمت گزاروں، لکھنے والوں اور قارئین نے اب تک جو کچھ بھی پیش کیا ہے، نیک نیتی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ''نعت رنگ'' کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی قبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ (الحمدللہ)'' (اداریہ نمبر ۱۷)

وہ رسائل جن میں شائع ہونے والے موضوعات کا دائرہ وسیع ہو، ان میں تکرار کے مسائل بھی پیدا نہیں ہوتے اور موضوعات کی کمی کا مسئلہ بھی پیش نہیں آتا لیکن موضوعاتی رسائل کی ترتیب میں متذکرہ دونوں مسائل کا سامنا بالعموم کرنا پڑتا ہے۔ لکھاریوں کا مسئلہ بھی رہتا ہے، موضوعات کی کمی بھی آڑے آتی ہے اور امکانات کی وسعت اور تنوع کا مسئلہ الگ رہتا ہے۔ صبیح رحمانی کو اس کا احساس رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ نعت کے حوالے سے لکھنے والوں کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ بے شک 'نعت رنگ' ایک موضوعی رسالہ ہے اور اس میں فقط ایک صنف سے متعلّق مواد شائع ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ لکھاریوں سے گزارش بھی کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع کو سنجیدگی سے بھی لیں اور مضامین و مقالات تحریر کرنے میں رواروی کا مظاہرہ کرنے سے بھی گریز کریں کیونکہ اس طرح نعت کو نقصان پہنچے گا اور فروغ نعت کا مشن بھی متاثر ہوگا۔

> ''الحمدللہ 'نعت رنگ' نے اپنے اشاعتی سفر کا ایک اہم حصہ طے کر لیا ہے۔ اردو میں علمی، ادبی اور دینی جرائد و رسائل کی اشاعت کے مسائل سے کون واقف نہیں اور اگر رسالہ کسی خاص موضوع سے متعلّق ہو تو دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں کیونکہ اس رسالے سے قارئین کا تعلّق وفاداری سے زیادہ وضع داری اور ضرورتاً سے زیادہ اخلاقاً ہی رہ جاتا ہے۔ ''نعت رنگ'' بھی

ایک موضوعی رسالہ ہے لیکن اس کا موضوع ایسا نہیں جس سے دلچسپی رواروی میں لی جائے۔ یہ اپنے قارئین سے پورے وقار و سنجیدگی کی رسد اور فکر و عمل کی کمک چاہتا ہے جو اسے حاصل ہے اور اس کا دائرہ روز بہ روز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔'' (اداریہ نمبر ۸)

ایک معیاری رسالہ ترتیب دینے کے لیے مدیر کو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ رسالے کو ترتیب دینے اور اسے قابلِ رشک معیار دلانے کے لیے اسے دونوں آنکھیں کھلی رکھنا پڑتی ہیں۔ ظاہری آنکھ سے گرد و پیش میں جنم لینے والی تبدیلیوں سے باخبر رہتا ہے اور باطنی آنکھ سے زندہ افکار و خیالات تک پہنچنے میں رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ یعنی وہ ایک باخبر نقاد کے طور پر ادب میں روز افزوں ہونے والی پیش رفت سے لمحہ بہ لمحہ آگاہ بھی رہتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو اس سے باخبر بھی رکھتا ہے۔ بطور مدیر صبیح رحمانی کو اس ذمہ داری کا کلی ادراک رہا ہے اور اس کا اظہار وہ اپنے اداریوں میں وقتاً فوقتاً کرتے بھی رہتے ہیں۔

''نعت اور نقدِ نعت کے ایک پرشوق قاری اور نعت رنگ کے مرتب کی حیثیت سے اس باب میں ہونے والی پیش رفت پر مسلسل میری نگاہ رہتی ہے اور میں اس میں ہونے والے ہر نئے کام اور نئے اضافے کے بارے میں باخبر رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے اس شعبے کی اکثر و بیشتر چیزیں میری نظر سے گزرتی بھی رہتی ہیں اور میرا ذہن ان کے حوالے سے اور عصری ادب و نقد کے تناظر میں سامنے آنے والے سوالات و مباحث اور افکار و تصورات کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا رہتا ہے۔ گزشتہ دنوں جو چند نئی تنقیدی تحریریں سامنے آئیں، ان کے مطالعے کے دوران میں دو ایک باتوں کا احساس ہوا۔ ''نعت رنگ'' کے قارئین اور اس دور کے اہلِ نقد و نظر کو میں ان کے بارے میں آگاہ کرنا یا آپ کہہ لیجیے کہ اُن کو بھی اپنے احساس کی اس رَو میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام اس خیال سے بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی بڑی علمی و فکری سرگرمی اس وقت تک نہ تو اپنے نئے رجحانات کے تعین میں کوئی مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے اور نہ ہی عہد در عہد آگے سفر کر سکتی ہے، جب تک کہ وہ اپنی تہذیب و روایت کے مرکزی نکتے کو ہمہ وقت ملحوظِ خاطر نہ رکھے۔ یہ مرکزی نکتہ اسی صورت میں ہمہ وقت ملحوظِ خاطر رہ سکتا ہے کہ جب اسے نئے افکار و مباحث کے بدلتے ہوئے تناظر میں مسلسل تازہ کیا جاتا رہے، اور بار بار اس کی طرف توجہ دلائی جاتی رہے۔'' (اداریہ نمبر ۲۸)

ایسا مدیر جس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو یا تخئیل کی بلند پروازی نہ رکھتا ہو وہ چبائے ہوئے نوالوں اور فرسودہ خیالات کو دہرا کر وقت گزاری کا سامان تو پیدا کر لیتا ہے لیکن اپنے حقیقی منصب کو ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ایک خلاق مدیر کے پاس زندہ خیالات کا خزانہ ہوتا ہے۔وہ مستقبل شناس بھی ہوتا ہے۔اس کا تخئیل نئے امکانات کے در بھی کھولتا ہے اور نئے خیالات کے لب بھی۔صبیح رحمانی کی زنبیل میں نئے خیالات بھی ہیں اور نئے منصوبے بھی،تخئیل کی بلند پروازی بھی ہے،تنقیدی صلاحیت بھی،حوصلہ اور ہمت بھی ہے اور فروغ نعت کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی۔ان تمام اوصاف کی ہم آہنگی سے وہ رسالہ ترتیب پاتا ہے جو معاصر ادبی رسائل میں اعتبار بھی رکھتا ہے اور افتخار بھی، شناخت بھی رکھتا ہے اور مقبولیت بھی۔

ادب اور قاری کا تعلّق اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور یہی تعلّق تخلیق کار اور قاری کا ہوتا ہے۔اس تناظر میں ڈاکٹر قمر رئیس کا درج ذیل پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

''اگر سکاٹ جیمس کی بات پر دھیان دیا جائے تو شاعر اور قاری کا یہ باہمی رشتہ ایک طرح کی 'ٹرنک کال' یا ایسی کا نا باتی ہے کہ ایک سرے پر شاعر اور دوسرے سرے پر قاری لیکن ٹرنک کال میں اگر فاصلہ زیادہ ہو یا راست نہ ہو،مخاطب کسی ہیجانی کیفیت میں بول رہا ہو،زبان و بیان پر قدرت نہ ہو یا زبان میں لکنت ہو اور دوسری طرف سامع کی سماعت میں کوئی فتور، ذہن میں کجی یا دل میں ہلچل ہو تو بات صحیح طور پر پہنچ نہیں سکتی۔اس استعارہ سے ظاہر ہے کہ شاعر اور قاری کا باہمی رشتہ بڑا پیچیدہ اور تہہ دار ہوتا ہے اور چونکہ یہ دو افراد کا باہمی تعلّق بھی ہوتا ہے۔اس لیے اس کے تعین میں انسانی نفسیات کا بھی دخل ہوتا ہے۔شاعر انسانی طبیعت کے اس وصف سے آشنا ہوتا ہے کہ وہ ہر اس انسان سے ابا یا کراہت کرتی یا کرنے لگتی ہے جو ایک سپردگی کا انداز لیے ٹوٹ کر اس کی طرف بڑھتا ہے یا اتنا قریب آجاتا ہے کہ پھر اس کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی یا ناصح بن کر اس کی انا کو ٹھیس پہنچاتا ہے یا اسے جاہل سمجھ کر گفتگو شروع کرتا ہے،اس لیے شاعر کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔اول یہ کہ وہ قارئین کا ایک سچا دوست عزیز اور آشنا بن کر اس طرح سامنے آئے کہ محسوس ہو جیسے ان میں سے ہی ایک ہے۔ان ہی کے اندر سے ابھرا ہے۔یہاں شاعر کی انا قاری کی انا میں تحلیل ہو کر اس کی شخصیت قاری کی شخصیت کا پرتو بن جاتی ہے(اردو میں نظیر اکبر آبادی،باوجود بے دماغی

کے عوام سے گفتگو کرنے والے میرؔ اور مولانا حالیؔ کا اپنے قاری سے تعلّق کم وبیش ایسا ہی تھا)
دوسرا راستہ شاعر کے سامنے یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کے درمیان ایک خاص فاصلہ برقرار رکھے۔ وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ قاری خود اس فاصلے کو اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق طے کر کے اس تک پہنچے۔ یوں تو ہر شاعر اور ہر قاری کے درمیان اس فاصلے کی نوعیت اور اسے طے کرنے کا عمل مختلف ہوتا ہے لیکن موٹے طور پر اس فاصلے کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔''[۵]

متذکرہ بالا اقتباس اگرچہ طویل ہو گیا ہے لیکن اس سے مدیر اور قاری کے باہمی رشتے کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مدیر کو اپنے قارئین سے تعلّق کو مضبوطی سے استوار کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنے قارئین/لکھاری سے تعلّق قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہو یا دونوں کے درمیان فاصلے کی خلیج بڑھ جائے یا اسی قسم کی دیگر صورتیں جنم لیں تو پھر مدیر کی کامیابی کے امکانات محدود تر ہو جاتے ہیں۔

شاعر کی طرح مدیر کا بھی قارئین اور عوام سے واسطہ ہوتا ہے اور وہ شاعر کی طرح متذکرہ رویوں میں سے ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ ہمارے درمیان دو طرح کے مدیر ہیں ایک وہ جو عظمت اور تفاخر کی بلند مسند پر متمکّن ہیں اور جن کا تعلّق اشرافیہ (ادبی) سے ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جنھوں نے اپنا اور رسالے کا تعلّق عوام سے جوڑ رکھا ہے۔ صبیح رحمانی کا تعلّق دوسرے گروہ سے ہے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ شاعر کا تعلّق فقط قاری سے ہوتا ہے لیکن مدیر کا تعلّق قاری سے بھی ہوتا ہے اور لکھاری سے بھی۔ ذیل میں ثانی الذکر کے حوالے سے مدیر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''گزشتہ ایک سال بغرضِ ملازمت میرے ملک سے باہر رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نعت رنگ کا اشاعتی وقفہ بھی طویل ہوا اور لکھنے والوں کو جگائے رکھنے کا عمل بھی متاثر ہوا۔ لے دے کے ڈاکٹر عزیز احسن ہی تھے جو میری خیریت دریافت کرنے کے لیے گاہے گاہے مجھ سے رابطہ کرتے تھے اور میں ان کے ذمے کوئی نہ کوئی کام لگا دیتا تھا۔ جسے وہ حسبِ روایت میری دل جوئی کے لیے خوش اسلوبی سے پورا کرتے رہے۔ اس لیے نعت رنگ ۲۴ میں آپ کو ان کی تحریری شمولیت کا تناسب کچھ زیادہ محسوس ہوگا۔ اور کئی مستقل لکھنے والے اس شمارے میں غیر حاضر بھی دکھائی دیں گے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے بحیثیت ڈائریکٹر، نعت ریسرچ سینٹر، اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مقالات کی سنجیدہ تنقیدی فضا سے اہلِ علم اور بالخصوص نعت پسند حلقہ یقیناً فکری دریچوں سے آتی ہوئی شعور کی روشنی سے مستفیض ہوگا۔ جو درحقیقت نعت رنگ کا مشن ہے۔ ڈاکٹر ریاض

مجید، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، گوہر ملسیانی، ڈاکٹر اشفاق انجم، پروفیسر انوار احمد زئی، ڈاکٹر افضال احمد انور، ڈاکٹر سراج احمد قادری، مولانا اسید الحق قادری اور ڈاکٹر شہزاد احمد کے نام قارئینِ نعت رنگ کے لیے نئے نہیں۔ ان کے علمی مقام و مرتبے اور نعت شناسی کے تناظر میں ان کی نعت رنگ میں موجودگی ہی نعت رنگ کے رنگوں میں اعتبار کے رنگوں کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر محمد آصف، ڈاکٹر بشیر عابد، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اور منظر عارفی کے نام نعت رنگ کے افق پر اس شمارے سے طلوع ہوئے ہیں۔ مگر یہ نام اہلِ علم کے لیے نئے نہیں ہیں۔ میں ان نئے دوستوں کا نعت رنگ میں خیر مقدم کرتا ہوں۔'' (اداریہ نمبر ۲۴)

صبیح رحمانی نے متذکرہ بالا اقتباس میں جسے 'جگائے رکھنے کے عمل'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی ہر رسالے کو ضرورت رہتی ہے۔ رسائل کی ادبی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ گرد و پیش سے بے خبر رہنے والے اور مصنّفین اور قارئین سے کمزور رشتہ رکھنے والے مدیر رسالے کو زیادہ دیر جاری رکھنے کی ضمانت نہیں دے سکتے کیونکہ مدیر بھی دکاندار کی طرح اپنا سامان (فکر) فروخت کرتا ہے۔ اپنے گاہکوں کے مزاج اور خواہشوں سے بے خبر دکاندار زیادہ دیر دکان کا پہیہ چلانے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ بعینہٖ مدیر کو بھی اپنے قارئین سے بامعنی رشتہ قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ بھی کہ اکثر تحریریں کسی ضرورت یا اصرار کے تحت ہی لکھی جاتی ہیں۔ اس کی وضاحت کی ضرورت اس لیے نہیں کہ لکھنے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں۔

''الحمدللہ کہ اب ''نعت رنگ'' کے لکھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہمیں اچھے مواد کی تلاش میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دستیاب مواد کو فوراً قارئینِ ''نعت رنگ'' تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پھر کچھ مسائل فوری توجہ چاہتے ہیں جن پر مشتمل مواد کو روکنا بھی انھیں ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔'' (اداریہ نمبر ۱۴)

'''نعت رنگ' کے اجرا کے وقت ہم نے جن خواہشات کا اظہار کیا تھا وہ کافی حد تک پوری ہو رہی ہیں۔ تنقیدی جمود خاصی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور نعتیہ ادب پر بے لاگ تبصروں اور تنقیدی مباحث کی ایسی فضا بن چکی ہے جس نے اہلِ علم کو نعت کے ادبی پہلوؤں کی جانب نہ صرف متوجہ کر دیا ہے بلکہ وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے اور لکھنے پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ 'نعت رنگ' میں لکھنے والے ناموں میں اہلِ علم کا مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع

ہمارے اس دعوے کی دلیل کے طور پر سامنے ہیں اور ہم اس کرمِ بے پایاں پر اپنے رب کے آگے سربسجود ہیں۔'' (اداریہ نمبر۱۵)

''ہندوستان اور پاکستان میں حمد ونعت پر لکھنے جانے والے ہر تحقیقی وتنقیدی مقالے میں 'نعت رنگ' کے کثیر حوالے ہمیں یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ رب العزت کی تائید اور نبی کریم ﷺ کی چشم التفات سے ہماری کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔ان سطور کو لکھتے ہوئے میرے دل میں کسی طرح کا بھی احساسِ تفاخر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف جذباتِ تشکّر ہیں کہ ربّ لوح وقلم نے میری اور 'نعت رنگ' کے قلمی معاونین کی مساعی کو قبول فرمایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فضا کو بنانے میں ہمارے لکھنے والوں کی بڑی خدمات ہیں بلکہ قربانیاں ہیں۔ ایک ایسے ماحوال میں جہاں مذہب سے جڑی ہوئی اصناف پر گفتگو کے دروازے صرف خوفِ فسادِ خلق سے بند ہوں وہاں حمد ونعت کے ادبی پہلوؤں پر شعریت اور شریعت کے حوالے سے اپنا نکتہءنظر، جرات، بے خوفی اور استدلال سے پیش کرنا اور پھر اس بات پر مختلف نکتہ ہائے نظر کے تناظر میں ہونے والے اعتراضات واختلافات کو حوصلے اور تحمّل سے سننا اور برداشت کرنا صرف اس لیے کہ نعت پر ادبی مباحث کے در کھلے رہیں اور صدیوں سے بند اس ایوان میں تازہ ہوا کے جھونکے آتے رہیں تا کہ ہمیں نعت کی علمی، ادبی، تہذیبی جہات کا علم ہو اور ہم اس کے آداب کا شعور حاصل کر کے نعت کی حقیقی قوت کو جان سکیں اور اس کو بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہی ہمیں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔'نعت رنگ' میں لکھنے والوں کی ان خدمات اور اس قربانی کو جو انھوں نے اپنی انا اور شہرت کے دائروں سے باہر نکل کر دی ہے، تاریخ ادب میں یقیناً یاد رکھا جائے گا۔'' (اداریہ نمبر۱۵)

صبیح رحمانی اور دیگر معاصر مدیروں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ 'نعت رنگ' کے حلقے کو خواہ ان کا تعلّق قارئین سے ہے یا مصنّفین سے دونوں کو 'نعت رنگ' کی لطیف ڈور سے جوڑے بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ذہنی تربیت اور فکری آبیاری کا سامان بھی فراہم کرتے رہتے ہیں۔نقاد کا کام تخلیق کا معیار متعیّن کرنا،تشریح کرنا،تفہیم کے ذرائع فراہم کرنا اور تعبیر کرنا ہی نہیں ہوتا ماحول کو سازگار بنانا بھی ہوتا ہے۔اس کے لیے اسے سمت کا تعین کرنا ہوتا ہے،اس کے لیے وسائل اور ذرائع فراہم کرنا ہوتے ہیں، ماحول بنانا ہوتا ہے۔صبیح رحمانی 'نعت رنگ' کے اداریوں سے یہ کام بخوبی لینے کا ہنر رکھتے ہیں۔اس حوالے سے ذیل میں دو پیراگراف درج کیے جاتے ہیں۔اوّل الذکر نعت نگاروں

کی ذہنی، علمی، فکری اور شعری تربیت سے متعلّق ہے اور ثانی الذکر سمت نمائی سے متعلّق:

(۱) محبّت کے جذبے ازلی و ابدی ہوتے ہیں... غیر مبدل... مگر ان کا اظہار سچا تخلیقی تجربہ اور تازہ کاری چاہتا ہے کہ اِس سے تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے نعت میں احترام رسالت مآب کا جذبہ ہمہ پہلو اور مسلسل توجہ طلب مسئلہ ہے۔ نعت کے مضامین و موضوعات کے اظہار میں ترجیحات نظر انداز نہیں ہونی چاہیں جذبے کا انہماک مبارک مگر جذبہ اطاعت نژاد اور محبّت تقلید سرشت ہونی چاہیے عقیدت کا اظہار جس بھی والہانہ پن سے ہو اس کا وفور اگر عقیدے کو مسخ کر جائے تو یہ ایسی کوشش اور محنت کس کام کی؟ گفتار و کردار اور قول و عمل کی مغائرت کسی شعبہ حیات میں کبھی بھی پسندیدہ نہیں رہی۔ نعت کے نازک اور مبارک فن میں اچھے ثمرات کیسے پیدا کر سکتی ہے؟ (اداریہ نمبر ۲۲)

(۲) نعتیہ مضامین کے اظہار میں تازہ کاری کے لیے مقدور بھر کوشاں رہنا ہم سب کے لیے ضروری ہے تازہ تراکیب نئے نئے اسمائے مبارکہ کی تخلیق اور تلاش، آہنگ و اوزان کے تجربے، بلیغ اور پُرتاثیر شعری زمینوں کی دریافت، جدید شعری اصناف کو نعتیہ مضامین کے لیے رواج دینے کی کوشش دوسری زبانوں کے نعتیہ کلام کے تعارف و تراجم اور طویل یک کتابی نعتیہ نظموں کی منصوبہ بندی، سیرتِ طیبہ کے تذکار مبارک کے ساتھ جدید دور میں اُمتِ مسلمہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے لیے اِس صنف میں ایک پُرتاثیر قرینے سے استغاثہ و استمداد کے مضامین کی آمیزش، ذاتی کردار سازی سے جہاں بانی تک کے پھیلے ہوئے مضامین و موضوعات کو اسلوبیاتی محاسن کے ساتھ نعت سے منسلک رکھنے کی کوشش تخلیقِ نعت کے مراحل میں ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے... نعت کی صنف آج ہم سب سے ہمہ جہت توجہ چاہتی ہے۔ محسن کاکوروی امیر مینائی، مولانا احمد رضا خاں، ظفر علی خاں، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حافظ لدھیانوی، صوفی محمد افضل فقیر، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، ابوالخیر کشفی، مظفّر وارثی، عاصی کرنالی... کیسے کیسے نعت کاروں نے خون جگر سے اس صنف کی آبیاری کی ہے؟ نعتیہ مضامین کے اظہار کے حوالے سے اِن اکابرینِ نعت کے فکر و فن کا گہرا اور مستقل مطالعہ ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۲)

ادبی مجلّے کی ترقی اور کامیابی کے حصول میں بنیادی کردار مدیر کا ہوتا ہے۔ وہ ایک سربراہ کی طرح سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ قارئین کو بھی اور مصنّفین کو بھی۔ اقبال نے میر کارواں کی جن خصوصیات ''نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز'' پر روشنی ڈالی ہے، مدیر کو بھی انھی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ اپنے مخصوص ادبی معتقدات اور بے لچک ذہنی رویوں کے نتیجے میں ادبی رسالہ بے توقیر ہو کر اپنے قارئین کی توجہ کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ مجلّے کو کامیاب بنانے اور قارئین کی دلچسپی

کے حصول کے لیے مجلّے میں ایسی فضا تشکیل دی جانا ضروری ہوتی ہے، جس میں مختلف الخیال افراد کھل کر سانس لے سکیں۔ اسے ایک کنویں کا مینڈک بننے کی بجائے وسیع اور فراخ حوصلے کا مالک ہونا چاہیے تا کہ وہ مجلّے کے لیے موصول ہونے والے ہر خیال اور نقطۂ نظر کو کشادہ دل اور کھلے بازوؤں کے ساتھ خوش آمدید کہہ سکے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ایسے مدیر کو نہ ادبی کساد بازاری کا شکوہ کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی ادب کی موت کا فتویٰ جاری کرنے کی ضرورت۔

رسالے/مجلّے کے ارتقا اور ترقی کا دار مدار مجلّے کی پالیسیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اگر مجلّہ زندگی آمیز ہو، معاشرتی رویوں اور ادب کو ہم آہنگ کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہو تو وہ قارئین کی قلبی اور ذہنی دلچسپیوں سے قریب ہونے کی وجہ سے شہرت کے پروں سے پرواز کرتا ہے اور جو مجلّہ زندگی کے رشتوں اور ادبی رجحانات کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کا عادی ہو، اور زندگی گریز رویوں کے فروغ کا باعث بنے وہ زیادہ دیر ادبی روایت میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا کیونکہ زمین سے ٹوٹا ہوا تعلق خواہ وہ ادب کا ہو یا زندگی کا زیادہ دیر پا نہیں ہوا کرتا۔ 'نقوش' کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کی پیشانی پر ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' کی عبارت تحریر تھی۔ 'نعت رنگ' نے اس طرح کی عبارت کا سہارا تو نہیں لیا لیکن اس کا منشور، رویہ، اور رجحان اسی خیال کا ترجمان رہا ہے۔

'نعت رنگ' اور دیگر زوال شدہ یا زوال آمادہ ادبی رسائل میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ 'نعت رنگ' نے ادب اور زندگی کو باہم آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف الخیال افراد کو 'نعت رنگ' کے رشتے میں ایک لڑی کی طرح پرو دیا۔ توڑنے کی بجائے جوڑنے کا فریضہ ادا کیا۔ کیونکہ اگر یہ مجلّہ بھی دیگر مجلّات کی طرح اجنبیت کی فضا قائم کرتا یا مدیرانہ فرعونیت کے زیرِ اثر اپنے اور قارئین کے درمیان فاصلوں کی خلیج حائل کر بیٹھتا یا خود کو کسی اور زمین کی مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کرتا یا ادب اور مذہب کو خانوں میں بانٹ کر دیکھنے یا تفریق کرنے کی غیر ادبی اور غیر دانشورانہ کوشش کرتا تو اس محفل میں کوکب نورانی اوکاڑوی، عبدالحکیم شرف قادری، عبدالنعیم عزیزی، حافظ عبدالغفار، خوشتر نورانی، حافظ محمد عطاالرحمٰن قادری رضوی، جیسے مذہبی علما 'نعت رنگ' کا حصہ بن پاتے اور نہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر نجم الاسلام، وقار احمد رضوی، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، مبین مرزا، ڈاکٹر یونس اگاسکر، ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی،

ڈاکٹر شبیر احمد قادری جیسی معروف ادبی شخصیات نظر نہ آتیں۔ مختلف مکاتب فکر اور نظریات کے حامل افراد کی 'نعت رنگ' کے فروغ اور ارتقا میں عملی کاوشوں کا نتیجہ ہی تھا کہ یہ رسالہ مذہب اور ادب سے تعلّق رکھنے والے اہلِ علم اور اہلِ قلم دونوں کے لیے قابل قبول بن گیا اور مخصوص موضوعاتی جریدہ ہونے کے باوجود اردو کی دیگر شعری اصناف میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

جس طرح اخبار کا مدیر معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ان واقعات سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے جو خبروں کی صورت اخبار کی زینت بنتے ہیں۔ اسی طرح مدیر کے نام موصول ہونے والے خطوط سے بھی وہ اداریوں کے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔ اداریوں کے انتخاب کا تعین خاص اہمیت اور ہنگامی نوعیت (Burning Issues) کے حامل موضوعات سے ہوتا ہے۔ اسی طرح رسالے کا مدیر بھی ادب میں رونما ہونے والے واقعات، تجربات، نظریات اور افکار سے اپنی فکری غذا حاصل کرتا ہے۔ اس کا مقصد انھیں درست یا غلط ثابت کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا بنیادی مقصد قارئین کو ان معاملات کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے جنھیں وہ اہمیت کے حامل سمجھتا ہے۔ ممکن ہے رسالے کے قارئین ان معاملات، واقعات، افکار، تجربات یا نظریات کو اہم نہ سمجھ رہے ہوں یا انھیں معمولی نوعیت کا سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہوں لیکن ایک حساس تخلیق کار اور نقاد کی طرح مدیر کا دوررس، گہرا اور تربیت یافتہ ادراک ان معاملات کی حساسیت یا اہمیت سے خود بھی بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور اس کی اہمیت، افادیت اور ضرورت اسی شدت کے ساتھ قارئین کو محسوس کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سراج منیر کا درج ذیل اقتباس زیادہ موزوں محسوس ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''اصل میں فنکار نہ تو عوام سے ماروا کوئی چیز ہے اور نہ 'عوام' ہی ہے۔ وہ دراصل اس چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان ایک قد آور درخت ہے جن کی جڑیں دور دور دھرتی میں پیوست ہیں لیکن وہ تمام پودوں سے اونچا اور اسی نسبت سے حساس ہے۔ ہوا کے جس ہلکے سے جھونکے کو دوسرے پودے محسوس نہیں کر سکتے، اسی جھونکے سے اس کی پتیاں جُھر جُھرا اٹھتی ہیں۔ زیادہ طاقتور جھونکے کو دوسرے پودے بھی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ اس کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے، یعنی دھرتی سے بھی اس کا تعلّق دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور اوپر کے ماحول سے بھی۔''[۲]

متذکرہ بالا اقتباس میں فنکار کی جگہ نقاد یا مدیر کو بھی رکھ کر دیکھیں تو بھی ادبی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایک تناور درخت اپنے تجربے اور قوت کی بنیاد پر تیز ہوا کے زور کو نہ

صرف جھیل جاتا ہے بلکہ وہ اپنے زیرِ سایہ پرورش پانے والے پودوں کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ بلکہ اپنے تجربے کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے پودوں کو وہ سبق بھی دے جاتا ہے جو وہ اس صورتِ حال سے حاصل نہیں کر سکتے اور پھر یہ کہ تناور درخت چھوٹے پودوں کو اپنا جز و سمجھتا ہے اس لیے ان سے جُڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ مدیر نعت رنگ قارئین اور مصنّفین کو اپنی برادری سمجھتے ہیں اس لیے وہ ان سے جڑے رہنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

'' آپ کے خطوط ہماری راہیں منور کرتے ہیں اور ہم آپ ہی کی تجاویز پر غور کر کے انہیں عمل کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی رسالے یا کتابی سلسلے کے کئی معیار قائم کئے جا سکتے ہیں ہمارے خیال میں اگر کسی کتابی سلسلے کے قاری' لکھنے والے اور عملۂ ادارت ایک ''برادری'' بن جائیں تو یہ کامیابی کا ایک واضح اور محکم معیار ہے۔ 'نعت رنگ' کے خوش نظر، دقیقہ سنج اور صاحب نظر پڑھنے والے آج دنیا کے ہر براعظم میں موجود ہیں اور نبی کریم ﷺ کی رحمت اللعالمینی کے تناظر میں ہمیں یقین ہے کہ یہ حلقہ وسیع تر ہو کر جلد ہی دنیا کے ہر ملک کو اپنے دامن میں لے لے گا اور اس کا اثر 'نعت رنگ' کے مضامین نثر و نظم پر بھی مرتب ہوگا۔'' (اداریہ نمبر ۵)

ایک برادری یا گروہ میں شامل تمام طبقات کے ذہنی یا ذوقی مراتب یکساں ہونا ممکن نہیں۔ اس حقیقت سے ایک ذہین مدیر بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ نو زائدہ اور تربیت یافتہ قارئین کے ذہنی معیارات اور ذہنی و فکری تشنگی کو بیک وقت محسوس بھی کرتا ہے اور اسے بجھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ نہ کمزور قاری کا ہاتھ چھوڑتا ہے اور نہ صحت مند قاری کو اپنے سے دور کرنے کی غفلت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ایک حقیقی مدیر عظمت یا بڑائی کے خبط میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ کشادہ دلی اور کھلے ذہن کے ساتھ دوسروں کی عظمتوں کا احساس بھی کرتا ہے، اعتراف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے موصول ہونے والے تمام مقالات و مضامین اور تخلیقات کو وہ کشادہ دلی سے دیکھتا بھی ہے اور پرکھتا بھی ہے اور اپنی رائے بھی قائم کرتا ہے۔ خواہ وہ تحریر اس کے منشور، مقاصد، نظریے سے مطابقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ عظمت کے خبط میں مبتلا مدیر ایک سیاسی منشور تو دے سکتا ہے لیکن ایک زندہ اور عوامی مقبولیت کا حامل رسالہ تشکیل دینے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔

کشادہ دلی اور انکسار کے جس وصف کا تذکرہ درج بالا سطور میں ہوا ہے وہ مدیر 'نعت رنگ'

کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی کشادہ دلی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں نے 'نعت رنگ' کے اداریوں کے لیے دوسری شخصیات کو بھی لکھنے کی دعوت دی گویا یہ ایک طرف اعتراف عظمت کا ایک انداز بھی ہے اور اپنی جگہ خالی کرنے کا عمل بھی جو بہت کم رسائل میں دیکھنے میں آتا ہے اور دوسرا یہ کہ نعت کے تنقیدی آفاق کو وسعت دینے کے لیے بھی انھوں نے مہمان مدیر کو نعت رنگ کے اداریے لکھنے کی دعوت دی۔ 'نعت رنگ' کے مہمان مدیروں میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، انوار احمد زئی، مبین مرزا اور ڈاکٹر ریاض مجید کے نام شامل ہیں۔

زندہ ادب کے بطن سے ہر لمحہ تازہ خیال، زندہ افکار، اور منفرد تجربہ پھوٹتا رہتا ہے۔ کچھ افراد انھیں خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور کچھ بے دلی سے۔ بڑا ناقد اور باشعور مدیر ان نظریات وافکار اور رجحانات و رویوں پر فوری رہنگامی ردِعمل دینے کی بجائے انھیں غور وفکر کی میزان پر تولتے ہیں اور پھر ایک متوازن ردِعمل کے ذریعے اسے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ نقاد کے پاس تو وسیع میدان ہوتا ہے۔ وہ مبسوط مقالے یا منضبط کتاب کی صورت میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرسکتا ہے لیکن مدیر کو یہ سہولت میسر نہیں ہوتی۔ چنانچہ تنگیِ داماں کو دیکھتے ہوئے وہ فقط قارئین کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کروانے اور انھیں سوچنے کی دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ سوال کا سہارا بھی لیتا ہے اور مکالمے کی راہ ہموار بھی کرتا ہے۔

مثلاً کرونا وبا کی صورتِ حال میں جب کہ پاکستان کی عوامی رائے عامہ اسے غیر سنجیدگی سے لے رہی تھی۔ اخباری مدیر کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ عوام کو حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کرتا اور اس وبا کے مہلک اثرات سے انھیں روشناس کرواتا۔ رسالے کا مدیر ادب کی اسی طرح کی صورتِ حال میں توجہ دلاؤ نوٹس کی صورت میں لکھنے والوں کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی معاملات کی سنگینی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ صبیح رحمانی نے تنقیدِ نعت کی ابتر صورتِ حال میں یہی فرض ادا کیا ہے۔ وہ ''نعت رنگ'' کے ابتدائی شماروں میں تنقیدِ نعت سے ناقدین کی بے رغبتی، بے توجہی اور بے اعتنائی پر فکر مند نظر آتے ہیں اور معاصر ادیبوں اور ناقدوں سے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''نعت رنگ'' کے اداریے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے کہیں لکھا ہے کہ ہر انسان کی طرح ہر دور کا بھی اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس مزاج کی عکاسی اس دور کے ادب سے مترشح ہوتی ہے۔ صبیح رحمانی نے جس دور میں 'نعت رنگ' نکالا

اس دور میں اردو میں تنقید کی نئی ہوائیں اپنا اثر قائم کر چکی تھیں۔ اس سے قبل اردو تحقیق نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا۔ قاضی عبدالودود، حافظ محمود شیرانی، مالک رام، حنیف نقوی، گیان چند جین، امتیاز علی عرشی، نصیر الدین ہاشمی، نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین رضوی ادیب، تحسین سروری، اور افسر امروہوی جیسے متعدد محققین نے اپنی تحقیقی بصیرت سے اردو کی ادبی تحقیق کو ایسی بنیاد فراہم کر دی تھی جس پر چل کر وہ دنیائے تحقیق میں اردو ادب کی آبرو کا باعث بن سکتی تھی۔

جس دور میں تحقیق اپنا سکہ بٹھا چکی تھی، اسی دور میں تنقید نے بھی اپنی کمر کس لی تھی۔ ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق نے بالخصوص اردو کی ادبی تنقید کو ثروت مند کرنا شروع کر دیا تھا۔ نوّے کی دہائی کے آس پاس اردو میں جدید تر مباحث اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان میں اوراق، فنون، صریر، ارتقا، تسطیر، دائرے اور ہندوستان میں، شب خون، شعور، عصری ادب، عصری آگہی، تناظر، شاہراہ، ذہن جدید، تحریک، معیار، نیا ورق، الفاظ، سطور، سوغات، شاعر، شعر و حکمت، نقد و نظر اور بازیافت جیسے رسائل نے جدید مباحث کو اپنے دامن میں جگہ دینا شروع کر دی تھی۔ اسی عہد میں 'نعت رنگ' کا اجرا اور اس کی بنیاد تنقید نعت پر رکھنے کی ضرورت فقط مدیر ہی محسوس نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ رُوحِ عصر کا مطالبہ بھی تھا۔ دانش مند مدیر کی نظر ماضی کے زندہ عناصر پر ہی نہیں مستقبل کی نبض پر ہوتی ہے اور وہ ماضی، حال اور مستقبل کو علیحدہ جزیروں کی صورت میں نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور سیال ارتقا کی صورت میں دیکھتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تحقیقی مزاج نے تنقیدی رویوں کے فرغ سے پہلے اپنی جگہ کیوں بنائی؟ یہ عمل برعکس کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تنقید کی عمارت ہوائی باتوں یا مفروضوں پر تعمیر نہیں ہوتی بلکہ ٹھوس حقائق کی بنیادوں پر ہی استوار ہوتی ہے اور تنقید کو ٹھوس بنیادوں کی فراہمی تحقیق نے فراہم کر دی تھی اور ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ تنقیدی فیصلوں اور تجزیاتی نتائج کی بنیاد حقائق پر ہی استوار ہوتی ہے اور صداقت کی تلاش اور حقائق کی بازیافت کا عمل تحقیق سے ہی وابستہ ہوتا ہے چنانچہ حقائق کی بازیافت کے بعد ہی تنقید اپنا کردار ادا کر سکتی تھی۔

موجودہ عہد میں تحقیق اور تنقید کی صورتِ حال حوصلہ افزا نہیں۔ ہمارے ہاں اس صورتِ حال نے کیوں جنم لیا؟ اور اس صورت حال میں نقاد اور مدیر کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ ادبی صورتِ حال کی بہتری کے لیے انتظار کرے یا آرنلڈ کے خیال کے مطابق ساز گار ماحول کی تشکیل میں اپنا مثبت

کردار ادا کرے۔ اول الذکر صورتِ حال کو بہتر نہیں کہا جا سکتا البتہ ثانی الذکر صورت ہی بہتر قرار دی جا سکتی ہے۔ صبیح رحمانی نے تنقیدِ نعت کی ابتر صورتِ حال میں دوسرا راستہ اختیار کیا اور اس کے لیے 'نعت رنگ' کی صورت میں ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں ادبی صورتِ حال کی بہتری کے لیے سازگار ماحول کی تیاری سے متعلق لائحۂ عمل تیار کرنے پر غور و فکر کیا جاتا ہے اور ذہن میں پرورش پانے والے ابہام، اشکال اور سوالات کے حل کو مکالمے کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مغربی افکار و خیالات سے استفادے کی پشت پر دو طرح کے رویے نظر آتے ہیں۔ پہلا رویہ اندھی تقلید کا ہے۔ اور دوسرا وہ محدود طبقہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ان نظریات سے استفادہ کرنے میں مضائقہ نہیں البتہ یہ عمل معاصر تنقیدی کسوٹیوں پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔ اگر یہ رجحانات ہمارے تہذیبی مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں اور ہمارے ادب کی تفہیم و تعبیر میں سود مند بھی ہوں تو انھیں اپنا لینے میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ اثرات اس کے برعکس ہوں تو اسے رد کرنے میں ذرا دیر نہیں کرنی چاہیے۔

مغربی افکار کے خوشہ چین، درآمد شدہ نظریات کی بنیاد پر ادب میں صحت مند یا زندہ عناصر کے متلاشی ناقدین کے طرزِ فکر و عمل اور نتائج کی مخالفت کی ضرورت نہیں البتہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ہر تہذیب و ثقافت اور ہر ادب کی اپنی الگ فضا اور اپنی منفرد روایت ہوتی ہے۔ اس کا مزاج بھی اپنا ہوتا ہے اور اساطیر اور اقدار بھی اپنی ہوتی ہیں۔ اس کی تفہیم و تعبیر میں اجنبی ماحول اور خیالات و افکار سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن فقط انھی پر اصرار غیر فطری اور غیر معروضی رویہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ہماری ادبی تنقید ہنوز اپنی حقیقی روح دریافت کرنے سے قاصر رہی ہے۔ پچھلی دو تین دہائیوں میں بعض درآمد شدہ نظریات سے حاصل کردہ زخم اپنے مرہم کی تلاش میں بھی ہیں۔ پچھلی دہائیوں میں دو تین دبستانِ تنقید (ترقی پسند، نفسیاتی، جمالیاتی) سے وابستہ ناقدین کی طرف سے قابلِ قدر کام سامنے آئے ہیں اور ان کی قدر کا تعین بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے لیکن اب جس تیزی سے نئے خیالات، افکار اور نظریات ہماری تنقید کا حصہ بنائے جا رہے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ ہمارے قاری یا ادب کی ضرورت ہیں بھی یا نہیں یا یہ کہ یہ نظریات ادب کی تفہیم و تعبیر یا سمت نمائی یا سمت متعیّن کرنے میں مفید ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ یہاں یہ سوچنے کی ضرورت بھی ہے کہ کہیں نئی بات کہنے کی دھن میں تو یہ راگ الاپے نہیں جا رہے؟ یا پھر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرح اپنی پراڈکٹ کو عوامی ضرورت بنا کر پیش تو نہیں کیا جا رہا؟ سماج،

تہذیب اور ثقافت کے گملے میں مصنوعی پودے لگا کر غیر ملکی کمپنیوں کا ہمیں صارف تو نہیں بنایا جارہا؟ یہ سوالات آج کے قاری کے ذہنوں میں جنم لے رہے ہیں۔ان سوالات پر سوچنے کی ضرورت ہے۔شاید اسی وجہ سے ہمارے ادب کے قاری اور ناقد کے درمیان فاصلے کی خلیج تشویش ناک حد تک وسیع ہو چکی ہے۔قاری تخلیق سے تو پہلے ہی نالاں تھا اب تنقید سے بھی خوف زدہ ہو کر منہ موڑ بیٹھا ہے۔

اکیسویں صدی کے بطن سے نئے خیالات و افکار نے جنم لے کر ہماری تخلیق، تنقید اور تحقیق کو ایک نیا رُخ دے دیا ہے۔ان حالات میں مدیر کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کا مکمّل ادراک رکھتا ہو نہ صرف ادارک بلکہ اپنے رسالے کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے اور اس سے کما حقہٗ ہم آہنگ کرنے کی استعداد بھی اپنے اندر پاتا ہو۔مقابلہ ان معنوں میں کہ نئی صورتِ حال اور نئے نظریات ایک خاص سوچ ،فکر اور صورتِ حال کے پروردہ ہوتے ہیں اور یہ کہ ان خیالات نے جن اذہان میں پرورش پائی اور جو ڈسکورس یہ لے کر آئے ہیں ان کے پس پردہ محرکات سے بخوبی واقفیت، صورتِ حال کا اِدراک، چیلنج سے نمٹنے کی منصوبہ بندی اور اس میں موجود صحت مند عناصر کو کشید کرنے کی صلاحیت بھی مدیر میں موجود ہونی چاہیے کہ ہر نیا عہد اپنے ساتھ زندہ عناصر بھی ساتھ لے کر آتا ہے اور ہم آہنگ ان معنوں میں کہ وہ نئے عہد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو بصورتِ دیگر اسے پسپائی اختیار کرنی پڑے گی جو فنا اور زوال کا دوسرا نام ہے۔

ادب میں تجربے جنم لیتے رہتے ہیں۔یہ تجربات انسانی زندگی میں سانس کی طرح ناگزیر ہوتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ تجربہ کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے یا ناکامی کا منہ دیکھتا ہے اس کا فیصلہ تو وقت کے سپرد ہوتا ہے لیکن باشعور نقاد اور بالغ نظر ادیب مستقبل کی ریکھا کو وقت سے پہلے پڑھ لیا کرتا ہے۔میں مدیر کو بھی ان دونوں سے جدا نہیں سمجھتا کہ وہ نقاد بھی ہوتا ہے اور ادیب بھی۔ اسے ادب میں جنم لینے والے تجربات سے بھی آگاہی ہونی چاہیے۔

مدیر کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ معاصر عہد پر نظر رکھے اور لحہ بہ لحہ بدلتی صورتِ حال سے آگاہ رہے اور ساتھ ہی اپنا اور اپنے رسالے کا محاسبہ بھی کرتا رہے۔اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کس بازار میں کون سی دکان کھولی ہے۔اس اصول سے بے خبر مدیر کو ناکامی کا منہ دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔وہ اصناف جن کا تعلّق مذہب سے ہوتا ہے اس کے پرستار ہر دور میں محدود رہے ہیں۔ مرثیے کو استثنائی حیثیت حاصل ہے کہ لکھنؤ کے نوابوں کی سرپرستی میں اس نے انیسویں صدی میں

خوب ترقی کی۔ ہر کہ ومہ مرثیہ نگار بن جاتا تھا اسی وجہ سے ''بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں'' کی مثل مشہور ہوئی۔ جہاں تک بات تنقید کی رہی ہے وہ مرثیہ، سلام، مناقب یا نعت ہو ان تمام اصناف کی تنقید میں غالب عنصر عقیدت کا ہی رہا ہے اور نعت تو سب سے زیادہ حساس رہی ہے۔ اس کی حساسیت کی ہی وجہ تھی کہ اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے میں ہر دور میں گریز کیا جاتا رہا ہے اور آج جب کہ اظہار رائے کی وہ پابندیاں اور سختیاں نہیں جو گزشتہ زمانوں میں دیکھنے میں آتی تھیں اور تنقید بھی ماضی کے مقابلے میں بہت ترقی کر چکی ہے۔ اس کے باوجود لکھنے والے آج بھی اس موضوع پر لکھتے ہوئے دس مرتبہ سوچتے ہیں۔ بہر حال اس رجحان نے نعت کی ادبی حیثیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ صبیح رحمانی کو اس بات کا ادراک ہے۔ وہ ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک نعتیہ ادب کی بات ہے تو اس کی صورتِ حال اس لحاظ سے اور بھی ابتر ہے کہ اسے کسی بھی عہد میں باقاعدہ تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نتیجتاً اربابِ نقد و نظر سے اسے ''شعرِ عقیدت'' کا نام دے کر عام ادبی فضا سے دور کر دیا اور یہ تکلیف دہ صورتِ حال کسی حد تک اب بھی برقرار ہے۔'' (اداریہ نمبر۴)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

> ''ہمیں تخلیق کاروں (اور بالخصوص نعت نگاروں) کی حساس طبیعت کا علم ہے اپنے فن پر تنقیدی گفتگو یقیناً ان پر گراں گزرتی ہوگی۔ ہم بھی ان آبگینوں کی نزاکت سے بے خبر نہیں مگر تنقید کی آنچ وہ آنچ ہے جو شیشے کو توڑتی نہیں بلکہ پختہ تر کرتی ہے۔ وہ شیشہ جو بھٹّی کی آگ سے مسکراتا ہوا نکلتا ہے شیشے کی آبرو بن جاتا ہے۔ جہاں تک کسی کی دل آزاری کی بات ہے تو ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والے تبصرے کسی ذات پر نہ ہوں بلکہ بات فن تک محدود ہے کہ فن کو پرکھنے والے تکریم فن کار کے بھی قائل ہوتے ہیں۔'' (اداریہ نمبر۴)

موضوعات کی تلاش

ہماری تحقیق میں بالعموم اور جامعات میں بالخصوص موضوعات کی تلاش ایک دردِ سر بن کر رہ گئی ہے۔ ملازمتوں کے حصول کے طریقِ کار اور ترقیوں کے سلسلے میں ایچ ای سی کی شرائط نے ایک طرف تحقیق کی رفتار کو بظاہر ہی سہی تیز کر دیا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ موضوعات کی کال سی پڑ گئی ہے۔ تحقیق کار اور نگران اِدھر اُدھر سر مارتے پھرتے ہیں لیکن کوئی اچھوتا موضوع بمشکل ہی ہاتھ

لگتا ہے۔ جامعات میں بالعموم مانگے تانگے کے موضوعات سے گزارا کیا جارہا ہے۔ بعض شعبوں میں موضوع کی تلاش میں طلبہ وطالبات کو دوڑا دوڑا کر ادھ موا کر دیا جاتا ہے اس طرح حاصل کیا ہوا موضوع تحقیق میں کیا برگ و بار لائے گا اور مانگے کی روشنی سے کون سی روشیں روشن ہوں گی اور تحقیق کا کونسا خورشید طلوع ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

یہ صورتِ حال کسی ایک شعبے سے وابستہ نہیں۔ سماجی شعبہ جات میں تو یہ مسئلہ عام ہے اور سائنس کے شعبہ جات میں بھی کم و بیش اسی صورتِ حال کا سامنا ہے۔ اس صورتِ حال میں انوکھے اور منفرد موضوع کی دستیابی گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے جیسی ہی ہوتی ہے۔ اگر کسی کے دامن میں کوئی اچھوتا، منفرد موضوع ہوتا بھی ہے تو اسے گوہر نایاب کی طرح چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ بعض شعبہ جات میں تو حلفیہ بیانات خواہ زبانی ہی سہی لینے کی روایات بھی سنی گئی ہیں۔ ان روایات کے وضعی ہونے یا راویوں کے ضعیف یا ثقہ ہونے سے ایک طرف اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے ضرور۔ بہر حال ہمارے دور کے دانشوروں کی مثال قدیم دور کے ان حکما سے مماثل بھی نظر آتی ہے جو مجرب نسخوں کو دل میں لیے آخری آرام گاہ تک پہنچ جاتے ہیں شاید انھیں کسی نے بتا رکھا ہے کہ وہاں ان نسخوں یا موضوعات پر کام کرنے کے لیے وافر وقت دستیاب ہوتا ہے۔

قاضی عبدالودود کی تحریروں میں موضوعات کی بھر مار نظر آتی ہے۔ ان کا نکتہ نکتہ تحقیق کی وسعتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جن موضوعات پر محققین صفحات کے صفحات سیاہ کر دیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو ایک سطر میں نمٹا دیتے تھے۔ ان کی تحقیق میں حقائق کا ایک انبار نظر آتا ہے لیکن دورِ حاضر کے مجلّات اٹھا کر دیکھ لیجیے بھاری بھرکم مقالے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ مقالہ نگار کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ مقالے میں کوئی سوال مستور ہے بھی یا نہیں۔ یا مقالہ نگار نے کوئی مفروضہ قائم کیا تھا بھی یا نہیں۔ مقالے سے کوئی روشنی جھانکتی بھی ہے یا فقط گھور اندھیر ہی اندھیرا ہے۔ 'نعت رنگ' میں بھی تحقیقی اور تنقیدی موضوعات پر مقالات و مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن ان میں بیشتر مقالات و مضامین ناقد یا محقق کی محنت کا ثبوت دیتے ہیں۔

مدیر ایک بھرپور ویژن کا حامل فرد ہوتا ہے۔ یہ وژن اس کے ذہن میں ہر وقت متحرک رہتا ہے اور وہ اس رسالے کو ترقی کے قدم بڑھانے، اس کا اعتبار قائم رکھنے اور اس میں دلچسپی قائم رکھنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ مدیر کا یہ وژن سطحی نوعیت کا حامل نہیں بلکہ آفاقی نوعیت کا حامل ہوتا

ہے۔ وہ اس وژن کو قابلِ عمل بنانے کے لیے عالمی افکار ونظریات سے استفادہ کرتا ہے اور اپنے ادب اور تہذیب سے بھی رس کشید کرتا ہے۔ اسے موضوعات کی اہمیت کا احساس بھی ہوتا ہے اور امکانات پر نظر بھی رکھتا ہے اور کسی بھی حالات کے مطابق فیصلہ کرنے اور عملی اقدام اٹھانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ایک مدیر اپنے گرد لکھنے، پڑھنے والوں کا ایک باشعور حلقہ جمع کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ تحقیق وتنقید یا رسالے کے موضوع رمنشور سے متعلّق موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں سے رابطے میں رہتا ہے اور پھر ان کی توجہ ان موضوعات کی طرف مبذول کرواتا ہے جن پر قلم اُٹھانا وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ پھر وہ ان موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ادب وفن کی نئی جہتیں سامنے لاتا ہے۔ قارئین کے ذوقِ ادب کی آبیاری کے لیے نئے مکالمے سامنے لاتا ہے، تازہ تر تخلیقات پیش کرتا ہے تا کہ قاری موضوع کی یکسانیت میں بھی تازگی اور فکر افروزی کے نئے تناظرات تک پہنچ سکے۔

ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ دونوں اقتباسات میں مدیر نعت رنگ نئے موضوعات اور امکانات کی تلاش کرتے اور نئے پہلوؤں پر غور وفکر کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ ان اقتباسات مدیر کے سنجیدہ کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خیال میں مدیر کو ہر لمحہ نئے موضوعات اور نئے امکانات پر غور وفکر کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں مدیر تنہا کردار ادا نہیں کرتا بلکہ رسالے سے جڑا ہر فرد اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ مدیر کے خیال میں ہر فرد کو نئے امکانات اور موضوعات پر غور کرنا چاہیے۔ اسی طرح آپسی کی گفتگو اور مذاکروں سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

> ''نئے عنوانات کی تلاش، نئے امکانات پر غور وفکر اور پھر اس پر قلم کاروں سے لکھوانا سب وقت طلب بھی ہے اور دشوار بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''نعت رنگ'' ایک بار پھر نعتیہ ادب کے نئے پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی رنگوں سے ''نعت رنگ'' ہمیشہ آراستہ ہوتا ہے مگر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو بھی ہم پیش کرسکیں۔'' (اداریہ نمبر ۲۱)
>
> ''موضوعاتِ نعت کے حوالے سے تنوع کی ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے اور میرے خیال میں اس کی تلاش میں ہمیں مذاکروں سے مدد مل سکتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہم اپنی گفتگو کی مجالس میں نعت سے متعلّق مختلف موضوعات پر بے تکان بولتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو میں ہم بعض اوقات ایسی فکر انگیز گفتگو سن لیتے ہیں یا کر لیتے ہیں جس کا ہمیں پہلے سے کوئی احساس نہیں ہوتا یا ہمارا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں ہوتا ہمیں

اپنی تحریروں کے لیے بیش تر موضوعات اسی طرح کی گفتگو سے مل سکتے ہیں، لہٰذا میں ''نعت رنگ'' کے تمام نمائندگان ومحبان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں اور شہروں میں نمایاں ادبی شخصیات کو مدعو کرکے عصرِ حاضر کے بین الاقوامی اور علاقائی مسائل اور تہذیبی رجحانات کے تناظر میں نعتیہ ادب پر مذاکروں کا اہتمام کریں اور اسے تحریری شکل میں ہمیں ارسال کریں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ان مذاکروں کے نتیجے میں ہم بے شمار تازہ موضوعات تک رسائی حاصل کرسکیں گے۔(ان شاءاللہ)''

'نعت رنگ' کے اداریوں کی عمارت ان تصورات، خیالات، افکار اور نظریات پر اٹھائی گئی ہے جو مدیر نعت رنگ کے دماغ میں عرصۂ دراز سے پرورش پا رہے تھے۔ ان خیالات کی پشت پر کئی دہائیوں کا تجربہ کام کر رہا ہے۔ کبھی وہ نعت کے فروغ کے اسباب تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی تنقیدِ نعت کے فروغ میں حائل رکاوٹوں کے اسباب پر غور وفکر کرتے ہوئے ملتے ہیں، کبھی نعت کے ادبی سرچشموں کا سراغ لگانے میں منہمک ہوتے ہیں، کبھی قدیم کلاسیکی ادبی تاریخ کو کھنگال کر نعت کے قدیم نقوش ڈھونڈھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی موضوعات کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور کبھی ادب اور نعت کے باہمی رشتوں پر غور وفکر کرتے نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ نعت اور ادب سے متعلّق موضوعات کو کھوجتے رہتے ہیں اور پھر ان تمام موضوعات اور دریافتوں کو ''نعت رنگ'' کے صفحات پر پیش کر کے صلائے عام دیتے ہیں کہ ہے تحقیق یا تنقید کا کوئی مردِ میدان جو آگے بڑھے اور ان موضوعات پر اپنی صلاحیتوں کو آزمائے۔ 'نعت رنگ' کے ستائیسویں شمارے کے اداریے میں انھوں نے ۵۸ موضوعات کی فہرست پیش کرکے ان طلبا و طالبات اور محققین اور ناقدین کی مشکل آسان کی ہے جو موضوعات کی تلاش میں سر پٹکتے اور دردر دستکیں دیتے پھرتے ہیں اور گندم نما جو فروشوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ کسی خضرِ تحقیق کے منتظر ہوتے ہیں۔

تکرار کا عنصر

صبیح رحمانی کے اداریوں میں سب سے زیادہ کھٹکنے والا عنصر تکرار کا ہے۔ ایک ہی مقصد کے بیان کی تکرار۔ تکرار دراصل نقص ہی کا دوسرا نام ہے لیکن کبھی تکرار نقص کی حدود سے نکل کر بذات خود خوبی بھی بن جاتی ہے۔ جس طرح مومن نے تعمیے اور تخرجے کی خامی کو اپنی تخلیقی ہنرمندی سے خوبی میں مبدل کر دیا تھا[۷] بعینہٖ ہر بڑا تخلیق کار، نقاد اور محقق تکرار میں بھی حسن کے کئی پہلو تخلیق

کر لیتا ہے۔ صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' میں بھی اور اداریوں میں بھی خیالات اور مضامین میں تکرار عیب بن کر سامنے نہیں آتی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں تکرار مصنّف کے غیر شعوری طرزِ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ شعوری عمل کا زائدہ ہے، جو ان کے مقصد کے تابع ہے وہ مقصد نعت کا حقیقی فروغ ہے۔ اور غالباً ان کے پیش نظر ''تکرار اللسان یتقلب علی القلب'' کا مقولہ بھی ہوگا کہ مقصد کی تکرار کا اظہار ہی قارئین کے دلوں میں رسوخ پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ دوسرا ''جگائے رکھنے کے عمل'' کے لیے بھی تو تکرار ضروری ہے۔ اس لیے کہ تسلسل کے ساتھ گرنے والا قطرہ ٹھوس پتھر میں بھی شگاف ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انھیں تسلسل کے ساتھ ''ورفعنا لك ذكرك'' کی صدائیں لگانا پڑتی ہیں۔

محمد رشید رضا نے اپنی کتاب ''الوحی المحمدی'' میں لکھا ہے کہ 'چونکہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے اس لیے اس میں مضامین کی تکرار کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ خیالات ہی میں انقلاب برپا کرے اور عقائد و اخلاق کی اصلاح کرے'۔[۸] غالباً صبیح رحمانی کے ہاں خیالات کی تکرار کا مقصد یہی ہے کہ وہ نعت کے گرد لپٹی ہوئی صدیوں کے فرسودہ، غیر اخلاقی اور غیر شرعی گرد کو دور کر سکیں یا پھر ان کے ذہن کے کسی گوشے میں گستاف لیباں کا یہ خیال موجود ہوتا ہے کہ 'مذہبی سیاسی اور سماجی تحریکوں کی تقاریر اور مضامین میں بار بار اعادہ اور تکرار قوموں میں جوش اور محویت پیدا کرتا ہے۔ اس طریقے سے ان میں قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہر بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے'۔[۹]

چونکہ ادبی رسائل کے مدیروں کے پیش نظر اداریہ لکھنے کے لیے وسیع موضوعات ہوتے ہیں اس لیے کبھی وہ زبان، کبھی نثر کبھی شاعری کبھی نظریات، کبھی افکار کبھی تجربات اور کبھی ادبی صورتِ حال پر قلم اٹھاتا ہے۔ عمومی ادبی رسائل کے مدیران کے پیش نظر موضوعات کا تنوع، تاریخ تہذیب، ثقافت، سیاست اور مذہب یہاں تک کہ جنگ، بدامنی، طوائف الملوکی اور گرانی جیسے موضوعات کو بھی محیط ہوتا ہے۔ اس لیے ادبی رسائل کے ہاں موضوعات کا ایک وسیع دائرہ ہوتا ہے لہٰذا مدیر کے پاس کہنے کے لیے بھی وسیع میدان ہوتا ہے لیکن موضوعی رسائل کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ اس کے اداریوں کا محور صرف ایک ہی موضوع بنتا ہے اور موضوعات کی وسعت اور تنوع عمومی رسائل کے مقابلے میں محدود ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی موضوعی رسائل میں تکرار کا عنصر دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ عنصر خیالات اور موضوعات دونوں صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ یہی صورت 'نعت رنگ' میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس

لیے بھی اداریوں میں یہ عنصر دیکھنے میں زیادہ آتا ہے۔

اختلافِ رائے/اختلافی مباحث

اردو کے ادبی رسائل پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے کئی رسائل ایسے رہے ہیں اور ہیں بھی جن میں مدیر حضرات اختلافی مباحث اور آراء کو شائع کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں جس کا مقصد رسالے کی فضا میں نئی اور تازہ ہواؤں کا سلسلہ داخل ہوتا رہے اور رسالے کی ادبی فضا یکساں خیالات کی تکرار سے ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند متعفّن نہ ہونے پائے۔ اختلاف رائے اور آزادیِ اظہار زندہ معاشروں کی نشانی ہوا کرتی ہے اور اسلام تو خود آزادیِ اظہار کا سب سے بڑا دعوے دار ہے۔ بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ایک کا خیال تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے جب کہ دوسرے گروہ نے ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا اور نبیِ رحمت ﷺ نے دوسری رائے کو قبول کیا تھا۔ عہدِ نبوی میں کئی معاملات پر اصحاب کرام میں اختلاف ہوا لیکن کبھی بھی اس اختلاف کو ناپسند نہیں کیا گیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے

> ''کہ اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے امور اجتہادیہ میں (ص ۱۸۸) آنحضرت ﷺ کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کی رائے کے برخلاف حکم کیا ہے اور باوجود نزول وحی کے ان کے خلاف پر مذمت نہیں آئی اور ان کے اختلاف پر منع وارد نہیں ہوا جیسا کہ گزر چکا۔ اگر یہ اختلاف حق تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور نامقبول ہوتا تو البتہ منع ہوتا اور اختلاف کرنے والوں پر وعید نازل ہوتی۔''[۱۰]

جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اختلاف کو خالقِ کائنات نے بھی پسند فرمایا ہے اور باعثِ تخلیقِ کائنات نے بھی۔ البتہ شرط یہ رکھی ہے کہ اختلاف میں ہوا و ہوس اور تعصّب اور جانبداری کا گزر نہ ہو۔ تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جائے۔ احترام آدمیت کو مقدم رکھا جائے۔ مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ

> ''جاننا چاہیے کہ وہ اختلاف جو اصحاب کرام امور اجتہادیہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا کرتے تھے اگر اس میں نعوذ باللہ ہوا و تعصّب کی بُو ہوتی تو یہ اختلاف سب کو مرتدوں میں داخل کر دیتا اور اسلام سے باہر نکال دیتا کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بے ادبی اور

بدمعاملگی کرنا کفر ہے۔اعاذنااللہ سبحانہ(اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے بچائے)''[۱۱]

اختلافِ رائے کو مذہب ہی میں نہیں ادب کی نشو ونما اور ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا گیا ہے۔مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ادب میں فکری اختلافات کو ہمیشہ نیک فال سمجھا گیا ہے۔یہ اس کو کمزور کرنے کی بجائے تنومند اور بالغ بناتے رہے۔ادب کی اسی وسعت، لچک اور بلند ظرفی سے فائدہ اٹھا کر ہم بعض مسلمہ اصول اور قوانین سے انحراف کر بیٹھتے ہیں۔''[۱۲]

اس سے یہ ہرگز مراد نہیں لینی چاہیے کہ اختلاف کا حق ہر ایرے غیرے کو حاصل ہے۔ جس کا جی چاہے وہ فتویٰ داغ دے۔مذہب میں بھی اور ادب میں بھی اس چیز کی پابندی لگائی گئی ہے کہ اختلافِ رائے اس شخص کا حق ہے جو اس معاملے یا صورتِ حال سے واقفیت رکھتا ہے۔نہ صرف واقفیت بلکہ اس پر ماہرانہ دسترس بھی رکھتا ہو۔اس رائے کو تقویت دینے میں مجتبیٰ حسین کا درج ذیل بیان ہی کافی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ادب کی بلندی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سلسلے میں ہر شخص کو اظہارِ رائے کی اجازت دیتا ہے۔صرف شرط یہ رکھتا ہے کہ یہ رائے پڑھے لکھے آدمی کی ہو جو ادب سے واقعی دلچسپی رکھتا ہو۔''[۱۳]

صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' میں اختلافی آراء اور مباحث کی آمد پر کوئی روک نہیں لگائی اور نہ اس کی اشاعت میں تذبذب سے کام لیا ہے بلکہ انھوں نے ہمیشہ زور دیا ہے کہ اختلافی مباحث کو خوش دلی سے قبول کیا جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے 'نعت رنگ' میں اختلافی مباحث پر مقالات شائع کیے تو بعض اصحاب نے اپنے خطوط میں اس امر پر تعجّب کا اظہار بھی کیا۔ان کے خیال میں 'نعت رنگ' ایک خاص مکتبۂ فکر یا سوچ کا حامل رسالہ ہے اور اسے اسی مخصوص مضامین و مقالات اور افکار و خیالات کو ہی 'نعت رنگ' میں جگہ دینی چاہیے تھی۔ان خیالات پر مدیر 'نعت رنگ' کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''کئی احباب نے اپنے خطوط میں ان مضامین کی اشاعت پر ''تعجّب'' کا اظہار کیا ہے، جن کے مندرجات سے انہیں اتفاق نہیں۔ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مقالہ نگاروں سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں علاوہ ازیں اگر علم و ادب اور فنون کی دنیا میں یہ اختلا فات نہ ہوتے تو فکر و نظر کے بہت سے گوشے اپنے امکانات کے ساتھ ہمارے سامنے نہ

> آپاتے۔ہم نے کوشش کی ہے کہ فکری اختلاف شخصی مخالفت نہ بننے پائے اور اختلاف کرتے ہوئے لہجے کی متانت اور اسلوب کی شرافت برقرار رہے۔'' (اداریہ نمبر ۴)

یہی وجہ ہے کہ جوابی مقالات ہوں یا اختلافی آراء انھوں نے دونوں کو 'نعت رنگ' کا حصہ بنایا۔البتہ کوشش یہ کی جاتی رہی ہے کہ اگر کوئی خیال، نقطۂ نظر یا مؤقف مدیر یا رسالے کی مرکزی پالیسی کے خلاف ہو تو اس اختلافی بحث / نقطۂ نظر کو عوامی مکالمے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور اس میں خود شریک نہ ہوا جائے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ انھوں نے اختلافات کی رسّی، ڈوری کو کھلا چھوڑ دیا کہ قارئین اسے خود سلجھائیں اگر کسی موقع پر انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اختلاف کی یہ ڈوری الجھنے لگی ہے یا بحث / اختلاف، مخالفت کی حدود میں داخل ہونے لگا ہے یا معاملہ ذاتیات تک پہنچ گیا ہے یا بحث بے جا تکرار میں تبدیل ہوگئی ہے یا بحث / اختلاف، نزاع کی صورت اختیار کرنے لگا ہے اس وقت مدیر نے اپنا مثبت اور مدبرانہ کردار ادا کیا ہے۔مبادا 'نعت رنگ' میدانِ کارزار یا مناظرانہ آماج گاہ بن جائے۔

اس بات سے یہ ہرگز مطلب نہیں لینا چاہیے کہ ان کے اداریوں میں اپنے معاصرین سے اختلاف کا پہلو نہیں نکلتا۔ وہ اختلاف کرتے ہیں لیکن شائستگی اور دلیل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔وہ نہ تو اس اختلاف کو جذباتی سطح پر لے کر مخالفت کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور نہ ہی کسی کی تنقیدی کارگزاریوں یا مؤقف پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اختلاف کو واعظانہ یا مناظرانہ انداز میں سلجھانے یا حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ انھیں علمی سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔اختلاف اور مخالفت کا فرق ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔وہ تنقید اور تحقیر کو ایک ہی خیال تصور نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اداریوں میں ذہنی کشادگی، گہری فکری آگہی اور کائناتی ادراک کی شہادتوں کی بکثرت مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ان کے مؤقف سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے، ہوتا بھی ہے لیکن ان کی ادب اور بالخصوص نعت کے لیے کارگزاریوں سے انکار ممکن نہیں۔اس حوالے سے درج ذیل پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

> ''یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمّل اتفاق ضروری نہیں ہے۔مکمّل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہوسکتا ہے۔اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب، فکر اور

تنقید کے لیے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔ اس لیے کہ اس سے خیال کے نئے در وا ہوتے اور فکر ونظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کو فکری ونظری سطح پر رہنا چاہیے۔ اسے ذاتی یا شخصی ہرگز نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اسے مخالفت کی سطح پر آنا چاہیے۔ نیا ہو یا پرانا، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر لکھنے والے کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت ہے۔ البتہ پرانے اور بڑے لکھنے والوں کے لیے ہمارے رویے میں زیادہ سنجیدگی، متانت اور لحاظ نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اپنے بڑوں کی عزت ووقار کا خیال رکھتے ہوئے نظر آئیں گے تو یہ دراصل بعد والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہوگا۔ ''نعت رنگ'' نے اختلافات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ اس شمارے میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم آئندہ بے احتیاطی یا بے ادبی کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کسی بھی مضمون کی اشاعت سے انکار کا حق محفوظ رکھتا ہے۔'' (اداریہ نمبر ۲۷)

صبیح رحمانی اپنے اداریوں میں اختلافی مباحث کو مکالموں کی سطح پر حل کرنے کے متمنّی نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں مناظرہ عقائد میں بے جا سختی پیدا کرتا ہے اور مکالمہ فکر وخیال کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ اس لیے معاملات الجھنے کی بجائے سلجھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کشادگی جنم لیتی ہے اور یہی کشادگی مہذب معاشرے کی نشانی، دین ہے۔

اس ضمن میں اتفاق یا اختلاف دونوں قسم کی آراء ہمارے لیے قابلِ احترام ہوں گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ (اداریہ نمبر۱)

''زندہ اور فکر انگیز ادب ہمیشہ مکالماتی فضا کو قائم رکھتا ہے۔ ''نعت رنگ'' ادب کی اس کشادگی کا قائل ہے اور اس پر کاربند بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کے صفحات پر ابتدا ہی سے اختلافِ رائے کی گرما گرم محفلیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، جن میں فکری، ذہنی، نظریاتی، علمی اور فنی حوالوں سے خوب خوب گفتگوئیں ہوئیں۔ ہم اب بھی ادب وفکر کے مکالماتی بیانیے کو نیک شگون سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح کے مکالمے ادب وفن کی راہوں پر نئے چراغ روشن کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے اگر کچھ لوگ ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والی کسی بھی تحریر کے بارے میں اپنی رائے یا اختلاف کا اظہار کرنا چاہیں تو ہم ان کو خوش آمدید کہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ بحث علمی وفکری اور ادبی نوعیت کی ہو اور اس کا لب و لہجہ بھی ادبی ہو۔'' (اداریہ نمبر۲۶)

''صبیح رحمانی اختلاف کو ناپسند نہیں کرتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ مہذب معاشروں کی طرح

اسے جذباتی انداز میں نہیں بلکہ فکری انداز میں لینا چاہیے اور اختلاف کو مخالفت کی حدود میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔ مہذب معاشروں کی طرح اپنے موقف کے خلاف بیانیے کا رد چیخ پکار اور شور شرابے کے برعکس دلیل اور عالمانہ سنجیدگی سے دینا چاہیے اور پھر یہ کہ نعت کا معاملہ تو زیادہ حساس نوعیت کا ہے۔ اس میں اعتدال، توازن اور سنجیدگی اور بھی ضروری ہے۔

''اس عرصے میں بعض ایسے مضامین و مقالات اور تجزیات سامنے آئے جن کے مطالعے میں یہ احساس شدت سے ہوا کہ اختلافِ رائے کے حدود کا قطعاً خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جن معاصرین یا متقدمین کی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے، ان کے لیے نامناسب رویے کا اظہار اختلاف کا نہیں، مخالفت کا واضح تأثر دیتا ہے۔ اختلاف کسی بھی رائے، خیال، فکر یا تصور سے کیا جاسکتا ہے، اور اس کے تقابل میں اپنی رائے یا خیال کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام دلائل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ محض کسی کو رد کر دینا یا پھر اس طرح کے کسی موقعے پر عمومی انداز کا مسترد کرنے والا لہجہ اختیار کرنا کافی نہیں ہوتا۔ بات میں وزن پیدا ہوتا ہے دلیل سے اور اس کو مستحکم کرتا ہے متبادل زاویہ، نیا خیال اور نیا بیانیہ۔ ایسا نہ ہو تو محض رد و مخالفت کا منفی احساس ہی سامنے آتا ہے جو نعت، ادب اور تنقید کسی کے لیے کارآمد نہیں ہوتا۔'' (اداریہ نمبر ۲۸)

رواداری، وسیع القلبی، عفوودرگزر اور روشن خیالی ہمارے مذہب اور ہماری معاشرت کا ایک مرکزی اور بنیادی نکتہ ہے۔ انتقام، مخالفت، تنگ نظری اور انسان دشمنی کو نہ مذہب نے استحسان کی نظر سے دیکھا ہے اور نہ ادب میں اس کی گنجائش نکلتی ہے البتہ اختلاف جس کے عقب میں کشادہ دلی موجود ہو اسے اسلام نے بھی پسند کیا ہے اور مہذب معاشروں کی بھی یہ خصوصیت رہی ہے۔ صبیح رحمانی کے خیال میں اختلاف کو بامعنی اور مثبت ہونا چاہیے۔ بے معنی اور منفی نہیں۔ ذیل کا پیرا گراف ملاحظہ فرمائیے:

''رواداری اور وسعتِ قلبی کو ہماری تہذیب و روایت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں سب سے بڑھ کر خود نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے روزمرہ امور میں نظر آتا ہے، اور جلوت و خلوت دونوں میں۔ چناں چہ ہماری علمی، فکری اور ادبی روایت بھی اس سے آراستہ نظر آتی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ادب و تنقید میں اختلافِ رائے کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ اہلِ علم و دانش تو اس ضمن میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اختلاف تو ادب کے لیے ایک بابرکت چیز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نئے

> پہلو سامنے لاتا اور نئے افکار کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تاہم اختلاف کو ہمیشہ اپنے حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اختلاف پھر اختلاف نہیں رہتا، بلکہ مخالفت بن جاتا ہے، جو کہ ظاہر ہے، مثبت نہیں، ایک منفی رویہ ہے۔ ادب وتنقید میں اور خصوصاً مطالعاتِ نعت میں تو ہر صورت میں اس سے مکمّل طور پر گریز کیا جانا چاہیے۔'' (اداریہ نمبر ۲۸)

متذکرہ بالا اقتباسات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صبیح رحمانی کے نزدیک اختلاف رائے براعمل ہرگز نہیں۔ اس کی اجازت ہمارا دین بھی دیتا ہے اور مہذب معاشرہ بھی۔ لہٰذا وہ اختلاف اور مخالفت میں فرق کرتے ہیں۔ وہ اختلاف کے حامی اور مخالفت کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک جذبات سے زیادہ دلائل و براہین اہمیت رکھتے ہیں۔ جذبہ برا نہیں، جذباتیت بری ہے۔ وہ جذبہ جس کی پشت پر تلاش اور جستجو کا خلوص کھڑا ہو وہ اقبال کے عشق کی طرح ہوتا ہے۔ جس کی پشت پر جذبہ بھی موجود ہوتا ہے ادراک (عقل) بھی۔

قارئین کے ذہنوں میں جنم لینے والے یا کلبلانے والے سوالات سے متعلّق جانکاری ہی مدیر کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ ان کا تسلّی بخش جواب دینا اور ان مسائل کے حل طلب جواب فراہم کرنا بھی کسی حد تک مدیر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدیر ان سوالات اور مسائل سے کس طرح آگاہی حاصل کرتا ہے۔ مدیر مشاہدات، مطالعات اور مراسلات سے فکر وخیال کی روشنی حاصل کرتا ہے اور پھر رسالے کی پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے جوابات دیتا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ رسالے کے حوالے سے سامنے آنے والے قارئین کے خدشات یا سوالات کو اہم نہیں سمجھا جاتا یا انھیں مخالفت برائے مخالفت سمجھتے ہوئے رد کر دیا جاتا ہے یا مدیر انھیں اپنی ذات پر حملہ یا مخالفت سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتا ہے یا وہ ان خیالات یا سوالات کو رسالے کی فضا کے لیے ناسازگار سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں ایک ذمہ دار مدیر سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اختلاف، مباحث اور مکالمے کا دروازہ نہ اپنے لیے بند کرے اور نہ رسالے کے لیے کیونکہ اگر یہ چشمے خشک ہو گئے یا اپنا راستہ تبدیل کر بیٹھے تو ایک طرف رسالے کا وجود خطرے سے دوچار ہوگا تو دوسری طرف مدیر بھی اپنا اخلاقی جواز فراہم کرنے سے قاصر رہے گا اور وہ مدیر جو قارئین اور لکھاریوں کے فکری سرچشموں سے رسالے کو سیراب کرتا رہے گا، اس سے نہ رسالہ بنجر پن کا شکار ہوگا اور نہ مدیر کے فکری اور تخلیقی سوتے ہی خشک سالی کا شکار ہوں گے۔ صبیح

رحمانی کی مثال مؤخرالذکر مدیر کی طرح ہے۔ وہ متذکرہ سوالات کا سامنا خوش دلی سے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنا محاسبہ بھی خود ہی کرتے ہیں۔ سوالات کے کٹہرے میں کھڑے ہونے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کی ہر کم و بیش ہر تحریر غور و فکر کی دعوت دیتی اور سوال اٹھاتی نظر آتی ہے۔

مدیرِ'نعت رنگ' نے اپنے ہر اداریے میں سوال کرنے اور اظہارِ خیال کی بلا روک ٹوک آزادی دے کر تنقید کے موسموں کو عام کر دیا تھا۔ اس مجلّے میں دیگر رسائل کے برخلاف خطوط کی اشاعت میں خاص دلچسپی لی جاتی ہے۔ خطوط کی اشاعت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اور بلا خوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس حوالے سے وہ خود بھی سوال قائم کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی سوالات اٹھانے کی دعوت/ترغیب دیتے رہے ہیں کہ 'نعت رنگ' ان کے روشن خیال افکار کو خوش دلی سے قبول کرنے کا منتظر ہے۔ لہٰذا وہ آئیں اور خطوط کے ذریعے اپنے خیالات، افکار اور نقطۂ نظر کو بے خوفی سے پیش کریں۔ (۱۴) مدیر کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے مجلّے کا دائرہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہو گیا۔ چنانچہ 'نعت رنگ' میں مذہب، تہذیب، تاریخ، ادب، تحقیق اور تنقید کے مباحث نظر آنے لگے۔ مدیر کی روشن خیالی اور فراخ دلی کے باعث اس مجلّے پر کسی مخصوص عقیدے، فرقے یا نظریے کی چھاپ لگی اور نہ یہ مجلّہ کسی مخصوص علاقے، رنگ اور نسل کا ترجمان ہی بنا۔

دوسری بات یہ کہ وہ خود بھی ایک متشکک ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اپنا بھی اپنے رسالے کا بھی ہر لمحہ محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔ قارئین کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنے، سوچنے پر مجبور کرنے، ان کے منجمد اور غیر متحرک ذہن کو متحرک اور فعال بنانے کا ایک طریق سوال بھی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے، اہم اور وضاحت طلب مقامات/گوشوں/نکات پر غور و خوض پیدا کرنے کے لیے سوال اٹھاتے ہیں۔ اس کا مقصد ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے جو کسی بھی وجہ سے نظر انداز ہو گئے یا غیر اہم سمجھتے ہوئے توجہ کے قابل نہ رہے۔ یہ سوال اچانک برآمد نہیں ہوتا اور نہ مواد سے باہر کی کوئی چیز ہوتا ہے بلکہ یہ ان کے کسی خیال یا متن کی زمین سے پھوٹتا ہے۔ قارئین کی توجہ کے حصول کے بعد وہ خود ہی ان گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور پیش کردہ سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ اپنی تحریروں میں بھی اور اداریوں میں بھی یہی انداز اختیار کرتے ہیں کہ بات کرتے ہوئے کسی وضاحت طلب مقام کی طرف توجہ دلاتے ہیں یا سوال اٹھا کر سوچنے کا موقع فراہم کرتے

ہیں۔ یہ سوال ان کے کسی خیال یا متن کی زمین سے ہی پھوٹتا ہے پھر خود ہی اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ وہ جواب نہ جذباتیت کا حامل ہوتا ہے نہ خیالی اور نہ مبہم بلکہ وہ منطقی اور استدلالی انداز میں اس کا جواب پیش کرتے ہیں۔ جس کی پشت پر ان کا مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور تجزیہ موجود ہوتا ہے۔ ذیل میں 'نعت رنگ' کے اداریوں سے ماخوذ تین سوالات اور ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیے

ا: ''ادب کی ناقدری کی آوازوں کے درمیان نعت نگاروں کے اس گلے کی گونج بھی کافی عرصہ سے سنائی دے رہی ہے کہ نعت کی کتابوں کی اشاعت کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی نکاسی کا مسئلہ بھی روز بہ روز گمبھیر ہوتا جارہا ہے یہی وجہ ہے کہ عام ادبی کتابوں کی طرح اب نعتیہ مجموعوں کی اشاعت کے لیے بھی کئی مرتبہ سوچنا پڑتا ہے اور اگر شائع کیا بھی جاتا ہے تو اتنی مختصر تعداد میں کہ صرف احباب میں اعزازی تقسیم کیا جا سکے۔'' (اداریہ نمبر ۹)

''بلاشبہ نعتیہ مجموعوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی ایک توجہ طلب مسئلہ ہے لیکن کیا صرف یہ مسائل نعتیہ مجموعوں کے ساتھ ہی ہیں یا عام ادبی کتب کی مجموعی صورتِ حال یہی ہے؟ کیا غزل کے تمام مجموعے، افسانے، تنقید اور تحقیق کی تمام کتابیں فروخت ہو رہی ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے یہ ایک الگ اور تفصیل طلب بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ نعت کے شائقین کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی کے باوجود نعتیہ کتب کی خریداری سے عدم دلچسپی اور بے اعتنائی کی شکایت کیوں؟

قصہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نعت کو شروع ہی سے سماع کی چیز قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں نعت کو ذوق شوق سے سننے والے اور اس کی سماعت سے اپنے قلوب واذہان کو جلا بخشنے والے لاکھوں افراد موجود ہیں لیکن نعت کی کتابیں یا نعتیہ مجموعے پڑھنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ یہ لمحہ فکر یہ ہے جس پر نعت کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں کو فوری توجہ کرنی چاہئے۔ الحمدللہ صرف ہمارے ملک ہی ایک محتاط اندازے کے مطابق ایسے اداروں کی تعداد کم وبیش دو لاکھ کے قریب ہے جو جلسہ ہائے میلاد النبی ﷺ کے انعقاد اور ذکر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے فروغ ہی کے لئے وجود میں آئیں ہیں تا کہ عوام النا س کے دلوں میں تذ کارِ رسول ﷺ کے ذریعے عشق کی شمعیں روشن کر کے انھیں عملی طور پر اسلامی معاشرے کی صورت گری کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس عشق کو ایک قوت بنا کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بھی کوشش کی جائے۔ ان نیک مقاصد کے لئے ہم سب نعت کو

موثر ترین ذریعہ تبلیغ قرار دیتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کام کو مزید وسعت دینے کے امکانات پر غور نہیں کرتے۔ ہم عشقِ رسول ﷺ کی اس دولت (نعت) کو تحریری شکل میں اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے سے کیوں غفلت برت رہے ہیں۔ میرا مقصد شکایت نہیں صرف توجہ دلانا ہے (ادار یہ نمبر ۹) کہ اگر ہمارے یہ محترم ادارے سیرت ونعت کی کتب کی اشاعت اور خریداری پر توجہ کریں تو ہم اپنے اس مشترکہ مشن کو اور زیادہ تیز کر سکتے ہیں جس کے لیے ہم رات دن مصروف عمل ہیں۔ ہر سال ہم میلاد النبی ﷺ کے موقع پر مختلف جلسوں اور محافل نعت کے انعقاد پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اگر ان اخراجات میں سے کچھ رقم کسی نثری کتاب یا نعتیہ مجموعے کی اشاعت پر خرچ کی جائے یا کسی شائع شدہ مجموعہ نعت کو خرید کر اپنے مہمانوں اور حاضرین محفل کی خدمت میں تحفتاً پیش کرنے کی روایت قائم کر لی جائے تو یہ تمام مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ گھر گھر میں حضور ﷺ کی سیرتِ مطہّرہ کے تذکار اور توصیف پر مشتمل کتب کی موجودگی سے تمام اہلِ خانہ مستفید ہو سکتے ہیں اور ہمارے سیرت ونعت نگار بھی اس پذیرائی پر مزید جذبے، ولولے اور لگن سے اپنی تخلیقی صلاحیتیں اپنے کاموں پر صرف کر سکیں گے۔ ان عظیم الشان محافل کی یاد بھی اس تحفے کی بدولت عوام کے دلوں میں تازہ رہے گی اور سب سے اہم بات یہ کہ نعت صرف سماع کی چیز نہیں رہے گی بلکہ اس کے مطالعے کا ذوق بھی فروغ پائے گا۔ رب کریم ہمیں سیرت ونعت کی اس حقیقی خدمت کی جانب متوجہ فرمائے۔ آمین''

۲: ''یہ سب حوصلہ افزا ہے، بہت حوصلہ افزا ہے لیکن قابل اطمینان نہیں۔ گزشتہ صدی کے مجموعی ادبی کاموں کے تناظر میں نعت پر ہونے والے ان کاموں کی رفتار اور مقدار ہمیں نہ صرف بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ اکیسویں صدی میں فروغ نعت کے حوالے سے مربوط لائحۂ عمل کا تقاضا بھی کرتی ہے، فروغ نعت کی یہ ساری انفرادی کوششیں خوش آئند ہیں تاہم ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ کیا ''نعت'' نے خود کو ایک صنفِ ادب کے طور پر تسلیم کروالیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں انفرادی طور پر اثبات میں اور اجتماعی یعنی اداروں کی سطح پر نفی میں ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے ادبی ادارے گاہے بہ گاہے تمام ادبی اضاف کے معیاری انتخاب بھی مرتب کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے مختلف موضوعات پر کانفرنسوں اور سیمینار وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں لیکن نہ ہی ان منتخبات میں ہمیں کوئی نعتیہ انتخاب نظر آتا ہے، نہ ہی کوئی کانفرنس نعت کے موضوع پر ہوئی ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

آیا نعت اب تک ادبی صنف کا درجہ حاصل نہیں کرسکی یا پھر ان اداروں کے بالانشینوں میں اس صنف کا کوئی حقیقی نمائندہ موجود ہی نہیں ہے۔'' (اداریہ نمبر ۱۱)

۳: ''مجھے کئی دوستوں نے خطوط، ٹیلی فون کالز اور بالمشافہ ملاقات پر ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے مضامین میں تکرار کی طرف متوجہ کروایا ہے اور ان میں تنوع اور تازگی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میں ایسے تمام دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ نہ صرف ''نعت رنگ'' کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اس کے موضوعات میں وسعت اور تنوع کے خواہاں بھی ہیں۔'' (اداریہ نمبر ۱۶)

''مسئلہ یہ ہے کہ نعت کے آداب اور مسائل کے حوالے سے ہونے والی گفتگو سے لے کر نعت کے تاریخی، تہذیبی اور ارتقائی جائزوں تک ہم نے جو کچھ بھی ''نعت رنگ'' یا کسی اور جگہ تحریر کی شکل میں پیش کیا ہے اس میں تکرار اس وجہ سے سامنے آ رہی ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کو نعتیہ ادب پر نثری سرمائے کی کمی کا احساس ہے اور اسی لیے وہ اس موضوع پر لکھتے وقت تاریخی تناظر کو بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قاری کو ایک ہی مضمون میں اجمالی ہی سہی ایک مکمّل خاکہ نعتیہ ادب کے ارتقائی مراحل پر مل جائے۔''

''یہ مضامین اگر علاحدہ علاحدہ رسائل و جرائد میں شائع ہوں تو شاید یہ بات ان مضامین کا حسن قرار پائے مگر ''نعت رنگ'' یا نعت ہی سے متعلّق کسی بھی جریدے میں اس طرح کی تکرار اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے دشواری پیدا کر رہی ہے، لہٰذا میں اپنے محترم لکھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ تاریخی تناظر کے حوالے سے صرف وہی معلومات پیش کریں جنھیں اضافہ کہا جاسکے ورنہ اب براہِ راست موضوع پر لکھنا ہی مناسب ہے۔'' (اداریہ نمبر ۱۶)

'نعت رنگ' اپنے ارتقائی سفر میں کامیابی کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ کئی اہداف حاصل کر چکا ہے۔ تنقیدِ نعت پر چھائے سکوت اور خاموشیوں کے موسموں میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا کر چکا ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں اور مضامین کے باعث تنقیدِ نعت کا سناٹا ٹوٹا اور ہنگامۂ فکر و خیال اور غوغا ہائے ہو پیدا ہوا۔ اکتیس ادبی شماروں کا فکری سفر اس بات کا شاہد ہے کہ کم و بیش تیس برس پہلے نعت کے ادبی فروغ کا جو علم تنِ تنہا صبیح رحمانی نے بلند کیا تھا، آج اس کو تھامنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے اور کامیابی کا وہ سفر جو دھندلی منزلوں کی تلاش میں شروع ہوا تھا اب وہ ہماری آنکھوں کے

سامنے روشن تر ہے۔

مدیر نعت رنگ نے تنقید نعت کے حوالے سے پھیلی ہوئی بے اعتنائی، بدگمانی کے شکوک دور کرنے اور خوف کے بادل چھانٹنے کے لیے ناقدین نعت کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ تنقید نعت کا مطلب تنقیص نعت ہرگز نہیں اور تنقید نعت کو بے لگام فضاؤں میں کھلا چھوڑنا بھی مناسب عمل نہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ بھی واضح کیا کہ نعت پر تنقید سے شرعی مسائل پیدا نہیں ہوں گے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نعت کو تنقیدی عمل سے نہ گزارنے کی وجہ سے نعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔نعت غیر اخلاقی اور غیر شرعی خیالات وتصورات کی آماج گاہ بن چکی ہے۔تنقید کا راستہ کھولنے سے نعت کا وہ حقیقی چہرہ سامنے آئے گا جس کا شریعت بھی تقاضا کرتی ہے اور تنقید ادب بھی منتظر ہے۔

دوسرا کام انھوں نے یہ کیا کہ اردو کے بیشتر رسائل کی طرح رسالے کے گرد گروہی اور انفرادی تعصّبات کی فصیلیں کھڑی نہیں کیں بلکہ ماضی میں چُنیں ہوئیں ان فصیلوں کو بھی ہٹا دیا جو خوف کا ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ان کا خیال ہے کہ نئے تنقیدی خیالات اور افکار فروغ نعت کی راہیں ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے کیونکہ خود ساختہ معیارات کی قائم کردہ فصیلوں میں مقیّد خیالات، حقیقت تک رسائی کے حصول میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔عام طور پر رسائل اپنے گرد متعیّنہ نظریات کا ہالہ بن لیتے ہیں۔جس میں مختلف ومتضاد نظریات وافکار اور خیالات وتصورات کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔یہ رویہ ماضی میں بھی تھا اور حال میں بھی برقرار ہے اس رویے کا ختم کرنا ہوگا۔

مدیر نعت رنگ نے رسالے میں اظہار خیال اور آزادی اظہار کا راستہ فراہم کیا اور ہر فرد کو اپنی بات کہنے اور اپنا مؤقف سمجھانے کا موقع فراہم کیا لیکن انھوں نے اختلاف کو مخالفت اور مکالمے کو مجادلہ بنانے کی ہرگز کوشش بھی نہیں کی اور اجازت بھی نہیں دی اور خود بھی یہ کوشش کی کہ اختلافی مباحث کے حوالے سے معتدل رویہ اپنائیں کیونکہ اگر وہ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں مناظرانہ رنگ داخل کرتے یا مبلغانہ رویہ اختیار کرتے تو ان کے اداریے نرے وعظ ونصیحت کے دفتر بن کر رہ جاتے اور نعت جیسی صنف کے لیے اس کی گنجائش نکالنا ان کے لیے ہی نہیں کسی کے لیے بھی نہایت آسان اور آزمودہ فارمولہ ہوسکتا تھا لیکن انھوں نے شعوری طور پر اس طرزِ عمل سے گریز کیا۔ان کا مقصد مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے قارئین کی ہمدردی،توجہ،ستائش یا وقتی مفادات کا حصول نہ تھا بلکہ ان کا مقصد نعت کا ادبی فروغ اور ادبی جہت کو سامنے لانا تھا۔ان کے خیال میں نعت کو جذباتی اظہار اور

مسلکی حدود و قیود میں مقیّد تو بہت سوں نے کیا ہے لیکن اب وقت نعت کو فقط مذہبی رنگ میں پیش کرنے کا نہیں، ادبی جہت کو سامنے لانے کا ہے۔ یہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور نعت کا تقاضا بھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ متذکرہ انداز اور رویوں کے باعث صنفِ نعت ادب کے مرکزی دھارے سے کٹی بھی رہی اور تنہائی کا شکار بھی ہوئی۔

چونکہ نعت متشدد مذہبی حلقوں کے ہتھے چڑھ کر مذہبی اور مسلکی پراپیگنڈے کی صورت اختیار کر گئی تھی اور فقط نصیحتوں، فضیلتوں اور طنز و تشنیع کا دفتر بن کر رہ گئی تھی اس لیے نعت ہی نہیں دیگر مذہبی اصناف بھی بعض کھلے ذہن کے ادیبوں کے لیے بے زاری کا باعث بن گئی تھیں۔ صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کا احمد رضا خان نمبر نکالا تو اس کے لیے شعوری کوشش کی کہ وہ مذہبی رنگ اختیار نہ کرنے پائے بلکہ احمد رضا خان کی وہ ادبی جہت جو ان کے ارادت مندوں کی عقیدت اور محبّت کے بوجھ تلے کہیں دب کر رہ گئی تھی اسے عقیدتوں کے انبار سے نجات دلا کر خالص ادبی کسوٹی پر پرکھا جائے اور ان کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھنے اور ان کے شعری عمل کو ادبی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس حوالے سے ذیل میں 'نعت رنگ' کے اٹھارویں شمارے کے اداریے سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ ان اقتباسات کے پیشِ نظر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدیر نعت رنگ کو نعت کے تحفّظ، بقا اور فروغ میں کیا کیا کاوشیں کرنا پڑی ہوں گی۔

''۔۔۔پھر ان مضامین کے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مولانا احمد رضا خاںؒ کے ایسے حلقۂ ارادت منداں سے تعلّق رکھتی ہے جو مولانا کی نعت گوئی پر صرف اور صرف مولانا سے عقیدت اور محبّت کے اظہار کی خاطر کچھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب زبان اور زبان سے جڑے مسائل ان کا مسئلہ اور موضوع نہیں۔'' (اداریہ نمبر ۱۸)

''نتیجتاً ایسی تحریروں کی تعداد زیادہ ہے جو اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کی تحسین کے نام پر جمع کر دی گئی ہیں اس انبار میں مولانا کی نعتیہ شاعری پر لکھے گئے ایسے سنجیدہ، علمی اور تنقیدی مقالے بھی ہیں جو عصری ادبی میلانات کی روشنی میں لکھے گئے تھے اور جنھیں نمایاں کرنا ضروری تھا، مگر وہ کہیں دب کر رہ گئے۔ ان کی وہ توقیر نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔'' (اداریہ نمبر ۱۸)

''یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم نے مولانا کی نعتیہ شاعری کو ادبی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور بحیثیتِ شاعر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ خود کی، نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ (اداریہ نمبر ۱۸) مولانا کی نعتیہ شاعری اور ان کا شعری عمل خالص ادبی

نقطۂ نظر سے ہونے والی گفتگو کا وسیع خیال افزا اور خیال افروز ماحول چاہتے ہیں۔ مگر ہم مولانا کی نعتیہ شاعری کو ان کے دیگر اہم اور وقیع کاموں کے ساتھ ملا کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں وہ بحیثیتِ شاعر محدود تر حوالے سے موضوعِ گفتگو بنتے ہیں اور بحیثیت ایک معروف عالمِ دین اور مذہبی و مسلکی رہنما کی حیثیت سے زیادہ توجہ حاصل کرتے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۱۸) اس صورتِ حال میں ادب کے نقاد یا قاری ان کے کلام پر رائے دینے میں محتاط رویوں کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔''

''مولانا پر لکھے گئے بیش تر اہلِ علم کے مضامین پر ایک نظر ڈالیے آپ کو مولانا کی مذہبی خدمات، علمی حیثیت اور عشقِ رسول ﷺ کے تذکرے تو خوب ملیں گے مگر شعری محاسن پر چند جملوں اور چند سطروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ ایسا صرف اور صرف اس لیے ہے کہ ہم اب تک مولانا کو خود بحیثیتِ شاعر موضوعِ گفتگو نہیں بننے دے رہے کہ کوئی لسانی یا ادبی اختلاف سامنے نہ آجائے اور اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو ہم نے اسے مولانا کی شخصیت یا علمی مرتبہ پر حملہ تصور کرتے ہوئے اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارا یہی رویہ مولانا کی شعری عظمت کے وسیع تر اعتراف میں حائل رہا ہے، (اداریہ نمبر ۱۸) مولانا کی زندگی میں بھی اور آج بھی اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ ایک عظیم نعت گو شاعر ہماری سنجیدہ اور مرکزی ادبی تاریخ کا حصہ نہ بن سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان کا یوں تذکرہ ہی نہیں چاہتے؟ اس طرح تو ہم خود اُردو کے نعتیہ اور اسلامی ادب میں مولانا کے مقام اور کام کا شمار نہ ہونے کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔ کیا سعدیؒ، رومیؒ اور جامیؒ کی منظومات پر کسی ادبی و لسانی تنقید نے ان کی شخصی عظمت اور علمی مرتبت کی ضیا کم کی ہے؟ ہمیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی ہوگی، اس فضا کو بدلنا ہوگا۔ ہماری یہ جذباتیت کلامِ رضا کی تفہیم کے راستے بند کر رہی ہے۔'' (اداریہ نمبر ۱۸)

'نعت رنگ' کا مطالعہ کر لیجیے۔ آپ کو ہر شمارے میں نئے لکھنے والے دستیاب ہوں گے اور نئے نئے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالات و مضامین بھی سامنے آئیں گے اور ایسی تحریریں بھی جگہ پا جاتی ہیں جو مدیر کے ادبی مؤقف، خیال، نظریے یا مزاج سے قطعاً موافقت نہیں رکھتیں۔ یہی نہیں بلکہ اس رسالے میں ایسے خطوط بھی شائع کر دیے جاتے ہیں جن کا موڈ (رنگ، مزاج) تنقیصی اور مخالفانہ ہوتا ہے۔ رسالے میں موجود متنوع موضوعات، رجحانات اور خیالات کی موجودگی کا مقصد اس فضا کو تخلیق کرنا ہے جو نعت کی فکری اور تنقیدی سطح کو بلند کرنے میں معاون و

مددگار ہو سکے۔'نعت رنگ' کے اکتیس شماروں کا بالاستعیاب مطالعہ کیجیے، پہلے شمارے سے اکتیسویں شمارے تک تقریباً ہر شمارے میں نئے لکھنے والے بھی نظر آئیں گے اور نئے موضوعات بھی اور اس کہکشاں میں اب ایسے ستارے بھی موجود ہیں جو نعت پر لکھنا تو در کنار سوچنا بھی کارِ فضول اور وقت کا ضیاع سمجھتے رہے تھے اور کچھ ایسے لکھاری بھی اس محفل میں نظر آتے ہیں جو نعت کو ادبی صنف تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں تھے۔

'نعت رنگ' کے تمام اداریوں کا مطالعہ کر لیجیے۔تمام اداریوں میں زیریں سطح پر نعت کی ادبی و فکری سمت کے تعین اور روایات کے فروغ کی لہر سرایت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اور وہ ہے۔'نعت رنگ' کے تمام اداریے اسی موضوع کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ کسی ادبی صورتِ حال پر لکھتے ہیں یا کسی ادیب یا شاعر کا انٹرویو کرتے ہیں، کسی شاعر یا ادیب کا گوشہ قائم کرتے ہیں، نعتوں کے تراجم کرواتے ہیں، مراسلات میں علمی مسائل و مباحث کو جگہ دیتے ہیں یا اداریہ تحریر کرتے ہیں، ان کا مقصد و مدعا فقط نعت شناسی کا فروغ رہتا ہے۔

آخر میں یہ سوال ہم سب کے ذہنوں میں جنم لے سکتا ہے کہ 'نعت رنگ' کے اجرا کا مقصد شہرت کا حصول تھا یا معاشی مفاد کا پیش خیمہ یا کچھ اور۔ یہ ذہن نشین رہے کہ صبیح رحمانی کا ایک معروف حوالہ نعت خواں کا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک ادیب وہ شہرت حاصل نہیں کر سکتا جو کسی گلوکار ،فن کار یا نعت خواں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کہ ادبی رسالے کا اجرا تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جو ادب کے زور پر معاشی خوش حالی کا باعث بن سکا ہو یا کوئی ادبی رسالہ کسی مدیر کی معاشی خوش حالی کا باعث بنا ہو۔'نعت رنگ' تو فقط موضوعی رسالہ ہے اور وہ بھی نعت کی ایسی جہت کا نمائندہ جسے عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جاتا۔اس سے مالی مفاد کا حصول قرین قیاس نہیں لگتا۔ ہمارا عوامی مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہ نعت خواں پر تو نوٹوں کی بارش برسا سکتا ہے لیکن نعتیہ رسالے کی مالی مدد کے لیے آمادہ نہیں ہو پاتا۔صبیح رحمانی نے اپنے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ لوگ نعتیہ محافل اور میلاد کی مجالس کے انعقاد پر لاکھوں خرچ کرتے ہیں لیکن کسی نعت کی کتاب کو خریدنے پر بخل سے کام لیتے ہیں۔ان کی یہ تجویز دل کے کانوں سے سننے کے لائق ہے کہ وہ لوگ جو محافل پر لاکھوں خرچ کرتے ہیں لیکن اگر وہ نعت کی کتابوں کو انعامات کی صورت میں تقسیم کرنے پر تیار ہوں تو نعت کے علمی فروغ اور نعت کے حوالے سے علمی بیداری جنم

لے گی اور نعت پر کام کرنے والوں کو حوصلہ افزائی بھی ملے گی۔ اس صورتِ حال میں لے دے کے نعت کا اصل مقصود عشقِ رسول ہی رہ جاتا ہے۔ اسی عشق کی بنا پر حاصل ہونے والا اضطراب ان کے اداریوں میں نظر آتا ہے۔ اسی اضطراب نے انھیں فروغ نعت کی شمع جلانے پر مجبور رکھا ہے۔ یعنی اس رسالے کا کوئی خارجی مقصد نہیں بلکہ داخلی ہے اور یہی مقصد یا محرک انھیں فروغ نعت کی کوششوں پر اُکسائے رکھتا ہے۔ مشفق خواجہ نے درست کہا تھا کہ نعت صبیح رحمانی کے لیے حرف دعا بن گئی ہے۔ درج ذیل پیراگراف اسی دعا کا اثر ہے۔

''یہ بات خاصی خوش آئند ہے کہ نعت کے ادبی فروغ کے لیے ''نعت رنگ'' کی بیس سالہ جدوجہد کے نتیجے میں نعت کی ادبی مقبولیت کا اب ایک ایسا ماحول بن گیا ہے کہ معاصر ادبی منظر نامے پر نعت کے تخلیقی وفور کی ایک تازہ لہر نظر آتی ہے جس میں اردو کے نامور شعرا کے دوش بدوش نو آموز شعرا بھی نعت گوئی کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ نعت رنگ میں تنقیدی مباحثوں اور مکالموں کے روشن ہونے سے آداب نعت گوئی کے باب میں شعرا کا احساس ذمہ داری بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نعت کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے میں جو اندیشے مانع تھے وہ دور ہوئے ہیں اور علمی، لسانی، عروضی اور تنقیدی زاویوں سے بے لاگ گفتگو کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی ہے جس ادبی سطح پر نعت کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے نعت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرنے والے حلقوں میں بھی اس کو بطورِ صنفِ سخن دیکھنے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس عمل میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ادبی ادارے اب خاصے فعال نظر آ رہے ہیں۔ بقول مجازؔ کچھ اس طرح کا منظر نامہ بن رہا ہے:

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، ادھر دیکھا تو ہے

(اداریہ نمبر ۲۵)

ب۔ صبیح رحمانی کا تنقیدی شعور

صبیح رحمانی کے تنقیدی شعور کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریر، تقریر، مزاج، سوچ، فکر اور طرزِ عمل بلکہ ان کی زندگی کا ہر پہلو نعت کی تنقید و تفسیر سے عبارت ہے لہٰذا صبیح رحمانی کے تنقیدی رویوں کا احاطہ کسی ایک جہت یا پہلو سے کیا جانا مناسب نہیں کہ اس طرح ان کے تنقیدی رویوں کی صرف ایک جہت کی نقاب کشائی ہی ہو پائے گی چونکہ ان کے تنقیدی رویوں کی متنوع جہتیں ر پرتیں ہیں جو تمام ہی اہمیت کی حامل ہیں اور تفصیلی مطالعے کی متقاضی بھی اس لیے ان کے تنقیدی شعور اور وژن کا کلی احاطہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ان کی تحریر و تقریر اور عمل اور طرزِ عمل کا مجموعی انداز میں جائزہ لیں۔ ان کے فکر و عمل میں موجود تنقیدی شعور کی ضو ان کی گفتگو، ادارت، انتظام، شاعری اور ثنا خوانی سے مترشح ہوتی ہے لیکن ان کی تحریروں میں تنقیدی شعور کا یہ عنصر بڑے واضح انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے تنقیدِ نعت کی کوئی منضبط اور باقاعدہ کتاب تو تحریر کی نہیں البتہ نعتیہ ادب پر شائع ہونے والی مختلف کتابوں میں شامل مقدمات،، پیش لفظ، دیباچے، تبصرے اور فلیپ ان کے تنقیدی شعور کا سراغ لگانے اور ان کا تنقیدی مقام متعیّن کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں[۱] بالخصوص 'نعت رنگ' کے اداریے تو باقاعدہ تنقیدی مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریروں کے اس غیر مربوط سرمائے کو مربوط انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم اپنے موضوع کو مزید سمیٹتے ہوئے صرف 'نعت رنگ' کے اداریوں تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔

'نعت رنگ' کے اداریے محض اداریے ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے نعت پر تنقیدی مضامین اور کہیں کہیں مقالہ جات کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ نہ صرف نعت

کے متنوع پہلوؤں اور جہتوں کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ مسائل و مباحثِ نعت سے متعلّق اہم سوالات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ صبیح رحمانی کا نظریہء نعت کیا ہے؟ وہ اسے اصناف شعر میں کیا درجہ دیتے ہیں؟ ان کے نزدیک نعت ہماری معاشرتی زندگی میں کیا تبدیلی لاسکتی ہے؟ موجودہ سیاسی ،سماجی اور تہذیبی صورتِ حال میں نعت ہماری رہنمائی کے لیے کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟ معاصر فکری انتشار میں نعت کس طرح سودمند ہوسکتی ہے؟ ماضی میں نعت کی ادبی صورت کیا تھی؟ حال میں کیا ہے؟ اور مستقبل میں اسے کس مقام پر ہونا چاہیے؟ نعت پر نقد ونظر کی ابتدائی صورتیں کیا رہی ہیں؟ تنقیدِ نعت کا آغاز کب ہوااور یہ ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کرچکی ہے؟ اور مستقبل میں نعتیہ ادب پر انتقادی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کریں گی؟ یہ سب وہ سوالات ہیں جو صبیح رحمانی کی تحریروں میں بالعموم اور اداریوں میں بالخصوص اٹھائے گئے ہیں۔ ان سوالات سے بھی صبیح رحمانی کے تنقیدی مزاج اور شعور کو تلاشنے، پرکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کا نقطۂ نظر، وژن، مؤقف اور آدرش بھی سامنے آتا ہے۔

صبیح رحمانی کا تنقیدی سفر تین دہائیوں سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔[۲] یہ سفر ’نعت رنگ‘ کی صبر آزما اور کٹھن صعوبتوں کی داستان بھی ہے اور تنقیدِ نعت کی رفتار و اطوار کا شاہد بھی اور مدیر کے ارتقاء پذیر ذہنی سفر کا حوالہ بھی۔ صبیح رحمانی نے جس زمانے میں تنقیدِ نعت کی جانب اہلِ علم کو متوجہ کیا۔ اس وقت ناقدین کی اکثریت تنقیدِ نعت کے موضوع کو شجرِ ممنوعہ سمجھ رہی تھی۔ ان کے خیال میں نعت شعرِ عقیدت سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی لہٰذا اس پر تنقیدی عمل غیر ضروری، غیر مفید اور غیر ادبی سرگرمی ہے۔[۳] مزید یہ کہ ان کے عہد تک تنقیدِ نعت کے حوالے سے جو کچھ لکھا جاچکا ہے اسے اردو کی ادبی تنقید سے ہم آہنگ کرنا ممکن نہیں۔ اس وقت مغربی تنقید کا تو ذکر ہی فضول ہے، خود اردو کے بیشتر ناقدین ادبی تنقید کے طے شدہ فارمولوں اور دبستانوں کی سرحدیں عبور کر کے تنقید کی نئی دنیا میں قدم رکھ رہے تھے۔ دوسری طرف تنقیدِ نعت تھی جو عقیدتوں کے محوروں، دل جوئیوں کے موسموں، مبصّرانہ جائزوں اور محدود دائروں میں مقیّد اور محوِ سفر تھی۔ اس پر مذہبی تشدد عنصر مستزاد۔ ان حالات میں نعت کو تنقید کے عصری معیارات سے ہم آہنگ کرنا اور اسے ادبی تنقید سے قریب تر کرنا صبیح رحمانی کا کارنامہ تھا۔ صبیح رحمانی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تنقیدِ نعت کی تحریک کے سلسلے میں پہلا قدم کسی نے اٹھانا تو ہے پھر یہ کام وہ خود کیوں نہ کریں اور انتظار انتظار میں یہ وقت بھی ہاتھ سے جاتا رہا اور آنے والا وقت عصرِ حاضر سے نازک تر ہوا تو پھر مزید مشکل ہوجائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ خلوص کی قوت اور

عشق کا جذبہ جس بھی کام سے ہم آہنگ ہو جائے وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ باقی رہا عقیدتوں اور دل جوئیوں کے رویے، اس پر نظر ثانی کروائی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ناقدین نعت کی رہنمائی اور ذہن سازی کی ضرورت ہے۔ اگر نعت کے ناقدین بلا سوچے سمجھے نعت گو شعرا کو کریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کرنا بند کر دیں اور نعت کو تنقیدی معیارات پر پرکھنا شروع کر دیں تو تنقید نعت کو اردو تنقید سے ہم آہنگ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اردو نعت میں اتنی تخلیقی توانائی موجود ہے کہ اسے کسی بھی دوسری صنف کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

یہاں قارئین کے ذہن میں یہ سوال جنم لے سکتا ہے کہ اس دور تک (نوّے کی دہائی تک) تنقید نعت کے حوالے سے دو چار کام ہی سامنے آئے ہوں گے اور لکھنے والوں کا حلقہ بھی چند ناموں سے آگے نہ بڑھ پایا ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ اردو میں جدید نعت کی روایت کا آغاز حالی سے ہوا، جسے شبلی نے 'سیرۃ النبی' میں پروان چڑھایا۔ تحقیق و تنقید میں شبلی نے 'سیرۃ النبی' میں تنقید نعت (سیرت) کا ایک حیران کن اور قابل عمل نمونہ پیش کیا۔ اقبال نے نعت کو ایک نیا رخ دیا۔ ان کے بعد مولانا ابوالحسن ندوی، مجید امجد، ممتاز حسن، حسن عسکری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مرزا محمد منور، شمیم احمد، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، افسر صدیقی امروہوی، عابد علی عابد، حمایت علی شاعر، حفیظ تائب، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ادیب رائے پوری، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر خورشید رضوی، رشید وارثی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، جمال پانی پتی، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر آفتاب نقوی، ڈاکٹر سراج احمد قادری، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر افضال احمد انور، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، ڈاکٹر شمیم احمد گوہر، ڈاکٹر وحید اشرف کچھوچھوی، پروفیسر محمد اقبال جاوید، پروفیسر محمد اکرم رضا، نظیر لدھیانوی، نعیم صدیقی اور راجہ رشید محمود وغیرہ کی تحریروں میں کہیں جستہ جستہ اور کہیں گہرے رنگ میں تحقیق و تنقید کے نقوش اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے نعت کو تنقیدی انداز میں دیکھنے اور پرکھنے کی شعوری کوشش تو ضرور کی لیکن یہ تمام رویے، رنگ اور قرینے اپنی نوعیت میں انفرادی ہی رہے، باقاعدہ ایک رجحان یا تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ صبیح رحمانی نے اس رجحان کو تحرک دیا اور اسے ایک تحریک میں منقلب کرنے کی کوشش کی گویا تنقید نعت ایک ٹھہرا ہوا، ساکن تالاب تھا جس میں کبھی کبھی تحرک کی لہریں نمودار ہوتی رہتی تھیں، صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کے ذریعے اس میں تحرک کا مستقل سامان فراہم کر دیا۔

ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ہر شخص کی اپنی ذہنی دنیا ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ خارجی ماحول اپنے اثرات بالواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی ہر شخص پر مرتب ضرور کرتا ہے البتہ کوئی اس کے گہرے اثرات قبول کرتا ہے اور کوئی کم گہرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے ادیبوں کا خارجی رویہ دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متضاد بھی ہوتا ہے۔ میر، سودا اور درد کے شعری رویے اس کی بہترین مثال ہیں۔ معاشرتی صورتِ حال، زمانی تغیّرات اور عصری ماحول یکساں ہونے کے باوجود تینوں شعرا کا شعری رویہ ایک دوسرے سے مختلف ہی رہا۔ یہی صورت تنقید نعت کی بھی رہی۔ صبیح رحمانی کی تنقیدی فکر کو اسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس ماحول میں صبیح رحمانی نعت پر تنقید کی ضرورت کا احساس دلا رہے تھے، اس زمانے کی علمی اور فکری دانش تنقید نعت کے حوالے سے معکوس رویہ ظاہر کر رہی تھی۔ صبیح رحمانی تنقید نعت کو ادبی شعور سے قریب کرنے کی بات کر رہے تھے اور معاصرین اس عمل کے نتیجے میں مناقشوں کے جنم لینے کے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انھوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے تنقید نعت سے متعلّق خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے تنقید نعت کو نامناسب طرزِ عمل اور مروّجہ تنقید سے بلند و بالا کہتے ہوئے معذرت کر لی۔[۴] یہی نہیں پی۔ٹی۔وی کے ایک ادبی پروگرام میں جس میں اردو کے معروف ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی، پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر آصف فرخی بھی شریک تھے، صبیح رحمانی نے تنقیدِ نعت کی اصطلاح استعمال کی تو پروڈیوسر کو پروگرام روکنا پڑا اور سراسیمگی کے عالم میں کہنا پڑا چونکہ یہ پروگرام نعت سے متعلّق ہے اس لیے اس پروگرام میں تنقید کے لفظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔[۵] یہ تھا عقیدت کا وہ منظر نامہ جس میں صبیح رحمانی نے تنقید نعت کا باقاعدہ آغاز کیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو تنقید میں اس رویے نے جنم لیا ہی کیوں؟ اور اس کے اسباب کیا تھے؟ ثانی الذکر سوال کا جواب تو سماجی، نفسیاتی اور مذہبی محرکات کا سراغ لگانے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے لیکن اول الذکر رویے کا سبب غالبًا ہمارا مذہبی و مسلکی رویہ بنا۔ ہم مذہب کے معاملے میں معروضی رویہ رکھنے کے عادی ہیں ہی نہیں اور نعت چونکہ مذہب سے جڑی ہوئی صنف رہی ہے اس لیے اسے بھی مذہب ہی کا ایک حصہ/جز و سمجھتے ہوئے تنقید سے بالاتر درجے میں رکھ دیا گیا اور نعت کو شعرِ عقیدت قرار دے کر تنقید کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے۔ غالبًا یہی وجہ نعت کی بطور ادبی صنف ترقی، شناخت اور فروغ میں حائل رہی۔ چونکہ نعت سے جڑے مذہبی حوالوں اور

شخصیات نے اسے حساس نوعیت کا حامل بنا دیا تھا، اس لیے اردو تنقید اس طرف آنے سے کتراتی اور راستہ بدلنے میں ہی اپنے لیے خیر کے پہلو تلاش کرتی رہی اور اگر کبھی بہ امر مجبوری اس طرف رُخ کرنا بھی پڑا تو سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے جان چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی گئی۔ موضوعیت، تقریظ و تحسین کا انداز تو ہو سکتا ہے تنقید کا نہیں۔ تنقید کا معاملہ تو معروضیت سے جڑا ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ تنقید نعت کے ابتدائی دور میں یہ رویہ سامنے نہ آ سکا۔[۶]

نوّے کی دہائی سے قبل تنقید نعت کا رجحان قابلِ رشک نہیں رہا۔ اس عہد تک تنقید نعت کے حوالے سے دل جمعی سے لکھنے لکھانے کا رجحان خال خال ہی رہا۔ باقی رہا تحقیق و تنقید کا معاملہ تو اس میں اجتماعی عنصر مفقود رہا۔ اس عہد کے رسائل و جرائد کا مطالعہ کیجیے۔ ان میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر مضامین کی نوعیت بالعموم فرمائشی، تعارفی یا تقریظی ہی ملتی ہے۔ اس لیے اس عہد کے مضامین سے کسی گہرے اور قابلِ قدر تنقیدی مطالعے کا مطالبہ بے سود ہے البتہ مضامین و مقالات میں کہیں کہیں تنقیدی اشاروں کی ایسی دبی دبی چنگاریاں بھی نظر سے گزر جاتی ہیں جو قارئین کو چونکانے کا سبب بھی بنتی ہیں اور نعت کے لیے ایسی ٹھوس بنیادیں بھی فراہم کرتی ہیں جن پر تنقید نعت کا قصرِ عالی تعمیر کیا جا سکتا تھا لیکن اس طرف اردو کے ادبی حلقوں نے سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ اس سلسلے میں حسن عسکری کا تنقیدی بیانیہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔[۷]

تنقید نعت کی متذکرہ بالا مجموعی صورتِ حال میں 'نعت رنگ' کا اجرا ہوا۔[۸] صبیح رحمانی نے اس صورتِ حال میں نعت سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو اس رسالے میں اکٹھا کیا۔ ان کی ذہن سازی اور سمت نمائی کرتے ہوئے تنقیدِ نعت کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ نعت کے موضوعاتی اور فنی مسائل کی طرف اہلِ قلم کو بطورِ خاص متوجہ کیا اور تنقید نعت کی دعوتِ فکر دی۔ تنقید نعت کے حوالے سے پیدا شدہ خوف دور کیا، نئے مکالمے اور مباحثے کو رواج دیا۔ اس فن پر دلچسپی کا سامان فراہم کیا اور ناقدین کی ذہن سازی کرتے ہوئے یہ سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کی کہ نعت بھی ادب کا ایک بڑا اور اہم موضوع ہے جسے محض مذہبی یا اعتقادی صنف کا لبادہ اڑھا کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب اس غلطی کا مداوا کیا جائے اور نعت اور تنقید نعت کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ ترک کرتے ہوئے خالص ادبی معیارات پر اس اہم ادبی سرمائے کو پرکھا جائے۔

ناقدین کی ذہن سازی کے بعد دوسرا بڑا کام ناسازگار حالات کو سازگار بنانے کا تھا تاکہ

سازگار ماحول میں آسانی اور آزادی کے ساتھ نعت کی درست سمت میں ترویج و اشاعت ممکن ہو سکے اور تنقیدِ نعت کا عمل روایت اور جدید تنقیدی فکر و عمل کی روشنی میں فروغ پا سکے۔ اس کے لیے انھوں نے 'نعت رنگ' کا پلیٹ فارم استعمال کیا۔ ناقدین کو لکھنے کی دعوت دی۔ نئے نئے موضوعات، گوشوں اور پہلوؤں پر مضامین لکھوائے۔ نعتیہ ادب کے حوالے سے اختلافی آراء اور حساس نوعیت کے حامل نزاعی مضامین بھی اس مجلّے میں شائع کیے تاکہ ناقدین کے مابین مکالمے کی فضا جنم لے سکے۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ نعت سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے ناقدین کی تحریریں سامنے آئیں۔ اختلافی مضامین سامنے آنے لگے جن کا جواب رد کی صورت میں سامنے آیا اور پھر جواب الجواب کا مرحلہ آیا۔ یہ مرحلہ مضامین و مقالات کی صورت میں بھی سامنے آ رہا تھا اور مراسلات کی صورت میں بھی۔[9] اس طرح مختلف الخیال دانشوروں اور مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ناقدین کے درمیان مکالمے کی راہ ہموار کی گئی تاکہ تنقیدِ نعت کا سفر نئے نتائج اور حاصلات کی روشنی میں ارتقائی منزل کی طرف رواں دواں ہو۔

اس ساری صورتِ حال میں مدیر نعت رنگ نے اپنی آنکھیں اور ذہن دونوں کھلے رکھے مبادا فکری اختلاف، ذاتی اختلاف میں مبدل ہو جائے اور مکالمہ، مجادلے یا مناظرے کی صورت اختیار کر جائے۔[۱۰] اس طرح نعت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مقالات سامنے آئے، مختلف موضوعات پر منضبط کتابیں تحریر میں آئیں، سندی اور غیر سندی مقالات لکھے گئے۔ کتابیں مرتب ہوئیں۔ تنقیدِ نعت کی وہ صورتِ حال جو نوّے کی دہائی سے قبل بالعموم تعارفی اور عقیدتی نوعیت کی حامل تھی اب وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ تنقیدی رنگ ڈھنگ میں ڈھلتی جا رہی تھی جو اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اب تنقیدِ نعت جذباتی فضا سے نکل کر ذہنی، منطقی اور تجزیاتی دائرے میں قدم رکھ چکی ہے۔ اس صورتِ حال نے تنقیدِ نعت کو نئے ذہن، نئی سوچ اور نئی فکر کا حامل نیا شعور دیا۔ یہ شعور کوئی دو چار روز کا پیدا کردہ نہیں تھا، اس کی پشت پر تین دہائیوں سے زائد عرصے کی محنت کام کر رہی تھی۔ صبیح رحمانی کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے تنقیدِ نعت ہی نہیں اردو تنقید کی روایت اور تاریخ میں بھی یاد رکھا جائے گا۔

صبیح رحمانی تخلیقِ نعت اور تنقیدِ نعت کے ادبی فروغ کے لیے جو سازگار ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کی مسلسل محنت اور کاوشوں کے نتیجے میں وہ سازگار ماحول پیدا ہوا بھی جس کا ثبوت 'نعت رنگ' کے تیس شماروں کی اشاعت اور ان میں شامل سینکڑوں مضامین و مقالات، نعت ریسرچ

سنٹر سے ایک سو سے زائد کتب کی اشاعت اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر نعتیہ رسائل و جرائد کا اجرا اور کثیر کتب کی اشاعت اور اب اردو ادب پر منعقد ہونے والی ملکی و بین الاقوامی کانفرنسوں میں نعت پر منعقدہ گفتگو کے پروگراموں کا تسلسل بھی صبیح رحمانی کی تشکیل کردہ ساز گار فضا کا ثمر ہی تو ہے جس کی آبیاری میں تین دہائیوں سے زائد عرصہ کی طویل محنت، مشقّت اور مجاہدہ کام کر رہا تھا اور یہ سب کچھ ان کی مدیرانہ صلاحیت اور تنقیدی شعور کی طویل منصوبہ بندی کی بدولت ہی وجود میں آیا۔

تنقیدِ نعت کی قبولیت کی فضا قائم کرنے کے بعد صبیح رحمانی کا اگلا پڑاؤ تنقیدِ نعت کے سلسلے میں فکری رہنمائی اور سمت نمائی کا آیا۔ ان کے تنقیدی افکار کی روشنی معاصر نعت گوشعرا کے نعتیہ مجموعوں پر ان کے دیباچوں یا فلیپ سے چھن چھن کر آ رہی تھی یا ان کتابوں سے جو انھوں نے اردو شاعری کی بڑی آوازوں (محسن کاکوروی، غالب، اقبال اور احمد رضا خان،) یا ان کی دیگر مرتبہ کتابوں کے مقدموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں ان کی تنقید کی نظری صورتوں کے علاوہ عملی کاوشیں بھی سامنے آتی ہیں لیکن تنقیدِ نعت کے قارئین بہتر جانتے ہیں کہ ایسی تحریروں میں تنقید کی وہ منضبط صورت سامنے نہیں آتی جو کسی تنقیدی کتاب یا بطور خاص تحریر کیے گئے تنقیدی مضامین میں دیکھنے میں آتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ تنقیدِ نعت کی یہ مربوط صورتیں بالخصوص ان کی ان تحریروں میں سامنے آتی ہیں جو 'نعت رنگ' میں اداریوں کی صورت میں لکھی گئیں۔ متذکرہ کتابوں میں تو ان کی تنقیدی فکر جھلک یا جھلکیاں دکھا کر غائب ہو جاتی ہے لیکن اداریوں میں ان کے تنقیدی خیالات کی وہ مسلسل رو موجود ہے جو ان کے تنقیدی افکار پر روشنی ڈالتی ہے، ان کے تحریکی مقاصد کی نشان دہی کرتی ہے اور نشانِ منزل کا پتہ بھی دیتی ہے۔ غرض یہ کہ ان کی تنقید کے تار و پود یا تنقیدی نظام کا ڈھانچہ بھی انھی اداریوں سے سامنے آتا ہے۔ ذیل میں ان کی تنقید کے اسی پہلو رگوشے پر توجہ کا ارتکاز رہے گا۔

صبیح کے تنقیدی خیالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ مقالہ صبیح رحمانی کی تنقیدی فکر کو کسی نئے دبستانِ تنقید سے منسوب کرنے کی کوشش نہیں اور نہ ہی ان کی تنقیدی تحریروں میں کسی ایسے تنقیدی نظام کو تلاشنے کی ضرورت ہے جس کی بنا پر ان کی تنقید کو کسی نئے تنقیدی ڈھانچے کی صورت میں پیش کیا جائے اور یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ایک نظام خیال یا دبستانِ تنقید (سے متاثر یا معتقد) کے مجہول نمائندہ بن کر بھی سامنے نہیں آتے بلکہ ان کے

ہاں اخذ وقبول اور رد وتر دید کا اپنا زاویۂ نظر یا نقطۂ نظر ہے جس کے سوتے ان کی بالیدہ فکر، مشرقی تہذیب اور مذہب کے زندہ عناصر سے پھوٹتے ہیں۔ مشرق یا مغرب کی کوئی فکر جو ان کے اس نظام سے مطابقت رکھتی ہے وہ اسے بآسانی قبول کر کے اپنے نظام تنقید کا حصہ بنا لیتے ہیں اور جو فکر اس سے مطابقت نہیں رکھتی اسے رد کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔

صبیح رحمانی کی تنقیدی فکر جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں غیر جانبداری، سنجیدگی، متانت، احتیاط، توازن، لچک دار اور ہمدردانہ رویہ، روشن خیالی، روایت سے وابستگی، تہذیبی اقدار سے آگہی، استدلال، علمی اور تہذیبی رویہ، انسان دوستی اور جمالیاتی بصیرت بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ انھی بنیادوں پر ان کی تنقید کا ایوان ایستادہ ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں صبیح کی تنقید ی اساس پر روشنی پڑتی ہے۔

''ادبی تنقید اور خصوصاً نقدِ نعت میں یہ بات بھی لازماً یاد رکھنی چاہیے کہ یہ فکر و نظر کو روشن کرتی ہے اور ذہنوں کو کھولتی ہے۔ اس لیے اس میں لہجے اور اندازِ بیاں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چوں کہ فکر و فہم کے راستے وا کرتی ہے، اس لیے ہمیشہ دلیل کے ساتھ آتی ہے۔ تنقید کو فتوے کا انداز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ فتووں کا طریقہ اور زبان دونوں الگ ہوتے ہیں اور ادبی تنقید کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تنقید کا مقصد بہتر تفہیم اور نئے زاویے کی تلاش ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ علمی انداز اور تہذیبی رویہ اختیار کرے۔ اس میں سنجیدگی، ذمہ داری اور متانت سے اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ مہذب انداز میں، دوستانہ طریقے سے اور ہم دردانہ مزاج سے اپنی رائے اور خیال کو اجاگر کیا گیا ہو۔ تنقیدِ نعت کے لیے تو یہ سب لازمے تقاضے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف استرداد کا رویہ اختیار کرتا ہے اور شدت پسندی کے ساتھ رائے دیتا ہے اور عمومی انداز میں بیانات جاری کرتا ہے تو چاہے وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، ادب و نقد میں اس کی بات کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ اگر ادبی تقاضے پورے نہ ہوں تو کوئی خیال، کوئی رائے، کوئی نظریہ، کوئی تصور اور کوئی فکر ادب و نقد میں جگہ ہی نہیں پا سکتی۔''[۱۱]

متذکرہ بالا پیراگراف میں صبیح نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی تنقیدی فکر کے وہ عناصر سامنے آتے ہیں جنھیں وہ تنقید میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ ہی نہیں کئی مقامات پر انھوں نے تنقید کے اصولوں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ ان تمام خیالات

سے ان کی تنقید کا محتاط، معتدل اور لچک دار رویہ سامنے آتا ہے۔

صبیح رحمانی ادب کی سماجی اہمیت اور کردار سے نا آشنا نہیں۔ ان کے نزدیک ادب زندگی کو اور زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے۔ ادب کا ایک رویہ مقامی ہوتا ہے اور دوسرا آفاقی۔ ادیب کو اپنے مقامی رویے کو اس آفاقی رویے سے جوڑنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے جہاں وہ ایک اکائی میں ڈھل رہی ہو۔ تنقید لکھتے ہوئے صبیح خود بھی اسی رویے کو تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایک مسلمان خاتون کی انگریزی نعت پیش کرتے ہیں تو زندگی کی دھڑکنوں کو سنتے ہیں۔ یہی صحت مند رویہ ہے۔[۱۲]

وہ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں تکرار کے ساتھ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ نعت کو بھی اور تنقید نعت کو بھی اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانا ہوں گی۔ آج کا معاشرہ ماضی کا سادہ معاشرہ نہیں رہا۔ آج کے مسائل ماضی کے مسائل سے مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ صنعتی ترقی، سائنسی ارتقاء، ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا نے کائنات کو سمیٹ کر ایک گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔ دہشت گردی، انتہا پسندی، وجودی تنہائی، باطنی بے چینی، نا آسودگی، فکری انتشار، معاشرتی انتشار، سماجی ٹھوٹ پھوٹ ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں نعت کو اپنا فریضہ ادا کرنا ہوگا۔ نعت نگاروں کو ماضی میں جینے کی بجائے حال سے آنکھیں چار کرنا ہوں گی۔ اپنے گردوپیش پر نظر رکھنا ہوگی اور متذکرہ صورتِ حال کو نعت کا حصہ بنانا ہوگا چنانچہ تخلیقی وفور دو سطحوں پر اظہار پائے گا۔ ایک طرف نعتِ رسولِ اکرم ﷺ سے محبّت کا اظہار ہوگا تو دوسری طرف عصری صورتِ حال کا عکاس بھی۔ نعت کا یہی وہ فریضہ ہے جس کا نقطۂ آغاز مسدس حالی سے ہوتا ہے اور پھر اقبال سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچتا ہے۔ باقی رہا معاملہ تنقید کا تو تنقید نعت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ نعت کے اس عالمگیر پیغام، پہلو یا جہت کو سامنے لائے۔ اس کی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔

صبیح رحمانی نعت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس میں زندہ عناصر کی تلاش پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ وہ زندہ عناصر جن سے نعت دورِ حاضر کی زندگی سے جڑتی ہوئی محسوس ہو۔ دورِ حاضر کی زندگی جن مسائل کا شکار ہے۔ انھیں تخلیقی کرب کے ساتھ نعت کا حصہ بننا چاہیے۔ اسی طرح نعت کی تخلیقی دنیا کو معاصر دنیا سے مضبوط رابطہ استوار کرنا چاہیے۔ اسی صورت میں نعت عہد حاضر کی زندگی کا معتبر اور زندہ حوالہ بن سکتی ہے۔ جدید نعت نگاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ اسی جہت کو تلاشنا اور روشناس

کروانا ضروری سمجھتے ہیں۔

'نعت رنگ' کی مقبولیت کے باعث ہمیں ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور شمالی امریکہ میں رہنے والوں کی جو نعتیں موصول ہورہی ہیں ان میں ان کی زندگی میں مسائل کی نمود بہت نمایاں ہے جس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ ہم ان علاقوں میں لکھی جانے والی نعتوں کے نقوش آپ کے سامنے پیش کریں گے اور یوں نعت کے نئے موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ہم نے جو تراجم پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ یہ بات آپ پر واضح کرسکتا ہے۔ ہشام علی حافظ کی نعت میں دیار رحمتہ للعالمین کا تذکرہ جس طرح آیا ہے وہ ہمارے احاطۂ فن وخیال سے مختلف ہے اسی طرح اس شمارے میں ایک مسلمان خاتون کی انگریزی نعت آپ ملاحظہ کریں گے اور گواہی دیں گے کہ یہ دھڑکن ہماری مشترکہ دھڑکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انفرادی آہنگ بھی رکھتی ہے۔[۱۳]

انھوں نے تنقیدِ نعت کو ادب اور زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں ادب اور تنقید کی ترقی اور ارتقاء زندگی سے جڑنے میں ہی مضمر ہے۔ صبیح رحمانی کے نزدیک وہی ادب زندہ اور پائدار ہوتا ہے جس میں زندگی کی نمود ہو۔ غیر متحرک اور اپنے عصر سے کٹا ہوا ادب زندگی کی توانائیوں سے محروم رہتا ہے۔ ادب کو اپنے عصر کا شعور ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نعت کی تخلیق ہو یا تنقید زندگی گریز رویوں کی بجائے حیات افروز رویوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جب ان کی تنقیدی فکر ترقی پسند فکر سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

اس عہد کا نعتیہ ادب اتنا ہی زندہ اور متحرک ہے جتنا کہ دوسری اصناف ادب آج کا نعت گو مکمّل عصری آگہی رکھتا ہے اور کربِ ذات سے مسائل کائنات تک غور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سیرتِ اطہر کو اس بے چین اور سکون کی طالب دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے کہ یہی راستہ ہے جو نسلِ انسانی کی بقا اور فلاح کا راستہ ہے۔ مسائل کائنات سے نبرد آزما دنیا اسلام اور رسول کائنات ﷺ کی حقانیت سے متاثر ہوکر دامن مصطفیٰ ﷺ میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ادبی تناظر میں نعتیہ ادب کا مطالعہ اس صنفِ سخن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پورے ادب کے ساتھ انصاف کے مترادف ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نقاد، ہمارے اس گراں مایہ نعتیہ سرمائے کو انتقاد کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے معنوی اور فنی پہلوؤں کو دیکھیں اور اس میں ہیئت کے تجربوں اور تازہ کاری کے رجحان کو نظر میں رکھ کر اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین

کریں۔[۱۴]

وہ نعت سے معاشرے کی تعمیر کا بھی کام لینا چاہتے ہیں۔اسی طرح جس طرح اسوۂ نبی پاکﷺ سے انفرادی سطح پر بھی اور معاشرتی سطح پر رہنمائی لی جاسکتی ہے۔یہی رہنمائی نعت سے بھی لی جاسکتی ہے۔معاشرے میں باہمی یگانگت، بھائی چارہ،احترامِ آدمیت،انسان دوستی،امن،اور محبّت،نعت کے ذریعے فروغ پاسکتی ہے۔اور موجودہ صورتِ حال میں جب مغربی فکری یلغار اور رویوں نے اسلام کا حقیقی چہرہ مسخ کرنے کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے اور مسلمانوں کو دہشت گرد بنانے کا پروگرام بنا رکھا ہے،ہمیں نعت سے یہ کام لینا ہوگا۔

صبیح رحمانی نعت کو فقط مسرت کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ سماجی خدمت گزاری کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ان کے نزدیک نعت فقط مدحت رسول ہی نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر معاشرے کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بھی ہے۔یہی وہ مقصد ہے جس سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔

> ''نعت صرف ایک صنفِ سخن ہی نہیں ہے بلکہ اس کا موضوعِ عظیم نبی کریمﷺ کی ذات اقدس کے حوالے سے اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔اسی لیے نعت گوئی ہمارے لیے محض تہذیب نفس یا تطہیر نطق کا وسیلہ نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کی تعمیر، اصلاح اور دینِ اسلام کی تبلیغ وتوسیع کا ذریعہ بھی ہے۔درحقیقت نعت رنگ کا سارا سفر اسی شعور کو عام کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔''[۱۵]

انسانی مزاج نثر سے زیادہ نظم سے اثر قبول کرتا ہے۔نظم انسانی ذہن سے زیادہ جذبے کو اپیل کرتی ہے۔وہ اس کی باطنی صورتِ حال کو اپنی گرفت میں لے کر اس پر اپنا تصرف جمالیتی ہے۔صبیح رحمانی کے شعور اور لاشعور کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ نعت سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو حالی نے مسدس سے لیا۔درج ذیل اقتباس کو ملاحظہ فرمائیے،اس میں صبیح رحمانی مسدس کی بجائے 'شاہنامۂ اسلام' کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے بھی ہماری بات کی تائید ہوتی ہے کہ شاہنامہ بھی دراصل مسدس ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

> ''میں یہ بات اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ ماہرین تعلیمی نفسیات نے زور دے کر کہا ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم اور نظم کے مقابلے میں مترنم طرزِ ادا کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ غالباً ''شاہ نامۂ اسلام'' کی تصنیف کی غایات میں سے ایک غایت یہ بھی تھی اور اسے

شاعرِ ''شاہ نامۂ اسلام'' نے لکھا بھی ہے کہ تاریخ کو خشک سطروں کی بجائے ترنم سے سنا جائے تو یہ یاد بھی رہتی ہے اور اثر بھی دکھاتی ہے۔اس تناظر میں سیرت کی تفہیم کے لیے نعت کے مترنم طرزِ ادا سے نئی نسل کی ذہنی تطہیر اور فکری تعمیر کا اہتمام ہم سب کے لیے آخرت کا زادِ راہ ثابت ہوسکتا ہے۔''[۱۶]

ان کے خیال میں ادب کا قدم ہر لمحہ آگے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ ماضی سے تعلّق اور اخذ و استفادہ بھی حال کی بہتری اور مستقبل کی تیاری کے لیے ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ حال کی تعمیر ماضی کی بنیادوں پر ہی کی جاسکتی ہے۔ نیا کا مطلب ماضی سے جدائی یا بے تعلّقی نہیں اور ماضی کا مطلب روایت کی بے جا تکرار اور اندھی نقالی نہیں لیکن آگے بڑھنے اور جدت سے ہم آہنگ ہونے کے لیے تازہ افکار و خیالات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اسے روایت کی توسیعی صورت ہونا چاہیے اگر تازہ افکار و خیالات کو روایت کے مزاج اور مناہج کا خیال کیے بغیر لادنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اقبال کی شاعری تو کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔ صبیح بھی اپنی تنقید میں شاندار ماضی کے روشن لمحات سے کسبِ نور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نعت میں چونکہ رسول کریم ﷺ اور ان کے متعلّقات کا تذکرہ ہے لہٰذا یہ مسلمانوں کا وہ شاندار زماضی ہے جس نے ہر زمانے کو اپنے افکا و اعمال سے روشن کیا۔ وہ ماضی کو ناپسندیدہ اور فرسودہ نہیں سمجھے بلکہ ماضی کا وہ شاندار دور جو رسول اکرم ﷺ کا دور ہے وہ اسلام کا شاندار دور ہے وہ اس سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

''وہ اپنے ماضی کے ان روشن لمحات کو ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں جو ذکرِ نبی کریم ﷺ سے منور ہیں۔''[۱۷]

صبیح کے نزدیک عہدِ رسالت وہ شاندار دور ہے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ ماضی کو تاریک نہیں روشن سمجھتے ہیں اور ان سے اکتسابِ فیض کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تنقید اور تحریروں میں اندھیروں کا مقابلہ کرنا، چراغوں کی روشنی، جیسی لفظیات ان کی روشن تنقیدی فکر کی عکاس ہیں۔

ہر زمانے کا اپنا سماج، مزاج اور ادب ہوتا ہے جس کی تشکیل و تعمیر میں اس زمانے کے محرکات اور اسباب و علل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا ہر زمانے کے ادب کو اسی زمانے کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی سماج کے مختلف ادوار کو ایک ہی پیمانے سے ناپا جائے یا ایک ہی انداز میں سمجھا جائے۔ لہٰذا ادب کو اس کے سماج اور تہذیب و ثقافت جس میں اس نے تخلیقی صورت گری اختیار

کی ہے، سے علیحدہ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا چونکہ ادیب بھی اسی سماج کا پروردہ ہوتا ہے اس لیے اس کو سمجھنے کے لیے بھی اسی سماج کو سمجھنا ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماجی اور سائنسی تبدیلیاں سماج کو بدلنے اور اس کے مذاق کو تشکیل دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ سماجی اور تاریخی صداقتیں پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے انسان بھی ان اثرات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید محمد عقیل کے نزدیک تو سماج کی تبدیلی کے ساتھ مزاج اور مذاق ہی نہیں جمالیاتی نظریہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہی سماج انسانی ذہن پر اثرات ڈالنے اور اسے بدلنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ [۱۸] اس حوالے سے صبیح رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''ادب و تہذیب کے جملہ مظاہر انسانی فکر و شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اس امر کو بھی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ افراد کے فکر و شعور کی تشکیل و تعمیر میں ان کے انفرادی ذوق و جستجو کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی، سماجی اور گروہی خواہش و کاوش کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ادب و تہذیب کا کام اپنے اظہار میں بے شک فردیت رکھتا ہے، لیکن اس کی صورت گری میں سماجی رجحانات اور گروہی رویے بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیب، شاعر یا کوئی بھی تخلیق کار خلا میں جی سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اظہار کی معنویت کا سراغ پا سکتا ہے۔ اسے اپنے معاشرے میں جینا ہوتا ہے اور یہیں اس کا فن جلا پاتا ہے اور معنویت سے ہم آغوش ہوتا ہے۔'' [۱۹]

صبیح کے خیال میں معاشرے کو مسلسل ترقی دینے اور فکری شعور کو ارتقائی سفر پر گامزن کرنے میں انسانی شعور بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ انسانی شعور معاشرے کا ہی پیدا کردہ ہوتا ہے۔ ہر معاشرے کی ترقی کا راز ارتقاء پذیر قوتوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر معاشرے سے ان قوتوں کو علیحدہ کر لیا جائے تو معاشرے کی ترقی ہی نہیں فکری ارتقاء بھی رک جاتا ہے۔

صبیح کے نزدیک معاشرے کی علمی و فکری سرگرمی اسی وقت ترقی کے قدم آگے بڑھاتی ہے جب وہ اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑی ہوئی ہو جب تک معاشرے کی جڑیں اس کی تہذیب و ثقافت میں گہری اتری ہوئی نہ ہوں اس وقت تک وہ معاشرہ ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی رہتی ہیں۔ وقت کی دوریاں ہوں یا فاصلے کی، تہذیبوں کے درمیان امتیاز کو جنم دیتی ہیں۔ یہ حقیقت ایک ہی تہذیب کو سمجھنے میں بھی معاون ہوتی ہے اور مختلف تہذیبوں کو سمجھنے میں بھی۔ اسی طرح دو مختلف تہذیبوں میں ترقی، ارتقاء کی رفتار ضروری نہیں یکساں

ہو۔اس کا دارومداراس معاشرے کی تاریخ،علوم وفنون کی ترقی اور سیاسی صورتِ حال پر ہوتا ہے اور یہ سماجی حقیقتیں ہر معاشرے اور ہر دور کی علیحدہ ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جو تہذیبیں ان حقائق کو سمجھے بنا دوسری تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے پر تُلی ہوئی ہوں وہ اپنی غیر فطری سرگرمیوں کے باعث اکثر ناکام ہی رہتی ہیں۔جن پر ہنس کی چال چلنے والے کوّے کی مثال صادق آتی ہے۔

یہاں ایک بات کی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ شاید صبیح رحمانی کے نزدیک معاشرے کی ترقی اوراس سے جڑے فکر وخیال کے سوتے صرف اسی وقت ترقی کے قدم آگے بڑھا سکتے ہیں جب وہ اپنے گرد بے لچک دیواریں کھینچ لیں اور اخذ وقبول کے تمام راستوں پر قفل چڑھا لیں۔ایسا نہیں ان کے خیال میں جس طرح ایک تناور درخت اپنی زمین میں اپنی گہری جڑوں کے ساتھ کھڑا ہوکر ہر طرح کے موسموں اور آفات کا مقابلہ بھی کرتا ہے اوران سے اثرات قبول بھی کرتا ہے۔اسی طرح تہذیبوں کو بھی ایک دوسرے سے فکر وخیال کی روشنی لینی چاہیے بس شرط یہ ہے کہ روشنی کا حصول اپنی تہذیب وثقافت اوراقدار کی قیمت پر نہ ہو۔یہ بھی حقیقت ہے کہ فکر وخیال کی تبدیلیاں زمانی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔فکر وخیال کی ہوائیں اپنے جلو میں تبدیلیوں کا سامان لے کر چلتی ہیں۔ابر باراں کی طرح برستے ہوئے تمیز نہیں کرتیں کہ نیچے سمندر ہے یا خشک اور بنجر میدان، پہاڑ ہیں یا ریت کے ٹیلے۔فرق اگر پڑتا ہے تو مزاج کے اثر اور نفوذ کی صلاحیت کا۔جس معاشرے میں یہ صلاحیت زیادہ ہو وہ زیادہ انجذاب کرتا ہے اور جس میں صلاحیت یا ظرف کم ہو وہ اسی تناسب سے اثرات قبول کرتا ہے۔

> ''ادب وفکر میں اظہار پانے والے خیالات وافکار دراصل اُس شعور کے مظاہر ہوتے ہیں جو کسی قوم کے اجتماعی طرزِ احساس کی تشکیل اور اس کی تہذیب کی تعمیر واستحکام کی بنیاد بنتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر معاشرے میں اہلِ دانش اپنے ادب وفکر کے دھاروں پر مسلسل نظر رکھتے ہیں۔اُن کے رخ اور رفتار سے وہ اُن کے مزاج اور کیفیت کا اندازہ کرتے اوران کی روشنی میں اپنے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ہمارے یہاں بھی ادب تہذیبی قدر اور فکر واحساس کا ایسا پیمانہ ہے جو ہمیں اپنے داخلی کیف وکم سے بخوبی آگاہ کرتا ہے۔'' [۲۰]
>
> ''میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی بڑی علمی وفکری سرگرمی اس وقت تک نہ تو اپنے نئے رجحانات کے تعین میں کوئی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے اور نہ ہی عہد در عہد آگے سفر کرسکتی ہے، جب تک کہ وہ اپنی تہذیب و روایت کے مرکزی نکتے کو ہمہ وقت ملحوظِ خاطر نہ رکھے۔ یہ مرکزی نکتہ اسی

صورت میں ہمہ وقت ملحوظِ خاطر رہ سکتا ہے کہ جب اسے نئے افکار و مباحث کے بدلتے ہوئے تناظر میں مسلسل تازہ کیا جاتا رہے، اور بار بار اس کی طرف توجہ دلائی جاتی رہے۔'' [۲۱]

''مختلف مکاتبِ فکر اور نظریات کے حامل نقادوں اور دانش وروں کے مابین مجادلے اور مباحثے کے مختلف مراحل کے بعد ہمارے اہلِ نقد پر اب یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی ہے کہ کوئی ادب اور اس کی تنقید اپنی تہذیبی اقدار سے روگرداں ہو کر نہ تو اپنی حقیقت کو پا سکتے ہیں اور نہ ہی جریدۂ عالم پر اپنے نقشِ جاوداں کا سامان کر سکتے ہیں۔'' [۲۲]

چونکہ ادب اپنے ثقافتی تناظر سے گہرا تعلّق رکھتا ہے۔ اس لیے اس میں جنم لینے والے خیالات، افکار اور اقدار اپنے اندر ثقافتی تناظر کا عکس لیے ہوتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت اپنے خدوخال ادب کے آئینے میں ہی دیکھتی ہے اور ادب کی تہذیب و تشکیل کے تمام عناصر تہذیب و ثقافت میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ معاشرے میں جنم لینے والے یا ادب میں اظہار پانے والے افکار و خیالات کا خمیر مقامی تہذیب و ثقافت کے خمیر سے ہی اٹھتا ہے۔ لہٰذا ہم مقامی ثقافتوں کی بوباس ادب میں محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر تہذیب کو ہر دور میں نئے خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نیا خون تہذیبوں کے خدوخال نکھارنے اور ان میں زندگی کی حرارتیں پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ البتہ یہ اہم بات ہے کہ تہذیبوں کو ملنے والا نیا خون اس کے اپنے بلڈ گروپ سے مطابقت بھی رکھتا ہو اور ملنے والا نیا خون فاسد اور زہریلے مادوں سے بھی مصفّا ہو۔ بصورت دیگر فائدے کے نقصان کا زیادہ احتمال رہتا ہے۔

مذہب تہذیب کا بنیادی عنصر ہے۔ اسے تہذیب سے الگ کر کے دیکھنا غیر فطری طرزِ عمل ہے۔ معاشرے کی کم و بیش تمام اقدار بالعموم مذاہب کی اخلاقیات سے ماخوذ ہوتی ہیں چنانچہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ تمام اقدار کے سوتے مذہبی افکار و خیالات سے ہی پھوٹتے ہیں۔ یہی قدریں مذہب کے راستے تہذیب و ثقافت میں اور تہذیب و ثقافت کے راستے ادب میں داخل ہوتی ہیں۔ پھر انھیں خانوں میں بانٹ کر دیکھنا یا الگ الگ سمجھنا کیا سماجی حقیقتوں سے لاعلمی کی عکاس نہیں؟ صبیح رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے نقد و نظر کے باب میں اپنی تہذیبی قدروں کا احساس اور دینی بنیادوں کا شعور اس سطح پر نظر آتا ہے کہ اُس کی نفی کا تو سوال ہی کیا، اسے کسی طرح نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' [۲۳]

جدید دور کی علمی اور فکری ترقی میں سائنسی علوم ہی نہیں سماجی علوم وفنون نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ سائنسی علوم نے انھیں تجزیاتی ذہن دیا۔ انھی علوم کی وجہ سے حقائق تک رسائی اور صداقتوں کا تعین اٹکل پچو یا قیاس آرائیوں کی بجائے سائنٹفک انداز سے کیا جانے لگا۔ جس نے سائنسی سچائی کی بازیافت کا عمل سکھایا۔ سماجی علوم نے انسان اور انسانی معاشرے کے بہت سے پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا۔ انسان کی نفسیاتی گہرائیوں کا تجزیہ کیا۔ سماجی اثرات کا مطالعہ کیا۔ صبیح رحمانی سائنسی اور سماجی دونوں قسم کے علوم کی افادیت کے منکر نہیں، معترف ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی شعور کے ارتقاء میں سب سے بڑا ہاتھ ہی جدید علوم کا مرہونِ منت ہے۔

وہ جدید فکری خیالات کو مشرقی تہذیبی مزاج کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں اور اردو کی ادبی روایت سے ایک فطری رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے تنقیدِ نعت کو اکہری سطح سے محفوظ رکھنے کے لیے سماجی اور سائنسی علوم سے استفادے کا بھی مشورہ دیا۔ جس سے تنقیدِ نعت وسعت آشنا ہوئی۔ اس طرح تنقیدِ نعت کا رشتہ پہلی مرتبہ معروضی فکر اور عصری دانش سے جڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نعت کی تفہیم جو جدید ناقدین کے نزدیک فرسودہ اور گزرے وقت کی راگنی ہو کر رہ گئی تھی، نئے افکار وخیالات سے ہم آہنگ ہو کر حال سے مربوط ہو گئی۔

درج بالا سطور میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ صبیح رحمانی ادب کی صحیح پرکھ کے لیے دیگر علوم کی واقفیت کو ضروری خیال کرتے ہیں لیکن وہ ادب کو دیگر علوم کا بدل تصور ہرگز نہیں کرتے۔ وہ ادب کو ان علوم وفنون کی ترازو میں نہیں تولتے۔ ان کے خیال میں علوم وفنون کو ادب کی تفہیم میں مدد دینی چاہیے لیکن ایسا نہ ہو کہ نقاد ادب کی تفہیم کو ثانوی حیثیت دے کر ان علوم وفنون کی دنیا میں کھو جائے یا ادب کو دیگر علوم وفنون کے لیے میدان جنگ بنا دے اور نہ بقول وارث علوی اسے دوسرے علوم و فنون سے تھوک کے بھاؤ خریدی گئی نظریہ سازی بننا چاہیے کیونکہ وہ نظریہ سازی جو دوسرے علوم کی سرزمینوں میں پروان چڑھنے والے نظریے کا تناور درخت ادب کے گلدان میں لگانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا پاش پاش ہونا لازمی امر ہے۔[۲۴]

زندہ معاشرے میں مباحثوں اور مکالموں کو فروغ ملتا اور اظہار رائے کی آزادی ہوتی ہے۔ یہی حال ادب کا بھی ہے اور تنقید کا بھی۔ زندہ اور متحرک ادب جکڑ بندیوں اور فارمولوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ ادیب جو فامولوں میں مقیّد رہ کر ادب تخلیق کرتا ہے یا تنقیدی سرگرمی میں حصہ لیتا ہے

وہ آزاد کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ فارمولہ سازی نے ادیب اور نقاد کی فطری آزادی چھین لی ہے۔ فارمولوں، نظریوں اور لگے بندھے سانچوں نے ادیب کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تنقید نقاد کے تجربے کا بیان نہیں بلکہ اس کے تعصّبات اور عقائد کا ڈھنڈورا بن جاتی ہیں یا پھر علوم وفنون اور فلسفے اور منطق کی ایسی دیوار بن جاتی ہیں کہ قاری کی نظر اس کے پارفن پارے کو دیکھ نہیں سکتیں[۲۵] زندہ خیالات کو فروغ دینے، مکالمے کو آگے بڑھانے اور فکر وخیال کے منجمد تالاب میں تحرک کا باعث بننے والی تنقید ہی زندہ اور مثبت تنقید کہلاتی ہے۔ اس حوالے سے صبیح رحمانی کے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''نعت رنگ'' کے اجرا کے وقت سے لے کر آج تک میں نے ''نعت رنگ'' کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کے نمائندہ رسالے کے مروّجہ اصول وضوابط کا پابند نہیں رکھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس انداز اور مزاج کے حامل نعت پر کئی جریدے شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ''نعت رنگ'' کو ایک ایسی محفل بنانے کی کوشش کی ہے جہاں مختلف الخیال احباب اپنے اپنے مکتبِ فکر و اندازِ نظر کے ساتھ شریک ہو کر ذکرِ نبی کریم ﷺ کے فکری، مذہبی، ادبی اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کر سکیں، یہی نہیں بلکہ ادب کا عام مگر باشعور قاری بھی اس گفتگو میں اسی اہمیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے جس کا حق ہم صرف لکھنے والوں کو دیتے رہے ہیں۔ ایک ایسے فورم پر جہاں اظہارِ رائے کی آزادی ہو وہاں مباحث کا دائرہ صرف فکری، ادبی، اور فنی نہیں رہتا بلکہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی مسلکی اور فقہی بھی ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے لیے معنی رکھتی ہیں اور ہم اپنے نظریات کو اسی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔[۲۶]

> ''اگر آج ہم نعت کے ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کو رواج دینے میں کامیاب ہو گئے تو کل نعت اور نعت نگاروں کو ادب اور تاریخ ادب میں ان کا جائز مقام مل جائے گا۔ اس صورت میں فائدہ یقیناً نعت نگاروں کو ہوگا۔''[۲۷]

> ''نعت رنگ'' کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ہم نعت پر ہونے والی گفتگو اور اس ضمن میں چھڑنے والے مباحث کو اُمتِ مسلمہ کے مختلف مکاتیبِ فکر اور مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان مکالمہ بنا سکیں۔''[۲۸]

صبیح رحمانی ادب یا تنقید میں اختلاف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اختلاف ہی سے فکری راہیں روشن ہوتی ہیں۔ وہ اختلاف رائے کو ایک مثبت رویہ گردانتے ہیں جس سے فکر

کے نئے نئے زاویے سامنے آتے اور نئے نئے امکانات اظہار کا راستہ پاتے ہیں۔[۲۹] ردِّعمل اور اختلافِ رائے کا اظہار ادب میں منفی نہیں، بلکہ مثبت رویہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکر کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ قلب ونظر میں وسعت اور معاشرتی ماحول میں رواداری اور وسعتِ قلبی جنم لیتی ہے۔ گویا یہ طرزِ عمل زحمت نہیں رحمت ہوتا ہے۔ اسلام نے بھی اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور معاصر عہد کے روشن خیال معاشرے بھی اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ہی نہیں ادب میں بھی اختلاف رائے کو سخت ناپسند کیا جاتا رہا ہے۔ روشن خیال کہلانے والے ناقدین اور اچھے بھلے دکھائی دینے والے افراد بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں نامناسب رویہ برتتے نظر آتے ہیں۔ فراخ دلی سے دوسرے کی رائے کو سننا اور کھلے بندوں اعتراف کرنے کی روایت اور مثالیں ذرا کم ہی نظر آتی ہیں۔

صبیح رحمانی اپنے تنقیدی رویوں میں جہاں اختلاف رائے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہاں اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اختلاف کو اختلاف ہی رہنا چاہیے، اسے مخالفت نہیں بننا چاہیے۔ اگر اختلاف کو سامنے لانا ضروری بھی ہو تب بھی اسے شائستگی اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ردِّعمل جذباتی انداز میں نہیں بلکہ دلیل کے ساتھ آنا چاہیے کیونکہ اختلاف میں جاہل کی معاونت جذباتیت کرتی ہے اور عاقل کی استدلال۔ ایک کے پاس جذبات کی شدت ہوتی ہے اور دوسرے کے پاس استدلال کی قوت۔

> ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اختلافِ رائے بری چیز نہیں مگر شائستگی ضروری ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اس کا خیال رکھتے ہیں مگر کچھ احباب اپنی تحریروں پر اُٹھنے والے سوالات سے خاصی حد تک آزردہ نظر آتے ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ''نعت رنگ'' کے معماروں میں ان عظیم ناموں کو دیکھیں جو ادب و مذہب کے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے نعت پر بے لاگ گفتگو کے در وا کرنے کے لیے اپنی تحریروں پر اعتراضات اور سوالات کشادہ دلی سے برداشت کیے اور مسلسل ''نعت رنگ'' میں لکھتے رہے کہ ہم سب نعت پر ایسی تنقیدی گفتگو کو فروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔''[۳۰]

''نعت رنگ'' بنیادی طور پر ایک نعتیہ ادب وتنقید کا فورم ہے۔ یہاں ہر فکر و خیال کے لوگوں کو جو نعت اور آدابِ نعت اور تنقیدِ نعت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوں، خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

کسی مسلک، کسی مکتب، کسی نظریے، کسی فلسفے اور کسی اسلوب کے تخلیق کاروں اور ناقدین کے لیے ہمارے ہاں نہ تو کوئی خاص رعایت اور نہ ہی کوئی پابندیاں۔ ہمارے ہاں اختلافِ رائے کو اہمیت دی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ ادب وشائستگی کو ملحوظ خاطر رکھ کر کیا گیا ہو۔ نعت کی تخلیق اور تنقید آپ کا، میرا، ہم سب کا کام ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے انداز سے، لیکن پوری ذمہ داری، سنجیدگی اور متانت سے کام کرنا چاہیے تاکہ ہم اس نعتیہ تنقید کو سلیقے اور کامیابی سے آگے بڑھا سکیں۔[۳۱]

جب اختلافِ رائے فطری عمل ہے تو پھر اسے مخالفت کی آنکھوں سے دیکھنا مناسب عمل نہیں۔ مذہبی معاملات ہی نہیں ادبی تنقید میں بھی اکثر اوقات ناقدین کا رویہ ایک دوسرے کے بارے میں مخالفانہ، جارحانہ اور معاندانہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض تحریروں میں ناقدین شخصی سطح پر بھی اتر آتے ہیں۔ تنقیدِ نعت کے سلسلے میں بھی کچھ آراء اسی طرح کی دیکھی گئی ہیں۔ نعت چونکہ رسولِ رحمت ﷺ کی تعریف وتحسین کے باوصف ایک مقدس صنفِ سخن کی حامل بن گئی ہے اس لیے اس پر تنقیدِ نعت میں اسلوبِ تحریر شائستہ اور مہذب ہونا دوہرا ضروری ہے۔ ایک ادبی لحاظ سے اور دوسرا مذہبی لحاظ سے۔ اسی لیے صبیح رحمانی اداریوں میں ناقدین سے گزارش کرتے ہیں کہ انھیں اختلاف رائے کا تو حق حاصل ہے لیکن انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مخالفت پر اتر آئیں یا احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ غیر شائستہ اسلوب اختیار کریں یا شخصی بے عزتی کو اپنا شعار بنائیں۔ اگر کسی ناقد کو کسی دوسرے کا نقطۂ نظر پسند نہیں تو اسے اختلاف رائے کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے استدلال کے ساتھ مہذب انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا جمہوری حق حاصل ہے اور یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ان کے نقطۂ نظر کو مکمّل طور پر رد کر دیں۔ اختلاف رائے یا آزادیِ اظہار کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی کی پگڑی اچھالی جائے یا اس پر لعن طعن کر کے اپنی دانست میں تنقید کا حق ادا کر دیا جائے۔ اس حوالے سے صبیح رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس عرصے میں بعض ایسے مضامین ومقالات اور تجزیات سامنے آئے جن کے مطالعے میں یہ احساس شدت سے ہوا کہ اختلافِ رائے کے حدود کا قطعاً خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جن معاصرین یا متقدمین کی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے، ان کے لیے نامناسب رویے کا اظہار اختلاف کا نہیں، مخالفت کا واضح تأثر دیتا ہے۔ اختلاف کسی

بھی رائے، خیال، فکر یا تصور سے کیا جا سکتا ہے، اور اس کے تقابل میں اپنی رائے یا خیال کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام دلائل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ محض کسی کو رد کر دینا یا پھر اس طرح کے کسی موقعے پر عمومی انداز کا مسترد کرنے والا لہجہ اختیار کرنا کافی نہیں ہوتا۔ بات میں وزن پیدا ہوتا ہے دلیل سے اور اس کو مستحکم کرتا ہے متبادل زاویہ، نیا خیال اور نیا بیانیہ۔ ایسا نہ ہو تو محض رد و مخالفت کا منفی احساس ہی سامنے آتا ہے جو نعت، ادب اور تنقید کسی کے لیے کارآمد نہیں ہوتا۔''[۳۲]

''اس وقت جب کہ نعتیہ تنقید اور مطالعات کا کام ادب کے مرکزی دھارے کا قابلِ قدر حصہ بن چکا ہے، نعت کے ناقدین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ادب میں ہر مکتبِ فکر کی اپنی ایک جگہ اور اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ کسی کو یکسر مسترد کر کے کوئی نیا خیال، کوئی نئی فکر یا کوئی نیا نقاد ادب و تنقید میں قطعاً اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ جگہ صرف اس صورت میں بن سکتی ہے کہ بے شک اختلافِ رائے کا اظہار کیا جائے، مگر تمام تر اختلاف کے باوجود دوسروں کی آرا، تصورات اور افکار کا احترام بھی کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ آزادیِ اظہار کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہاں، اختلافِ رائے کو سامنے لاتے ہوئے ضروری ہے کہ اپنے فکر و نظر پر توجہ مرکوز کی جائے اور اُن کی معنویت کو دلیل و برہان کے ساتھ شائستگی اور سلیقے سے پیش کیا جائے۔ نعتیہ تنقید کا فروغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب ان معاملات اور حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کیا جائے۔''[۳۳]

صبیح رحمانی اپنے اداریوں میں بار بار اس امر پر زور دیتے ہیں کہ نعت کا ایک مضبوط ادبی حوالہ ہے۔ اسے عرصہ دراز تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے ادبی امکانات اپنے تمام و کمال کے ساتھ سامنے نہ آ سکے۔ نعت کے ادبی حوالے اور تنقیدِ نعت، اردو کی ادبی روایت کی دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ لہٰذا اسے تنقیدی اور ادبی روایت سے ہم قدم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں غیر جانبدارانہ اور بے باک رویہ اپنانا ہوگا۔ یہ تنقید کی حقیقی روح بھی ہے اور تنقید نعت کے لیے وقت کی ضرورت بھی۔ تنقید موضوعیت کو برداشت نہیں کرتی۔ نری معروضیت جسے ایلیٹ نے شخصیت سے فرار کا نام دیا ہے، کو اپنانا ہوگا اور تنقید کی بنیاد مفروضوں اور خیالی باتوں پر رکھنے کی بجائے شائستہ، علمی استدلال پر رکھنا ہوگا۔

''ہمیں کسی نقاد کی نیت میں کھوٹ تلاش کرنے کی بجائے اس کی اپنی رائے کو علمی استدلال اور شائستگی سے رد کرنے کی روایت کو مضبوط بنانا چاہیے کہ یہی تنقید کا مثبت اور صحت مند

رویہ ہے۔ نعت کہنے، پڑھنے اور اس پر غور و فکر کرنے والوں کو ضرور احساس ہوگا کہ اب نعت کے ادبی پہلوؤں پر بے لاگ گفتگو کی ضرورت اپنی جگہ اہم ہے۔'' [۳۴]

اس حوالے سے ایک اور اداریے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ایک ایسے ماحول میں جہاں مذہب سے جڑی ہوئی اصناف پر گفتگو کے دروازے صرف خوفِ فسادِ خلق سے بند ہوں وہاں حمد و نعت کے ادبی پہلوؤں پر شریعت کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر جرات، بے خوفی اور استدلال سے پیش کرنا اور پھر اس بات پر مختلف نقطہ ہائے نظر کے تناظر میں ہونے والے اعتراضات و اختلافات کو حوصلے اور تحمل سے سننا اور برداشت کرنا صرف اس لیے کہ نعت پر ادبی مباحث کے در کھلے رہیں اور صدیوں سے بند اس ایوان میں تازہ ہوا کے جھونکے آتے رہیں تاکہ ہمیں نعت کی علمی، ادبی، تہذیبی، جہات کا علم ہو اور ہم اس کے آداب کا شعور حاصل کر کے نعت کی حقیقی قوت کو جان سکیں اور اسے بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہمیں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔'' [۳۵]

وہ ادب میں کسی ایک نظریے پر اصرار کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کسی ایک دبستان خیال سے چمٹے رہنے سے فکر کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے جس سے ادب میں کٹر پسند رجحان جنم لیتا ہے اس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اعتدال پسندی کے رجحان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ سخت اور بے لچک رویوں سے ادب میں جمود کا عنصر تقویت پاتا ہے۔ جس سے ارتقاء کا سلسلہ رک جاتا ہے اور فروغ کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ رویہ جسے وہ غیر انسانی سمجھتے ہیں، ادب میں شدت پسندی کو ہوا دیتا ہے، اور ادب کا بنیادی تعلّق تو انسان اور انسانیت سے ہی ہے۔ وہ اپنی رائے کو دوسروں پر مسلّط کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے میں ہر ادیب اور نقاد آزاد ہے۔ ان کے نزدیک سچا فن کار فطرت سے ہی نہیں، ادب سے بھی آزادانہ طور پر اثرات اور کیفیات کشید کرتا ہے۔ چبائے ہوئے نوالے، چلتے ہوئے فقرے اور بندھے ٹکے اصول، ادب اور تنقید کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ تقلید پرستی ہی کا ہی ایک روپ ہے۔

صبیح رحمانی کو نہ مشرق سے حذر ہے اور نہ وہ مغرب سے بے زار ہیں۔ وہ نہ مشرقی افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کو حرف آخر سمجھتے ہیں نہ مغربی افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کو حقیقی اور حتمی۔ لیکن ان دونوں کی اہمیت کے بھی قائل ہیں اور افادیت کے بھی اور دونوں سے بھرپور استفادے

کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ان دونوں میں توازن رکھنے کے قائل ہیں۔ جو ان کے متوازن اور غیر متعصّبانہ رویے اور رجحان کی عکاس بھی ہے۔

صبیح ادب کو خانوں میں بانٹنے کے قائل نہیں، بلکہ ان میں مکمّل ہم آہنگی کے قائل ہیں، یہاں تک کہ وہ ادب اور تہذیب، اور ادب اور مذہب کو بھی علیحدہ جزیروں کی صورت میں نہیں دیکھتے اور نہ اس کی تفہیم کسی مخصوص دبستان تنقید سے کرتے ہیں۔ وہ تفہیم نعت کے سلسلے کسی مخصوص دبستان سے استفادہ کرنے کے قائل نہیں بلکہ وہ فکری روشنی ہر اس مقام سے حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں سے اسے ملے۔ وہ حکمت کو مومن کا گم شدہ مال سمجھتے ہے کہ جہاں سے ملے لے لو البتہ خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول کو بھی ذہن نشین رکھتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر عزیز احسن کی کتاب 'اردو نعت اور جدید اسالیب' کے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مجھے امید ہے کہ ''اردو نعت کے جدید اسالیب'' تازہ واردانِ بساطِ نعت کو نہ صرف شعر گوئی کا نیا شعور عطا کرے گی بلکہ اس کے مطالعے سے وہ اپنی تخلیقات کو جدید ادبی رجحانات سے بھی ہم آہنگ کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں مطالعاتِ نعت میں ادب کے مغربی دریچوں سے آنے والی روشنی سے بھی جائز حد تک استفادے کے امکانات روشن ہوں گے۔''[۳۶]

صبیح رحمانی نعت کی تفہیم و تعبیر کے لیے بھی کسی ایک نظریے کو حتمی یا کافی نہیں سمجھتے اور نہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ کوئی ایک نظریہ نعت کی کلّی تفہیم کا دعوٰی کر سکتا ہے۔ جب انسانی ذہن اور شعور کسی ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتا بلکہ وقت گزرنے اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بدل لیتا ہے جو اس کے ارتقائی سفر۔۔۔تو پھر کوئی ایک خاص پیمانہ کس طرح حتمی تفہیم کا دعوی کر سکتا ہے۔ ان کے خیال میں فکر و خیال کی روشنی خواہ مشرق سے دستیاب ہو یا مغرب سے ہاتھ آئے، لے لینا چاہیے۔

وہ نعت کی تفہیم کے لیے انتخابی تنقید کی اصطلاح متعارف کرواتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ نعت کی معنوی، فکری اور لسانی پرتیں کھولنے اور ان کے تفہیم و تعبیر کے لیے جو دبستانِ تنقید یا مکتبہ فکر و خیال معاون ہو سکتا ہے، اسے استعمال میں لانا چاہیے خواہ اس کا تعلّق انتقاد مشرق سے ہو یا مغربی تنقید کے جدید تصورات سے البتہ نعت کی تفہیم کے لیے وہ دو باتوں پیشِ نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں ایک اقدار حیات اور دوسرا اسلامی روایت کا مطالعہ۔ نعت دیگر اصنافِ سخن

سے مشترک صفات رکھنے کے ساتھ ساتھ متذکرہ دو خوبیوں سے بھی متّصف ہے۔ اعلیٰ اقدارِ حیات سے اس لیے کہ نعت کا تعلّق رسول پاک ﷺ کی تعریف وتوصیف سے ہے اور رسول پاک ﷺ کی ذات جن اعلیٰ وارفع اقدار کی امین ہے ان کی بنیادی روح کا سمجھنا انتہائی اہم اس لیے ہے کہ ان کی شان میں ذرہ برابر کمی بیشی دائرہ ایمان سے خارج کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری شریعت اسلامی کی حقیقی روح کی تفہیم۔ اور یہ دونوں خصوصیات دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اسلام کو سمجھنا ہو تو رسول پاک ﷺ کی سیرتِ اطہر کا مطالعہ کیا جائے اور رسول پاک ﷺ کو سمجھنا ہو تو اسلامی شریعت کے بنیادی منبع قرآن پاک کا مطالعہ ضروری ہے۔

> ''میرا مؤقف یہ ہے کہ نعت کا مطالعہ انتخابی تنقید کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ انتخابی تنقید سے میری مراد یہ ہے ہ تنقید کے تمام دبستانوں کے اصولوں کی روشنی میں نعت کا مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی دبستانِ تنقید سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کن حالات اور کن ادوار میں لوگ نعت کی طرف متوجہ ہوئے یا ہوتے ہیں۔ نفسیاتی دبستان تنقید کے ذریعے ان رموز کی عقدہ کشائی ہوسکتی ہے کہ شاعروں کی روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کشاد میں نعت نے کتنا اور کس طرح حصہ لیا۔ نعت سے کس طرح شاعروں کا کیتھارسس ہوا ہے اور کس طرح نعت نے معاشرے کو پاکیزہ بنانے میں اپنا کردار ادا کیا، کیوں کہ اعلیٰ درجے کی نعت بلند تر اقدارِ حیات کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی اور اقدار ہی کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی سمت نمائی ہوتی ہے۔ نعت کے مطالعے کے لیے اسلام کا مطالعہ بھی لازمی ہے تاکہ منصب رسالت سے آگاہی حاصل ہو سکے اور نعت محض رسمی عقائد تک محدود نہ رہے کیوں کہ سرکار کی سیرت کا ذکر نظم میں ہو یا نثر میں انسان کی تعمیر کرتا ہے۔''[۳۷]

نعت کی تنقیدی تفہیم کے لیے صبیح رحمانی نے جو تنقیدی پیراڈائم دیا ہے وہ کافی حد تک ڈاکٹر وزیر آغا کے امتزاجی تنقید سے مماثلت رکھتا ہے۔[۳۸]

مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں صبیح رحمانی کا جو نعتیہ تنقیدی وژن سامنے آتا ہے وہ ایک معتدل اور متوازن نقاد کا ہے، جن کی ذہنی اور قلبی کائنات میں وسعت بھی ہے اور کشادگی بھی۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنا مؤقف مسلّط کرنے کی کوشش کرتے نظر نہیں آتے اور نہ اپنی رائے سے مختلف یا مخالف کسی خیال یا مؤقف کو یک قلم مسترد کرنے کا جارحانہ رویہ اپناتے نظر آتے ہیں بلکہ ان کی تحریروں میں جو رویہ سامنے آتا ہے وہ سمجھانے اور قائل کرنے کا ہوتا ہے۔ وہ کسی خیال یا نظریے کا

مطالعہ کھلے ذہن اور کشادہ دلی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ مشرقی خیالات کے خوشہ چین بھی ہیں اور مغربی خیالات سے استفادہ کرنے میں بھی انھیں کوئی عار نہیں لیکن وہ ان خیالات کو اپنی زمین، تہذیب، اقدار، اور ادبی روایات سے جوڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کے قائل ہیں۔ ادب میں جنم لینے والے تجربات کو بھی وہ ادب کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں نئے نئے تجربات اگرچہ روایت سے انحراف کی صورت نظر آتے ہیں لیکن ایک سطح پر وہ پرانی روایت کی توسیع بھی ہوتے ہیں۔ یہ توسیع ان کے نزدیک زندگی کی علامت ہے، فرار یا بغاوت کی کارفرمائی نہیں۔

ان کی تنقید کسی ایک مقام پر ٹھہر نہیں گئی بلکہ ہمیشہ نئے نئے افکار و خیالات کی جستجو نے انھیں متحرک رکھا۔ وہ ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کے مصداق، آگے بڑھنے اور نئی فکر کی روشنی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات میں ارتقاء موجود ہے لیکن ان کی تحریروں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بنیادی تنقیدی رویوں میں تبدیلی لا رہے ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات میں ارتقاء موجود ہے نہ کہ تضاد چنانچہ یہ تغیّر دراصل اثبات سے پھوٹتا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں اثبات اور تغیّر دو مختلف و متضاد رویے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا ہی ایک قرینہ ہے۔

اعتدال چونکہ ان کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے اس لیے ان کی تحریروں میں احساس تفاخر کا رویہ سامنے آتا ہے نہ احساسِ کمتری کا۔ تاہم وہ کسی فکر سے مرعوب دکھائی نہیں دیتے۔ اگر کسی فکر میں زندہ عناصر موجود پاتے ہیں تو اسے اپنی فکر سے ہم آہنگ کرنے اور تنقید کا حصہ بنا لینے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ بصورتِ دیگر اسے رد کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔ انھوں نے نظریہ سازی تو نہیں کی لیکن آئے دن ادب میں جنم لینے والے نظریات پر ان کی نظر رہتی ہے اور وہ ان نظریات کی خوبیوں اور خامیوں کا ادراک بھی بخوبی رکھتے ہیں۔ افکار و نظریات سے اخذ و استفادہ اور انجذاب و اتصال کے بعد انھی بنیادوں پر وہ نعت کے قارئین اور ناقدین کی سمت نمائی بھی کرتے ہیں۔ یعنی وہ اقبالؔ کے الفاظ میں ''جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق / خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو'' قسم کے (حامل) روایتی نعت گو یا ناقد نہیں بلکہ نعت کو خالصتاً ایک ادبی صنف سمجھتے ہوئے ادب ہی کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور نعت کے قارئین کی سمت نمائی بھی کرتے ہیں۔ وہ خود احتسابی کا ہنر بھی بخوبی جانتے ہیں اور ان کی اسی خود احتسابی نے جو اداریوں میں سوالات کی صورت میں

سامنے آتی ہے، انھیں نعت کے قارئین کے کٹہرے میں ہی کھڑا نہیں کیا، ضمیر کی عدالت میں بھی پیشیاں بھگتنے پر مجبور کیا ہے۔ اس رویے نے ان میں بے جا تفاخر پیدا کرنے کی بجائے خوب سے خوب تر کی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں رکھا ہے۔

صبیح رحمانی کی کوششوں نے تنقیدِ نعت کو ایک نئے افق سے روشناس کروایا۔ تنقیدِ نعت کو ایک سپاٹ، بے لچک اور تقریظی فضا سے نکال کر ایک نیا انداز دیا جو رنگا رنگ بھی ہے، لچک دار بھی، تجزیاتی بھی ہے، فکری بھی۔ انھوں نے تنقیدِ نعت کو جدید تنقیدی روشنی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ صبیح رحمانی کے تنقیدی شعور کا حاصل، وہ معاصر تنقیدی اذہان ہیں جنھیں انھوں نے نعت شناسی کے سلسلے میں بیدار کیا ہے اور یہ وہی تنقیدی اذہان ہیں جنھوں نے 'نعت رنگ' میں نعتیہ ادب کو تنقید کی کڑی کسوٹیوں پر اس طور پر کھا کہ نعت کا تخلیقی اور فنی حُسن نکھر کر سامنے آیا۔ جس کی وجہ سے تنقیدِ نعت پر چھائے ہوئے خوف کے مہیب بادل بھی چھٹنے پر مجبور ہوئے اور تنقیدِ نعت کی اصلاح کی طرف عوامی ہی نہیں ادبی ذہن بھی متوجہ ہوا۔ صبیح رحمانی نے تنقیدِ نعت کو جو افق دیا تھا وہ ان کی کوششوں سے آفاق میں تبدیل ہوا اور یہی ان کی کاوشوں کا ثمر اور تنقید کا حاصل ہے۔

آلِ احمد سرور نے اچھی تنقید کی قدروں کو مہذب انسانیت میں تلاش کیا ہے۔ صبیح رحمانی کی شخصیت اور تنقیدی مزاج کو اسی جملے میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے تنقیدِ نعت میں آفاقی قدروں اور زندہ روایات کو تلاش کیا اور اور اسے موجودہ عصر کے ادبی اور تنقیدی رویوں سے ہم آہنگ کیا۔ اب نعت کو تخلیقی سطح پر کسی جواز کی ضرورت ہے اور نہ تنقیدِ نعت کو کسی ادبی محاذ پر معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی ضرورت۔ ان کی تنقیدی فکر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی تنقیدی بصیرت اور تنقیدی کاوشوں سے انکار ممکن نہیں۔ ذیل میں صبیح رحمانی کے اقتباس پر اس مضمون کو مکمّل کیا جاتا ہے۔ یہ 'نعت رنگ' کے ایک اداریے کا اقتباس ہی نہیں، صبیح رحمانی کے تنقیدی رویوں کا اظہار بھی ہے:

> ''یہ بات خاصی خوش آئند ہے کہ نعت کے ادبی فروغ کے لیے ''نعت رنگ'' کی بیس سالہ جدوجہد کے نتیجے میں نعت کی ادبی مقبولیت کا اب ایک ایسا ماحول بن گیا ہے کہ معاصر ادبی منظر نامے پر نعت کے تخلیقی وفور کی ایک تازہ لہر نظر آتی ہے جس میں اردو کے نامور شعرا کے دوش بدوش نو آموز شعرا بھی نعت گوئی کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ نعت رنگ میں تنقیدی مباحثوں اور مکالموں کے روشن ہونے سے آدابِ نعت گوئی کے

باب میں شعرا کا احساس ذمہ داری بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نعت کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے میں جو اندیشے مانع تھے وہ دور ہوئے ہیں اور علمی، لسانی، عروضی اور تنقیدی زاویوں سے بے لاگ گفتگو کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی ہے جس ادبی سطح پر نعت کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے نعت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرنے والے حلقوں میں بھی اس کو بطورِ صنفِ سخن دیکھنے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس عمل میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ادبی ادارے اب خاصے فعال نظر آ رہے ہیں۔"[۳۹]

مندرجہ بالا مباحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صبیح رحمانی محض ایک نعت گو، نعت خواں اور نعتیہ ناقد اور صحافی ہی کا نام نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک تنظیم، ایک تحریک کا نام ہے۔ جس نے نعت کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کو انفرادی رجحان سے نکال کر اجتماعی روایت سے جوڑا اور نعت جو ایک جزیرے کے موافق تنہائی کا شکار تھی اسے ادبی روایت سے جوڑ کر مجلسی بنا دیا۔ اس کے لیے انھوں نے 'نعت رنگ' کا پلیٹ فارم استعمال کیا۔ اس مجلّے میں صبیح رحمانی کے تنقیدی خیالات کا سب سے زیادہ عکس ان کے تحریر کردہ اداریوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریے محض اداریے ہی نہیں بلکہ ایک بھرپور مقالوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں صبیح رحمانی کا شعورِ نعت اور تنقیدی وژن مکمّل طور پر اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے۔ تنقیدِ نعت کے ان مباحث کے ذریعے صبیح رحمانی نے نعت کو ایک زندہ، متحرک اور ادب کی جدید فکر سے قریب کر کے نئی سمتوں سے آشنا اور نئے آفاق سے روشناس کیا۔ ان کی کوششوں سے اب نعت کو محض تقدس کے ہالے میں لپیٹ کر دیکھنے کی بجائے خالصتاً ادبی اصولوں پر پرکھا جانے لگا ہے۔ اب نعت کی تنقید یعنی جانچ پرکھ کے لیے محض عقیدت اور جذبہ ہی نہیں بلکہ جدید ادبی، سائنٹفک اور معروضی نقطہ ہائے نظر اور زاویوں کو بھی بروئے کار لایا جانے لگا ہے۔ صبیح رحمانی کی ان کوششوں سے نعت ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اب ایک توانا ادبی صنف کے طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے جس کی تفہیم کے لیے نئے اور پرانے تنقیدی اصولوں سے مدد لی جا رہی ہے۔ اب تنقیدِ نعت محض مشرقی اور روایتی اصولِ نقد تک محدود نہیں رہی بلکہ متعدد مغربی تنقیدی افکار کی روشنی میں سامنے آنے والے مباحث کی وجہ سے اس میں اتنی ہی وسعت پیدا ہو گئی جتنی کہ خود اردو کی ادبی تنقید میں۔

ج۔ اُردو رسائل میں تعزیتی شذرات کی روایت اور 'نعت رنگ'

تعزیتی شذرات، تعزیتی مضامین یا وفیات نگاری کے حوالے سے اردو کے ادبی رسائل کی روایت کا مطالعہ کیا جائے اور ماضی میں وفات پانے والے ادیبوں کی خبریں ان کے معاصر عہد کے رسائل میں تلاش کی جائیں تو بہت کم رسائل اس تلاش میں ہمیں مدد دے پائیں گے اور اگر ایسے رسائل ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے جن میں معاصر ادیبوں کی وفات سے متعلّق تعزیتی مضامین باقاعدگی اور تسلسل سے شائع ہوتے رہے ہوں تو تلاش کا یہ عمل ہمیں مایوسی سے ہم کنار بھی کر سکتا ہے۔ البتہ تعزیتی مضامین کی اس کمی کو بیسویں صدی کے رسائل میں شخصیات کے حوالے سے قائم کردہ گوشے یا خاص نمبر ضرور پورا کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ رسائل میں موجود متذکرہ مضامین کی صورتیں دو قسم کی شخصیات سے متعلّق نظر آتی ہیں۔ یا تو وہ سربرآوردہ شخصیات ہوتی تھیں یا رسالے کی انتظامیہ سے ان کا خاص تعلّق رہا ہوگا۔ تیسری صورت ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض اوقات تو قد آور شخصیات بھی نظر اندازی یا کم نظری کا نوحہ کرتی نظر آتی ہیں۔ محمد حسین آزاد کا نام اور مقام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔[۱] اس وقت ہندوستان سے اردو کے کثیر تعداد میں رسائل شائع ہو رہے تھے۔ ان رسائل میں 'اردوئے معلّٰی' (علی گڑھ)، 'مخزن' (لاہور)، 'زمانہ' (بریلی، کانپور)، 'ادیب' (الہ آباد)، 'الندوہ' (لکھنؤ)، 'عصمت' (دہلی)، 'الناظر' (لکھنؤ)، 'لسان العصر' (لکھنؤ)، 'تمدن' (دہلی)، 'کمال' (دہلی)، علی گڑھ منتھلی (علی گڑھ)، 'دبدبہ آصفی' (حیدر آباد)، اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد کے

رسائل میں ایک بھی رسالہ ایسا نہیں جس نے آزاد کا خاص نمبر نکالا ہو یا رسالے میں کوئی گوشہ قائم کیا ہو۔ آزاد کی وفات کے بعد کی دو تین دہائیوں میں ادبی رسائل کی ایک مزید لہر نے ادبی فضا کو مزید گرما دیا تھا۔ اس وقت دہلی، لکھنؤ، بمبئی، الٰہ آباد، بھوپال، حیدر آباد اور لاہور ادبی رسائل کے مراکز کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ اس عہد کے رسائل میں 'معارف' (اعظم گڑھ)، 'دل گداز' (لکھنؤ)، 'صبح امید' (لکھنؤ)، 'نیا ادب' (لکھنؤ)، 'ادب' (لکھنؤ)، 'پیمانہ' (آگرہ، لکھنؤ)، 'مرقع' (لکھنؤ)، 'نقیب' (بدایوں)، 'اردو' (اورنگ آباد)، 'اردو' (الٰہ آباد)، 'ہندستانی' (الٰہ آباد)، 'چاند' (الٰہ آباد)، 'ادیب' (آگرہ)، 'ندوہ' (شاہ جہان پور)، 'نقاد' (آگرہ)، 'شمع' (آگرہ)، 'صحیفہ' (اٹاوہ)، 'تاج' (حیدر آباد)، 'نظارہ' (میرٹھ)، 'نقیب' (بدایوں)، 'عصمت' (دہلی)، 'ساقی' (دہلی)، 'ادیب' (دہلی)، 'کلیم' (دہلی)، 'برہان' (دہلی)، 'آج کل' (دہلی)، 'جامعہ' (دہلی)، 'سہیل' (علی گڑھ)، 'نگار' (بھوپال، لکھنؤ) معروف رسائل رہے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسائل کی بھی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ 'کہکشاں'، 'ہزار داستان'، 'عالمگیر'، 'نیرنگ خیال'، 'ادبی دنیا'، 'ہمایوں'، 'شاہکار'، 'ارمان' کے علاوہ بھی کئی رسائل لاہور سے شائع ہو رہے تھے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کسی رسالے نے بھی آزاد کا نمبر نکالا نہ کوئی گوشہ ہی قائم کیا۔ آزاد کے انتقال کے تقریباً تہتّر سال بعد ۱۹۸۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے 'راوی' کا آزاد نمبر شائع ہوا۔[۲] یہ ہند و پاک کا واحد رسالہ ہے جس نے محمد حسین آزاد نمبر نکالا۔ تقسیم ہند سے قبل تک کسی رسالے کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کے اعتراف خدمات میں کوئی نمبر یا گوشہ نکالتے۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اخبارات اور بیسویں صدی کے رسائل میں سے ایسے اخبارات اور رسائل کا شمار کیا جائے جن میں معاصر ادیبوں اور شاعروں کی وفات پر خبروں کا اہتمام کیا جاتا ہو تو اس حوالے سے بھی ہمیں کافی تگ و دو کرنا پڑ سکتی ہے۔ البتہ تلاش بسیار کے بعد بعض رسائل و اخبارات ایسے ضرور مل جائیں گے جو بے قاعدگی کے ساتھ معاصر ادیبوں کی وفات کی خبروں کو شامل اشاعت کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے رسائل کی تعداد بھی انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔ فوت ہونے والے ادیبوں سے متعلّق رسائل میں جگہ پانے والی خبریں بالعموم اداریوں کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ تاہم انیسویں صدی کے اخبارات سے بیسویں صدی کے رسائل تک معاصر ادبی شخصیات کی وفات سے متعلّق قطعات تاریخ اکثر و بیشتر رسائل میں ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں تو قطعات تاریخ کی تخلیق و اشاعت

ہر کتاب، رسالے، عمارت، کتبے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور کسی شاعر کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف اس وقت تک کیا ہی نہیں جاتا تھا جب تو وہ اس فن پر دسترس کا عملی ثبوت فراہم نہ کر دے۔[۳] کم وبیش ہر معروف مطبع میں کاتب کے ساتھ تاریخ گو شاعر بھی جڑا ہوا کرتا جس کے ذمہ داری یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ مطبع سے شائع ہونے والی کتابوں کی تاریخ کہے۔ اگر مطبع کے پاس یہ سہولت نہ ہوتی تو یہ خدمت مستعار لی جاتی۔ بہر حال انیسویں صدی کے اخبارات میں معاصر شعرا و ادبا کی زندگی کے اہم واقعات بالخصوص وفات کی تاریخیں ضرور شائع ہوا کرتی تھیں۔ 'اودھ اخبار' لکھنو کے نومبر دسمبر ۱۸۷۹ء کے تین شماروں میں غالب کے شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کی وفات کی ۳۷ تاریخیں (قطعات تاریخ) شائع ہوئیں۔[۴]

بیسویں صدی کے رسائل میں بھی قطعات تاریخ وفات کی اشاعت کا اہتمام دیکھنے میں آیا ہے۔ بعض رسائل تو انتقال کرنے والی شخصیت سے متعلّق قطعۂ تاریخ وفات کہہ کر بھیجنے کا اعلان بھی شائع کرتے تھے۔ خواتین رسائل میں 'شمع' ' علی گڑھ بہت اہمیت کا حامل رسالہ تھا۔ اس رسالے میں بالعموم خواتین ہی کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ رابعہ سلطان بیگم جن کی تحریریں اس رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو ایڈیٹر نے اداریے میں ان کی وفات کی تاریخ کہنے کی اپیل کی۔ ایڈیٹر لکھتی ہیں: '' ہماری نہایت لایقہ و روشن خیال بہن رابعہ سلطان بیگم صاحب جن کے بہت سے مضامین خاتون میں شایع ہوتے رہے ہیں نہایت افوس ہے کہ ایسا روح فرسا اور جانکاہ صدمہ بے وقت ان پر پڑا جس سے بڑا اور کوئی صدمہ اس دنیا میں کسی عورت کے لیے نہیں ہوسکتا یعنی ابھی ایک سال کا زمانہ گزرا کہ ان کی شادی میر تہنیت علی خان صاحب سکرٹری جٹپول اسٹیٹ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ خوشی چندروزہ ہے۔ افسوس میر تہنیت علی خاں نے ۲ تیر ۱۳۲۰ف کو چار بجے شام کے انتقال فرمایا۔ ان کا انتقال دوشنبہ کے دن ہوا جو ہمارے پیغمبر کی وفات کا دن ہے۔۔۔ عباسی بیگم صاحبہ کی فرمائش ہے کہ ناظرین و ناظرات خاتون میں سے جو قطعہ تاریخ لکھ سکتے ہیں وہ از راہِ ہمدردی فارسی یا اردو میں جس زبان میں ہو سکے لکھ دیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ناظرین و ناظرات اس استدعا کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ جب کہیں تو اس کو ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہم 'خاتون' میں شائع کر دیں گے یا عباسی بیگم صاحبہ کے پاس بھیج دیں گے۔ سنہ تاریخ کے لیے فصلی کے بجائے ہجری یا عیسوی سنہ زیادہ موزوں ہوگا۔[۵] اگر چہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

یہ عمل متروک ہوتا گیا لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ عمل بیسویں صدی کے اختتام تک کم وبیش جاری رہا۔ 'قومی زبان' کراچی میں تو شمیم صبا متھراوی کم وبیش چالیس سال تک ''گزشتہ سال جدا ہم سے ہو گئے یہ لوگ۔۔۔'' کے عنوان سے معاصر شخصیات کی وفات کی تاریخیں کہہ کر شائع کرواتے رہے۔ 'الولی' حیدرآباد کے شماروں میں اکرام حسین سیکری کی 'مشاہیر سندھ کی تاریخ ہائے وفات، شخصیات سندھ، ادیبوں اور شاعروں، مشاہیر ملت، مشاہیر چین، اور مشاہیر عالم کے سال ہائے وفات/انتقال کے عنوانات سے متذکرہ سالوں میں فوت ہونے والی شخصیات کی کہی ہوئی تاریخیں شائع ہوئی ہیں۔[۶] ان کے علاوہ معاصر شخصیات کی وفات پر جستہ جستہ تعزیتی مضامین، نوحے اور مرثیے بھی دیکھنے میں آتے ہیں لیکن یہ روایت کسی بھی رسالے میں تواتر کے ساتھ نظر نہیں آئی۔

بہت کم رسائل ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو معاصر ادیبوں کی وفات پر مفصّل تعزیتی مضمون شائع کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے سب سے اہم ادبی رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ تھا جو اپنے شماروں میں ادیبوں کی وفات پر مفصّل تعزیتی شذرہ قلم بند کیا کرتا تھا۔ 'معارف' میں شائع ہونے والے شذرات میں فوت ہونے والی شخصیت کی ادبی، علمی اور نجی زندگی کا تذکرہ اختصار مگر جامعیت سے کیا جاتا اور فوت ہونے والی شخصیت کی علمی وادبی کارگزاریوں پر خراجِ تحسین پیش کیا جاتا تھا۔ 'معارف' میں ۱۹۱۶ء تا ۲۰۱۲ء تک چھیانوے سال میں ۷۸۳ شخصیات کی وفیات قلم بند کی گئیں۔ 'معارف' میں شائع ہونے والی وفیات کو ڈاکٹر سہیل شفیق نے مرتب کر کے شائع کروا دیا ہے۔[۷] 'برہان' دہلی ۱۹۳۸ء تا ۲۰۰۱ء شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے میں بھی تعزیتی شذرات شائع ہوتے رہے۔ مولانا سعید اکبرآبادی نے دوران ادارت ۲۴۵ وفیات خود تحریر کی ہے۔ ان وفیات میں انھوں نے انتہائی معتدل اور مثبت انداز میں شخصیات کے سوانح اور علمی وادبی کارگزاریوں کو تعزیتی مضامین کا حصہ بنایا ہے۔ ان کا انداز اس قدر دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ مرحوم شخصیت کا پورا خاکہ قاری کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔[۸] اسی طرح 'فاران' میں ماہرالقادری ''یادرفتگاں'' کے عنوان سے فوت ہونے والے ادیبوں، شاعروں، اسکالروں اور اہم شخصیات سے متعلّق تعزیتی شذراتِ قلم بند کیا کرتے تھے۔ یہ فقط تعزیتی تحریریں ہی نہ ہوتی تھیں، فوت ہونے والے ادیب کی زندگی کا مختصراً نچوڑ بھی ہوا کرتا تھا۔ ان وفیات سے ماہرالقادری اور فوت ہونے والی شخصیات کے باہمی تعلّقات پر روشنی بھی پڑتی ہے اور شخصیت کی علمی وادبی زندگی کی کارگزاریاں بھی سامنے آتی ہیں۔ ماہرالقادری اپنے موضوع پر (وفیات میں) اس عالمانہ شان

سے قلم اٹھاتے تھے کہ شخصیت کی عظمت بھی تمام وکمال کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی تھی اور ماہر القادری کا علمی تبحر بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہتا۔ ماہر القادری کی تحریر کردہ وفیات کی ایک خوبی خلوص اور درد مندی بھی ہے جس سے مصنّف اور شخصیت کی قربت اور قریبی تعلّق کا پتہ چلتا ہے۔ سیکڑوں رسائل و جرائد کی تاریخ کے مطالعے کے بعد متذکرہ تین رسائل کے علاوہ کچھ رسائل و جرائد اور تلاش کیے جا سکتے ہیں جن میں معاصر ادیبوں پر تعزیتی شذرات تواتر سے تحریر کیے جاتے ہوں لیکن شاید رسائل کے انبار میں متذکرہ خصوصیت کے حامل رسائل کی تعداد چند ناموں سے آگے نہ بڑھ پائے۔

اسی روایت کو مدیر 'نعت رنگ' نے آگے بڑھایا۔ 'نعت رنگ' کے بیشتر شماروں میں متذکرہ روایت کے بھرپور نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نقوش مدیر نعت رنگ نے ''نئے دکھ'' کے عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ تعزیتی شذرات میں ان شعرا و ادبا کی وفیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے نعت یا 'نعت رنگ' سے جڑے رہے اور یہی تعلّق ان کی تعزیت نگاری/وفیات نگاری کا سبب بنا۔ 'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات دو طرح کے ہیں۔ تفصیلی بھی اور مختصر بھی۔ کہیں دو دو چار چار سطروں میں فوت ہونے والی شخصیت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کہیں تفصیل سے فوت ہونے والی شخصیات کی شخصی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور نعت سے متعلّق خدمات کو مؤثر اور دل نشیں اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں طرح کی تحریروں میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے، وہ لکھنے والے کی نعت سے گہری وابستگی، خلوص اور مرنے والی شخصیات سے قلبی تعلّق ہے۔ مدیر 'نعت رنگ' کی تحریر کردہ وفیات صحافیانہ ہیں نہ غیر شخصی۔ ان کا عمومی انداز شخصی اور موضوعی رہا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وقت گزاری کا سامان نہیں بلکہ ان کے باطن سے پھوٹتی ہوئی تحریریں ہیں یا مرنے والے کی وفات کا جو تاثر مدیر پر طاری ہوا، اس کا بلا کم و کاست اظہار تحریری تعزیت کی صورت متشکل ہو گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ شذرات تاثر ہوتے ہوئے بھی فقط جذباتی اظہاریے نہیں، ان کے عقب میں مصنّف کی تنقیدی صلاحیت اور تحقیقی جوہر پورے آب و تاب سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ شذرات/مضامین، ان کی ادبی زندگی کا بامعنی نچوڑ ہیں۔ صبیح رحمانی نے تعزیتی شذرات میں مختصر مگر جچی تلی لفظیات کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیت کی لفظی تصویر کشی اور ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کر دیا ہے۔

'نعت رنگ' میں وفیات نگاری کا آغاز دوسرے شمارے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ دوسرے

شمارے کے اداریے میں مدیرِ نعت رنگ نے آفتاب احمد نقوی، مولانا عبدالعزیز شرقی اور اختر لکھنوی کی وفات پر قدرے مفصّل تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ شمارہ نمبر تین میں ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، افسر ماہ پوری، صہبا اختر اور رضی دہلوی کی وفات پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کی وفات پر قریباً ایک پیراگراف اور باقی کے حوالے سے ایک ایک دو دو سطروں میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تیسرے شمارے کے بعد ساتویں شمارے تک کسی شمارے میں وفیات کا تذکرہ نظر نہیں آتا البتہ آٹھویں شمارے کے اداریے میں اقبال صفی پوری، شمیم جے پوری، خالد بزمی، الحاج قمر الدین احمد انجم، الحاج محمد علی ظہوری قصوری، الحاج محمد اختر سدیدی کی وفات پر فقط اظہارِ تعزیت کیا گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی ہے البتہ نویں شمارے میں وفات پانے والی شخصیات کا دو دو سطری تعارف پیش کیا گیا ہے جو اس بات کا عکاس ہے کہ ابتدا میں مدیر وفیات نگاری کی طرف خصوصی توجہ دے نہیں پاتے تھے۔ باقاعدگی اور تواتر سے یہ رجحان بیسویں شمارے کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ ابتدائی شماروں میں وفیات نگاری کی کمی یادنگاری، گوشوں کے قیام اور متن میں شامل اکا دکا تعزیتی مضامین سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیسویں شمارے کے بعد وفیات نگاری کا عمل جس تواتر کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اب مدیر تعزیتی شذرات لکھنے کی طرف دل جمعی کے ساتھ توجہ دینے لگے ہیں۔ راقم السطور کے خیال میں یہ غالباً مدیر کی اس سوچ کا عکاس ہے کہ تعزیتی شذرات سے حقِ تعزیت ہی ادا نہیں ہوتا، مرنے والے کی خدمات کے اعتراف سے کسی حد تک ادبی قرض بھی ادا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی بچھڑنے والے کی یادوں کو تازہ کرنے سے کیتھارسس کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس حوالے سے مدیر کا درج ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ’’’نعت رنگ‘ کے ابتدائیے میں وفیات کے مرحلے تک آتے ہی جہاں دل زخم زخم ہو جاتا ہے وہیں مدحِ نبیِ کریم ﷺ وابستہ ان خوش بختوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے اور ان کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے روح سکون بھی پاتی ہے، شاید ہم اسی طرح اپنے احساسِ غم کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔‘‘[۹]

’’نعت رنگ‘‘ کے تیس شماروں میں ۱۳۰ سے زائد شخصیات کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔ تعزیتی شذرات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی تھی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ان کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکا۔ کبھی کبھی ’’نعت رنگ‘‘ کو مرتب کرتے کرتے خاصی تاخیر ہو جاتی تھی، چنانچہ

تعزیتی شذرات رمضامین لکھنے کے عمل کوملتوی یا مؤخر کر دیا جاتا۔اس کا ایک سبب وقت کی گنجائش کی عدم فراہمی بھی ہوا کرتی تھی۔ مدیر کا نقطۂ نظر یہ ہوتا تھا کہ اس صورتِ حال میں تعزیتی شذرات لکھنے کے عمل میں وقت صرف کرنے سے رسالے کی اشاعت مزید تاخیر کا سبب بن کر ''نعت رنگ'' کے قارئین کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتی ہے چنانچہ ایسے مواقع پر مدیر نے بادلِ نخواستہ تعزیتی مضامین لکھنے سے گریز کیا ہے۔اداریوں میں موقع بہ موقع بادلِ نخواستہ اس التوا کے حوالے سے ذاتی قلق کا اظہار بھی کیا ہے۔اس قسم کا اظہار ابتدائی شماروں میں زیادہ نظر آتا ہے۔شمارہ نمبر ۲۴ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سید الحق بدایونی، رہبر چشتی، مہر وجدانی اور سجاد مرزا کی وفات پر صرف نام لکھنے پر اِکتفا کیا گیا ہے۔ کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جن پر ایک ایک دو دو سطروں میں تعزیت کر کے حق تعزیت ادا کر دیا گیا ہے۔ایسا ابتدائی تحریروں میں زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔بیسویں شمارے کے بعد یہ طرزِ عمل مفقود نظر آتا ہے۔اس کے چار سبب ہو سکتے ہیں۔ایک تو معلومات اور تجربے کا فقدان کہ ابتدائی شماروں میں مدیر کو وفیات نگاری کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس نہیں ہوا ہوگا جو بعد میں پیدا ہوا۔ دوسرا روایت کی عدم موجودگی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، تیسرا رسائل کی ضخامت کے مسائل اور چوتھا وقت کی کمی۔ابتدا میں ان چاروں اسباب میں سے ہر بار کوئی نہ کوئی سبب وفیات نگاری کے اندراج میں رکاوٹ کا باعث بنتا رہا۔اسی وجہ سے ابتدائی شماروں میں وفیات نگاری کی کمی اور بے قاعدگی دیکھنے میں آتی ہے لیکن جیسے ہی تجربے نے اپنی مدت پوری کی، مالی آسودگی حاصل ہوئی، مدیر کے علمی رابطے بڑھے اور ادبی تعلّقات میں وسعت آئی تو وفیات نگاری رسالے ہی کی نہیں دل کی ضرورت بھی بن گئی گویا اب یہ ذہنی مسئلہ ہی نہیں رہا تھا قلبی معاملہ بھی بن گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں شمارے کے بعد کے ''نعت رنگ'' کے اداریوں میں تسلسل کے ساتھ تعزیتی شذرات لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔اور 'نعت رنگ' کے ہر شمارے میں کئی کئی شخصیات پر تعزیتی شذرات دیکھنے میں آتے ہیں۔

''نعت رنگ'' کے اداریوں میں وفیات نگاری کیوں تحریر کی گئیں؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ ان پر درج بالا پیراگراف سطور میں روشنی ڈالی گئی ہے لیکن خود صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کے اداریوں میں اس حوالے سے اپنے مؤقف کا اظہار کیا ہے۔ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''نعت رنگ'' کے ہر تازہ شمارے کی اشاعت پر اپنے مرحوم نعت نگاروں اور نعت کاروں کی یادوں کو تازہ کرنا ہمارا معمول رہا ہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جو تاعمر ذکر نبی کریم ﷺ کے چراغ

روشن کرتی رہی ہیں۔ ان سے جڑی یادوں کا ہجوم ان سطور کو لکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنے اطراف محسوس ہوتا ہے۔ کتنے لہجے، فقرے، اشعار اور واقعات یوں تازہ ہوتے چلے جاتے ہیں گویا ملاقات ہو رہی ہو۔ ان عظیم خدمت گزارانِ نعت کی زندگی اور احوال و آثار کا تذکرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ان اچھی مثالوں اور خلوص و محبّت کے حوالوں کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے عہد کی تاریخ کے طور پر محفوظ کر جائیں۔ یہ مثالیں اور یہ حوالے ان نئے رہ روانِ نعت کے لیے عزم و حوصلے کا باعث ہوں گے اور وہ ان سے ایک مقصدی زندگی کا ڈھنگ سیکھ سکیں گے، ان بزرگوں کی راہ پر چلتے ہوئے وہ خود اپنی زندگی کے اختتام کو اپنے بعد والوں کے لیے موت کا نوحہ نہیں، بلکہ ایک بامعنی اور دائمی زندگی کا نغمہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔[۱۰]

'نعت رنگ' کے اداریوں میں شائع شدہ تعزیتی تحریریں دراصل ان شعرا و ادبا کی وفیات کا تذکرہ ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے نعت یا 'نعت رنگ' سے جڑے رہے ہیں۔ یہ تمام شخصیات مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلّق رکھتی ہیں۔ ان سب کا بنیادی اور مرکزی حوالہ ادب کا بنتا ہے اور ادب میں خاص طور پر نعت کا۔ نعت بیشتر شخصیات کی دلچسپی کا محور و مرکز اور تخلیقی سفر کا بنیادی حوالہ رہی ہے۔ یعنی نعت وہ مرکزی مقام ہے جہاں صبیح رحمانی اور فوت ہونے والی شخصیات کے تعلّقات کی سرحدیں آ کر یک جا ہو جاتی ہیں۔ ان میں بعض شخصیات ایسی ہیں جن کے صبیح رحمانی سے گہرے مراسم رہے ہیں اور اکثر شخصیات وہ ہیں جن کا صبیح رحمانی سے تعلّق ذاتی مراسم کی سطح پر تو نہیں رہا لیکن تعلّق کی نوعیت کا سبب مدحت رسول ﷺ بنی ہے۔ چونکہ ان شخصیات نے نعت کی خدمت میں زندگی گزار دی تھی اس لیے یہ صبیح کے لیے بھی محبوب شخصیات بن گئی تھیں۔ ان شخصیات کی جدائی صبیح رحمانی کے لیے دوہرے دکھ کا باعث تھی۔ ایک فکری اور نظریاتی رفقا کی جدائی اور دوسری اور سب سے اہم فروغ نعت کا ناقابلِ تلافی نقصان۔ چنانچہ ان شخصیات پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی کا قلم یادوں کا بھرا ہوا دمن لیے دکھوں اور غموں کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور وہاں سے سوز و گداز سے لبریز گہر ہائے آبدار ڈھونڈ ھ لاتا ہے۔ ان کے خیال میں مرنے والے والوں کی زندگیاں ایک ایسی شخصیت سے وابستگی میں صرف ہوئی تھیں جو محبوبِ خالقِ کائنات اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہے۔ اس لیے وہ ان شخصیات کو خوش نصیب سمجھتے ہوئے تعزیتی شذرات میں رشک اور محبّت کے جذبات سے اشک بار نظر آتے ہیں۔ ان شخصیات پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی کے جذبے کی شدت اور خلوص کی فراوانی دیدنی

ہے۔مرحومین پر لکھتے ہوئے وہ ماحول کی سوگوار کیفیت کو اپنے اندر اتار لیتے ہیں پھر خود اس کیفیت میں اپنے آپ کو پہلے منتشر کرتے ہیں پھر مجتمع۔یادوں، باتوں اور خیالات کی خوشبو انھیں حال سے ماضی میں لے جاتی ہے اور پھر وہ حال کی طرف لوٹتے ہیں اور گزرے ہوئے یادگار لمحوں کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور قارئین کو بھی اس کیفیت میں شریک کرتے ہیں۔اس حوالے سے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ''نعت رنگ کے ہر شمارے میں تحریر کی ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب میرا قلم وفیات کی وادی میں اترتا ہے ان ساعتوں میں دل کا عجب عالم ہوتا ہے ہزار ضبط کے باوجود بچھڑنے والوں کا غم اشکوں کے سیل رواں کی صورت امنڈ آتا ہے کئی راتیں ایسی گزرتی ہیں جن میں مرحومین کی یادوں کا ہجوم جاگتا ہے اور جگاتا ہے۔(ذوقی مظفر نگری)

اشکِ غم و الم سے ہیں آنکھیں بھری ہوئی
پھرتا ہوں کشتیوں میں سمندر لیے ہوئے

ایسی حالت میں حواس پر قابو رکھنا اور کچھ لکھنا کہاں ممکن رہتا ہے! مگر میری خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ اسم محمد ﷺ کے سائبان میں زندگی گزارنے والے ان خوش نصیبوں کا کچھ نہ کچھ تذکرہ مدح نبی کریم ﷺ کی اس عصری دستاویز میں محفوظ ہو جائے۔یہ ہماری تہذیبی ضرورت ہے ورنہ ان کے غلاموں کو ہمارے تذکرے کی ضرورت نہیں وہ جس ذکر سے رشتہ قائم کر چکے ہیں وہ ذکر ہی ان کی دائمی زندگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے بقول شاہ انصار الہ بادی

ع ان پہ مرتے ہیں تو مرتے نہیں مرنے والے[۱۱]

(۲) ''نعت رنگ'' کے ہر شمارے میں بعض رفیقانِ سفر کی جدائی کا ذکر کرتے ہوئے دل کی عجب حالت ہوتی ہے۔موت ایک حقیقت ہے، مگر جانے والے اور خاص طور پر آپ کے فکری یا نظریاتی رفقا جو نعت کے فروغ میں آپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ مصروفِ عمل رہے ہوں، ان کی جدائی معمولی صدمہ نہیں رہتی:

کتنے رفیق ہم سے اچانک بچھڑ گئے
اب ان کی زندگی بھی بسر کر رہے ہیں ہم (نیاز بدایونی)[۱۲]

'نعت رنگ' کے اداریوں میں تعزیتی شذرات کو دو رنگوں سے پینٹ کیا گیا ہے۔ایک تو وہ ہے جس کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیت کی عظمت کو اس انداز میں اجاگر کیا گیا ہے کہ ہم ان شخصیات کے کارناموں اور حاصلات سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں اور دوسرا وہ رنگ ہے جس کے ذریعے وہ شخصیات کی علمی و ادبی شخصیت کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ شخصیت کی باطنی صورت

بھرپور انداز میں سامنے آجاتی ہے اور ہم ان شخصیات کو اپنی چشمِ تصور سے دیکھتے ہی نہیں محسوس بھی کرنے لگتے ہیں۔ وفیات نگاری کی روایت میں خاکہ نگاری کے یہ عناصر اگرچہ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں لیکن جہاں کہیں بھی تحریر میں آئے ہیں قارئین کو فکشن کا مزا دیتے ہیں۔ صبیح رحمانی نے اپنے دلکش تخلیقی اسلوب کے ذریعے فوت ہونے والی شخصیات کے جستہ جستہ ایسے نقوش ابھارے ہیں کہ ہماری دیکھی ہوئی شخصیت معلوم ہوتی ہیں۔ ذیل میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں خاکہ نگاری کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔

(۱) ''بعض شخصیتیں ایسی شاداب اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں کہ ان کو مرحوم لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ امجد صابری بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھا کہ اس کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔۔۔ ہمیشہ ادب اور نیازمندی کے ساتھ ملنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ایک دل آواز مسکراہٹ والا، سروں کی دنیا میں گم، یہ شخص اپنے وجود میں بھی موسیقی جیسا بہاؤ رکھتا تھا۔۔۔ میں نے اسے ہر جگہ ایک ہی رنگ اور کیفیت میں پایا یعنی ''سراپا محبّت''۔ افسوس کہ ساری دنیا میں دینی اقدار کی روشنی کو مذہبی کلاموں کے ذریعے پھیلانے والے اس چراغ کو دہشت گردی کا اندھیرا نگل گیا اور ہماری ریاست اپنی روایتی بے حسی سے دیکھتی رہی۔ اس کا پڑھا ہوا کلام ''جب وقتِ نزع آئے دیدار عطا کرنا'' اس کی وہ عرضی بن گیا جو یقیناً قبولیت سے سرفراز ہوئی ہوگی، لیکن اس کے جانے کے ایک ماہ بعد تک اس کی آواز میں یہ عشق وعقیدت اور طلبِ شفاعت ورحمت میں ڈوبی ہوئی التجا پاکستان کے ہر ٹی وی چینل پر گونجتی رہی اور لوگوں کے عقیدے اور عقیدت کو تازہ کرتی رہی۔ امجد صابری تم چلے گئے مگر تمھارے نام اور کام کی روشنی دلوں کو گرماتی رہے گی۔ (ان شاءاللہ)[۱۳]

(۲) ''شفقت رضوی نہایت منکسر المزاج اور گوشہ نشیں طبیعت کے مالک تھے۔ میری ان سے ملاقات ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ میں نے انھیں ''نعت رنگ'' کے دو شمارے پیش کیے اور پھر ایک تعلّق قائم ہوگیا۔ میں گاہے گاہے انھیں نعت کے حوالے سے کتب فراہم کرتا رہا اور پھر اللہ کی رحمت سے وہ نعت شناسی کی طرف متوجہ ہوئے اور تواتر سے اس موضوع پر لکھنے لگے۔ وہ نہایت غیر جانب دار اور جارح مبصّر ونقاد کے طور پر سامنے آئے جس کے لیے شعبۂ نعت کے اکثر احباب ذہنی طور پر تیار نہ تھے، کیوں کہ یہاں تو دل جوئی کا موسم صدیوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھا سو میں نے اور شفقت رضوی نے کئی دیرینہ دوست کھودیے انھوں نے ''نعت رنگ'' کے لیے بہت لکھا طویل جائزے، مضامین، تبصرے، دریافت کے عنوان سے کئی اہم اور نادر نعتیہ شہ پاروں کی تلاش اور تعارف ہر شمارے میں ان کی کوئی نہ کوئی تحریر شائع ہونے لگی اور یوں نعتیہ ادب کو ایک معتبر اور صاحب الرائے نعت شناس مل گیا۔

۔۔۔کچھ عرصے بعد انھیں اپنے بچوں کے ساتھ امریکا منتقل ہونا پڑا۔ اس تبدیلی کے لیے نہ وہ قلبی طور پر آمادہ تھے نہ ذہنی طور پر، امریکا سے اکثر ان کے خطوط موصول ہوتے رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ وہاں خوش نہیں ہیں۔ زندگی بھر کام کی دھن اور لگن میں وہ قرطاس وقلم سے ایسے وابستہ ہو چکے تھے کہ اب اس سے وقتی جدائی بھی انھیں نا آسودہ کر دیتی تھیں۔ میں اکثر انھیں یہاں سے کتب ارسال کرتا جس پر اپنی رائے کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتے تھے۔ گویا یہ علمی تحفے انھیں وہاں تر و تازہ رکھنے کا کام سرانجام دیتے تھے لیکن وہ وہاں بھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے اپنی یادداشتیں مرتب کرنا شروع کر دی اور اس کے کچھ حصے انھوں نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کو ارسال بھی کیے اور ''نعت رنگ'' کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ برکت اللہ بھوپالی اور حسرت کی صحافیانہ زندگی پر بھی انھوں نے کتابیں وہیں مرتب کی پھر اچانک ان کی طبیعت کی خرابی اور وطن واپسی کی خبر آئی۔ ڈیفنس میں اپنے ایک دوست پروفیسر انیس زیدی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وطن کی محبّت انھیں واپس کھینچ لائی ہے اور یہاں رہ کر مزید کام کرنے کے آرزومند ہیں۔ مجھ سے کہا کہ کوئی موضوع دو، میں حج پر جانے والا تھا میں نے انھیں کافی مراد آبادی کی کتب کی عکسی نقول دی اور کہا اس پر کام کریں۔ بخوشی راضی ہو گئے کوئی بیالیس دن بعد میں واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ طبیعت بہت خراب ہے اور آئی سی یو (ICU) میں ہیں۔ ہسپتال گیا مگر ملاقات نہ ہو سکی گھر چلا آیا، اسی رات یہ اطلاع آ گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اپنے کسی خط میں انھوں نے مجھے ایک شعر لکھا تھا جو آج ان کے نصب العین کے طور پر ذہن میں تازہ ہو رہا ہے:

کچھ ایسے کام کرلو جو تم کو زندہ رکھیں
صدیاں کشید کرلو لمحوں کی زندگی سے

شفقت رضوی اپنے اس نصب العین میں کامیاب رہے اس کا گواہ صرف میں ہی نہیں ہماری پوری ادبی دنیا ہے۔[۱۴]

وفیات لکھتے ہوئے صبیح نے شخصیات کے ایسے گوشوں اور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جنھیں اس شخص کی نمائندہ جہت کہا جا سکتا ہے اہم بات یہ ہے کہ ان سے شخصیت کے ذہنی رویوں اور داخلی احساسات اور کیفیات کا بھی پتا چلتا ہے۔ احمد صغیر صدیقی ''نعت رنگ'' کے باقاعدہ قاری اور مستقل مزاجی سے اس رسالے میں کبھی خط اور کبھی مضمون کی صورت اپنی موجودگی کا ثبوت دیا کرتے

تھے۔ان کے 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے اکثر خطوط علمی نوعیت اور تنقیدی اظہار کے باوصف کسی مضمون یا مقالے سے کسی طور پر مختلف نہیں۔کم وبیش تمام خطوط میں ان کی تنقیدی صلاحیت اور ان کا علمی وادبی مطالعہ ساتھ ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔مدیر نعت رنگ نے ان کی وفات پر لکھتے ہوئے ان کی شخصیت کے اہم گوشوں کی کس خوبصورتی سے نشان دہی کی ہے۔اس کی شہادت ذیل کے اقتباس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ملاحظہ فرمائیے:[۱]

تھے یہاں سارے عمل ردِّعمل کے محتاج

زندگی بھی ہمیں درکار تھی مرنے کے لیے

احمد صغیر صدیقی بھی چلے گئے،ان کا یہ خوبصورت شعران کے شعری مجموعے ''لمحوں کی گنتی'' میں کبھی نظر سے گذرا تھا، آج اس اندوہناک خبر نے ذہن میں یہ شعر تازہ کردیا۔احمد صغیر صدیقی بحیثیت شاعر،ادیب،نقاد،کہانی کار اور مترجم کے عصری ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت اور اعتبار کے رنگوں کو گہرا کر چکے تھے۔۔۔ہندوپاک کے تمام قابل ذکر رسائل وجرائد میں ان کا کلام اور تحریریں تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔نعت رنگ سے انھیں بے حد محبّت تھی اور وہ مذہبی شاعری کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات اور ان کے جواب میں شائع ہونے والے مضامین کو بہت توجہ اور شوق سے پڑھتے تھے۔نعت رنگ میں ان کے مستقل خطوط شائع ہوتے رہے ہیں اور ہر خط میں وہ بعض نکات ایسے اٹھاتے تھے جس پر لوگوں کا ردّعمل نعتیہ تنقید میں نئے مباحث کو جنم دیتا تھا۔۔۔انھوں نے نعت رنگ کے لیے بعض مضامین بھی لکھے جو ان کی تنقیدی بصیرت اور جرأتِ اظہار کا آئینہ خانہ ہیں۔[۱۵]

ان سطور میں احمد صغیر صدیقی کے حوالے سے چند اشارے کیے گئے ہیں لیکن ان اشاروں سے بھی ان کی شخصیت اس طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ قارئین نہ صرف چشمِ تصور سے انھیں دیکھ لیتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے علمی پہلوؤں سے بھی آشنا ہوجاتے ہیں۔ان سطور سے ان کے خارجی نقوش تو نہیں ابھرتے لیکن ان کے باطن میں اترنے اور داخل میں جھانکنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے۔ صبیح رحمانی 'نعت رنگ' کے اداریوں میں فوت ہونے والی شخصیات پر لکھتے ہوئے مرحوم سے متعلّق ایسے واقعات اور پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں جن سے مرحوم کی نعت سے عقیدت،محبّت اور قلبی لگاؤ کے تمام مظاہر آشکار ہوجاتے ہیں۔ماہر القادری کی طرح شخصیت سے اپنے تعلّق کے حوالے نقل کرتے ہیں۔اسی طرح اس شخصیت سے ان کا تعلّق اور 'نعت رنگ' میں پیش کش کا دوطرفہ جواز

بھی نکل آتا ہے۔ پیر نصیر الدین نصیر گولڑوی اور شفیق احمد فاروقی کے تعزیتی شذرات میں اس کے ثبوت ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ چند مثالیں مزید ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ''مولانا عبدالعزیز شرقی نے کم وبیش ۲۵ سال مدینۃ الرسول ﷺ میں تسلسل کے ساتھ گزاری اس سے پہلے انھوں نے کئی حج اور عمرے کیے مولانا برصغیر کے ان عظیم صوفیا میں سے ہیں جنہیں جنت بقیع میں جگہ ملی۔ اپنے بیٹے کو انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ اگر میں بیمار پڑوں اور ہوش میں نہ رہوں تو علاج کے لیے مجھے حدود حرم سے باہر نہ لے جانا۔۔۔مولانا شرقی جماعت اسلامی کے بنیادی رکن تھے لیکن جب جماعت سے اختلاف ہوا تو خاموشی سے علیحدہ ہو گئے مگر زندگی بھر جماعت یا مولانا مودودی کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ سرورِ کائنات ﷺ کے اس غلام کو اپنے آقا کی ثنا خوانی سے فرصت ملتی تو کسی اور کا ذکر کرتا۔ ایک بار مدینے کے گورنر کے دفتر سے حکم ملا فوراً وطن واپس جاؤ۔ شرقی صاحب مواجہ شریف پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک اردو اور ایک فارسی نعت کہی۔ فارسی نعت کے ایک مصرعے میں اپنا عریضہ اس طرح پیش کیا۔

ع بر درِ تو نشستہ ام از درِ تو کجا روم

ترجمہ: ''میں تو آپؐ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہوں آپؐ کے دروازے سے کہاں جاؤں۔''

اگلے دن گورنر کے دربار میں پیشی ہوئی۔ گورنر نے چہرہ دیکھا اور کہا کہ شیخ کو اجازۃ العبادہ دیا جائے۔ یوں مولانا عبدالعزیز شرقی مدینے کی مکین بن گئے۔''[۱۶]

(۲) عاصی کرنالی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل کٹتا ہے، کتنے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھے جو ایک بار ان سے مل لے ان کا ہو جاتا تھا۔ شوخی، ذہانت، جملے بازی، خوش اخلاقی اور دل جوئی جیسے اوصاف نے مل کر عاصی صاحب کو باغ و بہار شخصیت بنا دیا تھا۔ تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، سفرنامہ، غزلیں، مناقب، مراثی، انھوں نے جس طرف رُخ کیا اپنے جوہر تخلیق سے گلستاں آباد کیے مگر نعت ان کے مزاج میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ ان کے سرمایہ تخلیق کا غالب حصہ ہمیں نعت ہی پر مشتمل نظر آتا ہے۔۔۔۲۰ جنوری ۲۰۱۱ء کو اپنی تخلیقی زرخیزی سے نعتیہ شاعری سنوارنے اور نکھارنے والا یہ خوب صورت اور صاحبِ اسلوب شاعر اپنی نعت گوئی کو اپنی عاقبت کا توشہ بنا کر یقین کی اس روشنی کے ہمراہ قبر کی تاریکی میں جا سویا:

کفن میں رکھ لیا تھا ایک کاغذ نعتِ روشن کا
یہ کاغذ قبر کی ظلمت میں عاصیؔ میرے کام آیا[۱۷]

(۳) چودھری عبدالغفور قمر نعت کا عمدہ ذوق رکھنے والے قاری تھے۔۔۔مرحوم نے نہ صرف قدما سے لے

کر عصرِ حاضر تک کے نعتیہ گوشعرا کی عقیدتوں کو جمع کرنے کی سعی مشکور کی ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ ان کے اپنے تاثرات بھی شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ اپنے ایک خاص آدرش اور ذوق شعری کے تحت کر رہے تھے اور جہاں جہاں ان کے اس ذوق کی تکمیل احسن طور پر ہوتی نظر آتی تھی وہیں وہ اپنے تاثرات بھی پیش کر دیتے تھے۔ اس انتخاب کے دوران وہ ہر اس شخص کے پاس گئے جس کے بارے میں انھیں علم ہوا کہ وہاں نعت کی کتب موجود ہیں اور یہی تلاش ان کو مجھ تک بھی لائی۔ تقریباً ۱۰۰ رکتب روزانہ وہ منگواتے اور اگلے روز انھیں واپس کر کے ۱۰۰ ر مزید نعتیہ مجموعوں کا تقاضا کرتے۔ ایک دن میرے حیرت کرنے پر انھوں نے کہا کہ یہ میری آکسیجن ہے۔[۱۸]

(۴) نعت خوانی کے اُفق پر چالیس سال سے معیار، اعتبار، عشق و ادب اور تہذیب و شائستگی کی علامت بن کر چمکنے والا نمایاں ستارہ بھی موت کی تاریکی میں گم ہو گیا، مگر اپنے پیچھے نعت خوانی کے اعلیٰ ذوق اور پڑھت کی ایک ایسی مؤدب اور شائستہ مثال چھوڑ گیا جسے نعت کی مجلسی روایت میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔[۱۹]

درج بالا مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صبیح رحمانی نے شعرا کی وفیات تحریر کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں کی پوٹلی پر لگی ہوئی گرہوں کو اس طرح کھولا ہے کہ ماضی حال کی تصویر بن کر سامنے آنے لگتا ہے۔ ان وفیات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان سے بعض ایسی معلومات پر سے بھی پردہ اٹھتا ہے جن کے عینی شاہد خود مدیر نعت رنگ ہیں۔ 'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات کا مطالعہ کیجیے ،ان میں بہت سی معلومات تو ایسی ہیں جو مرحومین کے آخری دنوں کی یادداشتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اسے مرحوم کی زندگی کا اختتامی سین بھی سمجھا جا سکتا ہے اور آخری دنوں کی یادداشتوں کا قیمتی خزانہ بھی۔ ملاحظہ کیجیے:

(۱) ۲۵ جون ۲۰۱۲ء کو نعت کے منظر نامے سے ایک اور اہم روشن ستارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر موت کی تاریکی میں گم ہو گیا۔۔۔ ستر کی دھائی سے مسلسل نعت کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں بے شمار مضامین لکھے ہیں اور یہ سلسلہ تا دمِ مرگ بھی جاری و ساری رہا۔ پاکستان سے شائع ہونے والے تمام رسائل و جرائد میں ان کے مضامین کی شمولیت اس بات کی غماز ہے کہ انھوں نے فروغِ نعت کے لیے نکلنے والے ہر جریدے کی قلمی سرپرستی کی۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کے حوالے سے ان کی برق رفتاری سے صاف ظاہر تھا کہ ایک مسافر، سفر پر جانے کی تیاری میں مصروف ہے اور اسے اس بات کا شعور ہے کہ اس سفر پر جو توشہ ساتھ لے جانا ہے اس میں غلامی و عشقِ نبیِ کریم ﷺ کی سند اور دستاویزات ضروری ہیں۔

نعت سرکار مرے دور کی پہچان بھی ہے
میری بخشش کا سرِ حشر یہ سامان بھی ہے

مجھے یقین ہے کہ دنیا میں نعت جس طرح ان کی پہچان اور شناخت کا حوالہ رہی ہے حشر میں بھی ان کی بخشش کا سامان ہوگی! ان شاءاللہ! [۲۰]

(۲) ریاض حسین چودھری کا شمار پاکستان کے ان چنیدہ نعت گو شعرا میں ہوتا تھا جو اپنے اسلوب سے الگ پہچانے جاتے تھے۔۔۔ وہ عمر کے آخری حصے میں بھی تخلیقی طور پر نہایت فعال اور متحرک رہے۔ کئی بیماریوں سے نبرد آزما ہونے اور ضعف کے باوجود نعت گوئی کا شغف انھیں تازہ دم رکھتا تھا۔ اکثر فون پر اپنے آنے والے مجموعوں کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے ان کی آواز میں عزم و ہمت کی روشنی صاف محسوس ہوتی تھی۔ کتابوں کے ناموں پر مشورہ، کن احباب سے رائے لی جائے، ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار، غرضے کہ وہ نقاہت اور بیماری کے باوجود کافی دیر تک فون پر گفتگو میں مصروف رہتے اور نعت کے ادبی فروغ کی صورت گری کے خوابوں کو تعبیر میں ڈھلتے دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ انھوں نے اپنی نعت کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے مکالمے کی صورت دے دی تھی۔ دیکھیے لاغر وجود میں ایک توانا روح کس طرح آقا سے التجائے کرم میں مصروف ہے:

حضور کتنے عوارض بدن سے لپٹے ہیں — قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں رہی آقا
حضور سانس بھی لینا محال ہے اب تو — کھڑی ہے سر پہ مرے شامِ زندگی آقا

ان کے چار مجموعوں کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ خدا کرے ان کا باقی ماندہ تخلیقی و تحریری سرمایہ بھی شائع ہو کر محفوظ ہو جائے۔ [۲۱]

(۳) '' آخری دنوں میں میرے کہنے پر انھوں (گوہر ملسیانی) نے نعت پر اپنے لکھے ہوئے مضامین یکجا کر کے اشاعت کے لیے 'کتاب سرائے' کو بھیجے تھے۔ [۲۲]

تعزیتی تحریروں میں متاثر کن اور حزن و ملال میں ڈوبا ہوا شذرہ سید اسحاق الدین کا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا صبیح رحمانی نے اپنا دکھی دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور ہم چشمِ تصور سے حزن و ملال کی کیفیات اور ماحول کو نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ اس شذرے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ لفظ نہیں چشمِ غم سے ٹپکنے والے آنسو ہیں جنھوں نے تحریر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اقبال نے اپنی والدہ کا پرتاثیر مرثیہ لکھا تھا جس میں زندگی اور موت کے فلسفے کو بیان کیا تھا۔ [۲۳] صبیح رحمانی نے مختصر سی تحریر میں نہ

حیات وممات کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے نہ والد مرحوم کے اخلاق وفضائل پر لمبی چوڑی تقریر کی ہے فقط اپنا کلیجہ نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۷/اگست رات بارہ بجے سے کچھ اوپر کا وقت تھا جب وہ ہاتھ جس کی انگلی تھام کر میں نے زندگی کے راستوں پر کھڑا ہونا، چلنا اور پھر دوڑنا سیکھا، میرے ہاتھوں میں دیکھتے دیکھتے زندگی کی حرارت سے محروم ہو گیا۔ کیسا لمحہ تھا، کیا بے بسی، ہائے ہائے۔ طبیعت تو ان کی کئی برسوں سے خراب تھی مگر پچھلے پانچ برس سے وہ مستقل بسترِ علالت پر رہے، کمزوری اور بیماریوں سے لڑتا جسم روز بہ روز نڈھال ہوتا جا رہا تھا، سماعت اور بصارت معدوم ہو چکی تھیں۔ نہ کچھ کہنے کے قابل نہ سننے کے، تاہم ان کے ہونے کا احساس بھی بہت تھا۔ ان کے ماتھے پر بوسے کی حلاوت، ان کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر سہلانے کے عمل سے میسر آنے والی جذبوں کی آسودگی، ان کی کمر اور پیروں کو آہستگی سے دبانے کے سعادت آثار لمحے، ان کو آواز دے کر ان سے کسی جواب کی موہوم سی اُمید۔ ان کے چلے جانے سے اچانک کیا کچھ چھن گیا ہے جیسے کسی نے سر سے آسمان اور پیروں سے زمین کھینچ لی ہو۔ کہیں خلا میں متعلّق سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ گھر جاؤں تو ان کا خالی بستر اور والدہ کی خالی آنکھیں دیکھنا کسی قیامت سے کم نہیں۔ یہ صرف میرا ہی نہیں میرے تمام بھائی بہنوں کا احوال ہے۔ ذہن و دل ویران ہیں اور قلم کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں۔

نظروں میں بھی ہے، دل سے بھی مستور نہیں ہے
نزدیک نہ ہو کوئی مگر دور نہیں ہے

میں اپنے والد کی وفات پر ساری دنیا سے اہلِ محبّت کے تعزیتی پیغامات اور ایصالِ ثواب کی محافل کے انعقاد پر تہِ دل سے ممنون ہوں اور قارئینِ نعت رنگ سے بھی دعا کے لیے التماس گزار ہوں کیونکہ اگر مجھ میں کوئی وصف ہے تو وہ میرے والد کی تربیت کا فیض ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی کامل مغفرت فرمائے اور انھیں شفاعتِ نبی کریم ﷺ نوازے۔ آمین!'' [۲۴]

وفیات نگاری کے سلسلے میں جن مرحومین کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے اکثر نعت گو شعرا ہیں۔ ان شعرا پر لکھتے ہوئے صبیح رحمانی ان کے شعری نمونوں سے ایسا زندہ شعر درج کرتے ہیں جو مرحوم کی تخلیقی جہت اور نعت سے قلبی تعلّق کو آشکار بھی کرتا ہے اور اس کے عقیدۂ آخرت پر روشنی بھی ڈالتا ہے۔ اس طرح کے شعر کے اندراج کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین فوت ہونے والے شاعر کے

ایک ہی شعر سے یہ اندازہ لگا سکیں کہ مرنے والا نعت کو اپنے لیے کس طرح توشۂ آخرت یا وسیلۂ نجات سمجھتا تھا۔شذرات کے آخر میں صبیح رحمانی مرنے والے کے عقیدے یا عشق کے مطابق اس کے خاتمے کے لیے دعا کرتے ہوئے اختتامی کلمات کی طرف بڑھتے ہیں۔جو ایک طرف اختتامی کلمات ہوتے ہیں تو دوسری طرف تعزیت کی ادائیگی۔مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

تھے یہاں سارے عمل ردِّعمل کے محتاج
زندگی بھی ہمیں درکار تھی مرنے کے لیے

احمد صغیر صدیقی بھی چلے گئے، ان کا یہ خوبصورت شعر ان کے شعری مجموعے ''لمحوں کی گنتی'' میں کبھی نظر سے گذرا تھا، آج اس اندوہناک خبر نے ذہن میں یہ شعر تازہ کر دیا۔[۲۵]

دوستو جشنِ تعیّش میں نہ لے جاؤ مجھے
مجھ کو فقرِ شہ والا سے حیا آتی ہے

وادیٔ نعت میں اس طہارتِ فکر و نظر اور نازک خیالی کے ساتھ داخل ہونے اردو کے ممتاز اور پختہ کار نعت گو جعفر بلوچ ۲۷ر اگست ۲۰۰۸ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔[۲۶]

اختر لکھنوی بہت دنوں تک مشاعروں کے اسیر رہے مگر پھر ان کا عشق پھیل کر اور وسیع ہو کر عشق سرورِ کائنات ﷺ کے پیکر میں ڈھل گیا اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ نعت گوئی میں صرف ہونے لگا۔کئی مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے۔ذاکر رسول ﷺ کے کردار میں اخلاق رسول ﷺ کی نمود نظر آنے لگی۔کوئی تنقید کرتا تو سن کر خاموش ہو جاتے۔زبان کی یہ نگہداشت آج کے معاشرے میں کم نظر آتی ہے۔وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن ان کے تین شعری مجموعوں میں سے دو مجموعے 'سرکار' اور 'حضور ﷺ' نعتیہ شاعری پر مبنی ہیں جو ان کی نعتیہ شاعری کے ذوق کا مظہر ہیں ان کا یہ شعر تو میرے لوحِ دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے ہمیں اچھا نہ لگا اے اختر
ہم سے پہلے درِ سرکار پہ جانا دل کا

مدینے سے اس دلی تعلّق کا ثبوت اختر لکھنوی نے یوں بھی فراہم کیا ہے کہ جس دن انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ان کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر حرمین شریفین روانگی کی تاریخ بھی وہی درج تھی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان نعت احمدؐ را[۲۷]

صبیح رحمانی ایک شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں۔ان کی تنقیدی تحریروں کے نقوش ان کے

اداریوں، مقدمات اور دیگر تحریروں میں بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے تنقیدی نقوش اداریوں میں تو موجود ہیں ہی وفیات میں بھی جستہ جستہ نظر آتے ہیں۔شعرا پر لکھتے ہوئے صبیح کا نقطۂ نظر، ان کے تنقیدی وژن، اصابت رائے اور فکری گہرائی کا عکاس ہے۔عام طور پر تنقیدی آراء وفیات کے آخری حصے میں نظر آتی ہیں لیکن کہیں کہیں آغاز میں بھی نظر آجاتی ہیں۔وفیات لکھتے ہوئے مرحومین کے تخلیقی اور تحقیقی وتنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین اور شعری فکر کا تجزیہ مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے جسے پڑھ کر محمد حسین آزاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔قاری ادب کا مزا بھی لے سکتا ہے اور تنقید کا بھی۔عام طور پر تنقیدی آرا آخری حصے میں لکھی گئی ہیں لیکن کہیں کہیں اس کا اظہار آغاز میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔شمارہ نمبر ۲۵ میں شفیق احمد فاروقی پر لکھتے ہوئے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ آغاز ہی میں لے لیا گیا ہے۔تعزیتی شذرات سے لیے گئے چند تنقیدی نمونے ملاحظہ فرمائیے:

(۱) انھوں (ریاض حسین چودھری) نے اپنی نعت کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے مکالمے کی صورت دے دی تھی۔دیکھیے لاغر وجود میں ایک توانا روح کس طرح آقا سے التجائے کرم میں مصروف ہے۔[۲۸]

(۲) ان (فقیرِ مصطفیٰ امیر) کی نعت گوئی نبی کریم ﷺ سے ان کی گہری عقیدت اور والہانہ پن کا اظہار ہے۔ انھیں فن سے زیادہ جذبہ صادق کی نمود سے اپنے نعتیہ کلام کو آراستہ کرنے کا ذوق وشوق رہا۔[۲۹]

(۳) قرآن وحدیث اور تاریخ کے جو اشارے ان (ابوالامتیاز ع س مسلم) کے کلام میں ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے تبحرِ علمی، عمیق مطالعے اور تحقیق وتجسّس کی گواہی دیتے ہیں۔ان کی نعت کا اساسی موضوع دربارِ رسالت میں حاضری وحضوری ہے کہ سفرِ حضوری ہی سے ان کی نعت گوئی کا آغاز ہوا تھا۔[۳۰]

(۴) حمایت بھائی کی نعتیہ شاعری بھی محض عقیدت کی بنیاد پر وجود میں آنے والی شاعری نہ تھی بلکہ اس میں ان کا سماجی شعور اور رسولِ اکرم ﷺ کا بنی نوع انسان کے لیے باعثِ رحمت ہونا اور رہنمایانہ کردار کا حامل ہونا نمایاں رہا۔[۳۱]

(۵) جب ان (نصرت رحیمی) کا مجموعہ کلام ''سعادت کے موتی ۱۹۹۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تو مجھ سمیت کئی احباب خوشگوار حیرت سے دو چار ہوئے زبان وبیان کے ساتھ شائستگی اور تخلیقی شعور نے ان کے کلام میں عشق نبی کریمؐ کی روشنی کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ [۳۲]

کچھ شذرات کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ صبیح رحمانی نے انھیں احاطۂ تحریر میں لانے سے قبل تحقیق وتلاش کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ان شذرات میں فوت ہونے والی شخصیت کی

پیدائش و وفات کے سنین، تخلیقات، تصانیف اور کارگزاریوں کا احاطہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ متذکرہ مراحل ان کے محققانہ مزاج اور تحقیقی صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ہیں تو تعزیتی شذرات لیکن ان پر مقالے کا گمان گزرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم شذرہ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کا ہے۔[۳۳]

'نعت رنگ' میں شامل تعزیتی شذرات ایک طرف ادبی رسائل کی روایت سے جڑے تسلسل کی ایک منفرد مثال پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اردو کے نعتیہ رسائل رصحافت میں ایک ایسے اجتہادی عمل کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جس نے نعتیہ صحافت کو ایک نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئے ذائقے سے روشناس کیا۔ گذشتہ دو تین دہائیوں میں اردو کے ادبی افق پر کئی نعتیہ رسائل، رسائل نمبر اور انتخابات نمودار ہوئے ہیں۔ ان میں تعزیتی شذرات رمضامین کے جستہ جستہ اور بکھرے ہوئے نقوش تو ضرور دیکھنے میں آتے ہیں لیکن، تعزیتی شذرات کی جو متنوع صورتیں 'نعت رنگ' میں سامنے آئی ہیں، ان کا عشر عشیر بھی متذکرہ رسائل میں نظر نہیں آتا۔ اردو کے ادبی رسائل میں 'نعت رنگ' کا شمار ان چند رسائل میں کیا جا سکتا ہے جس نے اردو رسائل کی روایت کو آگے بھی بڑھایا اور اسے نئے ذائقے، نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے آشنا بھی کیا۔ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے تعزیتی شذرات تحقیق وتنقید کا رنگ لیے ہوئے بھی ہیں اور خاکہ نگاری کے نقوش سے بھی آراستہ ہیں۔ زبان و بیان کا خوش رنگ اور رسیلا ذائقہ اس پر مستزاد ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ 'نعت رنگ' ایک نعتیہ صحافت کا نمائندہ رسالہ ہی نہیں اردو کے دیگر ادبی رسائل میں بھی ایک منفرد اور قابلِ تقلید مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

د: صبیح رحمانی کا اسلوبِ نگارش

اُردو کی ادبی روایت کا مطالعہ کرنے والے قاری کے سامنے مختلف و منفرد اسالیب کے حامل نثر نگاروں کی تحریریں سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے کچھ نثر نگار ایسے بھی ہیں جن کا اسلوب اپنے معاصرین ہی نہیں اردو کے تمام نثر نگاروں میں انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی تحریروں کو بلا مبالغہ بیسیوں تحریروں میں پہچانا بھی جا سکتا ہے۔ ایسے ہی صاحبِ طرز ادیبوں میں محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی، قاضی عبدالغفار اور سجاد انصاری کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ ان ادیبوں کے اسالیب سے ان کے معاصرین نے بھی حسبِ استطاعت استفادہ کیا اور متاخرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ آج تک جاری و ساری ہے۔ کسب فیض کی یہ مثالیں ''نعت رنگ'' کے اداریوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ادب میں زبان کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے ایک ادیب اپنے خیالات و افکار اور جذبات و احساسات کو لفظی پیکر کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر کرتا ہے۔ ادبی اور غیر ادبی تحریر میں حقیقی امتیاز تخلیقی اظہار کے ذریعے ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ خوبصورت تصور اور رعنائیِ خیال موزوں، برمحل اور دل نشیں لفظیات کے پیکر کا متلاشی ہوتا ہے۔ ناموزوں اور غیر ضروری لفظیات اور محض عبارت آرائی، خیال آفرینی اور ابلاغ کے راستے میں رکاوٹ بھی بنتی ہے اور بھرپور تاثر کو زائل کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ خیال اور اظہار میں کامل ہم آہنگی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ تاہم ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ادب فقط اظہار بیان ہی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں، راستہ ہے منزل نہیں۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

طرزِ ادایا اظہارِ خیال کو ادبیت کی تخلیق میں اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

تخلیق کار لفظ کا پارکھ اور مزاج شناس ہوتا ہے وہ اپنے دماغ میں پرورش پانے اور کلبلانے والے خیال کو برمحل لفظیات اور اظہار کی تخلیقی صلاحیت کے سہارے ہی وجود عطا کرتا ہے۔ تخلیق کار کا یہی ہنر ہے جو قارئین یا سامعین کے نہاں خانۂ دل میں اتر سکنے اور جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نقاد اس حقیقت سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے لہٰذا وہ فن کار کے ذہن کی تنگنائیوں میں پرورش پانے والے خیال کی تفہیم بھی انھی نقوش کی روشنیوں کے ذریعے کرتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ، خیال کی تفہیم میں بنیادی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ جدید لسانی نظریات نے تو متن کی تفہیم کے لیے قاری اور اس کے عصری ماحول کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔

''نعت رنگ'' کے اداریوں میں ایک ایسے منجھے ہوئے اور مشاق قلم کار کا اسلوب سامنے آتا ہے جس کی دسترس میں خیال کی رعنائی بھی موجود ہے اور تخلیقی اظہار کی صلاحیت بھی۔ لفظوں کا قابلِ قدر ذخیرہ بھی موجود ہے اور ان کے برمحل استعمال کا سلیقہ بھی۔ تراکیب، محاورات، تکرار لفظی، رعایتِ لفظی، قوافی اور دیگر لسانی اور ادبی اوصاف معنی خیزی اور ترسیل خیال کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ صبیح رحمانی کی تحریروں میں یہ ہنر ایک دوروز میں پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی تشکیل میں مدیر کا مسلسل مطالعہ، گہرا مشاہدہ، مستقل ریاضت کا عمل کام کر رہا تھا۔ 'نعت رنگ' کے ابتدائی شماروں میں اس ہنر کی جھلکیاں جستہ جستہ اور بکھری ہوئی حالت میں موجود ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی آتی گئی۔ ہنرکاری؛ تجربہ، مشق اور طویل ریاضت کا تاوان طلب کرتی ہے اس کے بعد ہی کوئی عنصر موجز ۂ فن میں ڈھل کر شہرت و ناموری اور تحسین و ستائش کے قابل ٹھہرتا اور حیات جاوید سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'نعت رنگ' کے اداریوں کے اسلوب کی تشکیل و تعمیر میں صبیح رحمانی کی مسلسل مشق اور ریاضت پیہم کار فرما رہی ہے۔

'نعت رنگ' کے ابتدائی اداریوں کا اسلوب سادہ، بیانیہ، وضاحتی اور بول چال کے قریب ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے، اسلوب رواں اور کسی حد تک سپاٹ ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ اسلوب ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا اور حسن و دل کشی، شگفتگی اور ادبیت کے عناصر اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ چھبّیس سال کی عمر میں 'نعت رنگ' کی ترتیب و اشاعت کا آغاز کرنے والے نوجوان کو نہ تو کسی ادبی گروہ یا شخصیت کی پشت پناہی حاصل تھی اور نہ ان کی پشت پر باوقار خاندانی علمی پس منظر موجود تھا۔ فقط

فروغ کا نعت کا جذبہ ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ اس میں شدت بھی تھی اور خلوص بھی۔ جذبے کی شدت اور خلوص کی گہرائی نے ان کا اسلوب سادہ، رواں اور بے ساختہ بنا دیا تھا لیکن جیسے جیسے عمر اور تجربہ بڑھتا گیا اور مطالعے اور مشاہدے کے دائرے وسیع ہوئے، ان میں اعتماد اور یقین کی پختگی آتی گئی جس کا اثر ان کے افکار پر بھی پڑا اور ان کے اسلوب میں بھی ظاہر ہوا۔

رفتہ رفتہ ان کے اسلوب میں جذبے کی شدت اور خلوص کی سچائی کے ساتھ اظہار کی پختگی اور خیالات کا بہاؤ بھی تیز تر ہوتا گیا۔ اسلوب بھی سادگی سے پرکاری، شخصی سے علمی، عمومی سے ادبی اور تخلیقی ہوتا گیا۔ اس کے دو سبب تھے۔ تین دہائیوں کا تجربہ اور ادبی ریاضت اور دوسرا منزل کی قربت، مقاصد کا حصول اور معاصر ادبی روایت میں 'نعت رنگ' کی منفرد شناخت۔ اب چونکہ ''نعت رنگ'' کا حلقہ فقط عوام تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ اس کے قارئین میں ادیب، نقاد، دانشور، علما اور ادب کے طلبہ بھی شامل ہو گئے تھے لہٰذا اب ان کی گفتگو عوام کے ساتھ ساتھ خواص سے بھی ہونے لگی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علم و ادب کی بڑی آوازیں عوام کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ مدیر نعت رنگ کا نقطۂ نظر یہ اور کوشش و کاوش یہ تھی کہ ''نعت رنگ'' علم و ادب کی معتبر آوازوں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس صورت میں اس کا دائرہ وسعت اختیار کر جائے گا اور وہ 'نعت رنگ' قارئین اور مصنّفین کو ایک برادری بنانے کی جس کوشش میں برسوں سے مصروف ہیں، اس میں انھیں کامیابی مل جائے گی۔ (ہمارے خیال میں اگر کسی کتابی سلسلے کے قاری، لکھنے والے اور عملۂ ادارت ایک ''برادری'' بن جائیں تو یہ کامیابی کا ایک واضح اور محکم معیار ہے۔[ا]) اسی وجہ سے اداریوں کا اسلوب سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ ادبیت کا رنگ اختیار کرنے لگا۔ اب ان کی نثر میں علمی نثر کی خصوصیات نمایاں ہونے لگیں اور ادبی نثر کا حسن، تنقیدی لب و لہجے اور فلسفیانہ خیالات و افکار کے اظہار کی صلاحیت کے ساتھ ہم آمیز ہو کر زیادہ متاثر کن ہو گیا۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ مخاطب کے بدلنے سے طرزِ تخاطب بھی بدلنے لگتا ہے اب چونکہ ان کا غالب روئے سخن اہلِ علم و ادب اور اہلِ مذہب و دانش کی طرف تھا۔ اس لیے ان کے اسلوب میں اختصار، تجزیاتی انداز اور استدلال کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ ماضی میں مخاطب عام قارئین تھے، اس لیے روئے سخن بھی سادہ رہا لیکن جیسے جیسے ''نعت رنگ'' ترقی کرتا گیا، اس تحریک میں اردو کی بڑی اور معتبر آوازیں شامل بھی ہوتی گئیں تو ان کا طرزِ تخاطب بھی بدلتا گیا۔ اس صورتِ حال میں

جب کہ معاصر ادبی تحریکات، نظریات اور افکار کی پیش بندی کرنا یا معاصر ادبی منظر نامے کو زیر بحث لانا مقصود تھا لہٰذا پیرایۂ اظہار بھی وہی اختیار کیا گیا جو معاصر ادبی منظر نامے پر رائج تھا۔ اب ان کے اسلوب میں نہ معذرت خواہانہ رویہ نظر آتا ہے نہ ناقدری کا گلہ بلکہ نئے اہداف اور امکانات کا ایک جہانِ تازہ ان کے سامنے تھا یعنی تجربہ، اعتماد، حوصلہ، وقار اور ٹھہراؤ ان کے اسلوب میں بھرپور انداز میں جلوہ گر تھا۔

''نعت رنگ'' کے اداریوں کے اسلوب میں ایک دھیما تغیّر دیکھنے میں آتا ہے جو ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے اکتیسویں شمارے تک پہنچا ہے۔ یہ ارتقا سادگی سے پرکاری، صحافیانہ سے شاعرانہ، غیر تخلیقی سے تخلیقی سفر کی روداد سنا رہا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ وہ اپنے حقیقی مقصد (مقاصد/ موضوع) سے کسی بھی مقام پر اغماض برتتے نظر آتے ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اظہار کی یہ تبدیلی نہ عبارت کی روانی میں مخل ہوتی ہے اور نہ خیال کی پیچیدگی کا باعث بنتی ہے بلکہ دونوں ہم آمیز ہو کر 'نعت رنگ' کے اداریوں کا جز ولاینفک بن کر سامنے آتے ہیں۔

صبیح رحمانی چونکہ خود ایک مشاق شاعر بھی ہیں اور اپنے عہد کے استاد شعرا کے صحبت یافتہ بھی ہیں۔ اس لیے ان کی تنقیدی نثر میں بھی تخلیقی اظہار ایک صاحبِ کمال زبان دان کی طرح نظر آتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ان کے ذہن میں پرورش پانے والا خیال تخلیقی صلاحیت سے ہم آہنگ ہو کر اظہار کی راہ پاتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی وضاحت طلب ہے کہ وہ فقط حسن ادا کے زور پر اپنی تحریر کو دلکشی سے ہم کنار نہیں کرتے بلکہ ان کا حسن خیال بھی اپنے تمام و کمال کے ساتھ ان کی تحریر میں جلوہ گر ہوتا ہے اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ثانی الذکر عنصر یعنی حسن خیال طرزِ ادا پر مقدم ہی رہتا ہے اور اوّل الذکر یعنی اسلوب مؤخر۔ وہ آزاد کی طرح نثر میں شاعری نہیں کرتے اور نہ نثر نگاری کے بہانے شاعری کرتے ہیں (اگرچہ شاعری ان کا بنیادی حوالہ بھی ہے) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی نثر میں کہیں کہیں شعریت کا عکس اپنے اظہار کا جواز فراہم کر ہی لیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی تحریر میں یہ عمل اس ہنرمندی سے رونما ہوا ہے کہ یہ شعوری کاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ خوبصورت لفظیات، خوش کن تراکیب، رعایتِ لفظی، محاورات، اور مقفّع جملوں کا استعمال ایک ماہر فنکار کی طرح کرتے ہیں۔ یہ خصوصیات اس طور پر ہم آہنگ ہو کر سامنے آتی ہیں کہ ان کی نثر میں ادبیت کی خوبصورتی سے ہم کنار ہوگئی ہے۔

صبیح رحمانی کے اداریوں میں نہ واعظانہ ہائے ہونظر آتی ہے نہ مولویانہ نصائح اور نہ ہی خطیبانہ بلند آہنگی، بلکہ ایک حکیمانہ، دانشورانہ اور رہنمایانہ اظہار کی وہ نرم اور لطیف رونظر آتی ہے جو سوچ پر پڑے ہوئے قفل اور غلامانہ ذہنیت کی تقلیدی ڈوریوں کو آہستگی سے کھولتی چلی جاتی ہے۔اس کے لیے وہ شورشرابہ کرتے ہیں نہ چیخ پکار سے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہوئے فکر ونظر کے دروازوں پر ہلکے ہلکے دستک دیتے چلے جاتے ہیں جو ان کے نزدیک جگانے کا سب سے بہتر عمل ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ لہجے کی کرختگی، مزاج کی رعونت، اظہار کی قطعیت، افتخار کا گھمنڈ اور لفظوں کی گھن گرج میں کی گئی گولہ باری جوڑنے کی بجائے توڑنے، قریب کرنے کی بجائے دور کرنے اور اپنا بنانے کی بجائے پرایا کرنے کی فضا سازگار کرتے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ ہتھیاروں اور اسلحہ بارود کے زور پر جیتی ہوئی جنگ اور چھینی ہوئی فتح چائے کے ابال کی طرح وقتی ثابت ہوتی ہے یا ایلوپیتھی دواؤں کا سا اثر رکھتی ہے کہ مرض چلا بھی جائے تو اپنے ایسے اثرات چھوڑ جاتا ہے جو کبھی بھی اور کسی بھی وقت پہلے سے زیادہ شدت سے نمایاں ہوجاتا ہے۔پچھلی کسر نکال سکتے ہیں چنانچہ وہ جوڑنے، اپنا بنانے اور قریب کرنے کے لیے مشفقانہ لہجہ، لطیف انداز، حکیمانہ ٹھہراؤ، دلی دردمندی، باطنی کسک، اور احساس کی نرم نرم روکو اپنے دل کش و دل نشیں لب و لہجے میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو لفظوں کے ذریعے کانوں تک اور کانوں سے ہوتی ہوئی روح کی گہرائیوں تک اترتی چلی جاتی ہے۔کانوں میں محبّت کا رس گھولنے اور روح کی گہرائیوں تک ٹھنڈک کا احساس جگانے کے لیے کبھی تراکیب کا تانتا باندھ دیتے ہیں اور کبھی محاورات کے ذریعے زبان دانی کا ہنر آزماتے ہیں، کبھی لفظی رعایات کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی تکرارِ لفظی سے موسیقیت پیدا کرتے ہیں، کبھی تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی قافیہ بندی سے شاعرانہ احساس جگاتے ہیں تو کبھی تجسیمی فکر سے خیال کو پر لگا کر اڑا دیتے ہیں، کبھی مفکّرانہ انداز اپناتے ہیں اور کبھی شاعرانہ غرض یہ کہ احساسِ جمال، اظہارِ جمیل کی لڑی میں پروکر ایک ایسی مالا بنتے ہیں جو روح کی فرحت کا سامان بھی ہوتی ہے اور ذہن کی خوراک بھی۔ذیل میں ان کے زبان و بیان کے تمام رنگوں کو اس انداز سے پینٹ کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے متذکرہ مؤقف کی شہادت بھی ملے گی اور اسلوب کی تمام نزاکتیں بھی سامنے آسکیں گی۔

اسمائے ضمیر کا استعمال

بفن نے کہا تھا کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شخصیت کی عکاسی تحریر اور تقریر دونوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ شخصیت سے تحریر اور تحریر سے شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔ پیچیدہ شخصیت کا اسلوب الجھا ہوا اور غیر مبہم اور شگفتہ شخصیت کا دل کش و دل نشیں، سادہ شخصیت کے اظہار میں بھی سادگی جھلکتی ہے اور نرگسیت پسند شخص کے اسلوب میں ذات کی تشہیر کا سامان موجود ہوتا ہے۔ اسمِ ضمیر کی تکرار اسلوب میں نمایاں نظر آتی ہے۔ احساسِ برتری کے حامل شخص کے اسلوب میں اس کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ خلوت پسند شخص اپنے گرد حصار کھینچ لیتا ہے اور انجمن آرا دوسروں کو بھی اپنے دائرے میں سمیٹ کر محفل سجا لیتا ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں جو اسلوب سامنے آتا ہے وہ مدیر کی متوازن شخصیت کا عکاس ہے۔ اداریوں میں 'میں' اور 'ہم' کی ضمیریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ دونوں ضمیروں کے طریقِ استعمال میں فرق موجود ہے۔ اداریوں میں جہاں 'میں' کی ضمیر استعمال ہوئی ہے وہاں اس سے مراد صبیح رحمانی خود ہیں اور جہاں ضمیر 'ہم' استعمال ہوئی ہے، اس سے مراد ادارہ لیا گیا ہے۔ اداریوں میں عام طور پر جب کسی سوال کا جواب دینا مقصود ہو، گزارش کرنی ہو، معذرت کرنی ہو یا خود کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہو تو وہاں بالعموم 'میں' کی ضمیر استعمال کی گئی ہے لیکن جہاں کریڈٹ لینا ہو، خوشی یا فخر کا اظہار کرنے جیسی صورتِ حال پیش کرنا ہو تو وہاں بالعموم 'ہم' کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ اداریوں کا مطالعہ کیجیے غالباً کہیں نظر نہیں آئے گا کہ مدیر نے لکھا ہو کہ 'ہم شرمندہ ہیں' یا 'ہمارے پاس جواز نہیں' یا 'ہم ناکام ہوگئے' یا 'ہم وعدہ پورا نہ کر پائے' وغیرہ البتہ 'مجھے شرمندگی ہے'، 'میں کر نہ پایا' وغیرہ جملے دیکھنے میں ضرور آتے ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ 'نعت رنگ' کے آخری اداریوں میں تو دونوں ضمیریں کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ ذیل میں چند ضمیروں کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

ضمیر واحد (میں) کی مثالیں

۱۔ ''نعت رنگ'' ۲۱، ایک بار پھر تاخیر سے پیش خدمت ہے۔ اس کی تاخیر سے اشاعت کے ضمن میں میرے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

بس اتنا عرض کروں گا کہ ''نعت رنگ'' کی اشاعت میں گو کہ تاخیر ہوئی لیکن میں نعت اور

فروغِ نعت کے کاموں سے کسی لمحے غافل نہیں رہا۔ (اداریہ نمبر۱۳)

۲۔ ''نعت رنگ'' ایک بار پھر خاصی تاخیر کا شکار ہوگیا۔ سوچتا ہوں کہاں تک اس تاخیر کے لیے معذرت کے بے جان لفظ تلاش کیے جائیں! حالات و واقعات وہی ہیں جن کا اعادہ وقت کا کوئی مثبت استعمال نہیں ہے۔ (اداریہ نمبر۲۲)

۳۔ 'نعت رنگ' کی اشاعت کے آغاز میں کچھ لوگوں کی طرف سے یہ سوال سامنے آیا کہ 'نعت رنگ' کتنا سفر طے کرسکتا ہے؟ آخر نعت کے پہلو ہی کتنے ہیں جن پر تواتر سے لکھا جاتا رہے؟ اس وقت اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔۔۔ میں نہایت عاجزی سے عرض کروں گا کہ ''نعت رنگ'' اسی محبّت اور معنویت کے سفر کا ایک تاب ناک رُخ ہے۔ (اداریہ نمبر۱۲)

۴۔ مجھے کئی دوستوں نے خطوط، ٹیلی فون کالز اور بالمشافہ ملاقات پر ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے مضامین میں تکرار کی طرف متوجہ کروایا ہے اور ان میں تنوع اور تازگی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میں ایسے تمام دوستوں کا بھی شکرگزار ہوں کہ وہ نہ صرف ''نعت رنگ'' کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اس کے موضوعات میں وسعت اور تنوع کے خواہاں بھی ہیں۔ (اداریہ نمبر۱۶)

۵۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ''نعت رنگ'' کے معماروں میں ان عظیم ناموں کو دیکھیں جو ادب و مذہب کے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے نعت پر بے لاگ گفتگو کے در وا کرنے کے لیے اپنی تحریروں پر اعتراضات اور سوالات کشادہ دلی سے برداشت کیے اور مسلسل ''نعت رنگ'' میں لکھتے رہے کہ ہم سب نعت پر ایسی تنقیدی گفتگو کو فروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔ (اداریہ نمبر۱۷)

۶۔ ''میں شکرگزار ہوں اپنے رب کا جس نے اپنی رحمت سے مجھے اتنی ہمت عطا فرمائی کہ میں کسی نہ کسی حد تک ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی میں مصروف ہوں۔ مجھے تحدیثِ نعمت کے طور پر بھی اس تفصیل کے بیان پر شرمندگی ہے مگر مقصود صرف اتنا ہے کہ مجھے معذرت کرنی ہے، ان احباب سے جو ''نعت رنگ'' سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر اس کا اظہار اپنے خطوط میں ''نعت رنگ'' کے مشمولات پر تبصروں کی صورت میں کرنے کے بجائے ''نعت رنگ'' کی اشاعتی تاخیر پر برہمی کے تاثر کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں ایسے تمام دوستوں سے اس وضاحت کے ساتھ کہ ''نعت رنگ'' ایک کتابی سلسلہ ہے اور اس کی اشاعت کا کوئی دورانیہ طے نہیں ہے۔ اپنے حق میں آسانیوں کی

دعا کا طلب گار ہوں۔'' (اداریہ نمبر۱۶)

ضمیر جمع (ہم) کی مثالیں

۱۔ ہم صرف بہتر مواد کی تلاش میں رہتے ہیں کہ آپ کے سامنے ہر شمارہ میں نعت کے ادبی پہلوؤں پر نئے رجحانات اور افکارِ تازہ پیش کر سکیں۔ (اداریہ نمبر۱۴)

۲۔ لیکن ہم غالبیات کے ایک توجہ طلب مگر تشنہ موضوع کو اس مرتبہ ''نعت رنگ'' میں ایک خصوصی گوشے کی صورت اُجاگر کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔۔۔ گزشتہ دنوں ہم سے جدا ہونے والے نعت نگاروں میں ایک اہم نام جناب شوکت ہاشمی کا ہے۔۔۔ ادارہ اقلیمِ نعت مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور اُن کے لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (اداریہ نمبر۱۲)

۳۔ ''نعت رنگ'' کے لیے نگارشات کی یہ فراہمی ہمارے لیے یقیناً طمانیت کا باعث ہے کہ ربّ کریم نے اس کام میں برکت پیدا فرمادی۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ قارئینِ کرام کے لیے بھی یہ بات خوشی اور اطمینان کا باعث ہوگی۔ (اداریہ نمبر۱۳)

۴۔ الحمدللہ کہ اب ''نعت رنگ'' کے لکھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہمیں اچھے مواد کی تلاش میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دستیاب مواد کو فوراً قارئینِ ''نعت رنگ'' تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ (اداریہ نمبر۱۴)

۵۔ ''نعت رنگ'' کے قارئین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور عالمی سطح پر اسے حاصل کرنے والی پذیرائی ہمارے اس یقین کو تقویت عطا کرتی ہے کہ ہمارے قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہماری اس پالیسی کو پسند کرتا ہے۔۔۔ انھوں نے ''نعت رنگ'' ۱۶ میں شائع ہونے والے اداریے پر ہمدردانہ غور فرمایا اور ہمیں ایک مذاکرہ کروا کے اس کی تفصیلات بھیج دیں۔ اس تعاون پر ہم ان کے ممنون ہیں۔۔۔ حفیظ تائب عصرِ حاضر کے معتبر نعت نگاروں میں تھے۔۔۔ ان کی وفات پہ ہم ایک مختصر تعزیتی گوشہ پیش کر رہے ہیں۔ (اداریہ نمبر۱۷)

۶۔ ''نعت رنگ'' ایک موضوعی جریدہ ہے۔ سو اس کے مشمولات میں تنوع پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ''نعت رنگ'' میں ہر بار تازگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا سامنے آتا رہے جس میں قارئین کا تجسّس برقرار رہے۔ کچھ عرصہ قبل ہم نے ''نعت رنگ'' میں جاری دیگر سلسلوں کے درمیان نعت شناسی کو شامل کیا تھا اور اسے خاصی اہمیت دی (اداریہ نمبر۲۲)

۷۔ چھبیسواں شمارہ پیش کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر تشکّر کے جذبات سے لبریز ہے۔ پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ ''نعت رنگ'' کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

رعایتِ لفظی کا استعمال

رعایتِ لفظی ایک ایسا ہنر یا فن ہے جس کے ذریعے عبارت میں دلکشی اور خوبصورتی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ شاعر یا مصنّف شعر یا نثر میں خیال کو خوبصورت پیرائے میں پیش کرنے کے لیے عبارت میں یکے بعد دیگرے ایسے الفاظ لاتا ہے جو اپنے معنی، ہیئت، آہنگ یا تعلّق کی بنا پر ایک دوسرے سے متعلّق ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مصنّف یا شاعر، جملے یا شعر میں سمندر کا لفظ استعمال کرتا ہے تو شعر یا جملے میں سمندر کی رعایت سے موج، لہر، طغیانی، کشتی، ناخدا، ساحل، کنارا اور طوفان وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ متذکرہ الفاظ سمندر کی رعایت سے لائے جاتے ہیں ایک طرف یہ الفاظ خیال کی ظاہری صورت میں دِلکشی میں اضافہ کرتے ہیں اور دوسری طرف معنی کو خوبصورت بنانے اور زور پیدا کرنے میں معاون و مددگار بھی ہوتے ہیں۔

اس ہنر کو برتنے کے لیے تجربہ، ذہانت، مشاہدہ، مشق اور زبان پر مہارت درکار ہوتی ہے کیونکہ ذرا سی غلطی سے طائرِ خیال ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور تحریر فقط لفظوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ رعایتِ لفظی کے استعمال سے اگرچہ تحریر میں حسن پیدا ہوتا ہے لیکن یہ فقط ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ شعر یا عبارت پڑھتے ہوئے قاری اگر یہ محسوس کرے کہ یہ ہنر خیال کی پیش کش کی بجائے فقط عبارت کی دلکشی کے لیے آزمایا گیا ہے تو اسے مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کوئی مصنّف اس فن کو دانش مندی اور برجستگی سے استعمال نہ کر سکے تو یہ بجائے خود ایک نقص بن جاتا ہے۔ اردو کے تقریباً ہر بڑے شاعر اور ادیب نے اس ہنر کو اپنی تخلیقات میں آزمایا ہے۔ لکھنؤ میں تو اس فن کو گلے کا ہار بنالیا گیا تھا۔ شاعری میں بھی اور نثر میں بھی۔ نثر میں اس کی خوبصورت مثالیں اور استعمال رجب علی بیگ سرور کی داستان 'فسانۂ عجائب' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

'نعت رنگ' کے اداریوں میں یہ خوبی اگرچہ کم کم موجود ہے لیکن جہاں کہیں بھی استعمال

ہوئی ہے اس نے عبارت کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ عبارتوں میں یہ ہنر باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں آیا بلکہ خیال جب اظہار کے سانچے میں ڈھلنے لگتا ہے تو یہ ہنر بھی اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ فن کار کا کمال ہی اس میں ہے کہ اس صنعت کو اس ہنرمندی سے برتا جائے کہ اس میں آورد کا گمان نہ گزرے۔ بڑے انشاپردازوں کے ہاں اس کے استعمال میں شعوری عمل دخل کا احساس نہیں گزرتا۔ آزاد اور سرور نے اس صنعت کو اپنی تحریروں میں برتا ہے اور اس میں ہنرمندی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ آزاد کے ہاں اس صنعت کا استعمال منصوبہ بند انداز میں سامنے آتا ہے لیکن صبیح رحمانی کے ہاں یہ منصوبہ بندی نظر نہیں آتی۔ اسی لیے لفظی رعایات اکثر اوقات ساتھ ساتھ نہیں بلکہ آگے پیچھے یا ترتیب سے ہٹ کر سامنے آتی ہیں۔ آزاد کے ہاں رعایت لفظی کے استعمال کی کامیابی ان کی زبان و بیان پر استادانہ گرفت اور طاقتور تخئیل پر منحصر ہے۔ جب کہ صبیح رحمانی کے ہاں اس صنعت پر مہارت اس درجہ نظر نہیں آتی جو آزاد کی نثر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے ہاں رعایات اس مشاقی سے سامنے نہیں آئیں جو آزاد اور دوسرے صاحب طرز ادیبوں کی تحریروں کا ہنر ہے۔ اس حوالے سے ذیل کی پہلی مثال ملاحظہ کیجیے، سفر کے ساتھ رفتار کا مقام اصل مقام سے دور جا پڑتا ہے اور درمیان میں قرآن پاک، تفسیر، عرفان کی جہتوں کا وا ہونا کی رعایات داخل ہوگئی ہیں۔ پھر سفر کی رعایت سے منزلیں اور قرآن کی رعایت سے نصیب، خداوند عزوجل اور کلام کی حفاظت کا ذمہ کی رعایات سامنے آئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رعایات میں نہ تو مشّاقی نظر آتی ہے اور نہ اسلوب کا کچا پن۔

۱۔ کسی بھی عہد کے تخلیقی خدوخال دیکھنے کے لیے اسی عہد کے آئینہ تنقید کی ضرورت پڑتی ہے۔ (اداریہ نمبر۲)

۲۔ پھر ۲۸/جنوری ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد میں خبر ملی کہ باغِ رسالت کا یہ خوش نوا عندلیب اس یقین کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا ہے۔ (اداریہ نمبر۲۲)

۳۔ نعت کے اس سفر نے ہر منزل پر نئے پڑاؤ کے ساتھ نئی اصناف کو اپنے جلو میں اس طرح لیا کہ مشام جانِ ادب معطّر و معنبر ہی نہیں محتشم اور محترم بھی ہوتی رہی۔ (اداریہ نمبر۲۳)

۴۔ جب کہ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر محمد آصف، ڈاکٹر بشیر عابد، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اور منظر عارفی کے نام نعت رنگ کے اُفق پر اس شمارے سے طلوع ہوئے ہیں۔ (اداریہ نمبر۲۴)

۵۔ وہ اپنی عقیدتوں کو جمع کر کے ایک مجموعہ نعت 'خلد نعت' کے نام سے پیش کیا۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی عمر بھر کی اس خواہش کا اجر پائیں گے اور 'خلد نعت' لے کر داخلِ خلد بریں ہوں گے۔ (اداریہ نمبر۲۳)

۶۔ تنقیدِ شاعری کی پوری تاریخ تہذیب کی عدالت میں شاعرانہ تخئیل کی اس الزام سے صفائی کی روداد ہے کہ وہ انسان کے لیے مضر ہے یا کم از کم بالکل بے کار ہے۔(اداریہ نمبر۱۹)
۷۔ والی آسی آج کے تاریک عہد (رات) میں اسم محمد (ﷺ) کے چراغ سے اپنی راہوں کو ہی روشن نہیں کر رہے ہیں بلکہ تاریکیوں اور اندھیروں سے نبرد آزما ہیں۔(اداریہ نمبر۵)
۸۔ زیرِ نظر شمارہ 'نعت رنگ' کا گیارھواں شمارہ ہے۔نئی صدی کی دہلیز پر ذکر نبی کریم ﷺ کے اس چراغ کو روشن کرتے ہوئے میں نئی مسرتوں اور نئی امنگوں کے جلو میں ان امکانات پر غور کر رہا ہوں جو آنے والے برسوں میں صنفِ نعت میں پیدا ہوں گے۔اس اہم موقعے پر میرے ذہن میں بیسویں صدی میں نعت گوئی کے فروغ کے کئی جائزے روشن یا۔(اداریہ نمبر۹)
۹۔ اسی لیے اس اشاعتی وقفے میں جو قابلِ ذکر ستارے آسمانِ نعت سے اوجھل ہو کر موت کی تاریکی میں گم ہو گئے، ان سب کے ناموں کا دمِ تحریر حافظے میں موجود ہونا بھی مشکوک۔تاہم چند ستارے اوجھل ہو کر بھی اپنے نام اور کلام کی اتنی روشنی چھوڑ گئے ہیں کہ وقت کی گردان کے کارناموں کو دُھندلانے میں ناکام رہے گی، ان شاء اللہ (اداریہ نمبر۱۹)
۱۰۔ اُردو کی شعری دنیا پر ''نعت رنگ'' کا طلوع صائبِ افکار کا اُجالا پھیلنے کا سبب بنا اور نعت کی شعری قدر افزائی کے لیے خالص ادبی پیمانوں کے استعمال کی راہیں روشن ہوئیں تا حال اس کے اکیس شمارے شائع ہو چکے ہیں اور وہ کارواں جو نعت کے ادبی فروغ کا جذبہ لے کر روانہ ہوا تھا۔اب الحمدللہ پوری اُردو دُنیا کو اپنے حصار میں لے چکا ہے۔(اداریہ نمبر۲۱)
۱۱۔ رضی دہلوی ملک کے مایہ ناز حرف شناس اور نامور خطاط تھے وہ فنِ خطاطی پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ آیاتِ قرآنی کا جمالیاتی شعور بھی رکھتے تھے۔'نعت رنگ' ۲ کا سرورق اُنھی کے نقشِ جمیل سے مزین تھا۔(اداریہ نمبر۳)

تکرارِ لفظی کا استعمال

صبیح کی تحریروں میں فقط تعقل پسندی اور استدلال کی قوت موجود نہیں بلکہ جذبہ بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر خشک اور روکھی پھیکی نہیں رہتی۔ان کی تحریر ذہن کو اپیل بھی کرتی ہے اور دل سے مخاطب بھی ہوتی ہے۔ذہن کو متاثر کرنے کے لیے تو استدلال کی ضرورت پڑتی ہے لیکن جذبات کو ابھارنے کے لیے لفظیات اور شاعرانہ اظہار کا سہارا لیا جاتا ہے۔

اس میں ایک تکرارِ لفظی کا استعمال بھی ہے۔ خطابت میں بھی جوش دلانے اور جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے بھی لفظی تکرار کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کا بیان ہے:

> ''تکرار زبان میں جذباتی طرز پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب متکلّم کسی جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔۔۔ جب متکلّم کا دل جوش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے تو الفاظ کے اتار چڑھاؤ، جملوں اور فقروں کی ترتیب اور ادائیگی نیز گفتگو کے عام انداز اور لب و لہجے میں تو فرق آتا ہی ہے، الفاظ، تراکیب اور فقروں کی تکرار بھی واقع ہوتی ہے۔ تکرار کا جذباتی اور تاثراتی زبان سے گہرا تعلّق ہے۔ جوش اور جذبے کے اظہار کے علاوہ بھی تکرار سے بیان میں شدت پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔''[۲]

صبیح کے ہاں تکرارِ لفظی سے جذبات کو متاثر کرنے کے علاوہ اسلوب میں موسیقیت اور بیان میں شدت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری پورے طور پر تحریر کی طرف متوجہ ہو پائے کیونکہ سپاٹ اور روکھی پھیکی تحریر عبارت میں دلچسپی کو زائل کرتی ہے اور بوریت کو جنم دیتی ہے۔ تکرارِ لفظی کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ دیکھیے کن کن دوستوں کا زخمِ جدائی روح پر دائمی نقش چھوڑ گیا، کیسے کیسے زخم دل کا گھاؤ بنے، بیان مشکل ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۲۔ اس کا وظیفہ منصبی یہ ہے کہ طبعی و اخلاقی دنیاؤں کی تمام چیزوں، تمام مظاہر، تمام حوادث میں سے ان کا جوہر کشید کرے اور اسے فن کی دنیا میں لے جائے جہاں اس کی تخلیقی قوت اس میں ایک تغیّرِ کلی پیدا کر کے اسے نئی شکلوں میں جلوہ گر کرے گی۔ (اداریہ نمبر ۱۹)

۳۔ بلکہ اس بات کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں کہ بحیثیت انسان، ڈاکٹر صاحب کتنے عظیم، کتنے ہر دلعزیز اور کتنے بلند مقام و مرتبے کے حامل تھے۔ (اداریہ نمبر ۲)

۴۔ جب یہ ہے تو پھر یہ بھی ہے کہ ہر نئے عہد میں آپ کے ذکر کی بلندی کے نئے سامان، نئے انداز، نئے پیرائے، نئے قرینے، نئے سلیقے، نئے ہنر، نئے جوہر، نئے رنگ اور نئے آہنگ سامنے آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے، ان ہی رنگوں میں ایک رنگ ''نعت رنگ'' ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کا آہنگ سب سے جدا، اچھوتا، انوکھا، البیلا اور دلربا ہے۔ اس تخصص اور امتیاز کا سبب اب بیان کا محتاج نہیں بلکہ حلقۂ یاراں ہو یا گروہِ نقاداں ... ہر ایک نے اس کے انداز کی یکتائی کو اب تسلیم کر لیا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۳)

اداریوں کی عبارتوں میں حسن پیدا کرنے کے لیے وہ کئی طریقوں کا سہارا لیتے ہیں۔ قوافی

کے ذریعے عبارتوں میں موسیقیت پیدا کرتے ہیں۔ متضاد اور مترادف الفاظ کے استعمال سے بیان میں زور پیدا کرتے ہیں۔ زبان و بیان میں دل کشی پیدا کرنے کے لیے وہ جن صنائع رذرائع کا استعمال کرتے ہیں ان کے ذریعے وہ معنی خیزی کے عمل کو تیز کرنا چاہتے ہیں اور خیال کی معنویت کو تقویت دینا چاہتے ہیں۔ یہ تمام صنائع اس طور پر یکجا ہو کر تخلیقی اتحاد کا نقشہ پیش کرتے ہیں کہ عبارت کی دل کشی بھی برقرار رہتی ہے اور معنی آفرینی کا عمل بھی متاثر نہیں ہونے پاتا۔

قوافی کا استعمال

۱۔ کیونکہ اس رسالے سے قارئین کا تعلّق وفاداری سے زیادہ وضع داری اور ضرورتاً سے زیادہ اخلاقاً ہی رہ جاتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۸)

۲۔ ان کی چند نگارشات پڑھیں بھی جس پر محفل میں ان کی سرشاری اور اشک باری آج بھی یادداشت کا حصہ ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۳۔ نعت خوانی کے اُفق پر چالیس سال سے معیار، اعتبار، عشق و ادب اور تہذیب و شائستگی۔۔۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۴۔ نام نہاد ترقی، خوش حالی اور روشن خیالی کے اس دور میں ظلمت پسندی کا یہ رویہ انسانی آزادی اور ارضیت پسندی کے نام پر فروغ پا رہا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

۵۔ عارف رضا کی شعری ریاضت، شاعرانہ صنعتوں کا شعور، زبان کے لہجوں پہ عبور اور مذہبیت اور اخلاقیات کو شعری گداز میں ڈھالنے کا ہنر انھیں معاصر نعت گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۸)

متضاد الفاظ کا استعمال

۱۔ افراد کی بلندی یا پستی کا اندازہ اُن کے مقصدِ حیات سے کیا جا سکتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

۲۔ نعت خوانی کے اُفق پر چالیس سال سے معیار، اعتبار، عشق و ادب اور تہذیب و شائستگی کی علامت بن کر چمکنے والا نمایاں ستارہ بھی موت کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۳۔ خود کو ساری عمر ''درویشِ مصطفیٰ مست'' لکھنے اور سمجھنے والا منیر قصوری۔۔۔ ۲رجون ۲۰۱۸ء کو اپنے فنِ نعت گوئی کا چراغ لیے ہوئے قبر کی تاریکیوں میں اُتر گیا۔ (اداریہ نمبر ۲۸)

۴۔ ایک متحرک، فعال اور وسیع النظر اور وسیع القلب شخصیت جس نے کراچی کے خون آشام ماحول میں ظلم تعصّب تفرقہ بازی اور جہل کی تاریکی کو علم کے چراغوں سے کم کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی صرف کی بالآخر ۱۸ ستمبر ۲۰۱۴ء کو اس جہاد میں جام شہادت نوش کر کے اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

مترادف الفاظ کا استعمال

۱۔ ’’نعت رنگ‘‘ اپنے اشاعتی سفر کے آغاز ہی سے غایتِ تخلیقِ کائنات کی مدح وتوصیف کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہے۔(اداریہ نمبر۲۶)

۲۔ ’نعت رنگ‘ کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اگرچہ ’نعت رنگ‘ کی اشاعت کے عرصہ اور مدت کے سلسلے میں ہم نے قارئین سے نہ کوئی وعدہ کیا ہے اور نہ دعویٰ مگر ہمارا احساس ہے کہ اس بار خاصی تاخیر ہوگئی ہے۔(اداریہ نمبر۳)

۳۔ خدا کی اس روشن دلیل کو اپنی عقل، اپنی روح اور اپنے پورے وجود میں بسانے کا جس سے ساری روشنیاں پھوٹتی ہیں، اور جس سے دُوری یا انقطاع ہی دراصل ظلمات، گمراہی یا تاریکی کا دوسرا نام ہے۔(اداریہ نمبر۲۶)

تراکیب کا استعمال

شاعرانہ وسائل شاعری ہی نہیں نثر کا زیور بھی ہوتے ہیں۔صاحبِ طرز ادیبوں کی تحریروں کا ایک اہم وصف تراکیب/مرکبات کا استعمال بھی ہے۔تراکیب تحریر میں خوبصورتی کے ساتھ زور اور دِلکشی بھی پیدا کرتی ہیں اور تاثر کو بھی گہرا کرتی ہیں۔ بڑے ادیب تو تراکیب سازی میں اختراع پسند طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔اردو کے تقریباً ہر بڑے شاعر اور نثر نگار نے نئی نئی اور مخترع تراکیب کے ذریعے رفعت خیال، معنی آفرینی، معنی خیزی، ترسیل خیال اور جمالیاتی حسن کی تخلیق وتشکیل میں مدد لی ہے اور یہی کوشش صبیح رحمانی کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔چونکہ وہ شاعر بھی ہیں اس لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں تراکیب کے تخلیقی استعمال سے معنی خیزی اور توسیع معنی کے ساتھ ساتھ مؤثر اظہار بیان کی تشکیل کی کوشش بھی کی ہے۔مسلسل تراکیب اور مرکبات کے پے در پے استعمال سے کہیں کہیں نثر کی لطافت اور فطری سادگی متاثر ہوتی ہے لیکن اکثر مقامات پر عبارت اپنا فطری حسن برقرار رکھے ہوئے ہے اور آورد کی بجائے آمد کا لطف بھی دیتی ہے۔

ہر لکھاری کا اپنا انداز واسلوب ہوا کرتا ہے۔کوئی روکھے پھیکے لفظوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہے اور کوئی دل پسند ودل فریب لفظیات، تراکیب، تشبیہات، استعارات اور دیگر شاعرانہ وسائل کے ذریعے ترسیل خیال کو تحریر یا تقریر میں منتقل کرتا ہے۔لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال ترسیل خیال کے ساتھ ساتھ خیال افروزی کی تخلیق میں بھی ایک وسیلے کے طور پر سامنے آتا ہے۔اس عمل میں فنکار کی شخصیت، ذہنی رویے اور دیگر مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔صبیح رحمانی کی تحریروں میں مفرد لفظیات کی جگہ

مرکبات کے استعمال میں دلچسپی کے اسباب انھی عوامل میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ صبیح رحمانی اپنے مدعاو مقصد اور فکر وخیال کے اظہار میں مفرد لفظیات کی بجائے مرکبات کا زیادہ سہارا لیا ہے جو لاشعوری محرکات کا زائدہ ہوسکتا ہے۔

رسالے کے نام 'نعت رنگ' کی ترکیب اس کی واضح مثال ہے۔ وہ رسالے کا نام رکھتے ہوئے وہ کسی مفرد نام کا انتخاب بھی کر سکتے تھے کیونکہ بیسیوں رسائل ایسے ہیں جن کے نام مفرد لفظیات سے حاصل کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر آہنگ، آئندہ، آستانہ، اتحاد، اردو، ادب، ادیب، ادراک، ارم، الفاظ، ارتقا، اثبات، انتخاب، افسانہ، انشا، امروز، اوراق، الزبیر، الشریعہ، الشجاع، القلم، الناظر، الہلال، الندوہ، تحریر، پیمانہ، تنویر، تحریک، تجلّی، جامعہ، خیابان، دبیر، ذخیرہ، رومان، زمانہ، زندگی، ساقی، ساربان، سویرا، شاعر، شگوفہ، شعور، عالمگیر، غالب، فاران، فنون، کلیم، کلچر، کمال، کھوج، مخزن، مصنّف، معاصر، معیار، معارف، مکالمہ، مباحثہ، نقوش، ندیم، نگار، نقیب، ہمایوں، وغیرہ کے علاوہ مفرد نام سے موسوم بیسیوں رسائل کے نام تحریر کیے جاسکتے ہیں۔

'نعت رنگ' پہلا رسالہ نہیں جس کا صبیح رحمانی نے مرکب نام رکھا۔ اس سے قبل بھی انھوں نے 'لیلۃ النعت' اور 'سفیر نعت' کے نام سے دو رسائل مرتب کیے۔ اس سے صبیح رحمانی کی مرکب ناموں سے دلچسپی اور رغبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صبیح رحمانی کی تحریروں راسلوب میں ترکیب سازی کا یہ عمل کیوں جنم لیتا ہے؟ اس سوال کا جواب صبیح کے تخلیقی رویوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ صبیح ایک شاعر بھی ہیں اور شعری کائنات میں تراکیب سازی اور ترکیب تراشی مروّجہ، پسندیدہ اور مقبول دستور رہا ہے۔ اردو کے معروف اور غیر معروف شعرا نے اس میدان میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں۔ تراکیب سازی کا استعمال شاعری ہی میں نہیں، نثر میں بھی یکساں انداز میں مقبول و معروف رہا ہے۔ بالخصوص اُردو کے صاحبِ طرز ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اس کا استعمال بھرپور انداز میں کیا ہے۔ آزاد کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔

صبیح رحمانی کی نثر میں تراکیب سازی کا یہ عمل دو اطراف سے آیا ہے۔ ایک شاعری کی طرف سے اور دوسرا نثری روایت کے اس سرچشمے سے، جس کے نمائندہ نثر نگاروں میں محمد حسین آزاد ،شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، قاضی عبدالغفار وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اداریوں میں کثرتِ تراکیب

کے استعمال کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے تراکیب سازی کی ٹکسال لگا رکھی ہے جہاں سے تراکیب اور مرکبات ڈھل ڈھل کر نکلتے چلے آتے ہیں جنھیں وہ اپنی نثر میں جوڑتے چلے جاتے ہیں ایسا شاید اس لیے ہوا ہے کہ انھیں بہت کہنے کی جلدی ہے۔ تراکیب کا استعمال، وسعتِ خیال کو تقلیل الفاظ میں پیش کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اداریوں میں استعمال کی جانے والی تمام تراکیب کو اگر اکٹھا کیا جائے تو ان کی تعداد بلا مبالغہ سیکڑوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تراکیب تو ان کی ساختہ و پرداختہ لگتی ہیں۔ ذیل میں صرف نعت کے حوالے سے استعمال کی جانے والی تراکیب پیش کی جاتی ہیں، جن سے ان کے خلاق ذہن کی زرخیزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فن نعت، صنف نعت، تنقید نعت، تنقیداتِ نعت، نقدِ نعت، انتقادِ نعت، تخلیق نعت، تحقیق نعت، تدوین نعت، نعت نمبر، فروغ نعت، نعت چیئر، نعت گوئی، نعت گو، نعت نگار، اقلیم نعت، خدام نعت، دنیائے نعت، مسائل نعت، شائقین نعت، قارئین نعت، نعت رنگ، قارئین نعت رنگ، نعت رسول، نعت کار، نعت کاروں، وابستگانِ نعت، نعت شناسی، نعت فہمی، تفہیم نعت، ذوقِ نعت، آسمان نعت، آدابِ نعت، نعت خوانی، نعت کار، نعت نگاری، محفل نعت، محافل نعت،، مقالاتِ نعت، جہانِ نعت، نعت نگار، نعت پسند، نعت خواں، صراطِ نعت، مطالعاتِ نعت، نعت نبی، نعت شناس، نعتیہ شاعری، نعتیہ ادب، نعتیہ کلام، نعتیہ مجموعہ، نعتیہ سرگرمی، نعتیہ نظم، نعتیہ کلام، نعتیہ زمینیں، نعتیہ مشاعرے، نعتیہ جرائد و کتب، معتبر نعت گو، آداب نعت گوئی، نعت ریسرچ سنٹر۔

نعت کے حوالے سے درج کی گئی تراکیب کے پیش نظر بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل نعت کے حوالے سے لکھی گئی کسی تصنیف میں اتنی تراکیب کا استعمال نہیں ہوا۔ صرف 'نعت رنگ' کو ہی یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں کثرت اور تنوع سے نعت کے حوالے سے تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کا کوئی لغت ایسا نہیں جس میں نعت کے حوالے سے اتنی تراکیب کو داخل کیا گیا ہو اور اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اردو اصناف شعر میں شاید ہی کوئی ایسی صنف ہو جس کے نام کے اشتراک سے اتنی تراکیب وضع کی گئی ہوں۔

'نعت رنگ' کے اداریوں میں استعمال کی گئی تراکیب کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پشت پر ایک ایسا تخلیقی اور اختراع ساز ذہن کارفرما ہے جس کی کٹھالی میں نت نئی، منفرد اور متنوع تراکیب ڈھل ڈھل کر سامنے آ رہی ہیں۔ ان تراکیب میں ادبیانہ چاشنی بھی موجود ہے اور شاعرانہ حسن بھی اور

بھرپور معنویت بھی۔ بطور مثال دو تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں جدت بھی ہے اور نیا پن بھی اور مدیر کے تخلیقی ذہن کی عکاسی بھی۔

مثال کے طور پر طائرانِ حرم کی ترکیب تو عام ہے لیکن طاہرانِ حرم کی ترکیب نئی بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس ترکیب کی خوبصورتی یہ ہے کہ یہ نعت کی فضا میں نگینے کی طرح جڑ بھی جاتی ہے۔ اسی طرح نطقِ انسانی تو عام ترکیب ہے لیکن نطقِ ایمانی نئی ترکیب ہے۔ اس طرح کی کئی تراکیب 'نعت رنگ' کے اداریوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

نطقِ ایمانی، کم اعتنائی، عدم توجہی، صورت گری، آغوشِ رحمت، کاروبارِ حیات، نکتۂ معراج، طاہرانِ حرم، وابستگانِ ادب، نتائج و آراء، حرف شناس، تخلیقی تذکرہ، یادنگاری، اشاعتی سفر، تنقیدی جمود، پُرثروت، خیال افزا، خیال افروز، لطیف الاحساس، نورانی دائرے، نورانی فضائیں، روشن فضائیں، روشن دلیل، تازہ مکالمہ، متن شعر، مبلغ علم، مطیع ومنقاد، یارانِ نکتہ داں، تکریم فن کار، گروہِ بوالہوس، سخن گسترانہ بات، آبگینہ ہائے قلوب، معنی آفریں دریچے، صاحبِ تخیّل تماشائی، انتقادی اصابت رائے، بزمِ فکر ونظر، فکر وتنقید اور تخلیق، دائمی سمت نما، علمی اور حوالہ جاتی ضرورت، مختصر تعزیتی گوشہ، جمالِ صوری وحسن سیرت، دفاع وتحفّظِ ناموسِ رسالت، عصری ادبی میلانات، نئے موضوعات اور زاویے، راہِ دین و دل، گہری تنقیدی نظر، تفصیلی اور مدلل انداز، مدحت گری کے خدو خال، نقوشِ حیات و سیرت، وابستگانِ دامن اردو۔

یہ تراکیب تخلیق نعت اور تنقید نعت پر گزرے ہوئے موسموں سے آشنا بھی کرتی ہیں اور فروغ نعت کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کی داستان بھی سناتی ہیں۔ ان تراکیب سے تحقیق نعت کی طے کردہ منزلوں کے نقوش بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں اور تخلیق نعت کے تخلیقی سرچشموں کے نشانات کے سراغ بھی ملتے ہیں اور نعت کے تاریخی اور تدریجی ارتقا کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔ یہ فقط مجموعہ لفظیات نہیں۔ ان تراکیب کے عقب میں صبیح رحمانی کے فکر واحساس اور خیالات وافکار کا خزینہ موجود ہے اور نعتیہ ادب کی تاریخ وروایت کا گنجینہ بھی۔ ان تراکیب میں نہ فرسودگی موجود ہے نہ بوسیدگی اور نہ روایتی تکرار۔ ان میں جدت بھی اور تنوع بھی، نیا پن بھی ہے اور دلآویزی بھی۔

غالب کے بعض اردو اشعار مسلسل تراکیب کے ستعمال سے فارسی زبان کا نقشہ پیش کرتے

ہیں۔اس کا ایک نقصان معنی خیزی اور ترسیل معنی کے عمل میں رکاوٹ کی صورت میں بھی سامنے آیا ہے۔نثر رواں اور سلیس نہیں رہ پاتی۔اداریوں میں بعض مقامات ایسے بھی نظر آتے ہیں جہاں لفظیات پر تراکیب نے غلبہ پالیا ہے اور تراکیب نے لفظوں کو پیچھے دھکیل کر اپنی جگہ بنالی ہے۔تراکیب کے ذریعے حسن کاری کی تخلیق کا یہ عمل بعض اوقات عبارتوں میں تصنّع کو جنم دینے کا باعث بھی بنا ہے لیکن ایسے مقام پر مشاق تخلیق کاروں اور نثر نگاروں نے اپنی قادرالکلامی، مشاقی اور ہنرمندی کے زور پر آورد میں بھی آمد کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

درج ذیل تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔جملوں میں ان کی ضرورت نہیں تھی لیکن تراکیب سازی اور تراکیب کے استعمال کے بے محابہ شوق نے ان مقامات پر بھی تراکیب داخل کرنے کے لیے گنجائش نکالنے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں ان کی اشد ضرورت نہ تھی۔پہلے جملے میں 'دمِ تحریر' کی جگہ 'تحریر کے وقت یا تحریر کرتے ہوئے'، دوسرے جملے میں 'شہرت کے بامِ عروج' کی بجائے 'شہرت کی بلندیوں' اور تیسرے جملے میں 'امیدِ شفاعت' کی جگہ 'شفاعت کی امید' لکھا جا سکتا تھا لیکن یہاں بھی تراکیب تراشی کا جذبہ / شوق ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہے۔ذیل کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مگر کیا کیا جائے کہ دمِ تحریر صرف چند نام ذہن میں تازہ ہو سکے۔(اداریہ نمبر ۲۳)
۲۔ نعت خوانی کے حوالے سے شہرت کے بامِ عروج کو چھونے والے دو بزرگ ثنا خواں۔۔۔(اداریہ نمبر ۱۹)
۳۔ بہرحال ہر نعت گو شاعر کی طرح وہ بھی دل میں اُمیدِ شفاعت لیے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔(اداریہ نمبر ۱۹)
۴۔ ان کے مقام و احترام کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔(اداریہ نمبر ۱۹)

مرکبات کے استعمال میں ان کی دل چسپی یا رغبت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات وہ زبردستی کی تراکیب بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ذیل کی پانچ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کئی لوگوں کے اشتراکِ ذہنی سے کام کی افادیت کے لیے مزید کئی پہلو روشن ہونے کے امکانات خاصے بڑھ جاتے ہیں۔(اداریہ نمبر ۱۹)
۲۔ وہ اپنے تمام وجودِ باطنی کے راز کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہے۔(اداریہ نمبر ۱۹)
۳۔ اور اسے فن کی دنیا میں لے جائے جہاں اس کی تخلیقی قوت اس میں ایک تغیّرِ کلی پیدا کر کے اسے نئی شکلوں میں جلوہ گر کرے گی۔(اداریہ نمبر ۱۹)
۴۔ چراغ سے چراغ جلنے کے اس عمل کو ارتقائی عمل کہیے یا تدریجی سفرِ فکر و فن، مگر یہ ہے اس بات کی دلیل۔۔۔(اداریہ نمبر ۲۳)

۵۔نور احمد میرٹھی کو علم وادب سے گہرا شغف تھا، وہ میدانِ تحقیق وتالیف کے ان تھک مسافر تھے۔(اداریہ نمبر ۲۲)

درج بالا عبارتوں پر غور کیجیے۔ پہلے جملے میں 'اشتراک ذہنی' کی جگہ 'ذہنی اشتراک' دوسرے جملے میں 'وجودِ باطنی' کی جگہ 'باطنی وجود' اور تیسرے جملے میں 'تغیّر کلی' کی جگہ 'کلی تغیّر' چوتھے جملے میں 'تدریجی سفرِ فکر وفن' کی جگہ 'فکر وفن کا تدریجی سفر' اور چوتھے جملے میں 'تحقیق وتالیف کے میدان' لکھا جا سکتا تھا لیکن تراکیب برتنے کے شوق نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔

درج بالا مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ قلت وقت کے سبب اور تفصیل سے گریز کی خاطر تراکیب کا استعمال کررہے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے اجمال پسند اور اختصار پسند طبیعت کے نتیجے کے طور پر سامنے آیا ہے۔

'نعت رنگ' کے اداریوں میں بالعموم تین مرکبات دیکھنے میں آتے ہیں۔ مرکبِ اضافی، مرکبِ عطفی اور مرکبِ توصیفی۔ ان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا مرکب، مرکبِ اضافی ہے۔ مرکبِ اضافی فارسی تراکیب کی خصوصیت ہے اور اس کا بکثرت استعمال شاعری میں دیکھنے میں آتا ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں تراکیب کی کثرت کیوں موجود ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کا مزاج خشک اور یبوست زدہ ماحول، رویوں، مزاج اور اسلوب کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا اظہار انھوں نے کئی مرتبہ گفتگو میں بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خشک اور روکھی پھیکی تحریروں کی نسبت شگفتہ، دل کش اور متنوع خصائص کی حامل تحریریں انھیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کے خواہش مند رہتے ہیں تاکہ قلیل لفظیات میں معنی کثیر کی ادائیگی ممکن ہو سکے۔ چنانچہ تراکیب کا استعمال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ خیال اور معنی کو یک رخا پن دینے کی بجائے پہلودار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اسلوب کی معنیاتی حدود کی توسیع بھی ممکن ہو اور زبان کے اظہاری اور ابلاغی سانچوں میں اضافے کے امکانات بھی کھلے رہیں۔

تراکیب کے حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ 'نعت رنگ' کے خوش نظر، دقیقہ سنج اور صاحب نظر پڑھنے والے آج دنیا کے ہر براعظم میں موجود ہیں۔ (اداریہ نمبر ۵)

۲۔ علاوہ ازیں نعت خوانی کی بڑھتی ہوئی مصروفیات مسلسل اسفار بھی توجہ کے انتشار کا باعث بنتے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۱۹)

۳۔ گوشۂ سلیم کوثر میں آپ حرمِ کعبہ میں اذانوں کی گونج بھی سن سکیں گے اور طاہرانِ حرم کے والہانہ پن کا مشاہدہ بھی کر سکیں۔ یہ گوشہ حاضری اور حضوری کے بے شمار روشن لمحوں کی لفظی منظر کشی ہے۔ (اداریہ نمبر ۱۷)

۴۔ یقیناً یہ مشکل کام تھا اور ایک مشترکہ جدوجہد چاہتا تھا سو تمام قلمی معاونین اس خصوصی شمارے کے حوالے سے بھی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنی عقیدت اور فن کے تال میل اور شعور وادراک کی ہم آہنگی سے نعتِ رسول ﷺ کی پوری تخلیقی اور معنوی کائنات پر غور وفکر کے نئے زاویوں اور نئے امکانات کو پیش کرتے ہوئے اس شمارے کو ادبِ نبوی ﷺ کے فروغ میں فکر افروزی کی ایک عصری دستاویز بنا دیا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۵۔ اسلامی افکار واحکام سے صریح دشمنی اور دیدہ دانستہ ہر ممکن ضرر رسانی کی اس فضا میں مذہبی افکار کی حقانیت اور سر بلندی کے لیے کام کرنا اور دینی رشتوں سے اپنے آپ کو منسلک رکھنا، توحید ورسالت کا اثبات واعلان کرنا، محبّتِ رسول ﷺ کے نغمے چھیڑنا معمولی بات نہیں، لیکن دل کشا حقیقت یہ ہے کہ آپ کو مذہبی شعور اور اس کے نظامِ اقدار سے گہری اور پُر خلوص وابستگی کے مظاہر بھی یہاں سے امریکا تک جہاں جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوا ہے وہاں وہاں واضح طور پر نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ مسلمان کی انفرادی زندگی میں ختمی مرتبت نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبّت ایمان کا لازمی جزو ہے تو اجتماعی دائرے میں آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اسلام کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ محبّت اور تقاضا دونوں مل کر ایک ایسی مضبوط اساس اور مستحکم رابطے کی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں جس پر اسلامی عقائد و عبادات ہی نہیں، بلکہ باہمی انسانی اخوت واخلاص کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۶۔ تاریخِ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد ہر دور کے شعرا نے ہادیِ برحق نبیِ مکرم ﷺ کے اوصاف ومناقب اور جمالِ صورت وکمالِ سیرت کے بیان میں حُسنِ کلام اور حُسنِ عقیدت کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ آپ ﷺ کے حسن وجمال کی بوقلمونی، آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے نقوشِ لازوال، میلاد ومعراج کے تذکرے، آپ کا پیغام، تقویٰ، طہارت، عالم گیری وجہاں بانی، آپ کی محبّت میں سوز وگداز، ہجر ووصال، آپ کے قرب کی خواہش، طلبِ شفاعت، آپ کے شہر میں قیام اور موت کی تمنا، آپ کے معجزات وغزوات، آپ کی تعلیمات میں انسان دوستی اور خیر کی روشنی سے معمور معاشروں کی صورت گری ایسے افکار وتصورات نعت گوئی کے عام اور مستقل موضوعات رہے ہیں۔ نعت گوئی کا دامن بھی اسلام کی توسیع کے ساتھ برابر پھیلتا رہا۔ عرب اور اس کے بعد عجمی ممالک میں جب اسلام کا نور پھیلا تو اس میں مقامی رنگوں کی آمیزش نے بھی اس صنف کے موضوعات اور اسالیب کو وسعت دی۔ خصوصاً فارسی نعت گوئی جو طلوعِ اسلام سے کم وبیش تین صدی بعد وجود میں آئی، اس میں

جن موضوعات نے جگہ پائی ان میں آشوبِ ذات اور آشوب دہر بھی شامل ہوئے۔ اسلامی ممالک میں سیاسی کش مکش، سلطنتوں کی شکست و ریخت اور اقتدار کی جنگ و قتال نے جہاں آبادیوں کو تہ و بالا کیا وہیں لوگوں کے معاشی اور معاشرتی نظام کو بھی زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس قسم کے آشوب و ابتلا میں شعرانے اپنے مصائب و آلام کے نوحے اور حزن و ملال کے مرثیے لکھے۔ استغاثے اور استمداد کے مضامین سامنے آئے جن سے اُردو نعت کے موضوعات کا دامن مزید وسیع ہوا۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

درج بالا تمام پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔ تراکیب کی ایک رو موجود ہے جو یکے بعد دیگرے عبارت میں اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ بعض اوقات تو تراکیب/مرکبات کا استعمال اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ ان کی تعداد مفرد الفاظ سے تجاوز بھی کر گئی ہے۔

طویل جملوں کا استعمال

میرا یہ خیال ہے، ممکن ہے آپ بھی اس سے اتفاق کریں کہ 'نعت رنگ' کے ابتدائی شماروں کے اداریوں میں موجود چھوٹے چھوٹے جملے بکثرت نظر آتے ہیں لیکن بیسویں شمارے تک پہنچتے پہنچتے ان کا اسلوب ابتدائی شماروں سے یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ اس میں صنائع شعریہ کا فن کارانہ استعمال جگہ بنا چکا تھا۔ ابتدائی شماروں میں موجود چھوٹے چھوٹے اور سادہ و سلیس جملے رفتہ رفتہ صنائع شعریہ سے بھی مملو ہوتے گئے اور طوالت بھی اختیار کرتے چلے گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بیسویں شمارے تک پہنچتے پہنچتے مدیر نعت رنگ ان تمام مقاصد کو حاصل کر چکے ہیں جو وہ رسالے کی اشاعت کے آغاز میں لے کر چلے تھے اور ان کی پشت پر کم و بیش ستائیس سال کا تجربہ کام کر رہا تھا اور مسلسل تحریری مشق بھی اپنی ہنرکاری کے ساتھ قدم جمائے کھڑی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر میں پختہ یقین کا حامل وہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا جو مشاق نثر نگاروں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ ان کے باطن میں سرسراتے بے چین و بے قرار جذبات، خیالات اور افکار کا تموج، ذہن و دل کے راستوں سے ہوتا ہوا تحریر و تقریر کی صورت میں جلوہ گر ہونے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے۔ جذبات و خیالات کی یہ مسلسل رو، ان کی تحریر میں طویل و مطول جملوں کی صورت میں سامنے آتی ہے جیسے ایک بند کے ٹوٹنے سے سیلاب کا ایک تیز ریلا بغیر کسی وقفے، سکون اور ٹھہراؤ کے بہتا ہی چلا جاتا ہے، ان کے ہاں جملوں کا اظہار بھی بغیر کسی وقفے، سکون اور ٹھہراؤ کے جاری رہتا ہے بعینہٖ حالت ان کی تقریر (گفتگو) کی ہوتی ہے کہ وہ بغیر سانس لیے مسلسل اظہار خیال کرتے چلے جاتے ہیں

اوراس میں توقف کرنے کی زحمت ذرا کم ہی اٹھاتے ہیں۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن وقت کی قلت ان کے آڑے آ رہی ہے چنانچہ اپنی بات پوری کرنے کی لگن اور فرض کی ادائیگی کی بے چینی انھیں بلاتوقف بولنے/لکھنے پر مجبور کرتی ہے جس کی وجہ سے ان کی گفتگو اورتحریر میں جملے طوالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس حوالے سے ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

''اس ساری تفصیل کے بیان کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے قارئین اور مستقبل کا ہر مؤرّخ اور محققِ نعت ہماری تحریک کے اس مختصر مگر باوقار اور آبرومندانہ سفر کی منازل سے بخوبی واقف ہو اور ہماری کامیابیوں پر غور کرتے ہوئے اس کے پیش نظر یہ بات بھی رہے کہ جب اللہ کریم کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب و علل کوئی مسئلہ نہیں رہتے صرف تیرہ برسوں میں نعت کے ادبی فروغ کا یہ کامگار سفر ہر اس شخص کو عزم و حوصلے کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتا ہے جو ذکرِ نبی کریم ﷺ کے حوالے سے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔(اداریہ نمبر ۲۱)

محاورات کا استعمال

روزمرہ اور محاورہ زبان کا ناگزیر جزو ہیں۔ان سے تحریر میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کا وصف جنم لیتا ہے۔محاورے کا خمیر اسی زمین سے پھوٹتا ہے جہاں زبان نے پرورش پائی ہو۔ صبیح رحمانی نے اداریوں میں محاوروں کا استعمال بھی کیا ہے۔محاوروں کے استعمال سے بات میں زور پیدا کیا جاتا ہے۔تحریر کو موثر بنایا جاتا ہے اور خیال کی ترسیل کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔عبارت مختصر اور اسلوب رواں ہو جاتا ہے۔یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صبیح رحمانی اداریوں میں نہ نذیراحمد کی طرح شوقیہ محاورے لاتے ہیں اور نہ محاورے کی خاطر جملہ تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔یعنی محاورہ فقط مقصد برآری کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سلیقے سے استعمال ہوا ہے کہ خود مصنّف کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ محاورہ لکھ رہے ہیں۔میرا خیال ہے کہ انھوں نے نثر کو دلکش بنانے میں دیگر وسائل کا تو شعوری استعمال کیا ہے لیکن محاورات یا روزمرہ کے سلسلے میں کوئی شعوری کدوکاوش نہیں کی۔اسی وجہ سے اداریوں میں محاوات زبردستی کی چیز بن کر نہیں بلکہ نثر کا حسن بن کر سامنے آئے ہیں۔ ذیل کے جملوں میں لوہا منوانا،ثابت ہونا، پہلی اینٹ رکھنا،سامنے آنا،سفر کرنا، طے کرنا،وا کرنا، پیدا کرنا،نظر آنا،ڈھل جانا،وجود میں آنا،آوازہ بلند ہونا،جڑے رہنا،پوشیدہ ہونا،لکھ پانا،آئینہ ہونا،رنگ

دینا، چراغ سے چراغ جلنا، دلیل ہونا، ڈھونڈ ھ نکالنا، سامان ہوناوغیرہ محاورات استعمال ہوئے ہیں۔ خیالات کو پیش کرتے ہوئے عبارتوں میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر فارسی محاورات ہیں۔ کچھ فارسی عبارتوں اور محاورات کا اردو روپ بھی جملوں کا حصہ بن کر سامنے آیا ہے۔ مثال کے طور پر 'بہانہ ڈھونڈ ھ نکالنا' کوئی محاورہ نہیں بلکہ 'ڈھونڈ ھ نکالنا' محاورہ ہے لیکن ان کے ذہن میں جامی کا یہ مصرع ''رحمت حق بہانہ می جوید' موجود ہوگا۔ اسی طرح 'پہلی اینٹ رکھنا' اردو میں کوئی محاورہ نہیں لیکن رومی کا یہ مصرع 'خشتِ اول چوں نہد معمار کج' لاشعور کے کسی گوشے میں محاورے کی صورت اظہار کی راہ پانے کے لیے بے تاب ہوگا۔ اسی طرح 'وا کرنا' اردو میں کوئی محاورہ نہیں البتہ فارسی میں 'وا کردن' ضرور ہے۔ اس حوالے سے ذیل کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ احمد ندیم قاسمی ادب کے تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ (اداریہ نمبر ۱۹)

۲۔ نعت گوئی کے حوالے سے ان کا مجموعہ ''جمال'' جدید نعت گوئی کا اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ (اداریہ نمبر ۱۹)

۳۔ اس لیے کہ اس شعبے میں تو ابتدا، یعنی پہلی اینٹ رکھنے سے ہی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ (اداریہ ۲۹)

۴۔ 'نعت رنگ' کی اشاعت کے آغاز میں کچھ لوگوں کی طرف سے یہ سوال سامنے آیا کہ 'نعت رنگ' کتنا سفر طے کر سکتا ہے؟ (اداریہ نمبر ۱۲)

۵۔ ممکن ہے اس احساس کی بدولت آئندہ کوئی اعلیٰ کام سامنے آسکے جو ادبِ نبوی کے نئے اور معنی آفریں دریچے وا کر سکے۔ (اداریہ نمبر ۱۸)

۶۔ ان کے ہاں نعت ایک ایسی تخلیقی جہت پیدا کرتی ہوئی نظر آتی جہاں حسن، موضوع، جذبے کی صداقت اور تاثیر ایسی اکائی میں ڈھل جاتے ہیں جس سے زندہ رہنے والی نعت وجود میں آتی ہے۔ (اداریہ نمبر ۱۹)

۷۔ ''نعت رنگ'' اسی تاریکی کے خلاف آواز ہ بلند کیے ہوئے ہے، اس گہرے ایمان و ایقان کے ساتھ کہ اس روشنی کی تلاش اور اس سے جڑے رہنے کی صورت ہی میں ہمارا قلبی سکون اور ہماری اخروی نجات پوشیدہ ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

اشعار/مصرعوں کا استعمال

اُردو ادب کا ایک باذوق قاری اور مشاق شاعر ہونے اور اس پر مستزاد اہلِ زبان ہونے کے باوصف انھیں نہ صرف لفظوں کی اہمیت کا ادراک ہے بلکہ وہ شعر کی بھی بھرپور تفہیم رکھتے ہیں۔ اداریہ لکھتے ہوئے اشعار اور مصرعوں کا استعمال دراصل اظہارِ بیان میں دل کشی اور زور پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور یہ (اشعار اور مصرعے) عبارتوں کا ایسا خوبصورت جزو بن کر سامنے آئے ہیں،

جن سے ان کی نثر پر استادانہ مہارت اور مشاقی کا پتا چلتا ہے۔ بعض اوقات اپنی بات کا آغاز ہی شعر سے کرتے ہیں اور کبھی بات کے نتیجے کے طور پر شعر لاتے ہیں۔ متذکرہ دونوں صورتیں وفیات نگاری میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ وفیات کے ضمن میں نعت گو شاعر کا تعارف کرواتے ہوئے اس کا ایسا نمائندہ شعر ڈھونڈھ کر لاتے ہیں جس کے ذریعے قاری، شاعر کی شخصیت سے متعارف اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ فوت ہونے والے شاعر کا تعزیتی شذرہ لکھتے ہوئے اس کے ایسے شعر سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں جو پیش کیے جانے والے سوگوار لمحے کی گداز کیفیت کا نمائندہ بن کر زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہوئے تلخ سچائیوں سے پردہ بھی اٹھاتا ہے۔

صبیح اپنی تحریروں میں اشعار ہی نہیں مصرعوں کو بھی خوبصورتی اور مہارت سے کھپاتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مصرع اسی موقع کی مناسبت سے تخلیقی وجود میں لایا گیا ہے گویا وہ اپنے تخلیقی جوہر کے ذریعے اپنی تحریروں کو مؤثر اور دلکش پیرائے میں سامنے لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور عبارتوں میں شعر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں (جز و مصرع) کو زیورات کے نگینوں کی طرح جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ ذیل کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ان کے تین شعری مجموعوں میں سے دو مجموعے 'سرکار' اور 'حضور ﷺ' نعتیہ شاعری پر مبنی ہیں جو ان کی نعتیہ شاعری کے ذوق کا مظہر ہیں ان کا یہ شعر تو میرے لوحِ دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے ہمیں اچھا نہ لگا اے اختر
ہم سے پہلے درِ سرکارؐ پہ جانا دل کا

مدینے سے اس دلی تعلّق کا ثبوت اختر لکھنوی نے یوں بھی فراہم کیا ہے کہ جس دن انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ان کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر حرمین شریفین روانگی کی تاریخ بھی وہی درج تھی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان نعت احمدؐ را (اداریہ نمبر۲)

۳۔ مستقل رہتا نہیں کوئی فضائے دہر میں
چار نے بستر لگائے چار کے بستر اُٹھے

فضا جلالوی کا یہ شعر کتنی بڑی سچائی کو کس خوب صورتی سے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ حقیقت ہے کہ ابھی ہم گزشتہ شمارے میں لکھے گئے نئے دُکھوں پر کھل کر رو بھی نہیں پاتے کہ بچھڑنے والوں کی ایک اور فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ (اداریہ نمبر۲۱)

۴۔ بقولِ شاعر: رونے کی بھی مہلت نہیں رونا تو یہی ہے

ان کا کلام ان کی عقیدتوں کا خوب صورت اظہار ہے۔ علمی رسوخ، تحقیقِ میلان اور مقامِ رسالت ﷺ کی نزاکتوں کے احساس نے ان کے کلام کو پُر تاثیر اور پُر بہار بنا دیا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

۵۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

ع حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ ذوقِ سفر زندگی کے ارتقاء کا بنیادی سبب ہے۔ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک۔ اور یہ مرحلے کبھی ختم نہیں ہوتے۔

ع ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود

اس حقیقت کا عکس زندگی کے ہر شعبے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۵)

۶۔ زاہد نیازی کی کم عمری، شعری صلاحیت اور نعتیہ سرگرمی کے تناظر میں اس کی اچانک موت نے مجھے واقعی صدمے سے دوچار کیا لیکن ''موت سے کس کو رستگاری ہے''۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

۷۔ یہ گوشہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے اپنی صلاحیتوں اور خدمات کے سبب اپنی زندگی میں بھی عروج پایا اور مرنے کے بعد بھی وہ بامِ عروج پر نظر آ رہے ہیں۔ ''میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں'' (اداریہ نمبر ۲)

محمد حسین آزاد سے تاثر پذیری

محمد حسین آزاد کی نثر ایک خوبصورت اور دلآویز نثر کا مرقع پیش کرتی ہے۔ ان کی تحریر میں خوبصورت لفظیات، دل کش تراکیب، برمحل محاورات، نادر تشبیہات، چمکتے استعارات اور تجسیمی انداز نے ان کی نثر کو انفرادیت بخشی ہے۔ ان شاعرانہ وسائل کے ذریعے وہ احساسات، خیالات اور افکار کو بصری صورتیں عطا کر کے قارئین کو لطف اندوز کرتے ہیں۔ تجسیمی انداز ان کا وہ مؤثر ہتھیار رہے جس کے ذریعے وہ فکرِ مجرد کو فکرِ محسوس میں منقلب کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی تحریروں میں بصری تمثالوں کی متعدد مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس ہنر میں ان کا کوئی ثانی نہیں تاہم اردو نثر نگاری کی روایت میں کثیر تعداد میں ایسے نثر نگار گزرے ہیں جنھوں نے اس خوبی کو اپنی نثر میں کامیابی سے برتا ہے۔ ان میں ایک نام صبیح رحمانی کا بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ عمل باقاعدہ منصوبہ بند انداز میں تو سامنے نہیں آتا لیکن کہیں کہیں یہ انداز اپنے اظہار کا راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا یہ عمل مُلّا وجہی کی سب رس یا مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کے اسلوب کی طرح حد درجہ کاوشی یا آرائشی نہیں لگتا۔

ذیل میں محمد حسین آزاد کی تصنیف 'آبِ حیات' سے کچھ مثالیں نقل کی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی 'نعت رنگ' کے اداریوں سے بھی کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ دونوں اقتباسات کو سامنے رکھتے ہوئے قارئین اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ صبیح رحمانی نے شعوری یا لاشعوری طور پر آزاد سے استفادہ کیا ہے۔ استفادے کی اثر پذیری فقط صنائع شعریہ کی حد تک محدود نہیں، بعض لفظیات کے مخصوص استعمال کے حوالے سے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں لفظ 'رنگ' کا استعمال خاص اہمیت کا حامل ہے۔

آبِ حیات کی مثالیں: (۳)

۱۔ اشتیاق نے بے قرار کر کے گھر سے نکالا مگر غزل بے اصلاح تھی۔ (ص ۲۹۶)

۲۔ مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا (ص ۲۹۹)

۳۔ طائرِ شہرت نے ابھی پر پرواز نہ نکالے تھے جو مرزا رفیع اور میر سوز کے جلسہ میں ایک لطیفہ ہوا۔ (ص ۱۶۰)

۴۔ خدا جانے طرفین نے زبان سے کیا کچھ کہا ہو گا مگر غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگیں اور ساتھ ہی نکتہ چینی کی عینکیں لگ گئیں۔ (ص ۱۷۴)

۵۔ اب سید انشا کے طائرِ فخر کی بلند پروازی اور زیادہ ہوئی۔ ہر غزل میں مضامین فخریہ کا جوش ہونے لگا۔ (ص ۱۷۵)

۶۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ اُنھیں قادر الکلامی کے دربار سے مُلکِ سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ طبیبِ کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا اور کونسا رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزیِ قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ اُنھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اِس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں

عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اُن ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے یا اُنھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے۔ جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔ (ص ۳۱۵)

'نعت رنگ' کی مثالیں

۱۔ اس ایوان میں فکرِ تازہ کے دریچے کم ہی کھلے ہیں وہی چند موضوعات اور وہی چند حوالے جن کی بنیاد پر لاتعداد مضامین کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہے (اداریہ نمبر ۱۸)

۲۔ ادب کی ناقدری کی آوازوں کے درمیان نعت نگاروں کے اس گلے کی گونج بھی کافی عرصہ سے سنائی دے رہی ہے۔۔۔ (اداریہ نمبر ۹)

۳۔ شوکت عابد کی غزلیہ نعتیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ثنائے محمد ﷺ کا یہ سوتا، ان کی ذات کی گہرائیوں سے، ابھر کر اور رِس رِس کر وادیِ قرطاس تک آیا ہے۔ (اداریہ نمبر ۶)

۴۔ ''نعت رنگ'' بھی ایک موضوعی رسالہ ہے لیکن اس کا موضوع ایسا نہیں جس سے دلچسپی رواروی میں لی جائے۔ یہ اپنے قارئین سے پورے وقار و سنجیدگی کی رسد اور فکر و عمل کی کمک چاہتا ہے جو اسے حاصل ہے اور اس کا دائرہ روز بہ روز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ (اداریہ نمبر ۸)

۵۔ ہمیں تخلیق کاروں (اور بالخصوص نعت نگاروں) کی حساس طبیعت کا علم ہے اپنے فن پر تنقیدی گفتگو یقیناً ان پر گراں گزرتی ہوگی۔ ہم بھی ان آبگینوں کی نزاکت سے بے خبر نہیں مگر تنقید کی آنچ وہ آنچ ہے جو شیشے کو توڑتی نہیں بلکہ پختہ تر کرتی ہے۔ وہ شیشہ جو بھٹّی کی آگ سے مسکراتا ہوا نکلتا ہے شیشے کی آبرو بن جاتا ہے۔ (اداریہ نمبر ۴)

۶۔ اس بار ہماری خواہش اور کوشش کے برعکس کچھ مضامین و خطوط ایسے بھی شائع کیے جا رہے ہیں جن میں سخن گسترانہ بات کچھ زیادہ ہی گھن گرج کے ساتھ سنائی دے گی!...لیکن علمی موضوعات پر گفتگو کرنے سے پہلے کوئی لکھاری اپنے مبلغِ علم کی حدود سے واقفیت حاصل کر لے تو شاید بعد کی پشیمانی سے بچ سکے! علمی موضوعات پر مکالمات کے جنم لینے سے علمی آفاق کی تسخیر کا عمل تیز تو ہوسکتا ہے لیکن لہجوں کی تلخی سے ہمیں آبگینہ ہائے قلوب کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ بھی رہتا ہے!۔۔۔ کاش اہلِ قلم ہماری محدودات اور

موضوع کی متانت کا خیال رکھ سکیں!!! (اداریہ نمبر ۲۳)

۷۔ والی آسی، مولانا عبدالباری آسی کے صاحب زادے ہیں، اور ان کی علمی اور ادبی روایات کے امین۔ شعر بہت سجا کے کہتے ہیں۔ یہ آرائش جوان کی غزلوں میں کہیں کہیں تکلّف کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے جب ایوان نعت رسول عربی کے کام آتی ہے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتی ہے اور ان کے قارئین پر یہ نکتہ وا ہوتا ہے کہ لہجے کے ٹھہراؤ، ایک ہی مصرع میں معنوی ولغوی وقف نے ان کی شعری آواز کی تعمیر میں کیسا حصہ لیا ہے۔۔۔ والی آسی آج کے تاریک عہد (رات) میں اسم محمد (ﷺ) کے چراغ سے اپنی راہوں کو ہی روشن نہیں کر رہے ہیں بلکہ تاریکیوں اور اندھیروں سے نبرد آزما ہیں۔ (اداریہ نمبر ۵)

۸۔ صاحبزادہ سیّد منظورالکونین کی ساری زندگی مدحت سرائی میں بسر ہوئی اور پایانِ عمر تک ان کا یہ جوش وجذبہ جوان رہا۔ ان کے آہنگِ ثناخوانی میں موسیقی کے اسرار ورموز سے آگاہی کی ادب آموز گونج بہت واضح سنائی دیتی تھی، یہی وجہ ان کے نعتیہ منظرنامے پر نمایاں رہنے کی بنی۔ ان کی پڑھت کا انداز، ادائی کا اسلوب اور طرز یں وضع کرنے کا مؤدّب اور باوقار اظہار ان کی محبوبیت کی وجہ بنا۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ چھوڑا جو نعت خوانی کے فن کو ان کے انداز میں اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کی صلاحیت سے مالامال ہے اور یہی سیّد منظورالکونین کا کمال ہے۔ ان کی چند نعتیں بھی میری نظر سے گزری ہیں جو ان کے عشق وادب کی حلاوت اور نسبت وتعلّق کا اعلامیہ بن وقت کے اوراق پر محفوظ ہوگئی ہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

'آبِ حیات' کے مقابل 'نعت رنگ' کے اداریوں کا مطالعہ کیجیے۔ قارئین بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ مدیر نعت رنگ محمد حسین آزاد سے فقط متاثر نہیں بلکہ ان کے ذہن کے نہاں خانوں کے کسی گوشے میں آزاد کا تخلیقی ذہن اپنی جگہ بنائے بیٹھا ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے اظہار کی راہ تلاش کر لیتا ہے۔

رنگوں کا استعمال

خیالات کی ترسیل کے متعدد ذرائع ہیں۔ ان میں موسیقی، نقاشی، مصوری، رقص، رنگ اور زبان اہمیت کے حامل ہیں۔ تخلیق کار اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کے اظہار میں انھی ذرائع کا استعمال کرتا ہے۔ موسیقار، موسیقی یا سروں کے ذریعے، مصور، رنگوں کے ذریعے، رقاص، رقص کے ذریعے، عمارت ساز نقش ونگار کے ذریعے اور لکھاری، موزوں اور برمحل لفظیات کے ذریعے اپنے خیالات کی حرارت کو منتقل کرتا ہے۔ صبیح رحمانی کے فکر وخیال کی جلوہ گری اسلوب کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئی ہے۔ ان کے خیالات، احساسات، مزاج، نفسی رویے اور افکار خواہ وہ شاعری میں نظم ہوئے یا نثر میں ادا ہوئے، انھیں ان کی لفظیات کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک لفظ 'رنگ' ہے۔ وہ اس

لفظ کا استعمال اس کثرت سے کرتے ہیں کہ یہ لفظ ان کا تکیۂ کلام لگتا ہے۔ نعتیہ موضوع پر شائع ہونے والے رسالے 'نعت رنگ' کا نام اس کی بین مثال ہے۔ 'نعت رنگ' کے اکتیس اداریوں میں بیسیوں مقامات پر اس لفظ کے متنوع استعمال کی صورتوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی تحریروں میں بھی رنگ، آئینہ، روشنی، اور اس سے متعلّقات کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ صبیح رحمانی کے اداریوں میں بھی یہ لفظیات کثیر تعداد میں موجود ہیں، جن پر آگے چل کر روشنی ڈالی جائے گی۔ ذیل میں 'نعت رنگ' میں موجود لفظ 'رنگ' کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ مگر مجھے یہ کیف رضوانی ایک دریشانہ رنگ میں ملے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۲۔ عصری ادبی منظر نامے پر اپنی شناخت اور اعتبار کے رنگوں کو گہرا کر چکے تھے۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۳۔ تحقیق اور تنقید کے رنگوں سے مزین ''نعت رنگ'' اہلِ علم و فن کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲)

۴)۔ شعر و ادب کے جو خزینے ہمیں اپنے متقدمین کی میراث کی صورت میں ملے ہیں، ان میں حمد کا رنگ و آہنگ نہایت نمایاں ہے۔ (اداریہ نمبر ۶)

۵۔ حفیظ تائب عصرِ حاضر کے معتبر نعت نگاروں میں تھے۔۔۔ان کی شخصیت اور کلام میں عشقِ نبی کریم ﷺ کے رنگ بہت گہرے تھے۔ (اداریہ نمبر ۱۷)

۶۔ 'نعت رنگ' کو نعت شناسی کی ایک تحریک کا رنگ دیتے ہوئے یہ بات ہمیشہ میرے پیش نظر رہی ہے کہ نعت صرف ایک صنف سخن ہی نہیں ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۷۔ نعت رنگ کے رنگوں میں اعتماد اور اعتبار کے جتنے بھی رنگ ہیں وہ اس کے قلمی معاونین اور سرپرستوں کی حوصلہ افزائی ہی سے نمایاں ہوئے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۸۔ طبیعت میں اوائل عمری ہی سے دینی رنگ غالب تھا۔۔۔ان کی مطبوعہ کتب میں ان کے دو نعتیہ مجموعے ''خم خانہ مدینہ'' (۱۹۸۵ء) اور ''عارض چہ عارض'' (۲۰۱۵ء) بھی شامل ہیں۔ جنھیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف کے کلام میں عشقِ نبوی ﷺ، مدینہ طیبہ میں قیام کی آرزو اور سیرت سرورِ دو عالم سے اکتسابِ فیض کی تمنا کے رنگ کتنے گہرے ہیں۔ (اداریہ ۲۸)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رنگ سے انسانی نفسیات کا کوئی تعلق ہے؟ اگر ہے تو اس کے انسانی نفسیات اور مزاج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اور تیسرا یہ کہ صبیح رحمانی اس لفظ کا استعمال کیوں کرتے ہیں؟ اور وہ کون سے رنگ ہیں جو انھیں مرغوب ہیں؟ ذیل میں ہم ان کے جوابات تلاش

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاں تک رنگوں کا تعلّق ہے تمام انسان نفسیاتی طور پر رنگوں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف رنگ مختلف افراد پر مختلف اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایک ہی رنگ ایک فرد کے لیے متاثر کن ہوسکتا ہے اور دوسرے کے لیے نفرت انگیز۔ ایک کے لیے دلچسپی کا باعث تو دوسرے کے لیے غیر دلچسپ۔ ایک کے لیے حسن خیزی کا باعث ہوسکتا ہے تو دوسرے کے لیے دہشت انگیز۔ رنگ اپنے اندر نفسیاتی کشش رکھتے ہیں اور دیکھنے والوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دیکھنے والے کی نفسی اشتہا کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رنگوں میں توجہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر انسان مختلف رنگوں سے متاثر ہوتا ہے۔ تاثر کی یہ اثر پذیری دوطرفہ ہوتی ہے۔ رنگوں کی طرف سے بھی اور انسان کے اپنے مزاج اور رویوں کی طرف سے بھی۔

ماہرِ نفسیات کے نزدیک مختلف افراد ایک ہی رنگ کے لیے مختلف جمالیاتی یا احساساتی ردِعمل رکھتے ہیں۔ مثلاً سرخ رنگ کسی کے لیے خوف، دہشت اور غصے کی علامت ہوسکتا ہے اور دوسرے کے لیے محبّت اور اپنائیت کا استعارہ۔ سیاہ رنگ کسی کے لیے سوگ، اداسی، افسردگی، پریشانی، غم واندوہ، خوف اور نفرت کی علامت ہوسکتا ہے تو کسی کے لیے سکون، تخلیق اور فرحت کا باعث۔ غالب کو سیاہ رنگ مرغوب تھا۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں نقش سویدا، دودِ چراغ، سرمایۂ دود، آرائش خم کاکل جیسے بکثرت استعارے چمکتے نظر آتے ہیں۔ صبیح رحمانی کے ہاں سفید، سیاہ اور آسمانی رنگوں کے نقش زیادہ گہرے نظر آتے ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے رنگوں کا تعلّق مختلف کیفیات، واردات، جذبات، اشیا اور صورتوں سے بھی جوڑا ہے۔ رنگوں کا یہ پہلو مفصّل مطالعے اور غور وخوض کا متقاضی ہے، جسے ایک علیحدہ مقالے کی صورت میں پیش کرنے تک ملتوی کیا جا رہا ہے۔

روشنی کے استعارے

لفظوں میں اپنی ایک کشش اور متاثر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض لفظیات بعض افراد کو مرغوب ہوتی ہیں۔ لفظوں کی اثر پذیری اور مرغوبیت تحریر وتقریر میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ مخصوص لفظیات سے دلچسپی اس کے مکرر اظہار کا باعث بنتی بھی ہے۔ تکرار کا یہ عمل فرد کے طرزِ فکر و عمل، نفسی

محرکات اور مقاصد حیات کا ترجمان رغماز بھی ہوتا ہے۔ تکرار کا یہ عنصر تحریر وتقریر دونوں میں جلوہ گر ہوتا ہے البتہ تحریر میں اس کا نقش تقریر سے زیادہ گہرا اس لیے ہوتا ہے کہ تحریر تقریر کی نسبت زیادہ کد و کاوش کا مظہر ہوتی ہے۔

صبیح رحمانی کے اداریوں میں بعض لفظیات کا استعمال بار بار اور تکرار کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اداریوں میں جنم لینے والے اس عمل کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ تو قاری کے گوش دل پر بار بار دستک دینے کے عمل سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ دوسری وجہ صبیح رحمانی کی شخصیت میں تلاش کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کشادہ دل اور وسیع ذہن کے مالک ہیں۔ وہ دلوں کو توڑنے کی بجائے جوڑنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ایک رجائی شخص کا نقش ابھرتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ہی نہیں، ان کی تحریروں میں بھی رجائی عنصر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں نہ تھکن کے آثار نظر آتے ہیں، اور نہ ہی مایوسیت ظاہر ہوتی ہے۔

اردو کے ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والا سنجیدہ قاری جانتا ہے کہ رسائل مدیر کے ذہن و فکر وعمل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ رسالے کی بناوٹ، مواد کی پیش کش اور بالخصوص اداریے رسالے کے منشور اور مدیر کے ذہنی رویوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان سے مدیر کی دل چسپی، عدم دل چسپی، پسند و ناپسند اور ذہنی تغیّرات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اداریے مدیر کے فکر وخیال، ذہنی سوچ اور پیش بندی کا ایسا میزان ہوتے ہیں جن کے ذریعے رسالے کے معیار واعتبار کا اندازہ رسالے کے نشیب و فراز اور کبھی اشاعتی بے قاعدگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رسالہ دو میں سے ایک رخ اختیار کرتا ہے۔ یا تو ترقی کی جانب گامزن ہوتا ہے یا زوال کا رخ کرتا ہے۔ زوال کی یہ رفتار بعض اوقات بہت تیز ہوتی ہے اور بسا اوقات اتنی سست کہ اس کا پتا لگانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ رسالہ زوال کے کس مقام پر کھڑا ہے، اداریوں کی بے یقینی اور مدیر کی تھکن سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کبھی چندہ نہ ملنے اور کبھی مصنّفین کی بے اعتنائی اور کبھی قارئین کے گلے شکوے کی صورت لگایا جاسکتا ہے۔ خوش آیند بات یہ ہے کہ یہ آثار 'نعت رنگ' کے اداریوں میں نظر نہیں آتے۔ ان کی مثال اس مؤذن کی سی ہے جو دن میں پانچ مرتبہ حی علی الصلوٰۃ کی آوازیں لگانے کے باوجود پانچ نمازیوں کی موجودگی پر بھی مایوس نہیں ہوا کرتا اور اگلی صبح پھر اسی جوش و جذبے کے ساتھ یہی عمل دہراتا نظر آتا ہے۔ نہ اس کی آواز میں مایوسی جھلکتی ہے نہ عمل سے بیزاری۔

ذیل میں چند ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہی جن سے صبیح رحمانی کے مقصدِ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں مدیر نعت رنگ کی ادبی کارگزاری اور فروغِ نعت کے سفر اور ذہنی رویوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ؔ میں ہوں وقفِ نعت گوئی کسی اور کا قصیدہ
مری شاعری کا حصہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا (ص،۱۹۷)

ؔ مری زندگی کی کتاب میں سبھی حرف نعت کے حرف ہوں
اسی ذکر و فکر میں ہوں بسر مرے ماہ و سال مرے نبی (ص،۲۰۰)

ؔ ایک اک گام پہ روشن کرو مدحت کے چراغ
نعت کی روشنی پھیلاؤ جہاں تک پہنچے (ص،۲۰۲)

ؔ زیست کے تپتے ہوئے صحرا میں ہے وجہ سکوں
ان کی یاد ، ان کی تمنا، ان کی سیرت کا گلاب (ص،۲۱۰)

ؔ میرے فکر و فن کا میری زیست کا
نعت عنواں ہے خدا کا شکر ہے (ص،)

درج بالا اشعار صبیح کے مقصدِ حیات کے ترجمان ہیں۔ نبی مکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور سیرتِ طیبہ کی تفہیم اور تحسین ان کا مقصدِ حیات ہے اور ان کا تمام نظامِ خیال اسی مقصدِ حیات کے تابع ہے۔ ان کے تمام خیالات اور اظہار کے تمام زاویے سب اسی مرکزی دھارے سے جڑے ہوئے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ کی ذات وہ مینارۂ نور اور سرچشمہ حیات ہے جس سے فکر و خیال کی کرنیں اور چشمے پھوٹ رہے ہیں اور یہ چشمے ہر زمانے، ہر خطے اور ہر فرد کو ان کی استطاعت اور ظرف کے مطابق سیراب کر رہے ہیں۔ اسی مینارۂ نور کی ایک کرن اور چشمے کی لہر نعت رنگ اور اس کے مشن میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

نہ روشن ہو کس طرح یہ چاند سورج
درِ مصطفیٰ سے ضیاء پا رہے ہیں (ص۹۱)

صبیح اپنے فکر و خیال کی روشنی اسی سرچشمے سے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی پسند و ناپسند، افکار و خیال، اقدار و نظریات کے تمام سوتے وہیں سے پھوٹتے ہیں۔ وہ عشق رسول کو حیاتِ انسانی

کی سب سے اہم قدر اور ضرورت تصور کرتے ہیں۔ان کے نزدیک آخرت میں ہی نہیں دنیا میں بھی نجات اور کامیابی کا راز اسی ذات سے مخلصانہ تعلّق اور لگاؤ میں پوشیدہ ہے اور اس تعلّق کا ایک مظہر نعتِ رسول ﷺ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔نعت فقط تحسین نبی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اسوہ ءرسول کی وہ کرنیں دیکھ سکتے ہیں جس نے انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو منور کیا ہے۔

نبی مکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر طائرانہ نظر ڈالیے۔ان کی زندگی کی جس جہت پر غالباً کم توجہ دی گئی ہے وہ ان کی رجائیت پسندی ہے۔آپ ﷺ ہر عمل، واقعے، رویے، فکر اور خیال میں امید کی کرن دیکھتے تھے۔مکہ کی زندگی ہو یا طائف کا سفر، ہجرتِ مدینہ ہو یا ہجرتِ حبشہ، مکی زندگی ہو یا مدنی ہمیں ان کے قول و فعل میں رجائی عمل نظر آتا ہے۔جنگ بدر میں جب مسلمانوں کی جانیں ان کے حلق میں آ گئی تھیں تب بھی مایوس ہو کر حوصلہ نہ ہارا۔ظاہری اسباب مکمّل کر لیے تو پھر دستِ دُعا دراز کیے۔جو ان کی رجائیت پسندی کی دلیل ہے۔صبیح رحمانی کے اداریوں میں رجائیت کی جو روشنی پھوٹ رہی ہے اس کا سرچشمہ نبی مکرم ﷺ کی ذات سے مستفاد نظر آتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے طاقِ جاں میں انھی کی نسبت کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں اور اس چراغ کی روشنی ان کے فکر و خیال اور اسلوب و اظہار سے جلوہ گر ہے۔

اگرچہ رجائیت کے عناصر صبیح رحمانی کی نظم و نثر میں بھرپور آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں لیکن فی الوقت اس عنصر کو 'نعت رنگ' کے اداریوں میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں یہ عمل ان کے ہاں دو سطحوں پر نمودار ہو رہا ہے۔ایک خیال اور مواد کی سطح پر اور دوسرا اظہار اور اسلوب کی سطح پر۔تمام اداریوں میں خیال اور اسلوب کی رو متوازی چلتی رہتی ہیں۔اداریے ہوں یا مقالات، انٹرویوز ہوں یا خطوط 'نعت رنگ' کا ہر حصہ اور گوشہ مدیر کے رجائی نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔اداریوں میں پیش کردہ خیالات کا مطالعہ کیجیے، مقالات و مضامین اور جواب الجواب مضامین کا لہجہ اور انداز ملاحظہ کیجیے۔خطوط میں مباحث کا سلسلہ دیکھیے، 'نعت رنگ' کے ہر حصے میں مکالمے اور روشن خیالی کی فضا، زندگی کی متنوع لطافتوں اور کیفیتوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس رسالے پر کسی مخصوص مکتبۂ فکر، گروہ، دبستانِ خیال کی چھاپ نظر نہیں آتی یہی ان کی رجائیت پسندی اور روشن خیالی کی دلیل ہے۔

ثانی الذکر صورت اسلوب کے ذریعے خلق ہوتی ہے۔اداریوں کے اسلوب میں خوبصورت لفظیات، روزمرے، محاورات، تشبیہات، استعارات، رعایت لفظی، متضاد الفاظ، قوافی کا استعمال، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دونوں سطحیں ان کے مرکزی نظامِ خیال سے جڑی ہوئی ہیں۔ جوان کے ذہنی وفکری رویوں اور طرزِ عمل کی ترجمان ہیں۔

تحریر میں خیال، بیان یا نقطۂ نظر کو مؤثر پیرائے میں ادا کرنے کے لیے جو ذرائع استعمال ہوتے ہیں، ان میں ایک تکرار بھی ہے۔ تکرار، حروف، الفاظ، جملوں کے مکرر اظہار سے بھی پیدا کی جاتی ہے اور خیالات کی مکرر پیش سے بھی۔ گویا یہ دو دھاری تلوار ہے جس پر چل کر کامیابی بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور ناکامی کا منہ بھی دیکھنا بھی پڑسکتا ہے۔ یہ لکھنے والے کی صلاحیت اور ہنرمندی پر منحصر ہے کہ وہ حسن کی تخلیق کرتا ہے یا بدصورتی کو جنم دیتا ہے۔ بہر حال یہ ایک مؤثر اور طاقتور اثرات کو تشکیل دینے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس انداز کو صبیح رحمانی نے دونوں سطحوں پر برتا ہے۔ خیال کی سطح پر بھی اور اسلوب کی سطح پر بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تکرار کا یہ عمل اس سلیقے اور ہنرمندی سے برتا گیا ہے۔ کہ نہ عبارت کا ادبی حسن متاثر ہوا ہے نہ موضوع و مفہوم کی معنویت زائل ہوئی ہے اور نہ ہی اس احساس نے جنم لیا ہے کہ ان کے پاس کہنے کو مزید کچھ نہیں رہا کہ پیش کیے گئے خیالات کو دوہرا کر اپنی بات ہی نہیں اپنا وزن بھی ہلکا کر رہے ہیں۔ ان امکانات کی زیادہ تر گنجائش اسلوب میں نکل سکتی تھی لیکن مدیر 'نعت رنگ' اس نقص سے بھی دامن بچا کر گزر گئے ہیں۔

'نعت رنگ' کے اکتیس شماروں کا مطالعہ کر لیجیے۔ تمام شماروں کا مواد اور اداریوں کا موضوع 'نعت رنگ' کے منشور کے گرد گھومتا ہے اور وہ ہے تنقید نعت کی سنجیدہ تنقیدی فضا سے اہلِ علم اور نعت پسند حلقے کو فکری دریچوں سے آتی ہوئی شعور کی روشنی سے مستفید کرنا تا کہ نعت کا ادبی فروغ ممکن ہو سکے۔ (اداریہ نمبر ۲۴)

تحریر و تقریر میں بالعموم خیالات اور لفظوں کی تکرار سے جذبات ابھارنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کی گنجائش اداریوں میں کچھ زیادہ ہی نکل سکتی تھی کیونکہ موضوع بذاتِ خود بھرپور جذبات فراہم کرتا ہے لیکن صبیح رحمانی نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ ان کا پہلا قدم ہی اس دائرے سے باہر اٹھا تھا جسے دل جوئیوں اور عقیدتوں کے موسموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا مشن اور مقصد تنقید نعت کا وہ ماحول تیار کرنا تھا جس کے ذریعے اہلِ علم نعتیہ ادب کے حقیقی مقام سے آشنا ہو سکیں۔ اس

کے لیے انھوں نے 'نعت رنگ' کا پلیٹ فارم استعمال کیا اور یوں بھی نعت سے متعلّق مختلف نوعیّتوں کے حامل سوالات اٹھائے۔ نعت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کے لیے ہر طرح کے مضامین شائع کیے۔ مضامین کی فکر سے اختلاف کرنے والے ناقدین کے جوابیہ مضامین شائع کیے۔ پھر جواب الجواب مضامین شائع کیے۔ وہ افراد جو مضامین میں نقطۂ اعتراض اٹھانے سے کتراتے تھے یا عدیم الفرصتی کے باعث ایسا کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان کے لیے خطوط کا حصہ مختص کیا گیا جس میں وہ خطوط کے ذریعے اپنے خیالات کا بے باکانہ اظہار کر سکیں۔ تکرار کی دوسری صورت جس کا استعمال بہت کم لیا جاتا ہے، وہ قائل کرنے کی ہے۔ تحریر و تقریر میں کسی نکتے کی نشان دہی کرنے کے بعد خیال یا لفظ کی تکرار کے ذریعے پیش کیے گئے نکتے کی اہمیت پر زور دینے اور مرکزی نقطۂ نظر پر توجہ مبذول کروانے کے لیے بھی یہ عمل کام میں لایا جاتا ہے۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں پیش کیے گئے سوال اور ان کے دیے گئے جواب دراصل قائل کرنے کی ہی کوشش ہے۔

ماہرینِ نفسیات کے مطابق لفظوں کے انتخاب میں انسانی نفسیات، اور ذہن دیگر عوامل کے مقابلے میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات کی اسی کارفرمائی کو نفسیاتی ناقدین ادب میں تفہیم کا اہم ذریعہ گردانتے ہیں۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں میں ویسے تو کثیر تعداد میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے صبیح رحمانی کے ذہنی رویوں کو سمجھا جا سکتا ہے لیکن دو لفظ ایسے ہیں جو ان کی روشن خیالی، وسیع القلبی، کشادگی، ہم آہنگی اور انسان دوستی کے نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں ایک ''روشنی'' اور دوسرا ''فروغ'' ہے۔ یہ دونوں لفظ صبیح رحمانی کے مقاصد حیات کے ترجمان اور ذہنی رویوں کے عکاس ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اداریوں میں بکثرت ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جنھیں ان الفاظ کی توسیعی صورت کہا جا سکتا ہے۔ ان میں اجاگر، نور، منور، جلا، جگمگانا، اُجلا، اجالا، چاند، چراغ، دیے، طلوع، فروغ، رنگ، آئینہ، مسرت، امنگ اور امکانات وغیرہ اہم ہیں۔ اسی طرح مسئلہ، راہ، باطن، فکر، دیار، ماضی، تنقید، نعتیہ ادب، افکار و تصورات، ملک عدم، ادبی تاریخ، اذہان، ستارے کا اوجھل ہونا، پہلو، شعری دنیا، مکالمہ اور بیانیہ، وغیرہ وہ لفظیات ہیں جن کے ساتھ روشنی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تمام لفظیات ان کے ذہنی رجحان اور نظام خیال سے وابستہ ہیں اور مدیر کی ذہنی فضا، نفسیاتی صورتِ حال، افکار و تصورات اور مقاصد کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ان لفظیات کی کثرت اور تکرار کے پس پشت ان کا وہی نفسی محرک کارفرما ہے جسے ان کی روشن خیالی اور رجائیت پسندی

سے تعبیر کیا گیا ہے۔متذکرہ لفظیات پر غور کیجیے، ہر لفظ کا تعلّق روشنی، اور کشادگی سے بنتا رجڑتا ہے۔ اداریوں میں مخصوص لفظوں کی تکرار اور متعلّق لفظوں کا بکثرت استعمال ان کے اس لاشعوری عمل کا زائدہ محسوس ہوتا ہے جس کا سطور بالا میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

اب یہاں ایک اور نکتے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اداریوں میں روشنی اور نور جیسے الفاظ کی متضاد صورتوں رلفظیات کا استعمال کس حد تک ہوا ہے؟ اور جتنا بھی ہوا ہے ان کی صورت ر نوعیت کیا ہے؟ اداریوں میں روشنی اور نور کے متضاد الفاظ یا حالتیں دیکھنے میں تو آتی ہیں لیکن دیگر الفاظ کی نسبتاً کم استعمال ہوئی ہیں۔ان میں تاریکی، اندھیرا اور ظلمت نمائندہ الفاظ ہیں۔اداریوں میں جہاں کہیں بھی تاریکی اور اس سے متعلّق لفظیات استعمال ہوئی ہیں۔ یہ تمام لفظیات اپنے خیال کے برعکس روشنی کے اثرات کو تقویت دیتے ہوئے اور تاریکی کی شدت کو کم کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔روشنی اور تاریکی کے تمام متعلّقات اور مناسبات یکجا ہو کر ایک ایسی فضا کی تشکیل دینے میں حصہ دار بنتے ہیں، جس سے اُمید اور رجائیت کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور ناامیدی، یاسیت اور سوگواری کی متوقع فضا غیر متوقع طور پر جنم نہیں لینے پاتی بلاشبہ یہ حیران کن امر ہے۔اس حوالے سے درج ذیل مثال ملاحظہ فرمائیے:

> ’’آفتاب ڈوب گیا لیکن اس کا نور باقی ہے۔ پھول مرجھا گیا لیکن مہک کو کون مٹا سکتا ہے۔‘‘ (اداریہ نمبر۲)

اس جملے میں آفتاب کے ڈوبنے کا ذکر آیا تو ساتھ ہی نور کے باقی رہنے کی امید بھی پیدا کر دی گئی۔ پھول کے مرجھانے کی اطلاع دی گئی ہے تو ساتھ ہی مہک کے باقی رہنے کی نوید بھی سنا دی گئی۔ان کے ہاں فضا سوگوار صرف ان حصوں میں نظر آتی ہے جہاں وہ تعزیتی شذرات قلم بند کرتے ہیں لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ ان مواقع پر بھی مدیر نے اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے جس سے ماحول سوگوار، ناخوش گوار اور مایوسیت زدہ ہونے نہیں پاتا۔

صبیح کی تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ برائی سے اچھائی، تاریکی سے روشنی، اندھیرے سے اجالا اور نا اُمیدی کے بطن سے امید کی روشنی برآمد کرتے ہیں۔ وہ رنج وغم اور یاس و نا اُمیدی کو خوشی و طمانیت اور آس و اُمید کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جسے ان کی کشادہ نظری، فراخ دلی، خوش دلی اور رجائیت پسند مزاج کی روشن دلیل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کی توثیق مندرجہ ذیل اس جملے سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر تو موت اور قبر کی تاریکیوں کا ہو رہا ہے لیکن جملے کی جو امتیازی خصوصیت ابھر کر سامنے آ رہی ہے اس میں نہ خوف ہے نہ اداسی بلکہ جو خیال ابھر کر سامنے آ رہا ہے وہ چراغ کی اس روشنی کا ہے جو قبر کی تاریکی، اندھیرے، خوف اور تنہائی کی شدت کو کم یا زائل کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چراغ کی روشنی نے قبر کی تاریکیوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اس جملے سے صبیح رحمانی کی ذہنی فضا کو بھی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی پشت پر موجود اس تصور کو بھی کہ عاشق اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ یہ اس کی خوش نصیبی، اور دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی ہے اور مقصدِ حیات بھی۔ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

"فنِ نعت گوئی کا چراغ لیے ہوئے قبر کی تاریکیوں میں اتر گیا۔" (اداریہ نمبر ۲۸)

اس حوالے سے ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

"تاہم چند ستارے اوجھل ہو کر بھی اپنے نام اور کلام کی اتنی روشنی چھوڑ گئے ہیں کہ وقت کی گردان کے کارناموں کو دھندلانے میں ناکام رہے گی، ان شاءاللہ" (اداریہ نمبر ۱۹)

اس عبارت سے بھی وہ فضا / ماحول پیدا ہوتا نظر نہیں آتا جس سے تاریکی یا نا اُمیدی جھلک رہی ہو۔ ستاروں کے اوجھل ہونے یا شخصیات کے زمین کی چادر اوڑھنے سے بھی مدیر اُداسی یا مایوسی پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس سے بھی وہ رجائیت کی روشنی اور امید کا پہلو دیکھ رہے ہیں۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں اور تعزیتی شذرات کی یہ ایک اہم خوبی ہے۔

'نعت رنگ' کے تمام اداریوں کا بغور مطالعہ کیجیے۔ کسی اداریے میں بھی قنوطیت، نا اُمیدی اور یاسیت، خوف، دہشت، پریشانی، غصہ، انتقام، جارحیت، طعن، تشنیع کے عکاس اور مظہر الفاظ بمشکل ہم دست ہوں گے لیکن امید، رجائیت اور روشنی کے استعارے جس کثرت اور تواتر کے ساتھ ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تمام اداریوں کی فضا ہی تبدیل کر دی ہے۔ 'نعت رنگ' میں استعمال ہونے والی تمام لفظیات کو اکٹھا کر کے ان کی معنوی سطحوں کو سامنے رکھا جائے اور پھر اداریوں میں ان کے معنوی پہلوؤں کو تلاش کیا جائے تو ان سے متذکرہ موقف کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

"نعت ایک باقاعدہ صنفِ سخن ہے یا نہیں، اس مسئلے پر ہمارے گزشتہ شماروں میں بھی گفتگو ہو چکی ہے اس بار بھی جناب سیّد حسین احمد نے اسی مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ

ہمارے نعت نگار اور قارئین اس مسئلے پر کوئی مکالمہ روشن کریں گے۔'' (اداریہ نمبر۱۲)

مندرجہ بالا جملے میں صبیح رحمانی نشان دہی کرتے ہیں کہ اہلِ علم و ادب کے ایک طبقے کے نزدیک تو نعت باقاعدہ صنفِ سخن ہے لیکن ہمارے ادب میں ناقدین کا ایک طبقہ وہ بھی موجود ہے جو اسے اصناف سخن میں شمار کرنے کا قائل نہیں۔ صبیح رحمانی نے اسے ایک مسئلہ قرار دیا ہے پھر اس مسئلے پر اٹھائے گئے سوالات، اعتراضات مباحث، نکات اور نقطۂ نظر کو بحث، مناظرہ، مجادلہ یا معرکہ سے موسوم کرنے کی بجائے گفتگو سے تعبیر کیا ہے۔ آگے چل کر نعت کے ایک اور مسئلے کا بیان ہوا تو اس کے لیے بھی انھوں نے مکالمے کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اسے روشنی سے تعبیر کیا۔ یہ لفظیات ان کی ذہنی ساخت اور نفسی صورتِ حال، باطنی رویوں، طرزِ فکر اور مقاصدِ حیات کی عکاس ہیں۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں کی بے شمار عبارتیں ایسی ہیں جن کے عقب سے روشنی، امید، فراخی اور کشادگی کی خوشگوار کرنیں جھانک رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ 'روشنی' ہے۔ اس کے بعد 'فروغ' کا۔ روشنی کے لفظ سے متعلّق الفاظ جیسے چراغ، شمع، طلوع، چاندنی، نور، منور، اجالا، اُجاگر، جگمگانہ، تابندگی، وغیرہ الفاظ بھی روشنی کی توسیعی صورت ہیں۔ اسی طرح ہم آہنگی، مکالمہ، پل، دائرے، زاویے، حلقہ، سوال، تنوع، پُل، کشادگی، آئینہ، خواب، سفر وہ لفظیات ہیں جو مدیر کی انسان دوستی اور وسعتِ قلبی کی عکاس ہیں۔ ان لفظیات کی پشت سے امید، رجائیت اور روشن خیالی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ذیل میں 'نعت رنگ' کے اداریوں سے کشید کی گئی متذکرہ لفظیات کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

روشنی

۱۔ ۔۔۔بلکہ پاکستان کے ادبی منظرنامے پر نعت کے ادبی اسالیب کی چاندنی بھی بکھیر دی۔ (اداریہ ۲۷)

۲۔ وہ اندر سے روشن اور دینی اقدار کو اہمیت دینے والی شخصیت ہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۷)

۳۔ ہم چاہتے ہیں کہ 'نعت رنگ' کی چھوٹ سے ہر دیار روشن ہو اور یہ کام آپ کا بھی ہے۔ (اداریہ نمبر۵)

۴۔ کئی لوگوں کے اشتراکِ ذہنی سے کام کی افادیت کے لیے مزید کئی پہلو روشن ہونے کے امکانات خاصے بڑھ جاتے ہیں۔۔۔ (اداریہ نمبر۲۱)

۵۔ ۲۰۱۴ء کو سرشار صدیقی بھی ایک کامیاب ادبی اور روحانی زندگی گزار کر یقیں کی اس روشنی کو ساتھ لیے ہوئے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۶۔ میری دعا ہے کہ دنیا کی ہر زبان اور ہر خطے میں ''نعت رنگ'' جیسے جریدے طلوع ہوں اور ''ورفعنالک

ذکرک'' کی روشنی پھیلتی چلی جائے۔(اداریہ نمبر۲۱)

۷۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مقالات کی سنجیدہ تنقیدی فضا سے اہلِ علم اور بالخصوص نعت پسند حلقہ یقیناً فکری دریچوں سے آتی ہوئی شعور کی روشنی سے مستفیض ہوگا۔ جو درحقیقت نعت رنگ کا مشن ہے۔(اداریہ نمبر۲۴)

۸۔نئی صدی کی دہلیز پر ذکرِ نبی کریم ﷺ کے اس چراغ کو روشن کرتے ہوئے میں نئی مسرتوں اور نئی منگوں کے جلو میں ان امکانات پر غور کررہا ہوں جو آنے والے برسوں میں صنف نعت میں پیدا ہوں گے۔اس اہم موقعے پر میرے ذہن میں بیسویں صدی میں نعت گوئی کے فروغ کے کئی جائزے روشن ہیں۔(اداریہ نمبر۱۱)

۹۔ تاکہ عوام الناس کے دلوں میں تذکارِ رسول ﷺ کے ذریعے عشق کی شمعیں روشن کرکے انھیں عملی طور پر اسلامی معاشرے کی صورت گری کی طرف متوجہ کیا جائے۔(اداریہ نمبر۹)

۱۰۔آپ کے خطوط ہماری راہیں منور کرتے ہیں۔(اداریہ نمبر۵)

۱۱۔ وہ اپنے ماضی کے ان روشن لمحات کو ہمارے سامنے پیش کررہے ہیں جو ذکرِ نبی کریم ﷺ سے منور ہیں۔ (اداریہ نمبر۱۷)

۱۲۔ان کی پہچان اور اختصاص ان کے پوربی، اودھی اور بھوجپوری زبانوں میں لکھے گئے وہ گیت ہیں جو ماحول کو منور اور سماعتوں کو روشن کرتے رہے ہیں۔(اداریہ نمبر۲۷)

۱۳۔کئی ادق فکری، فقہی اور ادبی مسائل پر پہلی بار''نعت رنگ'' نے ایسا مواد پیش کیا ہے جس نے نعت کی رسمیات سے بلند ہوکر ہمارے اذہان کو منور کیا اور اس پر بات کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔(اداریہ نمبر۱۷)

۱۴۔ہم غالبیات کے ایک توجہ طلب مگر تشنہ موضوع کو اس مرتبہ''نعت رنگ'' میں ایک خصوصی گوشے کی صورت اُجاگر کرنے کی سعی کررہے ہیں۔(اداریہ نمبر۱۲)

۱۵۔ ہماری خواہش ہے کہ نعت کے اسالیب میں رفعت، عقیدت اور ادبی محاسن اس طرح یک جا ہوجائیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے راستے جگمگا اٹھیں۔(اداریہ نمبر۵)

۱۶۔اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے، مسلمان وقت کی کسی بھی پیمائش کو ذکرِ نبی کریم ﷺ سے الگ کرکے نہیں دیکھتے۔ظرف زماں یا ظرف مکاں کوئی بھی ہو، ان ہی کی یاد اور ان ہی کے ذکر سے جگمگاتا ہے۔(اداریہ:۱۱)

۱۷۔ہم نے اہلِ علم کو سنجیدگی سے کلامِ رضا پر لکھنے کا موقع فراہم کیا تو مجھے یقین ہے کہ کلامِ رضا کی تابندگی اور اس کی عظمت سے نہ صرف ہماری ادبی تاریخ منور ہوگی بلکہ۔۔۔(اداریہ نمبر۱۸)

۱۸۔اُردو کی شعری دنیا پر''نعت رنگ'' کا طلوع صائبِ افکار کا اُجالا پھیلنے کا سبب بنا اور نعت کی شعری قدر افزائی کے لیے خالص ادبی پیمانوں کے استعمال کی راہیں روشن ہوئیں۔(اداریہ نمبر۲۱)

۱۹۔گوہر ملسیانی نے ایسے کئی علمی کام چھوڑے ہیں جن کی روشنی سے علم و ادب کے افق پر اُجالا رہے گا۔(اداریہ:۲۷)

۲۰۔نعتیہ ادب میں تازہ مکالمے اور نئے بیانیے کی روشنی طلوع ہو رہی ہے۔''نعت رنگ'' کا ہر تازہ شمارہ اس بدلتے تناظر کو نمایاں کرنے والا ایک ایسا اُجلا آئینہ بنتا جا رہا ہے جو مستقبل میں بھی اپنے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کرنے کے ساتھ حوالہ جاتی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گا۔ (ان شاءاللہ)(اداریہ نمبر ۲۷)

فروغ

۱۔ ''یہ عہد نعت کے فروغ کا عہد ہے۔'' (اداریہ نمبر ۲)

۲۔ فروغ نعت کی یہ ساری انفرادی کوششیں خوش آئند ہیں۔(اداریہ نمبر ۱۱)

۳۔ ''نعت رنگ'' نے نعت کے ادبی فروغ کی جو تحریک شروع کی تھی۔(اداریہ نمبر ۲۷)

۴۔ یہ شمارہ بھی اسی جستجو، اسی لگن اور اسی تمنا کا اظہار ہے جس کا گذشتہ شمارے تھے یعنی نعت کا ادبی فروغ۔ (اداریہ نمبر ۹)

۵۔سب سے اہم بات یہ کہ نعت صرف سماع کی چیز نہیں رہے گی بلکہ اس کے مطالعے کا ذوق بھی فروغ پائے گا۔(اداریہ نمبر ۹)

۶۔ ہم سب نعت پر ایسی تنقیدی گفتگو کو فروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔(اداریہ نمبر ۱۷)

۷۔نعتیہ ادب میں توانا رجحانات کے فروغ، صحت مند روایات کی ترویج اور موضوع کی تقدیس کے خدوخال اُجاگر کرنے کے لیے تنقید ناگزیر ہے۔(اداریہ نمبر ۱)

۸۔قارئین سے یہ درخواست ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں ہر اس شخص کے لیے دعا فرمائیں جو ذکرِ نبی کریم ﷺ کے فروغ میں کسی نہ کسی طرح شریک رہا ہے۔(اداریہ نمبر ۲۱)

۹۔ یہ لمحۂ فکر یہ ہے جس پر نعت کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں کو فوری توجہ کرنی چاہئے۔الحمدللہ صرف ہمارے ملک ہی میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ایسے اداروں کی تعداد کم وبیش دولاکھ کے قریب ہے جو جلسہ ہائے میلاد النبی ﷺ کے انعقاد اور ذکر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے فروغ ہی کے لئے وجود میں آئیں ہیں تاکہ عوام الناس کے دلوں میں تذکارِ رسول ﷺ کے ذریعے عشق کی شمعیں روشن کرکے انھیں عملی طور پر اسلامی معاشرے کی صورت گری کی طرف متوجہ کیا جائے۔(اداریہ نمبر ۹)

۱۰۔ یہ اور ایسے کئی سوال فروغ نعت کے حوالے سے ہمارے بلند بانگ دعووں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فروغ نعت کا کام انفرادی طور پر کرنے کے بجائے اجتماعی اور تحریک کی شکل میں کریں۔ ملک کے طول وعرض میں بے شمار ادارے اور تنظیمیں فروغ نعت کے حوالے سے سرگرم

عمل ہیں، اگر ان اداروں اور تنظیموں کی کوئی ملک گیر فیڈریشن قائم کر کے کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے تو ہم نعت کے حقیقی فروغ کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔اور سب سے اہم بات یہ کہ نعتیہ ادب کی ترویج واشاعت اور فروغ کا یہ کام ہم اسی میرٹ پر کروانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو دیگر اصناف شعروادب کے سلسلے میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔(اداریہ نمبر ۱۱)

اداریوں میں روشنی اور فروغ کے علاوہ کشادگی، تنوع، آسمان، ستارے وغیرہ جیسے الفاظ بھی مدیر کی ذہنی کشادگی اور فراخ دلی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ذیل میں کشادگی اور تنوع کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

کشادگی

۱۔ ''نعت رنگ'' ادب کی اس کشادگی کا قائل ہے اور اس پر کاربند بھی۔(اداریہ نمبر ۲۶)

۲۔ میں اس اہم اور نازک موڑ پر اپنے عہد کے نعت نگاروں سے مودبانہ التماس کروں گا کہ نعت کی ادبی اور فنی شناخت کے لیے کی جانے والی ان کاوشوں کو کھلے ذہنوں اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کریں اگر آج ہم نعت کے ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کو رواج دینے میں کامیاب ہو گئے تو کل نعت اور نعت نگاروں کو ادب اور تاریخ ادب میں ان کا جائز مقام مل جائے گا۔(اداریہ نمبر ۴)

تنوع

۱۔ موضوعاتِ نعت کے حوالے سے تنوع کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔(اداریہ نمبر ۱۶)

۲۔ مجھے کئی دوستوں نے خطوط، ٹیلی فون کالز اور بالمشافہ ملاقات پر ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے مضامین میں تکرار کی طرف متوجہ کروایا ہے اور ان میں تنوع اور تازگی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔(اداریہ نمبر ۱۶)

۳۔ ''نعت رنگ'' کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔(اداریہ نمبر ۲۶)

آئینہ

''آئینہ اردو غزل کا ایک سدابہار استعارہ ہے۔اس کے تشبیہی اور تلازماتی سوتے ہنوز خشک نہیں ہوئے ہیں''[۴] مغنی تبسّم کے اس بیان کو صرف غزل تک محدود کرنے کی بجائے پوری شاعری اور نثر پر بھی منطبق کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ نثر نگار بھی تو اپنی تحریروں میں آئینوں کو لفظ ہی نہیں استعاروں اور علامتوں میں استعمال کر رہے ہیں۔اداریوں میں بھی آئینہ کا لفظ اپنی مختلف

اور متنوع صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کسی بھی عہد کے تخلیقی خدوخال دیکھنے کے لیے اسی عہد کے آئینہ تنقید کی ضرورت پڑتی ہے۔ (اداریہ نمبر۴)

۲۔ ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کا یہ خوبصورت شعر نہ صرف ان کی دلی کیفیت کا آئینہ نہیں بلکہ ہر عہد کے نعت نگاروں کا اعتراف ہے۔ (اداریہ نمبر۲۲)

۳۔۔۔۔'نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش' فروغ نعت میں ان کی بے مثال خدمات کا آئینہ ہیں جسے وقت کی گرد کبھی دھندلا نہیں سکے گی۔ (اداریہ نمبر۲۳)

۴۔ تاکہ یہ آئینہ خانہ، ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ پندرہ سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ایک پل بن سکے۔ (اداریہ نمبر۵)

۵۔ فراق صاحب نے غزل کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ حیات وکائنات کا ایسا آئینہ ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر اور کل شناس ہے۔ (اداریہ نمبر۶)

۶۔ شوکت عابد کی نعتیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں کتنے ہی آئینے ہیں اور ہر آئینے میں اسم محمد ﷺ بھی ہے اور صفاتِ محمدی ﷺ بھی۔۔۔۔یہی غزل کے فارم کا کمال ہے۔ (اداریہ نمبر۶)

نعتیہ ادب میں تازہ مکالمے اور نئے بیانیے کی روشنی طلوع ہو رہی ہے۔ ''نعت رنگ'' کا ہر تازہ شمارہ اس بدلتے تناظر کو نمایاں کرنے والا ایک ایسا اُجلا آئینہ بنتا جا رہا ہے جو مستقبل میں بھی اپنے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کرنے کے ساتھ حوالہ جاتی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گا۔ (ان شاءاللہ) (اداریہ نمبر۲۷)

خواب/سفر

۱۔ نوّے کی دہائی میں صبیح رحمانی نے نعت کی ترقی، اصلاح اور فروغ کا ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر پانے کی خواہش میں دو چار رفقا کی معیت میں سفر کی ٹھانی تھی۔ منزل دور اور دھندلی تھی لیکن عزم وارادہ جوان تھا۔ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ وہ آتش کے اس شعر پر یقین رکھتے تھے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار رہ میں ہے

۲۔ ان کی تحریروں میں خواب اور سفر کی لفظیات بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں جو اس امر کی عکاس ہے کہ تیس سال کے عرصے میں وہ ''نعت رنگ'' کے اجرا کا باعث بننے والے خواب کو بھولے ہیں نہ سفر ترک ہی کیا ہے۔ ان کا فوکس منزل ہے اور اس کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کرتے رہے ہیں۔ ذیل میں

خواب اور سفر کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جو ان کے پختہ یقین کی مظہر ہیں۔
۳۔روشنی کے اس سفر میں ''نعت رنگ'' کا یہ چھبیسواں سنگِ میل ہے۔اس سفر میں ہم نے اہلِ قلم کو اس ہستی سے جوڑے رکھنے کی کوشش جاری رکھی ہے۔۔۔چھبیسواں شمارہ پیش کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر تشکّر کے جذبات سے لبریز ہے۔پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔''نعت رنگ'' کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔(اداریہ نمبر ۲۶)
۴۔چھبیسواں شمارہ پیش کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر تشکّر کے جذبات سے لبریز ہے۔پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔''نعت رنگ'' کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔(اداریہ نمبر ۲۶)
۵۔نعتیہ ادب کی تنقید کے بارے میں اس احساس تک پہنچنے کے لیے ''نعت رنگ'' نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ آج نعت پر تنقید کا سفر راست سمت میں جاری ہے اور اس کارواں کا ہر قدم اس منزل سے قریب تر ہوتا جارہا ہے جس کی تمنا ''نعت رنگ'' کے آغاز میں ہمارے ذہنوں میں بیدار ہو چکی تھی۔(اداریہ نمبر ۲۷)
۶۔اُردو کے اہم لکھنے والے بڑی تیزی سے اس صراطِ خیر کے مسافر بنتے چلے جارہے ہیں۔پیشِ نظر شمارے کے مشمولات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہم کو جس راستے کا مسافر بنایا گیا تھا اس پر استقامت اور کامیابی بھی ہمارے ساتھ کر دی گئی تھی۔(اداریہ نمبر ۲۷)
۷۔سطورِ بالا میں اٹھائے گئے سوالات کی تفتیش سے ہمیں اپنے ادب وفکر کی مسافت کا نہ صرف اندازہ ہو سکتا ہے، بلکہ اس احوال کی روشنی میں آئندہ کے سفر کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ابھر سکتا ہے۔(اداریہ ۲۹)
۸۔اس وقت اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا لیکن آج ''نعت رنگ'' کے سلسلے کی بارھویں کتاب اہلِ ادب کے سامنے پیش کرتے ہوئے، میں ایک سرشاری اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نعتِ رسولﷺ کا جہانِ معنی اس درجے وسعتوں کا حامل ہے کہ یہ سلسلہ چودہ سو سالوں سے تادمِ تحریر چلا آرہا ہے۔یہ سفر جو صرف عقیدت اور محبّت کی ایک کیفیت میں شروع کیا گیا تھا، آج معنویت کی کئی منزلوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے جاری وساری ہے۔میں نہایت عاجزی سے عرض کروں گا کہ ''نعت رنگ'' اسی

محبّت اور معنویت کے سفر کا ایک تاب ناک رُخ ہے۔(اداریہ نمبر۱۲)

۹۔ الحمدللہ! ''نعت رنگ'' کے ذریعے نعت کے ادبی فروغ کے لیے دیکھے جانے والے سارے خواب آہستہ آہستہ تعبیر سے ہم کنار ہوتے جا رہے ہیں۔(اداریہ نمبر۲۳)

۱۰۔''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' ہمارا خواب ہے اس خواب کو تعبیر سے ہم کنار کرنا دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں(اداریہ نمبر۱۹)

۱۱۔ ہم نے نعت کے ادبی فروغ کا جو سفر شروع کیا ہے وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔(اداریہ نمبر۱۹)

۱۲۔ یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔(اداریہ نمبر ۲۶)

۱۳۔ سو فروغِ نعت کو مزید وسعت دینے کے لیے ہم پہلا قدم اُٹھاتے ہوئے آپ کے سامنے ''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' کے قیام کی تجویز رکھ رہے ہیں۔(اداریہ نمبر۱۹)

۱۴۔ روشنی کے اس سفر میں ''نعت رنگ'' کا یہ چھبیسواں سنگِ میل ہے۔اس سفر میں ہم نے اہلِ قلم کو اس ہستی سے جوڑے رکھنے کی کوشش جاری رکھی ہے۔(اداریہ نمبر۲۶)

۱۵۔ ہم اپنے تمام رفقا' سرپرستوں اور مقالہ نگاروں کے ممنون ہیں کہ ان کے مسلسل تعاون اور توجہ سے نعت رنگ کامیابی کے سفر پر گامزن ہے۔(اداریہ نمبر۵)

۱۶۔'نعت رنگ' کی اشاعت کے آغاز میں کچھ لوگوں کی طرف سے یہ سوال سامنے آیا کہ 'نعت رنگ' کتنا سفر طے کرسکتا ہے؟ آخر نعت کے پہلو ہی کتنے ہیں جن پر تواتر سے لکھا جاتا رہے؟(اداریہ نمبر۱۲)

۱۷۔ وہ دن دور نہیں جب ہم اردو نعتیہ ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے اور اس کی وسیع پیمانے پر اشاعت کے اپنے دیرینہ خواب کو بھی تعبیر سے ہم کنار ہوتے ہوئے دیکھیں گے، ان شاءاللہ!(اداریہ نمبر۲۳)

۱۸۔ اپنے اس خواب کو تعبیر سے ہمکنار کرنے کے لیے انہوں نے اپنے دونوں صاحبزادگان ڈاکٹر حسن محی الدین قادری اور ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کو ذہنی، علمی اور فکری طور پر جس طرح تیار کیا ہے۔(اداریہ نمبر۲۵)

۱۹۔ یہ اپنا اشاعتی سفر زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکے۔(اداریہ نمبر۲۷)

۲۰۔ زیرِ نظر شمارے میں بھی اس راستے پر ہم نے کچھ اور سفر طے کیا ہے۔(اداریہ نمبر۴)

۲۱۔ الحمدللہ 'نعت رنگ' نے اپنے اشاعتی سفر کا ایک اہم حصہ طے کرلیا ہے۔(اداریہ نمبر۸)

۲۲۔ نعت رنگ تیزی سے اپنا ادبی مشن اور اشاعتی سفر طے کر رہا ہے۔(اداریہ نمبر۱۰)

دائرے/زاویے/حلقہ/مکالمہ/سوال

صبیح رحمانی کی تحریروں میں دائرے کا لفظ بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور اسی حوالے سے کہیں کہیں ''زاویہ اور حلقہ'' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی انھوں

نے دائرہ کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ ہی وسعت، پھیلاؤ اور روشنی کا ذکر بھی ضرور کیا ہے۔ اول تو 'دائرے' کے ساتھ تنگی، سکڑاؤ، مختصر یا محدود ہونے جیسے الفاظ نہیں ملتے اگر کہیں یہ عمل سرزد ہو ابھی ہے تو وہ منفی معنی میں نہیں مثبت معنی میں خیال افروزی کو تشکیل دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح جہاں بھی ''سوال یا مکالمہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں وہ کشادہ دلی، فراخ دلی، روشن، روشنی، جیسے الفاظ لاتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اس کا دائرہ روز بہ روز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ (اداریہ نمبر ۸)

۲۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ''نعت رنگ'' کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی قبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ (الحمدللہ) (اداریہ نمبر ۱۷)

۳۔ ملک کے کئی بڑے ثناخوانوں نے ان کے کلام کو پڑھ کر ان کی شہرت اور عقیدت کے دائروں کو دنیا کے کئی ممالک میں وسعت دی تھی۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

۴۔ وطنِ عزیز کے علاوہ کئی ممالک اور بالخصوص یو کے میں ان کی مقبولیت کا دائرہ خاص وسیع تھا۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

۵۔ عصری ضرورتوں کے تناظر میں نعت شناسی اور نعت فہمی کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے لیے جو اہم اقدامات کیے ہیں وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۳)

۶۔ مولانا کی مقبولیت اور تعارف کا دائرہ نعت خوانی کی وجہ سے شروع ہی میں خاصا وسیع ہو چکا تھا۔ (اداریہ: ۲۵)

۷۔ جس کی وجہ سے ان نورانی فضاؤں کا دائرہ دن بہ دن وسیع ہوتا رہا۔ (اداریہ نمبر ۲۲)

۸۔ ورنہ ان میں سے ہر ایک کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان پر علاحدہ علاحدہ۔۔۔ (اداریہ ۲۲)

۹۔ الغرض مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کے کئی نورانی دائرے مجھ ایسے گناہ گار کو آغوشِ رحمت میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۱۶)

۱۰۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق کے دائروں میں نعتیہ ادب پر ان کے کام کو ادب کا کوئی مؤرّخ کبھی نظرانداز نہیں کر سکے گا۔ (اداریہ نمبر ۲۱)

۱۱۔ حمایت علی شاعر کی شہرت اور ناموری کے کئی دائرے تھے جن میں سب سے نمایاں دائرہ شاعری کا تھا۔ (اداریہ نمبر ۲۹)

۱۲۔ پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

۱۳۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ حلقہ وسیع تر ہو کر جلد ہی دنیا کے ہر ملک کو اپنے دامن میں لے لے گا۔ (اداریہ نمبر ۵)

۱۴۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو میں نعت کے تنقیدی زاویوں پر بھی بات کی اور محافلِ نعت میں در آنے والی

اکثر بے تمیزیوں کی طرف اشارے بھی کیے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۱۵۔ ردِّ عمل اور اختلافِ رائے کا اظہار ادب میں منفی نہیں، بلکہ مثبت رویہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکر کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ (اداریہ نمبر ۲۶)

۱۶۔ یقیناً یہ مشکل کام تھا اور ایک مشترکہ جدوجہد چاہتا تھا سو تمام قلمی معاونین اس خصوصی شمارے کے حوالے سے بھی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنی عقیدت اور فن کے تال میل اور شعور و ادراک کی ہم آہنگی سے نعتِ رسول ﷺ کی پوری تخلیقی اور معنوی کائنات پر غور و فکر کے نئے زاویوں اور نئے امکانات کو پیش کرتے ہوئے اس شمارے کو ادب نبوی ﷺ کے فروغ میں فکر افروزی کی ایک عصری دستاویز بنا دیا ہے۔ (اداریہ نمبر ۲۵)

۱۷۔ تاکہ یہ آئینہ خانہ، ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ پندرہ سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ایک پل بن سکے۔ (اداریہ نمبر ۵)

متذکرہ بالا پیش کردہ مثالوں میں دائرے، زاویے، حلقۂ تعبیر، آسمان، ستارے، طلوع، اُفق، تابناکی، تنوع، کشادگی، آئینہ، آئینۂ خانہ، آبگینہ، شیشہ، آہنگ، قدم، اجاگر، فکر افروزی، آہنگ، اُمنگ، مسرت، جیسے الفاظ ان کی شخصیت کی پرتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ جس سے ایک صلح کل، ترقی پسند، روشن خیال اور انسان دوست شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ روشنی کے یہ استعارے غیر شعوری طور پر قاری کے ذہن، دل اور باطن کو غیر محسوس طریقے سے اپنی کشش کے دائرے میں لے آتے ہیں۔

یاسیت

ان کے ہاں موت، فنا، بندش، خاتمہ، زوال، مسئلہ، پریشانی، دُھندلاہٹ، موت کی اندھیر وادی، جیسے الفاظ اول تو استعمال میں آئے نہیں اور اگر کہیں ان کا جواز نکل بھی آیا ہے تو ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ان الفاظ کا استعمال ابتدا میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ابھی ان کی منزل واضح نہیں تھی۔ راستہ مشکل اور دُھندلا تھا۔ جگہ جگہ بندش، رکاوٹیں اور حوصلہ شکنی منہ چڑا رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ راستہ واضح ہوتا گیا اور امید کی روشنی یقین میں بدلتی گئی اور رکاوٹیں ہٹتی گئیں تو حوصلہ شکنی منہ دیکھتی رہ گئی۔ ان کے اسلوب کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے سے دلچسپ صورت سامنے آتی ہے۔ وہ اول تو تحریروں میں مایوسیت پیدا کرنے والے الفاظ لاتے نہیں اور اگر ان کے استعمال کی ضرورت پڑ بھی جائے تو ان کے ساتھ امید کی جوت جگانے والے الفاظ جوڑ دیتے ہیں تاکہ یاسیت

کی شدت میں کمی واقع ہو۔'نعت رنگ' ترقی کے قدم آگے کی طرف بڑھاتا گیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ استعمال سے نکلتے گئے۔نصف شماروں کے بعد ان لفظیات کا استعمال بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

مکالماتی انداز

غالب کے خطوط کا ایک وصف مکالماتی انداز بھی ہے۔ان کے خطوط میں یہ انداز مراسلے کی خوبی کے ساتھ ساتھ وقت کی ضرورت بن کر بھی سامنے آیا ہے۔انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا کر مکتوب نگاروں کے غیر شخصی انداز کو شخصی انداز میں بدل دیا تھا اور غالباً اس کے ذریعے اپنی ذہنی و قلبی تنہائی کا مداوا بھی کرلیا تھا۔صبیح رحمانی کے اداریوں میں تحریر کے جو انداز سامنے آتے ہیں،ان میں ایک انداز مکالمے کا بھی ہے۔اداریوں میں یہ انداز غالباً قارئین نعت سے براہ راست ہم کلام ہونے کی خاطر تشکیل دیا گیا ہے کیونکہ بول چال کے انداز میں خیالات کی ترسیل میں آسانی رہتی ہے۔تحریر میں مقفع ، مسجّع جملے اور فلسفیانہ اسلوب کا استعمال قاری کے قلبی دریچوں کو کھولنے ، ذہنی دروازوں پر دستک دینے اور تفہیم کی راہ ہموار کرنے کی بجائے مرعوبیت طاری کرنے کے کام آتا ہے جو خوف کی علامت ہے اور اس حالت میں تفہیم اور ترسیل کے امکانات اور راستے بالعموم مسدود ہو جاتے ہیں۔

چونکہ صبیح رحمانی نے اپنے اداریوں میں بار بار مکالمے پر زور دیا ہے۔اس کے ذریعے لکھاری اور قاری،مقرر اور سامع کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اور قربت پیدا ہوتی ہے۔وہ ادب و فکر کے مکالماتی بیانیے کو نیک شگون سمجھتے ہیں کیونکہ مکالماتی فضا ہی زندہ اور فکر انگیز ادب تخلیق کرنے میں سازگار ہوتی ہے۔اس لیے وہ ایک اداریے کا آغاز ہی مکالمے سے کرتے ہیں۔اداریے کے اس حصے کا مطالعہ کیجیے ایسا محسوس ہوتا ہے کوئی شخص واقعہ سنا رہا ہے اور اس انداز سے کہ ہم اس ساری صورتِ حال کو سن بھی رہے ہیں اور سمجھ بھی رہے ہیں۔اس صورتِ حال کو پڑھ کر احمد شاہ بخاری پطرس کا مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' ذہن کی گزرگاہوں میں دوڑنے لگتا ہے۔

میں ''نعت رنگ'' کا مولانا احمد رضا بریلویؒ نمبر مرتب کر رہا ہوں
اپنے قریبی دوستوں کے سامنے میں نے اچانک اپنی خواہش کا اظہار کیا
''کیوں؟''
ایک دوست کا مختصر سا یہ سوال ایک بہت بڑے استفسار کی صورت میرے سامنے آکھڑا ہوا۔
میں نے حیرت سے اس غیر متوقع ''کیوں'' پر اس دوست کی طرف دیکھا اور کہا،

''اعلیٰ حضرت شاہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ ہماری نعت گوئی کی ایک منفرد اور توانا آواز ہیں۔ایک ایسی آواز جس نے نعت گوئی میں ایک نئے اور مستقل دبستان کی بنیاد رکھی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے قرآن وسنتِ نبوی ﷺ، آثارِ صحابہ واہلِ بیتِ اطہار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تاریخ وسیر کے موجود مواد سے اپنے شعری حسن کو ایک ایسا علمی نکھار عطا فرمایا ہے جس سے نہ صرف اردو زبان و ادب کا نعتیہ سرمایہ باثروت ہو گیا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی اس موضوع اور اس کے علمی وفکری پہلوؤں کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی اور اہم خدمت سرانجام دینے والے نعت گو پر ایک خاص نمبر کی اشاعت کے حوالے سے یہ ''کیوں'' میری سمجھ سے بالا ہے۔''

''ہاں مگر ان کی نعت گوئی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مسلسل لکھا جا رہا ہے اس لیے کیا ضروری ہے کہ ہم ایسی ہی تحریروں کا ایک ڈھیر 'نعت رنگ' میں بھی لگا دیں جب کہ ابھی ہمارے کئی اکابر نعت گو شعرا کا تعارف بھی ہم پر قرض ہے۔'' ایک اور دوست نے بات آگے بڑھائی۔

اپنے دوستوں کے جواب میں شامل الفاظ ''ایسی ہی تحریروں'' نے بطورِ خاص مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور میں سوچنے لگا کہ آخر ''ایسی ہی تحریروں'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا کسی اہم اور عہد آفریں شاعر کے تخلیقی رویوں پر گفتگو کو کسی خاص مقام پر جا کر ختم ہو جانا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو ہم میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور اپنے دوسرے بڑے شعرا کی فکری اور شعری عمل کی تہ در تہ معنویت پر کس طرح مسلسل گفتگو کر رہے ہیں اور ہر بار تازہ امکانات کے ساتھ نئے نتائج کی بازیافت کس طرح جاری ہے؟ (اداریہ نمبر ۱۸)

استفہامیہ لہجہ

'نعت رنگ' کے اداریوں میں ہی نہیں صبیح رحمانی کی تمام تحریروں میں استفہامیہ لب ولہجہ عام ملتا ہے۔ وہ جن پہلوؤں پر قلم اُٹھاتے ہیں، خود بھی سوچتے ہیں اور قارئین کو بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ استفہامیہ لہجے کا سہارا لیتے ہیں۔ اداریوں میں بھی جا بجا استفہامیہ عناصر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں یہ لب ولہجہ کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اس پر غور کی ضرورت ہے کیونکہ یہ راستہ بھی 'نعت رنگ' کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

استفہامیہ لہجے کی بنیادی وجہ قارئین کے ذہنوں پر دستک دینا اور غور طلب پہلوؤں کی نشان دہی کرنا، مسائل کو سامنے لانا تا کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو سکیں۔ جو تحقیق کا شوق رکھتے ہیں وہ

تحقیق کر سکیں جنھیں قدرت نے تنقیدی صلاحیت سے مالا مال کیا ہے وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں اور پھر انھیں عمل پر اکسانا تا کہ تنقیدِ نعت کی وہ فضا تشکیل پا سکے جو ان کا مطمع نظر ہے۔ اس کے لیے اول وہ قارئین کے منتشر ذہنوں کی یکسوئی کے حصول کے لیے 'توجہ' حاصل کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے بعد وہ کوئی نکتہ سجھاتے ہیں اور پھر اس پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے لیے ان کی تحریر میں تین الفاظ بالعموم پڑھنے میں آتے ہیں۔ توجہ، غور اور فکر۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان تین لفظوں کی تکرار سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اس کا سادا سا جواب 'نعت رنگ' کے مقاصد 'غور اور فکر' میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ ذہن جو نعت کے حوالے سے مذہبی، تاریخی اور معاشرتی صورتِ حال کے تناظر میں بے اعتنائی برت رہا تھا اسے نعت کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ ان تینوں لفظوں کی تکرار اور بازگشت سے وہ قارئین کے منجمد، ٹھہرے ہوئے اور ساکن ذہنوں میں ارتعاش اور تحرک کی لہریں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ 'نعت رنگ' کے اداریوں کا بغور مطالعہ کیجیے! تمام اداریوں کا تار و پود اہلِ فکر و نظر کے لیے ہی تیار کیا گیا ہے۔ وہ پہلے شمارے سے ہی اہلِ فکر و نظر کو مخاطب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ''اُمید ہے کہ اہلِ فکر و نظر اس صحت مند تنقیدی سلسلے کو سراہیں گے۔ (اداریہ نمبر ۱)'' لیکن جو سوچتے ہی نہیں ان پر محنت کرنے کا عمل ہی بیکار ہے۔ ان کی مثال تو ''صمٌ بکمٌ عمیٌ'' کی مثل ہے جن پر توجہ کی بارش بے اثر رہتی ہے۔ ذیل میں بالترتیب مسائل، توجہ، غور اور فکر کے حوالے سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مسائل کی مثالیں اس لیے کہ اسی کی طرف ہی تو توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور ان سے بھی پہلے ایک پیراگراف درج کیا جا رہا ہے جس میں متذکرہ تینوں الفاظ بھی موجود ہیں اور استفہامیہ لہجہ بھی، جو بار بار قارئین کے ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے کہ شاید کوئی سوال انھیں سوچنے پر مجبور کر دے کہ ترقی اور فروغ کا پہلا قدم ہی سوچ اور غور وفکر کے نتیجے میں اٹھتا ہے۔ منجمد اور ٹھہرے ہوئے وجود میں زندگی کی حرارت کہاں؟ تحرک اور ارتعاش ہی تو زندگی کی علامت ہے۔ زندگی؛ تحرک اور غور وفکر میں مضمر ہے کہ انسان اور جانور میں تمیز شعور ہی سے تو پیدا ہوتی ہے۔

اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ان جملوں کی گونج آج کل ادبی حلقوں میں سنائی دے رہی ہے اور کسی حد تک ان میں سچائی بھی ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا اس دور کو نعت کا دور کہنے والوں نے اپنے بڑے سے بڑے نعت گو کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوئی کوشش کی ہے؟ کیا دیگر

اصناف سخن کی طرح نعت کے فکری اور فنی پہلوؤں پر علمی مباحث کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی گئی ہے؟ کیا تاریخ ادب کے مرتبین نعت نگاری اور نعت نگاروں کے فکر وفن اور ادبی حیثیت کو اجاگر کر رہے ہیں؟ کیا آج کسی اہم سرکاری اور غیر سرکاری ادبی کانفرنس میں کسی شاعر کو بحیثیت نعت نگار مدعو کیا جارہا ہے؟'' (اداریہ نمبر۲)

مسائل

۱۔ یہ تمام مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ (اداریہ نمبر۹)
۲۔مقالات سے قطع نظر نعت کے مسائل اور بہت سے پہلو خطوط کا موضوع بن سکتے ہیں۔ (اداریہ نمبر۴)
۳۔'نعت رنگ' نے نعت کی تاریخ سے آگے بڑھ کر مسائل نعت پر فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ (اداریہ:۴)

توجہ

۱۔ میرا مقصد شکایت نہیں صرف توجہ دلانا ہے۔ (اداریہ نمبر۹)
۲۔ زبان بھی کچھ قواعد کی پابند ہوتی ہے اس لئے یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ (اداریہ نمبر۱)
۳۔ مجھے اُمید ہے کہ ''نعت رنگ'' کے مستقل لکھنے والے بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ (اداریہ نمبر۲۱)

غور رفروغ

۱۔ اور ہم آپ ہی کی تجاویز پر غور کر کے انہیں عمل کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (اداریہ نمبر۵)
۲۔انھوں نے ''نعت رنگ'' ۱۶ میں شائع ہونے والے اداریے پر ہمدردانہ غور فرمایا۔ (اداریہ ۱۷)
۳۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیمی نصاب میں کتنے مدارج پر مطالعات نعت کو شامل کیا گیا ہے۔ (اداریہ نمبر۱۱)
۴۔ ''نعت رنگ'' کے قارئین کا ایک بڑا حلقہ ''نعت رنگ'' کے مواد کو نہ صرف نہایت توجہ سے پڑھتا ہے اور اس پر غور کرتا ہے۔۔ (اداریہ نمبر۱۴)
۶۔ نئے عنوانات کی تلاش، نئے امکانات پر غور وفکر اور پھر اس پر قلم کاروں سے لکھوانا سب وقت طلب بھی ہے اور دشوار بھی۔ (اداریہ نمبر۲۱)
۷۔ ''نعت رنگ'' کے زیرِ نظر شمارے میں جناب ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کا مضمون مطالعۂ نعت کے ایک نئے زاویے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو غور طلب بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ (اداریہ نمبر۱۲)
۸۔'نعت رنگ' میں شائع ہونے والی تنقیدی گفتگو سے اہل فکر ونظر نے اس اہم صنف سخن اور اس کے فکری وفنی پہلوؤں کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور یہی ہماری کامیابی کی پہلی منزل ہے۔ (اداریہ نمبر۴)

۹۔یہی وجہ ہے کہ آج ان پرغور کرکے ہم اپنے عہد کے تناظر میں نعتیہ فکر کے فروغ کا کام کرسکتے ہیں، بلکہ آنے والے دور میں بھی ان فکر انگیز نکات سے تخلیقِ نعت اور نقدِ نعت دونوں شعبوں میں استفادے کی صورتیں پیدا ہوں گی۔(اداریہ نمبر۲۹)

فکرافروزی/فکرانگیزی

۱۔ گفتگو میں ہم بعض اوقات ایسی فکر انگیز گفتگو سن لیتے ہیں۔(اداریہ نمبر۱۶)

۲۔ہماری تمنا ہے کہ آپ کے خطوط 'نعت رنگ' کی توصیف تک محدود نہ رہیں بلکہ بزمِ فکر ونظر بن جائیں۔(اداریہ:۴)

۳۔گزشتہ چند دہائیوں میں اُردو نعت گوئی میں فکری اور تخلیقی اعتبار سے جوتوانا رجحانات سامنے آئیں ہیں، وہ خوش کن ہی نہیں فکرافروز بھی ہیں۔[۲۷]

۴۔اس لیے کہ اس مضمون میں اردو شعر وادب کی تہذیب کے حوالے سے کچھ ایسے فکر افروز نکات اٹھائے گئے ہیں۔(اداریہ نمبر۲۶)

۵۔مسائل کے بڑھنے، خطرہ بننے، جیسے خیالات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان پر گفتگو کرنے، فکر کو آگے بڑھانے، یا موضوع بنانے کا ذکر کرتے ہیں۔

۶۔ 'نعت رنگ' نے نعت کی تاریخ سے آگے بڑھ کر مسائل نعت پر فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔(اداریہ:۴)

۷۔''نعت رنگ'' کے زیرِنظر شمارے میں جناب ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کا مضمون مطالعۂ نعت کے ایک نئے زاویے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو غور طلب بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔(۱۲)

۸۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ دونوں پرچے قارئینِ نعت کے لیے فکر افروز نگارشات سے مالا مال ہوں اور یوں اشاعت میں تاخیر کی جو کوفت قارئین نے اُٹھائی ہے اس کا کسی قدر ازالہ ہو سکے۔(اداریہ نمبر۱۳)

۹۔ 'نعت رنگ' کا مقصد نعت کے حوالے سے غور وفکر کی دعوت دینا ہے کیونکہ صبیح رحمانی سمجھتے ہیں کہ یہی عمل نعت کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا بھی کر سکتا ہے اور نعت کے ادبی، تخلیقی اور تنقیدی فروغ کا ضامن بھی بن سکتا ہے۔ درج بالا چوتھے اداریے میں انھوں نے ''مسائل نعت پر فکر کو آگے بڑھانے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جو اس بات کے عکاس ہیں کہ وہ مسائل کو پریشانی کا باعث کا خطرے کی علامت نہیں سمجھتے بلکہ اس پر غور کرنے اور اس کا حل ڈھونڈھنے کی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح انتیسویں اداریے کے اقتباس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ غور وفکر کے بعد فروغ کا مرحلہ سمجھتے ہیں اور جب 'نعت رنگ' اس طرف متوجہ کرنے اور غور وفکر کروانے میں کامیاب ہو گیا تو نعت کے فروغ کا مرحلہ شروع ہو گا اور وہ پُراُمید ہیں کہ یہ مرحلہ جلد شروع ہو گا۔

’نعت رنگ‘ کے اداریوں کے مطالعے سے ایک منجھے ہوئے لکھاری کا اسلوب سامنے آتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے پیغام بھی ہے اور اظہار کی تخلیقی قوت بھی۔ زبان و بیان پر بھی گرفت ہے اور متاثر کرنے کی صلاحیت بھی، جو اہل ذوق کو بھی اپیل کرتی ہے اور اہلِ دانش کو بھی۔ نو آموز طالب علم کے لیے کشش بھی رکھتی ہے اور نعت سے عقیدت رکھنے والے کے لیے بھی تقدیس کا سامان بھی۔ وہ لفظوں کے پارکھ اور زبان و بیان کی نزاکتوں سے آشنا بھی، بات کہنے کا فن بھی جانتے ہیں اور اسے دل کی گہرائیوں میں اتارنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ لفظوں کی جمالیاتی کیفیت سے بھی واقف ہیں اور حروف و اصوات کی نغمگی اور ترنم سے بھی آشنا۔ تاہم وہ لفظوں اور شاعرانہ وسائل کو مرصع کاری یا عبارت آرائی کے لیے استعمال نہیں کرتے فقط وسیلے یا ذریعے کے طور پر کام میں لاتے ہیں۔ وہ حرف شناس بھی ہیں اور ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے قدر دان بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعمال سے ان کی ذہنی تہذیب اور علمی ریاضت کا پتا چلتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خیال کی دولت کو اظہار کی ارزاں طشتری میں رکھ کر پیش کرنے سے اس کی وقعت میں کمی اور بے توقیری میں اضافہ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ان کے پاس خیال کی دولت بھی ہے اور اظہار کی صلاحیت بھی۔ وہ اسلوب کے سہارے چلنے والے ادیب نہیں۔ خیال کو اسلوب پر فوقیت حاصل رہتی ہے لیکن ترسیل معنی کرتے ہوئے اظہارِ بیان کو نظر انداز نہیں کرتے۔

ان کی تحریر محض مجرد فکر سے عبارت نہیں فنی علائم و رموز سے بھی مملو ہے۔ فکر و فن کے اسی حسین امتزاج سے ہی ان کے اداریوں کا محلول تیار ہوتا ہے جسے قارئین کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرنے اور فکری تشنگی بجھانے کے لیے ’نعت رنگ‘ کے اداریوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ذہن کی خوراک اور دوسرا دل کی غذا۔ ان کی تیاری میں صبیح رحمانی کا مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر، خونِ جگر کی بھٹی میں تپ کر ہی معجزۂ فن کی صورت سامنے آئے ہیں۔

ماحصل

آخر میں بات ختم کرنے سے قبل کچھ سوالات کے جوابات تلاش کرنا ضروری ہیں۔ یہ سوالات 'نعت رنگ' کا جواز فراہم کرنے، مدیر نعت رنگ کے ادبی کردار کو روشن کرنے اور تین دہائیوں پر محیط نعت کی تخلیق وتنقید میں ہونے والی پیش رفت سے روشناس کرنے میں مدد فراہم کریں گے۔ سب سے پہلا سوال یہ کہ ''نعت رنگ'' اپنے آغاز میں جو مقاصد اور اہداف لے کر چلا تھا، ان کے حصول میں کامیاب ہوا بھی ہے یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ کہ اس رسالے نے معاصر ادبی روایت کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ تیسرا سوال یہ کہ مدیر کی کم وبیش پچیس سالہ جدو جہد کا حاصل کیا ہے؟ اور آخری یہ کہ کیا یہاں پر مدیر کا سفر ختم ہو گیا یا یہ فقط ایک پڑاؤ ہے، کامیابی کا پڑاؤ کہ آگے چلیں گے دم لے کر

''نعت رنگ'' کے اکتیس شماروں کے ادبی سفر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ رسالہ اپنی پیدائش کے وقت سے جن مقاصد کا علم لے کر چلا تھا اس میں اسے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ''نعت رنگ'' کی وجہ سے نعت کو تخلیقی توانائی حاصل ہوئی اور تحقیقی وتنقیدی حوالوں سے اس کا دامن وسیع ہوا، ادبی شناخت حاصل ہوئی اور اعتبار وافتخار کے نئے حوالے میسر آئے۔ نعت کا محدود اور مخصوص دائرہ وسعت سے ہم کنار ہوا۔ یہ وسعت تخلیقی سطح پر بھی نمودار ہوئی، تحقیقی سطح پر بھی اور تنقیدی سطح پر بھی۔ اسّی کی دہائی تک محفلوں اور عقیدتوں کے سائے میں پروان چڑھنے والی نعت کے عمومی رویے میں تبدیلی رونما ہوئی اور اب اس کا سفر ادب وتنقید کی وسیع شاہراوں پر رواں دواں ہے۔ نعت سماع سے گفتگو اور گفتگو سے مکالمے اور مکالمے سے مباحث کے میدان میں اُتر چکی ہے۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت کے مضبوط حوالے تلاش کر چکی ہے۔

اِبتدا میں نعت کے بطور صنفِ سخن اعتراف اور قبولیت کا مسئلہ درپیش رہا۔ آغاز میں اردو کے ناقدین اسے بطورِ صنف تسلیم کرنے پر تیار ہی نہ تھے۔ ’نعت رنگ‘ نے تواتر کے ساتھ نعت کے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی پہلوؤں/رجہات پر کام کروایا۔ نعت کو تخلیقی توانائی فراہم کی، نئے راستوں اور نئی منزلوں سے روشناس کروایا۔ نعت کے نظرانداز، فراموش، گم شدہ اور پوشیدہ گوشوں کو تلاش کیا۔ چنانچہ اب نعت تخلیقی سطح پر اپنے بھرپور امکانات کو بروئے کار لا رہی ہے۔ نعت کے ساتھ جڑا ہوا دوسرا مسئلہ تنقید نعت کی ادبی اہمیت اور قبولیت کا تھا۔ اور اب وہ بھی حل ہو چکا ہے کہ نعت کی تنقید میں اب معاصر ناقدین نے بھی قسم توڑ دی ہے۔ وہ ناقدین جو نعت کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے میں پس وپیش سے کام لے رہے تھے، اب ان کی تنقیدی تحریریں بھی نظر آنے لگی ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب وہ تمام ناقدین اس میدان میں بھی طبع آزمائی پر تیار ہو گئے۔

معاصر عہد تک نعت کی تنقید میں جتنا مواد تحریر میں آچکا ہے اتنا دیگر شعری اصناف میں تحریر میں نہیں آیا۔ شعری اصناف میں قصیدہ، مرثیہ، سلام، منقبت، مثنوی اور دیگر شعری اصناف نعت سے کوسوں دور رہ گئی ہیں۔ اگر تنقید نعت کی ترقی کی رفتار یہی رہی تو مستقبل قریب میں اس کی اردو کی نمائندہ اور معروف اصناف سخن کی ہم سری کے قابل ہونے کی پوری امید کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا اصنافِ سخن نعت کے ادبی مقام تک پہنچ پائے گی؟ ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ بالفرض یہ اصناف سخن نعت کے موجودہ مقام تک پہنچ پانے میں کامیاب ہو بھی جائے تو بھی نعت جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے، یہ اصناف اس کی اس رفتار کا مقابلہ کرنے اور اس کے ہم قدم ہونے کی نہ صلاحیت رکھتی ہیں اور ہی سکت۔

’نعت رنگ‘ سے قبل نعت کا غالب رجحان غزل کی ہیئت سے ہی مخصوص تھا البتہ کچھ نعتیں قصائد کی ہیئت میں بھی ہم دست ہو جاتی تھیں۔ ’’نعت رنگ‘‘ کی کوششوں سے صنفِ نعت نے ترقی کے قدم آگے بڑھائے ہیں اور تخلیق نعت نئی ہیئتوں میں جلوہ گر ہونے لگی ہے۔ اب نعت آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو اور دیگر ہیئتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے اور یہ سفر مسلسل جاری وساری ہے۔

تخلیق نعت کے امکانات کو وسعت دینے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک تراجم کا بھی ہے۔ اردو میں مختلف زبانوں کی نعتوں کے تراجم پیش کیے جانے لگے جس میں نعت کی حدود کو وسعت ملی۔ اردو نعت کی فکری زرخیزی میں اضافہ ہوا۔ عہدِ حاضر کا تخلیق کار نعت میں ماضی کی

یادوں کومحفوظ کر کے تاریخی حوالوں کومحفوظ کرنے اور مستقبل کے امکانات کوکھوجنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر چہ نعت کا مرکز ثقل تو حجاز ہے لیکن نعت کے موضوعات، احساسات اور افکار سرحدوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُردو کا قاری اب نعت میں مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب کی زندہ اور متحرک دھڑکنوں کو بھی محسوس کر رہا ہے۔ مشرق ومغرب کی یہ دھڑکنیں تراجم، سوشل میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے تخلیق نعت کے امکانات کو وسعت دے رہی ہیں۔

نوّے کی دہائی سے قبل تفہیم نعت کا عنصر تحسینی، تقریظی، وضاحتی، تشریحی اور موضوعی رہا ہے۔ 'نعت رنگ' کی کوششوں سے نعت کی تفہیم کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو نعت کا مطالعہ معروضی رخ اختیار کر گیا۔ تجزیاتی طریقۂ کار کے اصول متعیّن ہونے کی طرف پیش قدمی ہونے لگی۔ نعت کی تفہیم کے سابقہ معیارات (مذہبی اور شرعی) ادبی، لسانی، تہذیبی اور فلسفیانہ اور جدید تنقیدی نظریات و افکار سے مستفید ہو کر ادبی تنقید کے معاصر منظر نامے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ چونکہ 'نعت رنگ' کا ابتدائی شمارہ ہی تنقید نمبر کا نکالا گیا اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس رسالے کی بنیاد ہی فکری اور تنقیدی مسالے سے تیار ہوئی ہے گویا اس رسالے کا خمیر زندہ تخلیقی عناصر سے تیار ہوا ہے۔ اس رسالے نے نعت کی تفہیم و تعبیر کے لیے قدیم دبستان تنقید کے ساتھ ساتھ جدید تنقیدی نظریات و افکار کو برتنے میں دلچسپی لی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نعت محدود اور مخصوص دائروں سے نکل کر وسیع و عریض وادیوں میں قدم رکھنے کے قابل ہو گئی لہٰذا تنقید نعت کا قدیم دبستان نئے زمانے کی نئی فکر اور نئے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر محدود اور مخصوص دائرے سے باہر نکل آیا۔ اردو ادب اپنے ارتقا کی جن بلندیوں کو سر کر چکا ہے اس میں قدیم اور جدید تنقیدی نظریات کا بڑا اہم ہاتھ رہا ہے۔ پچھلی دو دہائیوں میں اردو کے کم و بیش تمام جدید و قدیم تنقیدی نظریات کا عملی اطلاق نعت پر بھی کیا گیا۔ جس کی وجہ سے تخلیق نعت کی متنوع جہتوں کا سراغ لگایا گیا۔ 'نعت رنگ' اب اس اہمیت کا حامل رسالہ بن چکا ہے کہ نعت کی کوئی بھی بات اس کے ذکر کے بغیر ادھوری اور کوئی بھی کام اس سے استفادے کے بغیر نامکمّل رہے گا۔ اس حوالے سے صبیح رحمانی کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ

> ''نعت رنگ کا شعری، ادبی، تخلیقی اور تنقیدی اثاثہ اس اہمیت کا حامل ہو گیا ہے کہ آئندہ صنف نعت پر کسی بھی کام کے لیے اسے لازمی حوالے کی حیثیت حاصل رہے گی۔'' (اداریہ نمبر ۲۵)

'نعت رنگ' سے قبل اردو نعت پر تحقیق و تنقید کے لیے برتے جانے والے بیشتر موضوعات

کم وبیش یکساں نوعیت کے حامل ہوتے تھے۔ یکسانیت کے اسی عنصر نے نعت کے موضوع کو بے توقیر کر رکھا تھا۔ 'نعت رنگ' کے اجرا اور اس کی کوششوں کے بعد رفتہ رفتہ موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ 'نعت رنگ' کے اجرا سے قبل تنقید و تحقیق کی صورتِ حال اور موضوعات کی نوعیّتوں میں واضح فرق ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق و تنقید میں موضوعیت کی بجائے معروضیت نے جگہ بنائی۔ تحسینی اور تاثراتی عنصر متروک ہوا اور تنقیدی عنصر اظہار کے راستے تلاش کرنے لگا۔ موضوعات کا دائرہ وسیع ہو کر شخصیات، اسالیب، تحریکات، رجحانات، افکار، نظریات کو اپنے اندر سمیٹنے لگا۔ غرض یہ کہ 'نعت رنگ' کو تنقید نعت، تحقیق نعت کے حد فاصل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کے ستائیسویں اداریے میں نعتیہ ادب میں تازہ مکالمے اور نئے بیانیے کی روشنی طلوع ہونے کی نوید سنائی ہے۔ یہ فقط ایک اعلان یا دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت بھی ہے۔ مدیر نے کئی اداریوں میں مکالمے پر زور دیا ہے اور ہر فرد کو آزادی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی دعوت دی ہے۔ اظہار کی آزادی، بے خوف و خطر اپنا مؤقف پیش کرنے کی سہولت، اختلافِ رائے کو کھلے دل سے سننے کا حوصلہ تنقیدِ نعت کا راستہ ہموار کرنے اور اسے ادب کی مین سٹریم میں لانے کا سبب بنے۔ 'نعت رنگ' کے مضامین، خطوط، انٹرویوز، اور آراء میں تنقیدی اظہار کے واضح نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر آغاز ہی میں اس طرزِ عمل پر روک لگا دی جاتی اور خیالات کا گلہ گھونٹ دیا جاتا تو 'نعت رنگ' میں جو تنوع اور رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ نظر نہ آتی اور تنقیدِ نعت کا وہ نیا منظر نامہ طلوع نہ ہو پاتا جو اس وقت اپنے پورے آب و تاب سے روشن ہے۔ اس طرح 'نعت رنگ' میں ذہنی کشادگی اور وسعتِ قلبی کی وہ فضا سامنے آئی جو اعلیٰ ادب کا اختصاص رہا ہے۔ اس سے قبل نعت پر لکھتے ہوئے یا مکالمہ کرتے ہوئے دِقت محسوس ہوتی تھی۔ 'نعت رنگ' نے گھٹن کے اس ماحول کو کشادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح تنقید نعت کا وہ بیانیہ سامنے آیا جو تنقید ادب کے بیانیے سے کسی بھی طور مختلف، متضاد اور منفرد نہ تھا۔ نتیجتاً تنقیدِ نعت، تنقیدِ ادب کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی۔

'نعت رنگ' کی کوششوں سے جو ادبی اور تنقیدی فضا تشکیل پائی اس میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر گروہ کے لیے آزادانہ اور بے خوف و خطر اپنا مؤقف پیش کرنے کی گنجائش نکل آئی۔ اسی وجہ سے 'نعت رنگ' مختلف و متبائن نظریات و افکار کی حامل شخصیات کا پسندیدہ پلیٹ فارم بن گیا۔ انھی شخصیات کی کوششوں سے نعت کے حوالے سے نئے نئے موضوعات سامنے آئے اور تنقیدِ نعت کے بھرپور

اِمکانات کو بروئے کار لایا گیا۔ ’’نعت رنگ‘‘ کے لکھاریوں میں بھی اور قارئین میں بھی تدریجاً اضافہ ہوا ہے۔ بڑے لکھاریوں کے عدم کو سدھارنے، ذود رنجی کے باعث علیحدگی اختیار کرنے یا ’’نعت رنگ‘‘ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکنے کے باعث پیچھے رہ جانے والوں کے باوجود اس کے حلقہ احباب میں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ اس میں مستقلاً اضافہ ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے لکھاریوں میں ادب کے مین سٹریم کے افراد بھی نظر آتے ہیں یہ ایسے ادیب، شعرا، ناقدین یا محققین ہیں جو عصری ادبی تناظر میں اپنی ایک الگ، منفرد اور مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ یہ ’نعت رنگ‘ کی بڑی کامیابی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ’’نعت رنگ‘‘ کا دامن نئے لکھنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہا۔ جس طرح ہر تہذیب کو نئے خون سے تقویت ملتی ہے اسی طرح ’’نعت رنگ‘‘ کو بھی نئے لکھنے والوں سے تقویت حاصل ہوئی۔

نعت کے حوالے سے اکتیس ضخیم اور معیاری شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں تخلیق، تنقید اور تحقیق کا وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ بلا مبالغہ یہ ذخیرہ اپنے معیار اور مقدار کے حوالے سے اردو کی دیگر اصناف سے کسی بھی طور کمتر حیثیت کا حامل نہیں۔ نعت ریسرچ سینٹر انٹرنیشنل نے بہت کم وقت میں نعتیہ ادب پر کام کی تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حوالہ جاتی کتب کی اشاعت کا انتظام و انصرام کیا اور صرف چند ہی برسوں میں ستر سے زیادہ کتب کی اشاعت کو ممکن بنایا جن میں تحقیقی مقالہ جات، کتابیات، اشاریہ سازی اور نعتیہ ادب کی دیگر جہتوں پر علاحدہ علاحدہ مطالعاتی جائزوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں جس سے تنقید و تحقیق کے مزید زاویوں پر کام میں تیزی کے امکانات نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ کام یہاں رکا نہیں بلکہ بہت تیزی کے ساتھ ترقی کے قدم آگے بڑھا رہا ہے اور اگلی ایک دہائی میں اس سے دو گنا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام سامنے آنے کی امید پیدا ہو چلی ہے۔ نعت ریسرچ سنٹر کی اس کارگزاری کا مقابلہ پاکستان کے نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں سے کیا جا سکتا ہے۔ وسائل کی عدم موجودگی اور سرکاری سرپرستی اور اعانت کے بغیر اتنی بڑی تعداد میں کتب کی اشاعت اور متنوع موضوعات پر ہونے والا کام ’نعت رنگ‘ اور نعت ریسرچ سنٹر کی اعلیٰ کارکردگی اور کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے اور تحقیق و تنقید کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے نعتیہ ادب کے حوالے سے کمیاب اور نایاب کتب کو سکین کر کے نعت ریسرچ سنٹر کی ویب سائٹ اور گروپ میں اپ لوڈ کیا گیا ہے، ان کتب کی تعداد سو سے زیادہ بنتی ہے۔ یہ کام بغیر کسی تعطّل کے تیزی سے جاری و

ساری ہے۔ یہی نہیں ''نعت رنگ'' کے تمام شماروں کو بھی پی۔ڈی۔ایف صورت میں اپ لوڈ کر دیا گیا۔مزید یہ کہ نعت ریسرچ سنٹر سے پچھلے سالوں میں نعت کے حوالے سے شائع ہونے والی نئی کتابوں کو بھی پی۔ڈی۔ایف صورت میں اپ لوڈ کر دیا گیا تا کہ دنیا کے کسی کونے میں بیٹھا ہوا نعت کا عاشق ومتلاشی کتب کی عدم فراہمی کا شکوہ یا گلہ نہ کر سکے۔

نعت ریسرچ سنٹر کی ویب سائٹ کے ذریعے صرف کتابوں کی پی۔ڈی۔ایف کو بھی آئن لائن کیا اور نعت کے رخ روشن کو جلا دینے والی ہر نئی کتاب پر آئن لائن تبصرے کے ذریعے نعت کے حوالے سے ہونے والی پیشرفت سے بھی لحہ بہ لحہ آگاہ کیا جا تا رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ نعت ریسرچ سنٹر، واٹس ایپ گروپ نے بھی فروغِ نعت کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا ہے۔نعتیہ محافل کی سرگزشت، نئی تخلیقات،تنقیدی مباحث،معرکہ آرائیاں،خبریں،تبصرے،تحقیقی مشکلات کا حل، طلبا و طالبات کی علمی معاونت،معلومات کا تبادلہ غرض یہ کہ اس گروپ کے ذریعے نعت کے حوالے سے ہر مثبت قدم اٹھایا جا رہا ہے۔متذکرہ آن لائن کتب خانوں سے مستفید ہونے والے افراد میں نعتیہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد ہی نہیں تحقیق وتنقید کی تنگ وتاریک، پتھریلی اور خارزار گزرگاہوں کے مسافر بھی ان کتب خانوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

'نعت رنگ' جس عہد میں طلوع ہوا اس وقت نعتیہ رسائل مخصوص قسم کی مذہبی روایت کا لبادہ اوڑھے اردو کی مرکزی ادبی روایت سے الگ تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔نعتیہ رسائل ایک الگ جزیرے کی حیثیت رکھتے تھے جس کا ربط اور تعلّق دیگر معاصر ادبی رسائل سے واجبی سا ہوا کرتا تھا۔'نعت رنگ' کے ظہور نے صنف نعت اور 'نعت رنگ' کو ادبی روایت سے اس طرح جوڑ دیا کہ اب 'نعت رنگ' نعت کا ہی نمائندہ رسالہ نہیں رہا بلکہ اردو کے ادبی رسائل میں بھی نمایاں اہمیت کا حامل رسالہ بن کر سامنے آیا ہے۔

آغاز میں 'نعت رنگ' کے قارئین اور مصنّفین کا حلقہ محدود اور مخصوص تھا۔مدیر نعت رنگ کی لچک دار پالیسی کی وجہ سے قارئین اور مصنّفین کا حلقہ وسعت اختیار کرتا گیا۔رفتہ رفتہ اس دائرے میں قدیم اور جدید نسل سے تعلّق رکھنے والے افراد شامل ہوتے گئے۔ چنانچہ 'نعت رنگ' کے ہر نئے شمارے کے افق سے تحقیق وتنقید اور تخلیق وترتیب کے نئے نئے اور روشن ستارے طلوع ہو رہے ہیں، جن کی ضیابار روشنی نعتیہ منظر نامے کو ہی منور نہیں کرتی اردو کے ادبی منظر نامے کو بھی وسعت دیتی اور

روشن کرتی نظر آتی ہے۔ 'نعت رنگ' کے افق سے طلوع ہونے والی شخصیات سے ملاقات قارئین کو بدمزہ کرنے کی بجائے خوشگوار اثرات کا باعث بنتی ہے۔ ان کے ادبی ذوق کی آبیاری کرتی اور ادب کی تفہیم کے وسائل فراہم کرتی ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں صحت مند رویوں کو فروغ ملا۔ نئے نئے اور متنوع فکر و خیال کے گل دستے 'نعت رنگ' کی سطح پر نمودار ہو کر اپنی خوشبو سے قارئین کے ذہنوں کو معطّر کرنے لگے۔ نعت کی تخلیق اور تنقید میں برسوں سے سرایت کردہ فکری انجماد ختم ہوا۔

اردو رسائل کی تاریخ ہی میں نہیں نعتیہ رسائل کی تاریخ میں بھی 'نعت رنگ' نے انفرادیت اور شناخت قائم کرتے ہوئے نئی روایتوں کی بنیاد ڈالی۔ اظہار کے نئے قرینے، بحث و مباحثہ کے معتدل رویے، اور تحقیق و تنقید کے منفرد زاویے قائم ہوئے اور ان کے معیارات کو بلند تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نعت کی تخلیق میں نئے ذائقوں کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے اور تحقیق و تنقید میں بھی نئے در وا ہوئے ہیں۔ 'نعت رنگ' نے قارئین اور لکھاریوں کے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ ایسے مصنّفین کی ایک بڑی تعداد کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو 'نعت رنگ' کے افق سے ابھر کر اردو دنیا کے آفاق میں متعارف ہوئے۔ ایسے مصنّفین کی بھی کمی نہیں جنھیں 'نعت رنگ' نے نعتیہ ادب اور تنقید و تحقیق کے لیے تیار کیا۔ یہ محض ایک رسالہ ہی نہیں ایک تحریک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس کا مقصد نعت کو نئے موضوعات سے آشنا کرنا اور تنقید نعت کو تقدیس اور عقیدت کی فضاؤں سے نکال کر معروضی رویوں سے آشنا کرنا ہے۔ یہ 'نعت رنگ' کی کوششوں کا ثمر ہی تھا کہ نعت کی تحریک نعتیہ ادب کی نشاۃ الثانیہ کا باعث بن گئی۔

چنانچہ اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نعتیہ تنقید میں نئی ذہنی رو جنم لے چکی ہے۔ جو محض ماضی کی طرف مراجعت کرنے کی بجائے مستقبل کی طرف بھی محو سفر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ذہنی سفر میں ماضی کو یکسر فراموش نہیں کیا گیا اور نہ محض نئے افکار و نظریات پر بھروسا کیا گیا ہے بلکہ اخذ و قبول کا ایک متوازن رویہ سامنے آتا ہے جس کی جڑیں اپنی تہذیب و ثقافت اور زمین سے بھی جڑی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں گرد و پیش کی تہذیب و ثقافت اور خیالات و افکار کی آب و ہوا سے بھی استفادہ کر رہی ہیں۔ اس طرح تنقید نعت کا سفر ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف تسلسل کے ساتھ گامزن ہے۔

'نعت رنگ' نے اسّی کی دہائی میں جو سفر شروع کیا تھا وہ سفر آج بھی جاری ہے لیکن فرق

یہ ہے کہ اس وقت ان کے ہمراہیوں میں دو چار افراد تھے اب ان کی تعداد سیکڑوں میں پہنچ چکی ہے۔ 'نعت رنگ' کے ابتدائی ادوار میں اس رسالے کو کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا، مشکل فیصلے کرنے پڑے، مخالفتوں اور بے اعتنائیوں کا سامنا رہا لیکن اب آزمائشوں کا دور گزر چکا ہے۔ اب 'نعت رنگ' تشکیلی دور سے گزر کر رجحان ساز اور تاریخ ساز دور میں داخل ہو چکا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کا خواب مدیر 'نعت رنگ' نے تین دہائیوں قبل دیکھا تھا۔ 'نعت رنگ' کا موجودہ منظر نامہ اس خواب کی تعبیر پیش کرتا ہے۔

مقدمے کا اختتام صبیح رحمانی کے درج ذیل اقتباس پر کیا جاتا ہے۔ یہ پیرا گراف 'نعت رنگ' کی کوششوں کا نچوڑ بھی ہے اور صبیح رحمانی کی کاوشوں کا ثمر بھی:

> ''انتقادِ نعت کے جس سلسلے کو ہم نے ''نعت رنگ'' کے ذریعے اپنے آغازِ کار سے ہی فروغ دینے کی کوشش کی تھی، اس میں اب ''نقد الانتقاد'' کا مرحلہ آن پہنچا ہے۔ یقیناً یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے۔ اس لیے کہ اب اس امر کا جائزہ لینا اور فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ انتقادِ نعت کے تاحال کن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور کون سے گوشے ابھی تک توجہ طلب ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جن پہلوؤں پر جس طرح بات کی گئی ہے وہ ادبی و فکری معیارات کے لحاظ سے کس قدر لائقِ توجہ رہی۔ کن سوالات کا جواب کس سطح سے فراہم کرنے کی سعی کی گئی اور کون سے نئے سوالات اٹھائے گئے اور مباحث کا کون سا نیا تناظر قائم کیا گیا۔ ادب کی کسی بھی صنف اور اس کے موضوعات کے حوالے سے یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب انھیں ادب و فکر کے مرکزی دھارے میں جگہ مل جاتی ہے۔ الحمدللہ، اردو نعت آج یہ مقام حاصل کر چکی ہے۔'' (اداریہ ۲۹)

حواشی وحوالہ جات

ا۔ نعت کا تنقیدی تناظر اور نعت رنگ کے اداریے

۱۔ اقبال۔ اقبالیات اور ہم، مشمولہ اقبال ایک شاعر، سلیم احمد، قوسین لاہور، ۱۹۷۸ء بار دوم ص ۱۵

۲۔ اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل: ص ۱۶

۳۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، انور سدید، ص ۱۱۳

۴۔ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ڈاکٹر افضال احمد انور، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، مارچ ۲۰۱۰ء، ص ۶۵

۵۔ شاعر اور قاری کا رشتہ، قمر رئیس، ہماری زبان، نئی دہلی، ۱۵، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۴۔۳

۶۔ عصری شعور۔ ایک بحث۔ ضیاء الحسن، سیارہ، لاہور، مئی جون ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۰

۷۔ دیکھیے آب حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبد السّلام، شعبۂ اردو، زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء، ص

۸۔ الوحی المحمدی۔ محمد رشید رضا مترجم محمد رشید احمد ارشد، ۱۹۵۹ء۔ س ن۔ ص ۲۱۶

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۲۔ ادب اور آگہی مجتبیٰ حسین۔ ص ۹۳

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ نعت رنگ، شمارہ نمبر ۱۵، ص ۴۸

ب: صبیح رحمانی کا تنقیدی شعور

۱۔ صبیح رحمانی کی مرتبہ کتابوں میں 'اردو حمد کی شعری روایت، اردو نعت کی شعری روایت، کلام محسن کاکوری: ادبی وفکری جہات، اقبال کی نعت: فکرو اسلوبیاتی مطالعہ، پاکستانی زبانوں میں نعت: روایت وارتقاء، نعت نگر کا باسی، غالب اور ثنائے خواجہ، کلام رضا، فکری وفنی زاویے، اردو نعت میں تجلّیاتِ سیرت، ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد ونعت وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ دو درجن سے زائد کتب میں ان کے تحریر کردہ مضامین ومقدمات شامل ہیں اور کم وبیش اتنی ہی تعداد

میں انھوں نے کتابوں پر فلیپ بھی تحریر کیے ہیں۔

۲۔ نعت اور نعتیہ ادب کے فروغ اور نعتیہ ادب کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے صبیح رحمانی نے عزیز احسن اور انوار حسین صدیقی کے ساتھ مل کر ۱۹۹۵ء میں 'اقلیم نعت' کی بنیاد رکھی اور اس ادارے سے ۱۸ کتابیں شائع کیں۔ ۲۰۰۲ء میں 'اقلیم نعت' کے تحت ہی 'نعت ریسرچ سنٹر' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے مقاصد میں 'نعت رنگ' کی اشاعت کے بعد نعت شناسی اور نعت فہمی کے بڑھتے ہوئے شعور اور ذوق کو تعلیمی اداروں اور جامعات تک وسعت دینا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۸۷ء کے آس پاس گل بہار نعت کونسل کراچی کی تنظیم کا حصہ بنے اور ۱۹۸۷ء میں گل بہار نعت کونسل کے زیرِ اہتمام پہلی لیلۃ النعت کانفرنس منعقد ہوئی جس کے نگرانِ اعلیٰ کے فرائض صبیح رحمانی کے سپرد ہوئے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (i) 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۱، ص ۱۲۔۱۱ (ii) دیباچہ ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت مرتبہ صبیح رحمانی، نعت ریسرچ سنٹر کراچی، اکتوبر ۲۰۱۵ء

۳۔ اس حوالے سے صبیح رحمانی کا بیان ہے: ''مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ کہ مذہبی شاعری کو ہمارے ہاں محض عقیدے یا عقیدت کا معاملہ سمجھ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں عوام ہی کا نہیں بیشتر خواص کا تاثر بھی یہ ہے کہ وہ ایک خاص جذبے کی تسکین کا ذریعہ ہے اور بس۔ معنویت کی متنوّع تشکیلات، ذہنی رجحان سازی اور تہذیبی طرزِ احساس کی تعمیر میں وہ کیا اور کیسا کردار ادا کر سکتی ہے، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہمارے ہاں کم، بہت ہی کم محسوس کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقلیمِ نعت کے بلند پایہ شعرا محسن کاکوروی، کرامت علی خان شہیدی، مولانا حسن رضا خان، غلام امام شہید، بیدم شاہ وارثی، عزیز لکھنوی، اکبر وارثی میرٹھی، امجد حیدر آبادی، تہذیب النسا بیگم، لطف بدایونی، سیماب اکبر آبادی، حمید صدیقی لکھنوی، احسان دانش، اقبال سہیل، طفیل ہوشیار پوری، ماہر القادری، ضیاء القادری بدایونی، بہزاد لکھنوی، حافظ مظہر الدین، صوفی افضل فقیر، یزدانی جالندھری، عبدالعزیز خالد، مظفّر وارثی، حنیف اسعدی اور اعجاز رحمانی وغیرہم تک کسی کے فکروں کا وہ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ مرتب نہیں ہو سکا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسا کوئی بھی مطالعہ نہ صرف اس شاعر کے کلام کی بہتر تفہیم کا ذریعہ بنا، بلکہ اس کے ذریعے ہمیں اپنے ادب و شعر کے رجحانات اور معاشرے پر ان کے اثرات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی۔ ص ۱۰۔ حرفِ آغاز، صبیح رحمانی، کلام محسن کاکوروی، ادبی و فکری جہات، مرتبہ صبیح رحمانی، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۱۸ء

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا بیان ہے: کسی نعت یا نعتیہ مضمون کے بارے میں حسن و قبح کے حوالے سے کسی طرح کا حکم لگانا مناسب نہیں۔ ان نقطوں کا استعمال، نعت اور نعت کے مباحث میں

میرے دائرۂ خیال وقلم سے خارج ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جن الفاظ وخیالات کی نسبت ہو جائے وہ میرے نزدیک تنقید مروّجہ سے بلند و بالا ہو جاتے ہیں۔'' ((۱) نعت نامے بنام صبیح رحمانی، ص ۱۵۱۷ (۲) ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد ونعت ص ۱۷)

۵۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے بظاہر بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے لیکن اس موضوع کی نزاکت اور معاشرتی صورتِ حال کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پی۔ٹی۔وی کے ایک ادبی پروگرام میں جس میں اردو کے معروف ادیب بھی شریک تھے، صبیح رحمانی نے تنقیدِ نعت کی اصطلاح استعمال کی تو پروڈیوسر کو پروگرام روکنا پڑا اور سراسیمگی کے عالم میں کہنا پڑا کہ یہ پروگرام نعت کا ہے اس میں تنقید کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ (دیکھیے: ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد ونعت، ص ۱۸)

۶۔ ان اسباب پر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ ان کا بیان ہے: ''نعت کی پذیرائی زیادہ تر دینی حلقوں میں ہوئی۔ اس لیے عام ادبی حلقے اسے دینی ادب کا حصہ سمجھ کر علما وصوفیا کے لیے خاص قرار دیتے رہے۔ چونکہ ادبی تخلیق میں مذہبی عنصر کے وجود کو بالعموم ہماری ادبی تنقید دوسرے درجے کی چیز سمجھتی رہی ہے اس لیے ادبی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔ دوسری جانب دینی حلقے تھے۔ ان کے ہاں نعتیہ شاعری صرف وقتی آسودگی اور قلبی بےقراری کے لیے لمحاتی قرار کا باعث رہی۔ اس لیے ان کے ہاں بھی نعت کو مناسب مقام نہ مل سکا۔ نعتیہ شاعری کے فنی جائزے کے راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خوش عقیدگی اور خوفِ فسادِ خلق بنی کہ مقدس کلمات کو کس طرح نقد ونظر کے تختے پر چن دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں نعتیہ ادب کا با قاعدہ اور سنجیدہ فنی محاکمہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لیے جو رائے بھی قائم کی گئی وہ مفروضوں اور دل جوئیوں پر مبنی رہی۔ نعت کی شعری حیثیت کو خود نعت گو حضرات کے طرزِ عمل سے بھی نقصان پہنچا۔ شعری صلاحیت رکھنے والے عموماً وہ لوگ تھے جو دینی حلقوں میں قابلِ احترام شخصیتوں کے مالک تھے۔ وہ لوگ دربارِ نبوی کی نزاکتوں کو بھی سمجھتے تھے اور شاعری کے رموز وغوامض کو بھی مگر وہ نعت کی آواز اور اپنی عقیدت کا اظہار جان کر اس کی نمائش مستحسن نہ سمجھتے تھے۔ وہ خوف زدہ تھے مبادا یہ جذبہ ریاکاری کی زد میں آ جائے۔ اس کے برعکس وہ اصحاب تھے جنھیں شعر اور جذبہ شعر کے تخلیقی اظہار پر قدرت حاصل نہ تھی یا ان کے ہاں جذبہ موجود تو تھا لیکن وہ اپنے اندر اس کے تخلیقی اظہار کی صلاحیت نہ پاتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ارادت کا اظہار شعر کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس طرح ہر وہ شخص جو وزن وقوافی کی عامیانہ سی شد بد بھی رکھتا تھا، شعر کہنے لگا۔ عوام نے محبّت سے انھیں سنا، اور یوں یہ شعوری کاوش جو زیادہ تر تصنّع کے ذیل میں آتی گئی، مقبول ہوتی گئی۔ (نعت میں احترام رسالت کے تقاضے از ڈاکٹر

محمد اسحاق قریشی بحوالہ اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر عبدالعزیز خان (عزیزاحسن)،نعت ریسرچ سنٹر کراچی، مارچ ۲۰۱۳ء،ص۔۔۔)

۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محسن کاکوروی از محمد حسن عسکری مشمولہ 'اردو نعت کی شعری روایت، مرتبہ صبیح رحمانی، اکادمی بازیافت، کراچی، ص ۲۰۱۶ء، ص ۳۰۰۔۲۷۵۔

۸۔ 'نعت رنگ' کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے تیس شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

۹۔ اس کی تفصیل 'نعت رنگ' کے تیس شماروں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس کا مختصر تذکرہ شفقت رضوی کی تصنیف 'نعت رنگ کا توضیحی مطالعہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔

۱۰۔ مدیر 'نعت رنگ' کا مؤقف ملاحظہ فرمائیے:

''یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمّل اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مکمّل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہوسکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب، فکر اور تنقید کے لیے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔ اس لیے کہ اس سے خیال کے نئے در وا ہوتے اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کو فکری و نظری سطح پر رہنا چاہیے۔ اسے ذاتی یا شخصی ہرگز نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اسے مخالفت کی سطح پر آنا چاہیے۔ نیا ہو یا پرانا، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر لکھنے والے کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت ہے۔ البتہ پرانے اور بڑے لکھنے والوں کے لیے ہمارے رویے میں زیادہ سنجیدگی، متانت اور لحاظ نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اپنے بڑوں کی عزت و وقار کا خیال رکھتے ہوئے نظر آئیں گے تو یہ دراصل بعد والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہوگا۔ 'نعت رنگ' نے اختلافات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ اس شمارے میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم آئندہ بے احتیاطی یا بے ادبی کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کسی بھی مضمون کی اشاعت سے انکار کا حق محفوظ رکھتا ہے۔''(۵۳)

۱۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۹

۱۲۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۴، مئی ۱۹۹۷ء ص ۱۲

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۹

۱۵۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۴۷

۱۶۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۳، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۱۷۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۷، نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۰

۱۸۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں: ''ہر سوسائیٹی اور ہر سماج کے مزاج اور مذاق کے ساتھ ہر دور کا جمالیاتی نظریہ بھی بدلتا جاتا ہے۔اس طرح بغیر سماج کے ذوق اور پسند و ناپسند کے معیاروں کا تجزیہ کیے ہوئے صرف اصولی طور پر جمالیات کے کسی نظریے کی تجسیم وتدوین نہیں کی جاسکتی۔(سماجی تنقید اور تنقیدی عمل، ڈاکٹر سید محمد عقیل، تہذیب نو پبلی کیشنز، الہ آباد، اپریل ۱۹۸۰ء، طبع اول، ص ۱۰)

۱۹۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۶، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۹

۲۰۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۷

۲۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۸

۲۲۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۸۔۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۸

۲۴۔ مکتبی اور تہذیبی تنقید، وارث علوی، شعر وحکمت، حیدر آباد، شمارہ نمبر ۷۔۶، ص ۱۹۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۲۶۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۷، نومبر ۲۰۰۴ء

۲۷۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۴، مئی ۱۹۹۷ء، ص ۱۱

۲۸۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۶

۲۹۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۶، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۱

۳۰۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۷، نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۹

۳۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۔۹

۳۴۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۶، ص ۸

۳۵۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۵، مئی ۲۰۰۳ء، ص ۱۰

۳۶۔ اردو نعت کے جدید اسالیب، ڈاکٹر عزیز احسن، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، دسمبر ۱۹۹۸ء، بیک فلیپ

۳۷۔ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ڈاکٹر افضال احمد انور، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ۱۲/مارچ ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵

۳۸۔ دیکھیے: ڈاکٹر وزیر آغا کا انٹرویو: مصاحبین، ڈاکٹر رشید امجد، جمیل آذر، انجم نیازی، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، جلد ۷، شمارہ ۳۰۔۲۷، ص ۴۱۹۔۴۰۰

۳۹۔ ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۴۸۔۴۷

ج: اردو رسائل میں تعزیتی شذرات کی روایت اور ’نعت رنگ‘

۱۔ دیکھیے: آب حیات، محمد حسین آزاد مرتبہ ابرار عبدالسّلام، شعبہء اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

۲۔ دیکھیے: راوی، مولانا محمد حسین آزاد نمبر، مدیر محمد جاوید غنی، شمارہ نمبر ۲۷، ۱۹۸۳ء، گورنمنٹ کالج لاہور

۳۔ الطاف حسین حالی نے دیوان حالی میں قطعات تاریخ کے اندراج سے پہلے تاریخ گوئی اور ان کی خود کی تاریخ گوئی کے حوالے سے صلاحیت اور خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ چند سطریں پیش کی جاتی ہیں:
’’راقم کو فی الواقع مادہء تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسنِ اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادۂ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جز وشاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طوعاً وکرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپچ سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔۔۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی اُن سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔۔۔ جو شخص مادہء تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔‘‘ تفصیل کے لیے دیکھیے: دیوانِ حالی، الطاف حسین حالی، الناظر بک ایجنسی لکھنؤ، س۔ن، ص ۱۸۰۔۱۷۹

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اودھ اخبار اور تفتہ کی وفات کی تاریخیں، ابرار عبدالسّلام، سہ ماہی اردو ۱۴۔ ۲۰۱۳ء۔ یہی مقالہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے رسالے فکر و تحقیق، جولائی ستمبر ۲۰۱۶ء جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۳ میں بھی شائع ہوا۔

۵۔ دیکھیے: ’خاتون‘ علی گڑھ۔ ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۴۔۲۶۳

۶۔ دیکھیے: الولی حیدرآباد، اگست ۱۹۷۵، مارچ ۱۹۷۶، اگست ۱۹۷۶، اکتوبر ۱۹۷۶ء، دسمبر ۱۹۷۶، اپریل ۱۹۷۷، اکتوبر ۱۹۷۷، نومبر ۱۹۷۷ء، اپریل ۱۹۷۸ء، اور جون ۱۹۷۸ء

۷۔ وفیاتِ معارف، مرتبہ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، قرطاس، کراچی، ۲۰۱۳ء

۸۔ دیکھیے: اشاریہ ماہنامہ برہان دہلی، مرتبہ محمد شاہد حنیف، اوراقِ پارینہ پبلشرز، لاہور، س۔ن، ص ۱۸

۹۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر، ۲۰۱۹ء، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ص ۱۳

۱۰۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۱۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۵۲۔۵۱

۱۲۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۴

۱۳۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۶، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۶

۱۴۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۱

۱۵۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۹۔۱۸

۱۶۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۰، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۔۱۰

۱۷۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۱

۱۸۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۱، س۔ن، ص ۱۸

۱۹۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۷

۲۰۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۳، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۔۲۳

۲۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۷

۲۲۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۵

۲۳۔ دیکھیے: والدہ مرحومہ کی یاد میں، بانگ درا، مشمولہ کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۶۔۲۵۴

۲۴۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۳

۲۵۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۸

۲۶۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۰

۲۷۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۰، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۲۸۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۸

۲۹۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۰

۳۰۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۴

۱۳۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۹، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۰

۲۳۔ 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۶۱

۳۳۔ دیکھیے: 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۱۸، نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۔۱۰

د: صبیح رحمانی کا اسلوب نگارش

۱۔ نعت رنگ شمارہ نمبر ۴

۲۔ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۵

۳۔ ' آبِ حیات' کی تمام مثالیں راقم الحروف کی مرتبہ آب حیات سے ماخوذ ہیں۔ صفحات نمبر کے لیے دیکھیے: آبِ حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسّلام، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء

۴۔ آئینہ: اردو غزل کا ایک مقبول استعارہ، مشمولہ انسان اور آدمی، مغنی تبسّم، ناشر الیاس ٹریڈرز شاہ علی بنڈہ حیدر آباد، مئی ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعت رنگ ۱۰

ابتدائیہ۔۔۔

’’نعت رنگ‘‘ پیش خدمت ہے۔
فروغ نعت کے اس عہد زریں میں
یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں
لیکن نعت نگاری کی طرف رجوع عام کے اس اہم دور میں
نعت کو رطب و یابس اور شعرا کے غیر محتاط رویوں سے
محفوظ رکھنے کی پہلی سنجیدہ اور باقاعدہ کوشش ضرور ہے
اس ’’کتابی سلسلے‘‘ میں موضوعاتِ نعت کی ایک ایسی دھنک پھیل ہوئی ہے
جو کئی رنگوں کے امتزاج کی مظہر ہے
یہ رنگ تحقیق و تنقید کی دھوپ سے کشید کیے گئے ہیں
یہ رنگ عصر حاضر کے نعتیہ منظر نامے سے چنے گئے ہیں
یہ رنگ شعرا کے گل ہائے عقیدت سے جمع کئے گئے ہیں
امید ہے یہ رنگ
آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی روحانی فضا تصویر کرنے میں کامیاب ہوں گے
جو آپ کے دل کو نور اور دماغ کو سرور عطا کرے گی۔ میں ’’نعت رنگ‘‘ میں اپنی عقیدت
کا رنگ بھرنے والے ہر قلم کار اور تمام مشتہرین کا شکر گزار ہوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ
آپ کی رائے کا منتظر بھی۔

صبیح رحمانی

ادارتی شذرہ: گفتنی

اب تک جو مضامین آپ کی نظر سے گزرے ان میں نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اب جو دو مضامین پیش کیے جا رہے ہیں ان میں عملی تنقید (Practical Criticism) ہے۔ یہ مضامین محض تحسین نعت پر مبنی نہیں ہیں کیونکہ اردو نعتیہ ادب میں نعت کی تحسین (Appreciation) کا پہلو کسی بھی اعتبار سے تشنہ نہیں رہا ہے البتہ محتاط رویوں کے اظہار کی روایت کے نشانات بڑے دُھندلے ہیں۔ سو مذکورہ مضامین اس روایت کے احیاء کی پر خلوص کوشش کا حصہ ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ فکر و نظر اس صحت مند تنقیدی سلسلے کو سراہیں گے۔ مسئلہ ابلاغ (Communication) کا ہے۔ تاہم خلوص کی زبان کا کوئی خاص لہجہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کا ابلاغ بہر حال ہو جاتا ہے۔ نعتیہ ادب میں توانا رجحانات کے فروغ، صحت مند روایات کی ترویج اور موضوع کی تقدیس کے خدوخال اجاگر کرنے کے لیے تنقید ناگزیر ہے۔

باایں ہمہ، تحسین، تعبیر اور تفہیمِ شعر خالصتاً ذوقی معاملہ ہے۔ اس لیے شعری پسندیدگی کے زاویے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن شریعت کے معیارات کی پاسداری ہر حال میں ضروری ہے۔ زبان بھی کچھ قواعد کی پابند ہوتی ہے اس لئے یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ موضوع کی رفعت اور عربوں کی لسانی دانش کے تناظر میں ان باتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس ضمن میں اتفاق یا اختلاف دونوں قسم کی آراء ہمارے لیے قابلِ احترام ہوں گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

''ادارہ''

نعت رنگ ۰۲

ابتدائیہ

''یہ صدی نعت کی صدی ہے۔''، ''یہ عہد نعت کے فروغ کا عہد ہے۔''، ''نعت پر جتنا کام اس دور میں ہو رہا ہے گذشتہ ادوار میں نہیں ہوا۔''

ان جملوں کی گونج آج کل ادبی حلقوں میں سنائی دے رہی ہے اور کسی حد تک ان میں سچائی بھی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اس دور کو نعت کا دور کہنے والوں نے اپنے بڑے سے بڑے نعت گو کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوئی کوشش کی ہے؟ کیا دیگر اصناف سخن کی طرح نعت کے فکری اور فنی پہلوؤں پر علمی مباحث کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی گئی ہے؟ کیا تاریخ ادب کے مرتبین نعت نگاری اور نعت نگاروں کے فکر وفن اور ادبی حیثیت کو اجاگر کر رہے ہیں؟ کیا آج کسی اہم سرکاری اور غیر سرکاری ادبی کانفرنس میں کسی شاعر کو بحیثیت نعت نگار مدعو کیا جا رہا ہے؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ حیرت اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج بھی نعت کو دوسرے درجہ کی صنف سخن سمجھ کر اس پر سرسری گفتگو ہو رہی ہے حالانکہ اس عہد کا نعتیہ ادب اتنا ہی زندہ اور متحرک ہے جتنا کہ دوسری اصناف ادب آج کا نعت گو مکمّل عصری آگہی رکھتا ہے اور کرب ذات سے مسائل کائنات تک غور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سیرت اطہر کو اس بے چین اور سکون کی طالب دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ یہی راستہ ہے جو نسل انسانی کی بقا اور فلاح کا راستہ ہے۔ مسائل کائنات سے نبرد آزما دنیا اسلام اور رسولِ کائنات ﷺ کی حقانیت سے متاثر ہو کر دامن مصطفیٰ ﷺ میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ادبی تناظر میں نعتیہ ادب کا مطالعہ اس صنفِ سخن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پورے ادب کے ساتھ انصاف کے مترادف ہو

گا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نقاد، ہمارے اس گراں مایہ نعتیہ سرمائے کو انتقاد کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے معنوی اور فنی پہلوؤں کو دیکھیں اور اس میں ہیئت کے تجربوں اور تازہ کاری کے رجحان کو نظر میں رکھ کر اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کریں۔

الحمدللہ ''اقلیم نعت'' نے ''نعت رنگ'' کے ذریعے اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔تحقیق اور تنقید کے رنگوں سے مزین ''نعت رنگ'' اہلِ علم وفن کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ادب پر لکھنے والے حضرات اور ہمارے قاری اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اس تحریک میں شریک ہو کر ادب کی اس اہم روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کریں کہ نیکی اور سعادتوں کے باب میں تعاون قرآن کا حکم بھی ہے۔

نئے دکھ

گذشتہ دنوں ہمارے ادبی افق پر سے کئی تابناک ستارے موت کی اندھیری وادی میں گم ہو گئے۔چل چلاؤ تو لگا ہی ہوا ہے لیکن نعت کے حوالے سے حضرت عبدالعزیز شرقی ،اختر لکھنوی کا غم ہی کیا کم تھا کہ ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے قتل کی خبر بھی دل کا زخم بن گئی۔

مخبر صادق ﷺ نے ایک ایسے دور کی پیش گوئی فرمائی تھی۔جب قاتل کو علم نہ ہو گا کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے؟ اور مقتول کو معلوم نہ ہو گا کہ اسے کس لیے قتل کیا جا رہا ہے؟ ان حالات میں کسی کا درجہ شہادت پر فائز ہو جانا اللہ کا انعام خاص ہے۔ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی ۲۸ کتوبر ۱۹۹۵ء کو اپنے دوست مقبول کاوش کے ساتھ گورنمنٹ کالج شاہدرہ (لاہور) جاتے ہوئے قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔موت کے بارے میں یہ بات تو ہمارے ایمان کا جز ہے کہ موت اپنے وقت سے ایک لمحہ پہلے آتی ہے نہ ایک لمحہ بعد۔اصل بات تو یہ ہے کہ کس دھج سے کوئی مقتل میں گیا۔ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی جب تک زندہ رہے، اعلیٰ اقدارِ حیات کی صداقت کی شہادت دیتے رہے۔نعتِ رسول ﷺ کی 'اوج' سامانیوں کی شہادت دیتے رہے کہ اس دورِ پُرفتن میں حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے کسی نہ کسی حد تک اپنے اخلاق کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے۔حضور نبی کریم ﷺ سے عشق کے مدعی ہمارے معاشرے میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں مگر ان میں سے کتنے ہیں جن کو دیکھ کر مسلمان کی یہ شناخت سامنے آسکے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آفتاب نقوی جس وقت شہید ہوئے۔ اس وقت وہ کالج جا رہے تھے یہ ادائے فرض کا راستہ تھا۔ مسلمان کی زندگی حقوق وفرائض کی ادائیگی کی ایک مسلسل زنجیر ہے اور علم کے راستے کو ہماری شریعت نے ویسے بھی جہاد کا راستہ کہا ہے۔

نعت کے حوالے سے سید آفتاب احمد نقوی کا نام گورنمنٹ کالج شاہدرہ کے مجلّے 'اوج' کے نعت نمبر کے حوالے سے سامنے آیا۔ نہ جانے وہ کون سی مبارک گھڑی تھی جب اس مجلّے کا نام 'اوج' رکھا گیا۔ یہ مجلّہ دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کو دیکھ کر ایک تخلیقی اور مضبوط منصوبہ بندی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی جلد میں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی نعت گوئی کا انتخاب اور پاکستان کے مختلف نعتیہ مرکزوں پر خاصے تفصیلی مضامین شائع ہوئے ہیں، دوسری جلد انتخاب کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین بھی اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ 'اوج' کا یہ نعت نمبر نعت کے سلسلے میں ایک حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز شرقی نے کم وبیش ۲۵ سال مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تسلسل کے ساتھ گزاری اس سے پہلے انھوں نے کئی حج اور عمرے کیے مولانا برصغیر کے ان عظیم صوفیا میں سے ہیں جنھیں جنت البقیع میں جگہ ملی اپنے بیٹے کو انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ اگر میں بیمار پڑوں اور ہوش میں نہ رہوں تو علاج کے لیے مجھے حدود حرم سے باہر نہ لے جانا۔ مولانا شرقی کا نعتیہ مجموعہ 'فیوض الحرمین' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اس مجموعے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی جیسے اکابرین کے مقدمے شامل ہیں۔ مولانا شرقی جماعتِ اسلامی کے بنیادی رکن تھے لیکن جب جماعت سے اختلاف ہوا تو خاموشی سے علیحدہ ہو گئے مگر زندگی بھر جماعت یا مولانا مودودی کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غلام کو اپنے آقا کی ثناخوانی سے فرصت ملتی تو کسی اور کا ذکر کرتا۔ ایک بار مدینے کے گورنر کے دفتر سے حکم ملا فوراً وطن واپس جاؤ۔ شرقی صاحب مواجہ شریف پر جا کر بیٹھ گئے اور ایک اردو اور ایک فارسی نعت کہی۔ فارسی نعت کے ایک مصرعے میں اپنا عریضہ اس طرح پیش کیا:

ع بر درِ تو نشستہ ام از درِ تو کجا روم

ترجمہ: ''میں تو آپ ﷺ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہوں آپ ﷺ کے دروازے سے کہاں جاؤں۔''

اگلے دن گورنر کے دربار میں پیشی ہوئی۔ گورنر نے چہرہ دیکھا اور کہا کہ شیخ کو اجازۃ العبادہ دیا جائے۔ یوں مولانا عبدالعزیز شرقی مدینے کی مکین بن گئے۔

اختر لکھنوی بہت دنوں تک مشاعروں کے اسیر رہے مگر پھر ان کا عشق پھیل کر اور وسیع ہو کر عشق سرورِ کائنات ﷺ کے پیکر میں ڈھل گیا اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ نعت گوئی میں صرف ہونے لگا۔ کئی مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے۔ ذاکرِ رسول ﷺ کے کردار میں اخلاق رسول ﷺ کی نمود نظر آنے لگی۔ کوئی تنقید کرتا تو سن کر خاموش ہو جاتے۔ زبان کی یہ نگہداشت آج کے معاشرے میں کم نظر آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن ان کے تین شعری مجموعوں میں سے دو مجموعے ’سرکارؐ‘ اور ’حضور ﷺ‘ نعتیہ شاعری پر مبنی ہیں جو ان کی نعتیہ شاعری کے ذوق کا مظہر ہیں ان کا یہ شعر تو میرے لوحِ دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے:

سچ تو یہ ہے ہمیں اچھا نہ لگا اے اختر
ہم سے پہلے درِ سرکارؐ پہ جانا دل کا

مدینے سے اس دلی تعلّق کا ثبوت اختر لکھنوی نے یوں بھی فراہم کیا ہے کہ جس دن انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ان کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر حرمین شریفین روانگی کی تاریخ بھی وہی درج تھی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان نعت احمدؐ را

آمین بجاہ سید الرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

صبیح رحمانی

ادارتی شذرہ

گوشۂ آفتاب احمد نقوی

آفتاب ڈوب گیا لیکن اس کا نور باقی ہے۔ پھول مرجھا گیا لیکن مہک کو کون مٹا سکتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی اپنی ذات میں ایک مکمّل ارادہ تھے۔ ایک ایسا ارادہ جس کی مساعیٔ جمیلہ سے پوری اردو دنیا میں نعتیہ ادب کے ذوق کا زبردست احیا ہوا۔ ان کی خدمات نے اہلِ علم و فن سے خراج تحسین وصول کر کے اردو ادب اور بالخصوص نعتیہ ادب میں زندہ رہنے والے نقش قائم کئے اور ایسا منصب اعلیٰ پایا کہ آئندہ نعتیہ ادب کا کوئی محقق یا تذکرہ نگار انہیں نظرانداز نہ کر سکے گا اور یہ زندگی کوئی معمولی زندگی نہیں ہے۔

’نعت رنگ‘ کا یہ گوشہ آفتاب احمد نقوی بظاہر بہت مختصر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ’نعتیہ

ادب' کے حوالے سے یہ گوشہ تاریخ کا ایک انمٹ باب ثابت ہوگا۔اس گوشے میں ڈاکٹر آفتاب احمدنقوی کی اندوہناک ہلاکت پران کے ہم عصر شعرا اور ممتاز اہل قلم نے جوتعزیت نامے رقم کئے ہیں وہ نہ صرف ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے فکروفن اور شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اس بات کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں کہ بحیثیت انسان، ڈاکٹر صاحب کتنے عظیم، کتنے ہر دلعزیز اور کتنے بلند مقام ومرتبے کے حامل تھے۔ یہ گوشہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمدنقوی نے اپنی صلاحیتوں اور خدمات کے سبب اپنی زندگی میں بھی عروج پایا اور مرنے کے بعد بھی وہ بام عروج پرنظر آرہے ہیں۔''میں بعدمرگ بھی بزم وفا میں زندہ ہوں''

ڈاکٹر آفتاب احمدنقوی ایک نظر میں

اصل نام، آفتاب احمدنقوی۔ ولدیت، یعقوب احمدنقوی مرحوم۔سن ولادت، ۹رستمبر ۱۹۵۱ء
جائے ولادت۔صدوالی چک نمبر ۱۱۱نزدسانگلہ ہل تحصیل وضلع شیخوپورہ۔انتقال ۲۸ر اکتوبر ۱۹۹۵ء لاہور
(جی ٹی روڈ لاہور پرصبح ساڑھے نو بجے کے قریب دونا معلوم موٹرسائیکل سواروں نے فائرنگ کرکے شہید کردیا۔ان کے ہمراہ ان کے دوست مقبول احمد کاوش بھی وہ بھی اس فائرنگ سے جاں بحق ہوگئے)

مطبوعات

تفسیر حدیث ببلوگرافی۔اسلامیات (دوحصے) ببلوگرافی
سیرت نگاری (اردو، پنجابی، فارسی، عربی) ببلوگرافی (یہ تینوں کتابچے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے۔)
۔بحیثیت مدیر گورنمنٹ کالج سیالکوٹ کے ادبی مجلّہ 'کاوش' کا ہجری نمبر ۸۱۔۱۹۸۰ء
۔بحیثیت مدیر گورنمنٹ کالج وزیرآباد کے ادبی مجلّہ 'چناب' کا مولانا ظفرعلی خان نمبر ۱۹۸۴ء
۔بحیثیت مدیرِ اعلیٰ گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور کے ادبی مجلّہ 'اوج' کا قراردادِ پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۹۰ء
۔بحیثیت مدیراعلیٰ گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور کے ادبی مجلّہ 'نعت نمبر' (دوحصوں میں) ۹۳۔۱۹۹۲ء
۔زیرِ طبع: پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ 'پنجابی نعت گوئی'

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۰۳

احوال

’نعت رنگ‘ کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر چہ ’نعت رنگ‘ کی اشاعت کے عرصہ اور مدت کے سلسلے میں ہم نے قارئین سے نہ کوئی وعدہ کیا ہے اور نہ دعویٰ مگر ہمارا احساس ہے کہ اس بار خاصی تاخیر ہوگئی ہے۔

اس تاخیر کے کئی اسباب ہیں۔ اچھے مضامین اور تحریروں کی فراہمی خاصا صبر آزما اور مشکل کام ہے، پھر اشتہارات کی فراہمی۔ اردو دنیا کی تین بڑی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن وابستگانِ دامن اردو اپنے کسی رسالے کو اشتہارات سے بے نیاز نہیں بنا سکے سنجیدہ رسائل و جرائد کی اشاعت ایک ہزار نسخوں تک محدود رہتی ہے۔

نبی اکرمﷺ کی محبّت اساس ایمان ہے لیکن یہ محبّت ہر موسم میں ہمارے معاشرے اور کردار کا اساسی حصہ بننے کی جگہ مجالس نعت و سیرت تک محدود ہے اور وہ بھی ربیع الاول کے مہینے میں۔ نعت گوئی اور نعت خوانی کا ذوق عام ہے مگر نعتیہ مجموعے ناشر کی دُکان یا شاعر کے گھر میں مدتوں رکھے رہتے ہیں۔ اس کا ایک سبب عام کتب فروشوں کا رویہ بھی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں سیرت کی کتابوں نعتیہ مجموعوں اور رسالوں کے لیے کم سے کم ایک معقول مرکز ہو۔ ان حالات اور اس پس منظر میں نعت رنگ کی مقبولیت اور اہلِ دل کے ساتھ ساتھ اہلِ ادب اور اہلِ نظر کا التفات۔۔۔ ہم اسے اللہ تعالی کا کرم اور نبی محترم کی عنایت سمجھتے ہیں اور یہ خیال ہمارے ذہن میں اس وعدہ الٰہی سے پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دیتا۔

میں نے جب یہ سفر شروع کیا تو دو چار ساتھی ہی ساتھ تھے مگر الحمدللہ اب یہ قافلہ خاصا

وسیع ہے جس میں لکھنے والے اور پڑھنے والے سبھی شامل ہیں۔ پاکستان کے علاوہ بھارت، عرب امارات، سعودی عرب، یورپ کے ممالک اور امریکا میں بھی وابستگان اردو 'نعت رنگ' کا انتظار کرتے ہیں۔ ہمیں جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان میں سے کچھ منتخب خطوط ہم شائع کرتے ہیں جن سے آپ کو اردو دنیا کے ان اہلِ نظر کے تاثرات کا اندازہ ہوسکتا ہے اس اعتبار سے بھی 'نعت رنگ' ایک محفل بنتا جا رہا ہے جس میں دور و نزدیک کے محبان شامل ہو رہے ہیں۔

نعت سے متعلق نعت رنگ سے پہلے بھی کئی اہم رسائل شائع ہو رہے تھے ان رسالوں نے بہت مفید کام کیا ہے۔ ان کے ذریعہ اکابر نعت گو شعرا کا کلام محفوظ ہو گیا ہے ان کے منتخبات بڑی افادیت کے حامل ہیں۔ ان کے خاص نمبر تحقیقی حوالے سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نعت اور نعت گو شعراء پر قابلِ قدر مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن نعت رنگ کو اللہ نے بعض پہلوؤں سے اولیت کا شرف عطا کیا ہے یا بعض باتوں اور موضوعات کو نعت رنگ نے زیادہ سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی دی ہے۔ نعت کے تقدس سے تو کافر بھی انکار نہیں کرتے لیکن نعت کے فنی پہلوؤں پر گفتگو خاصی محدود رہی ہے۔ نعت سے متعلق مقالوں اور کتابوں کا ہمیں علم ہے لیکن ان میں سے بیشتر تذکرہ کی سطح سے بلند نہیں ہوتیں۔ نعت کے دو پہلو ہیں ایک ادبی وفنی اور دوسرے پہلو کا تعلق مضامین سے ہے جس کا رشتہ اسلام کے بنیادی عقاید سے جا ملتا ہے نعت رنگ کے نقادوں نے دونوں پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ان پہلوؤں پر ہم نے معتبر نقادان ادب سے تعاون چاہا، ان کی خدمت میں بار بار حاضریاں دیں لیکن ان کی مصروفیات کی بناء پر ہمیں ان کا تعاون حاصل نہ ہوسکا انھوں نے تعاون کا وعدہ فرمایا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اگلے شماروں میں ان کے مقالے اور تنقیدی تحریریں پڑھ سکیں گے لیکن یہ بات ہمارے لیے بڑی خوش آئند ہے کہ ہمارے کچھ دوستوں نے 'نعت رنگ' کے صفحات کے ذریعہ پہلے پہل اپنی گہری تنقیدی نظر اور ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ رشید وارثی اور عزیز احسن کے نام اس سلسلے میں بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات اور نتائج و آراء سے اختلاف ممکن ہے مگر انھوں نے جس تفصیلی اور مدلل انداز کو اپنایا ہے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ایک اور اہم نکتہ جس کی طرف نعت کاروں کی توجہ مبذول کروانا از حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ 'نعت رنگ' کے حوالے سے جو تنقیدی تحریریں سامنے آئی ہیں ان کی پسندیدگی اور مقبولیت سے متاثر ہو کر ہمارے کچھ اور نئے نقاد بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں، یہ نہایت خوش آئند بات ہے لیکن

ان کی آمد سے نعت کے فکری وفنی پہلوؤں پر گفتگو کا دائرہ وسیع ہونے کے بجائے یک لفظی رائے تک گھٹ کر رہ گیا ہے اور یہ یک لفظی رائے شائع بھی نعت کے ایک ماہانہ رسالے میں ہوئی۔ میرے خیال میں یہ انداز نہ تنقید و ادب کے شایان شان ہے اور نہ نعت کا تقدس ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے۔ شاعر کے اسلوب، لفظی کوتاہیوں یا خیالات پر تنقیدی رائے ضرور دیجیے لیکن سنجیدگی، متانت اور استدلال کے ساتھ۔ غلطی تو انسان کے خمیر میں شامل ہے، بس اس بنیادی سچائی کو سامنے رکھتے ہوئے دوسروں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی جائے تا کہ جس کی غلطی یا کوتاہی ہو وہ آپ کا شکریہ ادا کرے۔ یہ بات ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ لیکن اگر نقاد کا انداز جارحانہ ہے یا اس کی تحریر میں تضحیک کا رنگ ہے تو دل بھی خراب ہوں گے اور تنقید بھی مجروح ہوگی۔ اس سلسلے میں نعت سے متعلّق رسائل کے مدیروں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور ایسی تنقیدی تحریروں کو شائع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ تنقید کا فن نہ تو تنقیص کے مترادف ہے نہ بے دلیل تحسین کا۔ تنقید تو نام ہے مغز کو سامنے لانے کا۔ یہ ایک طرف اعتراف تحسین ہے اور دوسری طرف فن سے آگاہی۔

'نعت رنگ' کے حوالے سے ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ نعتیہ ادب پر رسمی تبصروں کی جگہ معتدل اور دیانت دارانہ تنقید و تبصرہ کو اہمیت دی جائے۔ اگر نعت کا نقاد ہی دیانت دار نہ ہوگا تو پھر ادبی دیانت کی تلاش اور کہاں کی جائے گی۔ اسی طرح 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے منظوم حصہ میں ہماری کوشش رہی ہے کہ نعتوں کے منظوم تراجم شائع کئے جائیں اور آئندہ اردو کی بہترین نعتوں کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا جائے تا کہ نعت کی ادبی شناخت کا دائرہ وسیع تر ہو سکے۔ شامل اشاعت اردو نعتوں میں ہیئتی تنوع کو اہمیت دی جا رہی ہے تا کہ جدید اصناف میں مدحت گری کے خدوخال کو بہتر طور پر اجاگر کیا جا سکے۔ ہم نعتیہ سانیٹ' واکا' ہائیکو' دوہے' نعتیہ کافیاں اور نعتیہ گیت بھی پیش کریں گے جو شعرا ان اصناف میں نعت کہتے ہیں وہ ہماری اس تحریر کو درخواست تصور کرتے ہوئے ہماری مدد کریں۔

نعت گو شعرا اور نعت کاروں کے خاکوں کا سلسلہ بھی 'نعت رنگ' کا حصہ بن رہا ہے۔ جو لوگ حضور ﷺ کے نقوش حیات و سیرت کے مرقع نگار ہیں ان کی زندگیوں اور ان کے نقوش کی تلاش بھی ایک مستحسن عمل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نعت رنگ کے اس سفر عقیدت میں آپ بھی شریک رہیں گے۔

'نعت رنگ' ۲ اور ۳ کی درمیانی مدت اشاعت کے دوران جو خدام نعت ہم سے جدا ہوئے ان میں ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی' افسر ماہ پوری' صہبا اختر اور رضی دہلوی کے نام بہت نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، ایک محقق، دانشور کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے انہوں نے سندھی زبان وادب کے فروغ کے لئے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔نعت کے حوالے سے ان کی تحقیقی کتاب 'سندھی کی نعتیہ شاعری' شائع ہوچکی ہے جبکہ قصیدہ بُردہ کا منظوم سندھی ترجمہ طباعت کا منتظر ہے۔افسر ماہ پوری نے ایک نامور شاعراور تہذیبی شخصیت کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کی۔ان کا نعتیہ مجموعہ 'طور سے حرا تک' ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔صہبا اختر اپنی ملی شاعری کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔انھیں ''شاعر پاکستان'' کہا جاتا تھا۔ملی شاعری کا تصور خدااور رسول کے بغیر کیا ہی نہیں جا سکتا یہی وجہ تھی کہ صہبا اختر کی عام شاعری یا خالص نعتیہ شاعری میں محبّت رسول کریم ﷺ کے لافانی نقش دکھائی دیتے ہیں ان کا مجموعہ نعت ''اقراء'' اردو نعت میں ایک زندہ اضافہ تھااور اس میں پہلی مرتبہ ہیئتی تنوع دیکھنے میں آیا تھا۔

رضی دہلوی ملک کے مایہ ناز حرف شناس اور نامور خطاط تھے وہ فن خطاطی پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ آیات قرآنی کا جمالیاتی شعور بھی رکھتے تھے۔'نعت رنگ' ۲ کا سرورق انھی کے نقشِ جمیل سے مزین تھا۔ان تمام خدام نعت کے اٹھ جانے سے دنیائے نعت سوگوار ہے'اقلیم نعت' ان سب کی بخشش اوران کے تمام پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۰۴

احوال

کتابی سلسلے 'نعت رنگ' کی چوتھی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے نزدیک ادب (اور بالخصوص نعت) ہم پر کاروبارِ حیات کو سہل بناتی ہے۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام انسانیت کا نکتۂ معراج اور دائمی سمت نما ہیں اور نعت انہیں ﷺ کا تخلیقی تذکرہ۔ یہ وہ ذکر ہے جو نہ صرف ہماری زندگیوں کا قبلہ درست کرتا ہے بلکہ ہمیں اس کارگہہِ شیشہ گری میں سانس لینے کا سلیقہ بھی عطا کرتا ہے۔

اس سلسلے کی گذشتہ کتابوں میں شائع ہونے والے نعتیہ ادب پاروں کی پسندیدگی سے قطع نظر۔ نعت پر تنقیدی گفتگو کو بڑی اہمیت دی گئی اور سراہا گیا لیکن کچھ دوستوں نے اسے ناپسند بھی کیا اور مقامِ حیرت یہ کہ ان دوستوں میں اکثریت نعت نگاروں کی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ رویہ کوئی نیا نہیں ہے اور نہ یہ مسئلہ صرف نعتیہ ادب کے تخلیق کاروں کا ہے بلکہ ادب کی مجموعی فضا میں بھی ہم عصر تنقید کے بارے میں تخلیق کار کا رویہ یہی رہا ہے اور وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے اور اپنے زمانے کی تنقید میں دلچسپی نہیں لیتا۔ تخلیق کار کی تنقید سے اس لاتعلّقی کے باوجود ادب پاروں کی پرکھ کیلئے قاری بہرحال نقاد ہی کی طرف دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں کسی بھی عہد کے تخلیقی خدوخال دیکھنے کے لیے اسی عہد کے آئینۂ تنقید کی ضرورت پڑتی ہے۔

جہاں تک نعتیہ ادب کی بات ہے تو اس کی صورتِ حال اس لحاظ سے اور بھی ابتر ہے کہ اسے کسی بھی عہد میں باقاعدہ تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نتیجتاً اربابِ نقد و نظر سے اسے ''شعرِ عقیدت'' کا نام دے کر عام ادبی فضا سے دور کر دیا اور یہ تکلیف دہ صورتِ حال کسی حد تک اب بھی برقرار ہے۔

'نعت رنگ' میں شائع ہونے والی تنقیدی گفتگو سے اہلِ فکر و نظر نے اس اہم صنفِ سخن اور

اس کے فکری وفنی پہلوؤں کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور یہی ہماری کامیابی کی پہلی منزل ہے۔'نعت رنگ' کے جو ادبی اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔اب وہ دن دور نہیں جب نعت اپنے پورے تقدس اور پوری ادبی شان کے ساتھ دیگر اصاف سخن کے ہجوم میں نمایاں نظر آئے گی۔ میں اس اہم اور نازک موڑ پر اپنے عہد کے نعت نگاروں سے مؤدبانہ التماس کروں گا کہ نعت کی ادبی اور فنی شناخت کے لیے کی جانے والی ان کاوشوں کو کھلے ذہنوں اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کریں اگر آج ہم نعت کے ادبی' فکری اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کو رواج دینے میں کامیاب ہو گئے تو کل نعت اور نعت نگاروں کو ادب اور تاریخ ادب میں ان کا جائز مقام مل جائے گا۔اس صورت میں فائدہ یقیناً نعت نگاروں کو ہو گا۔

ہمیں تخلیق کاروں (اور بالخصوص نعت نگاروں) کی حساس طبیعت کا علم ہے اپنے فن پر تنقیدی گفتگو یقیناً ان پر گراں گزرتی ہو گی۔ہم بھی ان آبگینوں کی نزاکت سے بے خبر نہیں مگر تنقید کی آنچ وہ آنچ ہے جو شیشے کو توڑتی نہیں بلکہ پختہ تر کرتی ہے۔وہ شیشہ جو بھٹّی کی آگ سے مسکراتا ہوا نکلتا ہے شیشے کی آبرو بن جاتا ہے۔ جہاں تک کسی کی دل آزاری کی بات ہے تو ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والے تبصرے کسی ذات پر نہ ہوں بلکہ بات فن تک محدود ہے کہ فن کو پرکھنے والے تکریم فن کار کے بھی قائل ہوتے ہیں۔

ہم یہ بات بھی عرض کر چکے ہیں کہ 'نعت رنگ' نے نعت کی تاریخ سے آگے بڑھ کر مسائل نعت پر فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔زیرِ نظر شمارے میں بھی اس راستے پر ہم نے کچھ اور سفر طے کیا ہے۔گذشتہ دنوں کچھ یارانِ نکتہ داں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے؟ 'نعت رنگ' اسی سوال کا جواب ہے۔اور اس جواب کے مستقل پہلوان شاءاللہ مسلسل نظر کے سامنے آتے رہیں گے اس کتاب میں بھی آپ کو خاصی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو نظر آئے گی۔ مقالات سے قطع نظر نعت کے مسائل اور بہت سے پہلو خطوط کا موضوع بن سکتے ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ آپ کے خطوط 'نعت رنگ' کی توصیف تک محدود نہ رہیں بلکہ بزمِ فکر و نظر بن جائیں۔کئی احباب نے اپنے خطوط میں ان مضامین کی اشاعت پر ''تعجّب'' کا اظہار کیا ہے، جن کے مندرجات سے انہیں اتفاق نہیں۔ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مقالہ نگاروں سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں علاوہ ازیں اگر علم و ادب اور فنون کی دنیا میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو فکر و نظر کے بہت سے

گوشے اپنے امکانات کے ساتھ ہمارے سامنے نہ آپاتے۔ہم نے کوشش کی ہے کہ فکری اختلاف شخصی مخالفت نہ بننے پائے اور اختلاف کرتے ہوئے لہجے کی متانت اور اسلوب کی شرافت برقرار رہے۔

'نعت رنگ' میں آپ مختلف شعراء کی نعتوں کے گوشے ملاحظہ فرما چکے ہیں ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ سے انتخاب کے ساتھ ان شعرا پر تنقید کا آغاز بھی کریں اور خود وہ شاعر بھی اپنی زندگی اور فن پر مختصراً اظہار خیال کریں یوں اس گوشے کی حیثیت بھی ایک دستاویز کی ہو جائے گی۔

'نعت رنگ' کی مقبولیت کے باعث ہمیں ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور شمالی امریکہ میں رہنے والوں کی جو نعتیں موصول ہو رہی ہیں ان میں ان کی زندگی میں مسائل کی نمود بہت نمایاں ہے جس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ہم ان علاقوں میں لکھی جانے والی نعتوں کے نقوش آپ کے سامنے پیش کریں گے اور یوں نعت کے نئے موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ہم نے جو تراجم پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ یہ بات آپ پر واضح کرسکتا ہے۔ہشام علی حافظ کی نعت میں دیار رحمتہ للعالمین کا تذکرہ جس طرح آیا ہے وہ ہمارے احاطہ فن وخیال سے مختلف ہے اسی طرح اس شمارے میں ایک مسلمان خاتون کی انگریزی نعت آپ ملاحظہ کریں گے اور گواہی دیں گے کہ یہ دھڑکن ہماری مشترکہ دھڑکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انفرادی آہنگ بھی رکھتی ہے۔امید ہے اس گفتگو کے پس منظر میں آپ ''نعت رنگ'' کو نہ صرف خصوصی توجہ سے پڑھیں گے بلکہ اس کے مقاصد کو سمجھ سکیں گے۔ہمیں آپ کی رائے اور مشوروں کا دھڑکتے دل کے ساتھ انتظار رہے گا۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۰۵

نقشِ اول

علامہ اقبال نے کہا تھا:

ع حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ ذوق سفر زندگی کے ارتقاء کا بنیادی سبب ہے۔ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک۔اور یہ مرحلے کبھی ختم نہیں ہوتے۔

ع ٹھہرتا نہیں کاروان وجود

اس حقیقت کا عکس زندگی کے ہر شعبے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

نعت رنگ ''اقلیم نعت'' کے تمام رفقا اور سرپرستوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے اور آج اس کتابی سلسلے کی پانچویں کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ہیں یہ احساس ہو رہا ہے کہ کسی ایک مقام پر ٹھہرنے اور دائرے میں چکر لگانے کے بجائے ہم کچھ نہ کچھ آگے بڑھے ہیں۔نعت رنگ کا ہر شمارہ ایک قدم ہے اور ہر قدم ہمیں کچھ نہ کچھ آگے لے گیا ہے۔

اب اس بات کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں کہ ہمارا یہ احساس اور تاثر صحیح ہے یا نہیں۔اور اگر صحیح ہے تو کس حد تک۔آپ کے خطوط ہماری راہیں منور کرتے ہیں اور ہم آپ ہی کی تجاویز پر غور کر کے انہیں عمل کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی رسالے یا کتابی سلسلے کے کئی معیار قائم کیے جاسکتے ہیں ہمارے خیال میں اگر کسی کتابی سلسلے کے قاری' لکھنے والے اور عملۂ ادارت ایک ''برادری'' بن جائیں تو یہ کامیابی کا ایک واضح اور محکم معیار ہے۔'نعت رنگ' کے خوش نظر، دقیقہ سنج اور صاحبِ نظر پڑھنے والے آج دنیا کے ہر براعظم میں موجود ہیں اور نبی کریمﷺ کی رحمت اللعالمینی کے تناظر میں ہمیں یقین ہے کہ یہ حلقہ وسیع تر

ہو کر جلد ہی دنیا کے ہر ملک کو اپنے دامن میں لے لے گا اور اس کا اثر 'نعت رنگ' کے مضامین نثر و نظم پر بھی مرتب ہوگا۔

عصرِ حاضر میں جب نعتیہ شاعری اپنے فن اور اسلوب کے اعتبار سے تخلیقی شاعری کا ایک معتبر حوالہ بن رہی ہے۔ 'نعت رنگ' نے فکر و تنقید اور تخلیق دونوں کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نئے موضوعات اور زاویوں پر مقالے اور مضامین شائع کیے ہیں، جس سے غور و فکر اور بحث کے نئے دریچے کھل رہے ہیں اور نعت کے ادبی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے ہماری خواہش ہے کہ نعت کے اسالیب میں رفعت، عقیدت اور ادبی محاسن اس طرح یک جا ہو جائیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے راستے جگمگا اٹھیں 'نعت رنگ' کی تازہ اشاعت نے ہم پر آتش کے اس شعر کے مفاہیم کو زیادہ واضح کر دیا ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

لیکن ابھی ہمیں اور مسافر نوازوں کی ضرورت ہے ہم چاہتے ہیں کہ 'نعت رنگ' کی چھوٹ سے ہر دیار روشن ہو اور یہ کام آپ کا بھی ہے۔ اشارہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ آخر میں ہم اپنے تمام رفقا' سرپرستوں اور مقالہ نگاروں کے ممنون ہیں کہ ان کے مسلسل تعاون اور توجہ سے نعت رنگ کامیابی کے سفر پر گامزن ہے۔ اب اس سعادت کے سفر میں جناب طارق رحمٰن صاحب (مینجنگ ڈائریکٹر فضلی سنز) بھی شامل ہو گئے ہیں، ان کا جذبہ اور طباعت اشاعت کے سلسلے میں ان کا تجربہ اور حوصلہ نئی منزلوں کو ہم پر سہل کر دے گا۔ (ان شاء اللہ)۔ (شمارہ نمبر ۵، فروری ۱۹۹۸ء)

صبیح رحمانی

ادارتی شذرہ

گوشۂ والی آسی

والی آسی' مولانا عبدالباری آسی کے صاحب زادے ہیں، اور ان کی علمی اور ادبی روایات کے امین۔ شعر بہت سجا کے کہتے ہیں۔ یہ آرائش جو ان کی غزلوں میں کہیں کہیں تکلّف کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے جب ایوان نعت رسول عربی کے کام آتی ہے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتی ہے اور ان کے قارئین پر یہ نکتہ وا ہوتا ہے کہ لہجے کے ٹھہراؤ، ایک ہی مصرع میں معنوی و لغوی وقف نے ان کی شعری آواز کی تعمیر میں کیسا حصہ لیا ہے۔

والی آسی آج کے تاریک عہد (رات) میں اسم محمد (ﷺ) کے چراغ سے اپنی راہوں کو ہی روشن نہیں کررہے ہیں بلکہ تاریکیوں اوراندھیروں سے نبرد آزما ہیں۔ یہی نعت گوئی کا حقیقی منصب اور مفہوم ہے۔ والی آسی نے شاعرانہ تخیّل، تاریخی شعور اور محبّت کو ملا کر حیات نبوی اور عہد نبوی کے بعض واقعات اور لمحات کو شعر بنا دیا ہے:

میں اپنی آنکھوں کی کھڑکیاں بھی جو بند کرلوں تو دیکھتا ہوں

ان لائنوں سے شروع ہونے والی دو نظمیں ہم پیش کررہے ہیں۔ کیا اچھا ہو جو والی آسی اپنی ایسی تمام نظمیں ہمیں ایک ساتھ اشاعت کے لیے مرحمت کردیں تاکہ یہ آئینہ خانہ، ہمارے پڑھنے والوں کے ساتھ پندرہ سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ایک پل بن سکے۔

نعت رنگ ۰۶

گوشۂ شوکت عابد

غزل کے پیکر کو نعت گوئی کے لیے استعمال کرنے والے شعرا پر تحدید اور تنگ دامانی کا الزام لگانے والے نقادوں کے بیشتر ممدوح شعرا غزل گو شاعر ہی ہیں۔کیا یہ ایک تضاد نہیں؟

فراق صاحب نے غزل کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ حیات و کائنات کا ایسا آئینہ ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر اور کل شناس ہے۔

شوکت عابد کی نعتیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں کتنے ہی آئینے ہیں اور ہر آئینے میں اسم محمد ﷺ بھی ہے اور صفات محمدی ﷺ بھی۔۔۔یہی غزل کے فارم کا کمال ہے۔ روایتی ہیئت میں اپنے شخص جذبہ کی نمود۔۔۔اس پر شوکت عابد کو ناز کرنے سے زیادہ اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔۔۔شوکت عابد زمینوں کے انتخاب اور تکرار ردیف کے ہنر سے بھی آگاہ ہیں اور اس نکتے سے بھی واقف ہیں کہ شاعر دوسروں سے پہلے' اپنے ساتھ کلام کرتا ہے۔

جب بھی نعت کا مصرعہ لکھ　　　پہلے نام خدا کا لکھ
چوم کے روضۂ انور لکھ　　　مدحت ساقیِ کوثر لکھ

شوکت عابد کی غزلیہ نعتیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ثنائے محمد ﷺ کا یہ سوتا، ان کی ذات کی گہرائیوں سے، ابھر کر اور رِس رِس کر وادیِ قرطاس تک آیا ہے۔ان کے نعتیہ قطعات میں بات کے مکمّل ہونے کا عجب احساس ملتا ہے، اور یہی قطعہ نگاری کا ہنر ہے۔

(ادارہ)

نعت رنگ ۷۰

ابتدائیہ

حمد باری تعالی کی دینی اہمیت' افادیت اور فضیلت پر بے شمار آیات قرآنی وارشادات محبوب سبحانیﷺ ہمارے سامنے موجود ہیں جو حمد کو عبادت کا درجہ عطا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حمد صرف ایک صنف سخن ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے نطق ایمانی کی حیثیت سے بھی سامنے آتی ہے۔

شعروادب کے جو خزینے ہمیں اپنے متقدمین کی میراث کی صورت میں ملے ہیں' ان میں حمد کا رنگ و آہنگ نہایت نمایاں ہے۔عربی و فارسی کے تناظر میں بھی۔ہم دیکھتے ہیں کہ حمد کی ایک توانا روایت شعروادب کا حصہ تھی۔اردو کے تو خیر سبھی شعرا نے اسے اپنا موضوع قرار دیتے ہوئے اپنے دواوین کا آغاز حمد سے کیا یہی نہیں بلکہ اردو پر مسلم تہذیب کے گہرے اثرات کے باعث غیر مسلم شعرا کے ہاں بھی حمد نگاری کے رجحان نے فروغ پایا اور وہ بھی اپنے دواوین کا آغاز حمد سے کرنے لگے۔اس طرح دامن اردو میں ایک کثیر سرمایہ حمد جمع ہوتا گیا، بدقسمتی سے ہمارے نقادان فن نے ادب ودین کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے اور ان کے یہاں مذہبی شاعری بحیثیت صنفِ سخن کچھ زیادہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھی گئی، جس کی وجہ سے ہماری دینی شاعری ارتقائی مراحل تو طے کرتی رہی لیکن اپنے فن اور اسلوب کے اعتبار سے دیگر اصناف سخن کی ہم پلہ ہو سکی اور نہ ہی اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ہو سکا۔حمد پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے اور اسے رسماً اختیار کیا جانے لگا۔

الحمدللہ، ہمارے عہد میں مذہبی شاعری سے کم اعتنائی کا یہ رویہ رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا ہے اور ہمارے ارباب تنقید واہل تحقیق ان جواہر پاروں کی ادبی پرکھ کی جانب توجہ کررہے ہیں۔نعت اور مرثیہ پر خاصا کام ہو چکا ہے' کئی تحقیقی وتنقیدی مقالے شائع ہو چکے ہیں جو ان اصناف کے ادبی

خدوخال کو اُجاگر کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان اصناف کے ساتھ ساتھ اب حمد پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، خالص حمدیہ مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں، کئی حمدیہ منتخبات منظرِ عام پر آ چکے ہیں جو ہمارے حمدیہ ادب کے صدیوں کے سفر کو سامنے لا رہے ہیں۔ تاہم حمدیہ ادب کے تنقیدی و تحقیقی مطالعے کی صورت میں کوئی کتاب اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آئی ہے، صرف چند رسائل و جرائد کے حمد نمبر شائع ہوئے ہیں جن میں موضوع کی وسعت اور ہمہ گیریت کا احاطہ کرنے کی مخلصانہ مگر ناتمام کاوش و جستجو دکھائی دیتی ہے۔ اس مجموعی فضا میں ہم ''نعت رنگ'' کا ''حمد نمبر'' پیش کر رہے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی دعوے کے۔ حمدیہ ادب پر ہونے والے کام کے تناظر میں ہمارے کام کی اہمیت اور افادیت کا تعین آپ کو کرنا ہے۔ اپنے اس کام کے حوالے سے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ یہ نمبر مرتب کرتے ہوئے ہم نے اُن سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر بار بار حمد کے حوالے سے سامنے آتے رہے ہیں، چاہے وہ نعت کے مقابلے میں حمد کی طرف عدم توجہی سے متعلّق ہوں یا حمد کے موضوعات، اس کے رجحانات، اس کی دینی و ادبی اہمیت کے بارے میں۔ ہمیں یقین ہے کہ 'نعت رنگ' کا یہ 'حمد نمبر' آئندہ حمدیہ ادب پر کام کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی حوالہ ٹھہرے گا اور اس راہ دین و دل کے مسافروں کی منور راستوں کی طرف راہ نمائی کرے گا۔

ہماری دعا ہے کہ 'نعت رنگ' کا یہ ساتواں شمارہ جو اس کے سجدۂ شکر کے طور پر سامنے آ رہا ہے اس کے مصنّفین، معاونین، منتظمین اور قارئین کے لیے وسیلۂ نجات بن جائے، آمین۔

(شمارہ نمبر ۷، اگست ۱۹۹۹ء)

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۰۸

<u>ابتدائیہ</u>

الحمدللہ 'نعت رنگ' نے اپنے اشاعتی سفر کا ایک اہم حصہ طے کرلیا ہے۔ اردو میں علمی، ادبی اور دینی جرائد و رسائل کی اشاعت کے مسائل سے کون واقف نہیں اور اگر رسالہ کسی خاص موضوع سے متعلّق ہوتو دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں کیونکہ اس رسالے سے قارئین کا تعلّق وفاداری سے زیادہ وضع داری اور ضرورتاً سے زیادہ اخلاقاً ہی رہ جاتا ہے۔ ''نعت رنگ'' بھی ایک موضوعی رسالہ ہے لیکن اس کا موضوع ایسا نہیں جس سے دلچسپی رواروی میں لی جائے۔ یہ اپنے قارئین سے پورے وقار و سنجیدگی کی رسد اور فکر و عمل کی کمک چاہتا ہے جو اسے حاصل ہے اور اس کا دائرہ روز بہ روز وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔

نعت رنگ کا یہ آٹھواں شمارہ بھی نعت کی تخلیق، تنقید، تحقیق اور اور تدوین کے مختلف علمی وادبی پہلوؤں کو ہمارے سامنے لارہا ہے جس سے نعت پر ادبی گفتگو کے مزید در وا ہوسکیں گے کہ یہی ہمارا نصب العین ہے۔

گزشتہ دنوں جو چند اہم نعت نگار ہم سے جدا ہوئے اُن میں اقبال صفی پوری، شمیم جے پوری، خالد بزمی، الحاج قمر الدین احمد انجم، الحاج محمد علی ظہوری قصوری، الحاج محمد اختر سدیدی وغیرہ شامل ہیں، ادارہ اقلیم نعت ان نعت نگاروں کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ (شمارہ نمبر ۸، ستمبر ۱۹۹۹ء)

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۰۹

ابتدائیہ

ادب کی ناقدری کی آوازوں کے درمیان نعت نگاروں کے اس گلے کی گونج بھی کافی عرصہ سے سنائی دے رہی ہے کہ نعت کی کتابوں کی اشاعت کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی نکاسی کا مسئلہ بھی روز بہ روز گمبھیر ہوتا جارہا ہے یہی وجہ ہے کہ عام ادبی کتابوں کی طرح اب نعتیہ مجموعوں کی اشاعت کے لیے بھی کئی مرتبہ سوچنا پڑتا ہے اور اگر شائع کیا بھی جاتا ہے تو اتنی مختصر تعداد میں کہ صرف احباب میں اعزازی تقسیم کیا جاسکے۔

بلا شبہ نعتیہ مجموعوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی ایک توجہ طلب مسئلہ ہے لیکن کیا صرف یہ مسائل نعتیہ مجموعوں کے ساتھ ہی ہیں یا عام ادبی کتب کی مجموعی صورتحال یہی ہے؟ کیا غزل کے تمام مجموعے، افسانے، تنقید اور تحقیق کی تمام کتابیں فروخت ہورہی ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے یہ ایک الگ اور تفصیل طلب بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ نعت کے شائقین کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی کے باوجود نعتیہ کتب کی خریداری سے عدم دلچسپی اور بے اعتنائی کی شکایت کیوں؟

قصہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نعت کو شروع ہی سے سماع کی چیز قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں نعت کو ذوق شوق سے سننے والے اور اس کی سماعت سے اپنے قلوب واذہان کو جلا بخشنے والے لاکھوں افراد موجود ہیں لیکن نعت کی کتابیں یا نعتیہ مجموعے پڑھنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ یہ لمحہ فکر یہ ہے جس پر نعت کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں کو فوری توجہ کرنی چاہئے۔ الحمدللہ صرف ہمارے ملک ہی ایک محتاط اندازے کے مطابق ایسے اداروں کی تعداد کم وبیش دولاکھ کے قریب ہے جو جلسہ ہائے میلاد النبی ﷺ کے انعقاد اور ذکر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے فروغ ہی کے لئے وجود

میں آئیں ہیں تا کہ عوام الناس کے دلوں میں تذ کارِ رسول ﷺ کے ذریعے عشق کی شمعیں روشن کر کے انھیں عملی طور پر اسلامی معاشرے کی صورت گری کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس عشق کو ایک قوت بنا کر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی بھی کوشش کی جائے۔ان نیک مقاصد کے لئے ہم سب نعت کو موثر ترین ذریعہ تبلیغ قرار دیتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کام کو مزید وسعت دینے کے امکانات پر غور نہیں کرتے۔ ہم عشقِ رسول ﷺ کی اس دولت (نعت) کو تحریری شکل میں اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے سے کیوں غفلت برت رہے ہیں۔ میرا مقصد شکایت نہیں صرف توجہ دلانا ہے کہ اگر ہمارے یہ محترم ادارے سیرت ونعت کی کتب کی اشاعت اور خریداری پر توجہ کریں تو ہم اپنے اس مشترکہ مشن کو اور زیادہ تیز کر سکتے ہیں جس کے لیے ہم رات دن مصروف عمل ہیں۔ ہر سال ہم میلا دالنبی ﷺ کے موقع پر مختلف جلسوں اور محافل نعت کے انعقاد پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اگر ان اخراجات میں سے کچھ رقم کسی نثری کتاب یا نعتیہ مجموعے کی اشاعت پر خرچ کی جائے یا کسی شائع شدہ مجموعہ نعت کو خرید کر اپنے مہمانوں اور حاضرین محفل کی خدمت میں تحفتاً پیش کرنے کی روایت قائم کر لی جائے تو یہ تمام مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ گھر گھر میں حضور ﷺ کی سیرتِ مطہّرہ کے تذکار اور توصیف پر مشتمل کتب کی موجودگی سے تمام اہل خانہ مستفید ہو سکتے ہیں اور ہمارے سیرت ونعت نگار بھی اس پذیرائی پر مزید جذبے، ولولے اور لگن سے اپنی تخلیقی صلاحیتیں اپنے کاموں پر صرف کر سکیں گے۔ان عظیم الشان محافل کی یاد بھی اس تحفے کی بدولت عوام کے دلوں میں تازہ رہے گی اور سب سے اہم بات یہ کہ نعت صرف سماع کی چیز نہیں رہے گی بلکہ اس کے مطالعے کا ذوق بھی فروغ پائے گا۔ رب کریم ہمیں سیرت ونعت کی اس حقیقی خدمت کی جانب متوجہ فرمائے۔ آمین

زیرِ نظر شمارہ 'نعت رنگ' کا نواں شمارہ ہے۔ یہ شمارہ بھی اسی جستجو، اسی لگن اور اسی تمنا کا اظہار ہے جس کا گذشتہ شمارے تھے یعنی نعت کا ادبی فروغ۔ اُمید ہے شائقین نعت اور وابستگان ادب ہمارے اس شمارے کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

گذشتہ دنوں نعت کے کئی اہم شاعر ہم سے جدا ہو گئے۔ ان میں حافظ لدھیانوی ایک بہت بڑا نام ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کام کی ہمہ گیری کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف بڑے پیمانے پر ہونا چاہئے لیکن ہم نعت رنگ کی اشاعت میں مزید تاخیر کے خوف کے باعث یادنگاری کے عنوان سے چند ایسے مضامین پیش کر رہے ہیں جو ان کی شخصیت، کارناموں

اور کام کی تفصیل سے قارئین کو کم از کم متعارف ضرور کرا سکیں گے۔ صائم چشتی نعت کے ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے خاصے متعارف تھے انھوں نے کئی علمی و دینی کتابیں لکھیں اور ان کے کئی نعتیہ مجموعے بھی شائع ہوئے۔ شریف الدین نیر ایک بزرگ نعت گو اور نعت خواں کی حیثیت سے خوب شہرت رکھتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے ان کا ایک نعتیہ مجموعہ بھی شائع ہوا۔ آصف مظہر حسین ایک نعت خواں کی حیثیت سے دنیائے نعت میں متعارف ہوئے تاہم بعد میں انہیں ایک اچھے ناظم محفل کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا تھا۔ ان اصحاب کی یاد مدتوں دل کا زخم رہے گی۔ اللہ رب العزت ان خادم نعت کی مغفرت فرمائے۔ آمین (شمارہ نمبر ۹، مارچ ۲۰۰۰ء)

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۰

ابتدائیہ

'نعت رنگ' کا دسواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اللہ رب العزت کے کرم خاص، سرورِ کائنات ﷺ کی توجہ، قلمی معاونین کی سچی لگن، مستعدی اور سرپرستوں اور قارئین کی مسلسل حوصلہ افزائیوں کا کمال ہے کہ نعت رنگ تیزی سے اپنا ادبی مشن اور اشاعتی سفر طے کر رہا ہے۔

آج 'نعت رنگ' کو علمی و ادبی دنیا میں جو اعتبار حاصل ہوا ہے وہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ یہ جریدہ ایک خاص موضوع سے متعلق ہے یا اس کا مقصد حُب رسالت ﷺ کی تبلیغ و ترویج ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نعتیہ ادب میں موجود برسوں کے تنقیدی جمود کو توڑنے اور اس پر ہونے والی گفتگو کو ایک خاص روایتی فضا سے نکال کر خالص ادبی و شعری معیارات کے تناظر اور شرعی مسلمات کی روشنی میں پرکھنے اور نعت کو ادبی سطح پر عام کرنے کی کوششوں کے سبب ہے۔

نعتیہ ادب پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے۔ اس کے آثار و نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن ادبی حیثیت سے اس کا جائزہ بہت کم نظر آتا ہے اور اگر کچھ کام ہوا بھی ہے تو وہ یکجا نہیں، اس اعتبار سے نعت رنگ کے شمارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ نعت رنگ کے شماروں میں ایسے مضامین و مواد پیش کیا جائے جو آئندہ نعت پر کام کرنے والوں کی علمی اور حوالہ جاتی ضرورت بن جائے۔ 'نعت رنگ' کا یہ شمارہ بھی ہماری اسی خواہش کا اظہار ہے۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۱

ابتدائیہ

اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے، مسلمان وقت کی کسی بھی پیائش کو ذکر نبی کریم ﷺ سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ ظرف زماں یا ظرف مکاں کوئی بھی ہو، ان ہی کی یاد اور ان ہی کے ذکر سے جگمگاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ 'نعت رنگ' کا گیارھواں شمارہ ہے۔ نئی صدی کی دہلیز پر ذکر نبی کریم ﷺ کے اس چراغ کو روشن کرتے ہوئے میں نئی مسرتوں اور نئی منگوں کے جلو میں ان امکانات پر غور کر رہا ہوں جو آنے والے برسوں میں صنف نعت میں پیدا ہوں گے۔ اس اہم موقعے پر میرے ذہن میں بیسویں صدی میں نعت گوئی کے فروغ کے کئی جائزے روشن ہیں۔

بلا شبہ بیسویں صدی (جسے نعت کی صدی بھی کہا گیا) میں نعت گوئی کے رجحان میں قابلِ رشک اضافہ ہوا اور نعت گوئی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ نعت کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا، ہیئت میں تبدیلیاں ہوئیں، تخلیق نعت کے ساتھ ساتھ تحقیق نعت، تنقید نعت اور تدوین نعت کا شعور بھی پیدا ہوا جس کے نتیجے میں بے شمار معیاری نعتیہ مجموعے، کئی اہم تحقیقی مقالے، کچھ تنقیدی کتابیں، چند ادبی انتخاب اور نعت گو شعرا کے کئی اہم تذکرے سامنے آئے۔ علاوہ ازیں رسائل و جرائد کے اہم نعت نمبر شائع ہوئے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے نعت کو اہمیت دی اور خود حمد و نعت سے متعلّق کئی رسائل و جرائد اور کتابی سلسلوں کا اجرا ہوا۔

یہ سب حوصلہ افزا ہے، بہت حوصلہ افزا ہے لیکن قابل اطمینان نہیں۔ گزشتہ صدی کے مجموعی ادبی کاموں کے تناظر میں نعت پر ہونے والے ان کاموں کی رفتار اور مقدار ہمیں نہ صرف

بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ اکیسویں صدی میں فروغ نعت کے حوالے سے مربوط لائحۂ عمل کا تقاضا بھی کرتی ہے، فروغ نعت کی یہ ساری انفرادی کوششیں خوش آئند ہیں تاہم ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ کیا ''نعت'' نے خود کو ایک صنف ادب کے طور پر تسلیم کروالیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں انفرادی طور پر اثبات میں اور اجتماعی یعنی اداروں کی سطح پر نفی میں ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے ادبی ادارے گاہے بہ گاہے تمام ادبی اصناف کے معیاری انتخاب بھی مرتب کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے مختلف موضوعات پر کانفرنسوں اور سیمینار وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں لیکن نہ ہی ان منتخبات میں ہمیں کوئی نعتیہ انتخاب نظر آتا ہے، نہ ہی کوئی کانفرنس نعت کے موضوع پر ہوئی ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ آیا نعت اب تک ادبی صنف کا درجہ حاصل نہیں کرسکی یا پھر ان اداروں کے بالانشینوں میں اس صنف کا کوئی حقیقی نمائندہ موجود ہی نہیں ہے۔

ہمارے سامنے یہ صورتِ حال بھی ہے کہ ہمارے ان سرکاری اداروں نے ادبی کتب اور ادبی خدمات پر تو لاکھوں روپے کے انعامات رکھے ہیں، لیکن نعتیہ مجموعوں کو خالص مذہب کے کھاتے میں ڈال کر وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام ہونے والی، سیرت کانفرنس کے موقع پر چند ہزار روپوں کے انعامات تک محدود رکھا ہے اور ظلم یہ کہ اس رقم کو بھی بہ یک وقت دو دو مصنّفوں میں برابر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ صورتِ حال اس بات کا اعلان نہیں کہ ہمارے یہ ادارے نعت کو اب تک ادب میں شامل کرنے سے گریزاں ہیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کی کتنی جامعات میں نعت چیئرز قائم کی گئی ہیں؟ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر نعت کے موضوعات پر کتنے حقیقی مقالے لکھوائے گئے ہیں، یا لکھوائے جارہے ہیں؟ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیمی نصاب میں کتنے مدارج پر مطالعات نعت کو شامل کیا گیا ہے۔

یہ اور ایسے کئی سوال فروغ نعت کے حوالے سے ہمارے بلند بانگ دعووں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم فروغ نعت کا کام انفرادی طور پر کرنے کے بجائے اجتماعی اور تحریک کی شکل میں کریں۔ ملک کے طول وعرض میں بے شمار ادارے اور تنظیمیں فروغ نعت کے حوالے سے سرگرمِ عمل ہیں، اگر ان اداروں اور تنظیموں کی کوئی ملک گیر فیڈریشن قائم کر کے کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے تو ہم نعت کے حقیقی فروغ کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ نجی اور سرکاری اداروں کی توجہ حاصل کر کے، نعتیہ شاعری کے رجحانات اور موضوعات کے حوالے سے معیاری انتخاب مرتب

کرواسکتے ہیں،نعتیہ شاعری کےفکری اور تجزیاتی مطالعات کی تنقیدی کتابیں قلم بند کرواسکتے ہیں اور ان کی ترویج واشاعت کا اہتمام کرواسکتے ہیں،نعت گوئی کی تاریخ اور نعت گوشعرا کے تذکرے قومی اور علاقائی زبانوں میں مرتب ہوسکتے ہیں، سرکاری سطح پر ہونے والی ادبی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں نعتیہ ادب کے لیے خصوصی حصے کا تعین کرواسکتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ نعتیہ ادب کی ترویج واشاعت اور فروغ کا یہ کام ہم اسی میرٹ پر کروانے کا مطالبہ کرسکتے ہیں جو دیگر اصناف شعروادب کے سلسلے میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

ادب اگر انسانی اقدار کی سربلندی کا نام ہے تو نعت ہمارے عقیدے کی اساس ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کی نقیب بھی ہے۔اس لیے نعت کو ادب میں وہ جگہ ملنی چاہیے جس کی یہ مستحق ہے۔ادبی صنف کے اعتبار سے بھی اور ہماری ملی اور قومی شناخت کے وسیلے کے لحاظ سے بھی۔

'نعت رنگ' ۱۰ اور ۱۱ کی درمیانی اشاعتی مدت میں جو اہم نعت نگار ہم سے جدا ہوئے ان میں اقبال عظیم، کلیم عثمانی، اختر ہوشیار پوری، لالہ صحرائی، لطیف اثر، طاہر شادانی اور محمد علی ظہوری، سید ریاض الدین سہروردی اور استاد فدا خالدی دہلوی کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اقلیم نعت ان عظیم نعت نگاروں کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے اور قارئین نعت رنگ سے بھی ان کے حق میں دعا کی درخواست ہے۔(شمارہ نمبر ۱۱، مارچ ۲۰۰۱ء)

نعت رنگ ۱۲

ابتدائیہ

'نعت رنگ' کی اشاعت کے آغاز میں کچھ لوگوں کی طرف سے یہ سوال سامنے آیا کہ 'نعت رنگ' کتنا سفر طے کرسکتا ہے؟ آخر نعت کے پہلو ہی کتنے ہیں جن پر تواتر سے لکھا جاتا رہے؟

اس وقت اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا لیکن آج ''نعت رنگ'' کے سلسلے کی بارھویں کتاب اہلِ ادب کے سامنے پیش کرتے ہوئے، میں ایک سرشاری اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ نعتِ رسول ﷺ کا جہانِ معنی اس درجے وسعتوں کا حامل ہے کہ یہ سلسلہ چودہ سو سالوں سے تادمِ تحریر چلا آرہا ہے۔ یہ سفر جو صرف عقیدت اور محبّت کی ایک کیفیت میں شروع کیا گیا تھا، آج معنویت کی کئی منزلوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے جاری وساری ہے۔ میں نہایت عاجزی سے عرض کروں گا کہ ''نعت رنگ'' اسی محبّت اور معنویت کے سفر کا ایک تابناک رُخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ، فکر کا ہر زاویہ اور دل کی ہر دھڑکن نبی کریم ﷺ سے وابستہ ہے اور آپ ﷺ کا تذکرہ ہر شرفِ انسانی اور ہر سعادت کا تذکرہ ہے اور آپ ﷺ کے کمالات تمام علوم کی انسانی تشریح ہیں۔ نعت کا مطالعہ ہماری نبی کریم ﷺ سے وابستگی اور آپ ﷺ سے عقیدت و محبّت کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں اور نہ یہ محض ادبیات کا کوئی ایک پہلو ہے بلکہ یہ عمرانیات، بشریات، تاریخ اور مطالعۂ ثقافت کو ایک ہی نکتے پر مرکوز کر کے ہمارے سامنے لاتا ہے۔

''نعت رنگ'' کے زیرِ نظر شمارے میں جناب ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کا مضمون مطالعۂ نعت کے ایک نئے زاویے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو غور طلب بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ نعت ایک باقاعدہ صنفِ سخن ہے یا نہیں، اس مسئلے پر ہمارے گزشتہ شماروں میں بھی گفتگو ہو چکی ہے اس بار بھی

جناب سیّد حسین احمد نے اسی مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے نعت نگار اور قارئین اس مسئلے پر کوئی مکالمہ روشن کریں گے۔

دُنیائے غزل میں غالبؔ کی فرماں روائی گزشتہ ڈیڑھ صدی سے قائم ہے اردو ادب میں جتنا غالبؔ پر لکھا گیا ہے، شاید ہی کسی اور پر لکھا گیا ہو لیکن ہم غالبیات کے ایک توجہ طلب مگر تشنہ موضوع کو اس مرتبہ ''نعت رنگ'' میں ایک خصوصی گوشے کی صورت اُجاگر کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ یہ گوشۂ غالبؔ کے عشقِ رسول ﷺ، غالبؔ کی نعت گوئی اور غالبؔ کی شاعری کے نعتیہ ادب پر اثرات کے کئی پہلوؤں سے ہمیں متعارف کرواتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ غالبؔ کے ہاں نعتیں تعداد میں کم ضرور ہیں لیکن معیارِ شعری اور معیار نقد و تحقیقِ غالبؔ میں اُن کی ایک خاص اہمیت ہے جسے اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ہم سے جدا ہونے والے نعت نگاروں میں ایک اہم نام جناب شوکت ہاشمی کا ہے۔ وہ اپنے منفرد اسلوب اور والہانہ پن کے باعث نعت نگاروں کے ہجوم میں علاحدہ دکھائی دیتے تھے۔ ادارہ اقلیمِ نعت مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور اُن کے لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

مرتب

نعت رنگ ۱۳

ابتدائیہ

اس بار باوجود کوشش اور خواہش کے ''نعت رنگ'' کی اشاعت تاخیر کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اسباب چند در چند رہے، تاہم یہاں ان کا تذکرہ بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ بس اتنا عرض کروں گا کہ ''نعت رنگ'' کی اشاعت میں گو کہ تاخیر ہوئی لیکن میں نعت اور فروغِ نعت کے کاموں سے کسی لمحے غافل نہیں رہا، بلکہ کچھ ایسے امور اور اسباب پر توجہ رہی جو نعت گوئی، نعت خوانی اور مطالعۂ نعت کے ضمن میں آگے چل کر زیادہ بہتر نتائج کا باعث ہوسکتے ہیں۔

اس عرصے میں ''نعت رنگ'' کے لیے جو نگارشات موصول ہوئیں، ان کی مقدار کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ پرچے کو دو الگ اور اپنی جگہ مکمل حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چناں چہ ''نعت رنگ'' کے دو شمارے (نمبر ۱۳ اور ۱۴) ایک ساتھ قارئین کو پیش کیے جا رہے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ دونوں پرچے قارئینِ نعت کے لیے فکر افروز نگارشات سے مالا مال ہوں اور یوں اشاعت میں تاخیر کی جو کوفت قارئین نے اُٹھائی ہے اس کا کسی قدر ازالہ ہوسکے۔ ''نعت رنگ'' کے لیے نگارشات کی یہ فراہمی ہمارے لیے یقیناً طمانیت کا باعث ہے کہ ربّ کریم نے اس کام میں برکت پیدا فرمادی۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ قارئینِ کرام کے لیے بھی یہ بات خوشی اور اطمینان کا باعث ہوگی۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۴

اِبتدائیہ

''نعت رنگ'' ۱۴ پیشِ خدمت ہے۔ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ ''نعت رنگ'' کی بہ یک وقت دو اشاعتیں سنجیدہ قارئین اور خریداروں کو دشواری میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ ایک تو اتنا سارا مواد ایک ساتھ پڑھنے کو مل جاتا ہے جس کا فوری پڑھنا دشوار ہوتا ہے اور پھر ایک ساتھ دو شماروں کی خریداری کا اضافی بوجھ بھی۔

مجھے اپنے دوستوں کے اس گلے سے خوشی ہوئی کہ ''نعت رنگ'' کے قارئین کا ایک بڑا حلقہ ''نعت رنگ'' کے مواد کو نہ صرف نہایت توجہ سے پڑھتا ہے اور اس پر غور کرتا ہے بلکہ اس پر اظہارِ خیال کرنے کے لیے ''نعت رنگ'' کی اشاعتوں میں ایک مناسب فاصلہ بھی چاہتا ہے۔

ایسے دوستوں کی رائے سر آنکھوں پر تاہم گزارش یہ ہے کہ ''نعت رنگ'' ایک کتابی سلسلہ ہے جس کی اشاعت کا کوئی دورانیہ مقرر نہیں ہے۔ ہم صرف بہتر مواد کی تلاش میں رہتے ہیں کہ آپ کے سامنے ہر شمارہ میں نعت کے ادبی پہلوؤں پر نئے رجحانات اور افکارِ تازہ پیش کر سکیں۔

الحمدللہ کہ اب ''نعت رنگ'' کے لکھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہمیں اچھے مواد کی تلاش میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دستیاب مواد کو فوراً قارئینِ ''نعت رنگ'' تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پھر کچھ مسائل فوری توجہ چاہتے ہیں جن پر مشتمل مواد کو روکنا بھی انھیں ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے میری ذاتی مصروفیات بھی کافی بڑھ گئی ہیں اکثر ملکی اور بیرونِ ملک اسفار درپیش رہتے ہیں جن کے نتیجے میں ''نعت رنگ'' تاخیر کا شکار ہوتا ہے اور قارئینِ ''نعت

رنگ‘‘ کوفت کا۔اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ان دو اشاعتوں کو اس تاخیر کی تلافی تصور فرمائیں۔

نئے دُکھ

گزشتہ دنوں نعت کاروں کو جس صدموں سے دوچار ہونا پڑا ان میں نہایت اہم اور معتبر نعت گو نعیم صدیقی کی وفات، ممتاز محقق و شاعر اور ماہنامہ ’’نعت‘‘ لاہور کے ایڈیٹر راجا رشید محمود کی اہلیہ کا انتقال اور عصرِ حاضر کے نمائندہ نعت گو شاعر حفیظ تائب کے والدِ ماجد کا انتقال شامل ہیں۔دعا ہے اللہ ربّ العزت مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۵

ابتدائیہ

’نعت رنگ‘ کا پندرھواں شمارہ عید میلاد النبیﷺ کی مبارک ساعتوں میں منظرِ عام پر آرہا ہے کہ یہ مبارک ساعتیں اور مسرت و انبساط کے یہ رنگ ہماری زندگیوں اور ہماری خوشیوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ویسے بھی ہماری خوشی کا ہر رنگ ’نعت رنگ‘ ہی تو ہے۔

’نعت رنگ‘ کے اجرا کے وقت ہم نے جن خواہشات کا اظہار کیا تھا وہ کافی حد تک پوری ہو رہی ہیں۔ تنقیدی جمود خاصی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور نعتیہ ادب پر بے لاگ تبصروں اور تنقیدی مباحث کی ایسی فضا بن چکی ہے جس نے اہلِ علم کو نعت کے ادبی پہلوؤں کی جانب نہ صرف متوجہ کر دیا ہے بلکہ وہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے اور لکھنے پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ میں لکھنے والے ناموں میں اہلِ علم کا مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع ہمارے اس دعوے کی دلیل کے طور پر سامنے ہیں اور ہم اس کرمِ بے پایاں پر اپنے رب کے آگے سر بسجود ہیں۔

’نعت رنگ‘ کا زیرِ نظر شمارہ نعت کے ادبی، تنقیدی اور تہذیبی سفر کی پندرھویں منزل ہے۔ یہ ادبی سفر ہم نے شعریت اور شریعت کے سائبان میں طے کیا ہے۔ اس مسافت پر ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ہماری توقعات سے بڑھ کر ہیں۔ نعت کے ادبی فروغ کی اس تحریک کے زیرِ اثر اب تک جو تنقیدی کتب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں، ان میں ’نعت اور تنقیدِ نعت‘ (ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی)، ’’اردو نعت اور جدید اسالیب‘‘ (عزیز احسن)، ’’نعتیہ ادب میں تنقید اور مشکلات تنقید‘‘ (ادیب رائے پوری)، ’’اردو میں نعت گوئی‘‘ (شفقت رضوی)، ’’نعت اور آداب نعت‘‘ (علامہ کوکب

نورانی اوکاڑوی) شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں حمد ونعت پر لکھنے جانے والے ہر تحقیقی وتنقیدی مقالے میں 'نعت رنگ' کے کثیر حوالے ہمیں یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ رب العزت کی تائیداور نبی کریم ﷺ کی چشمِ التفات سے ہماری کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔

ان سطور کو لکھتے ہوئے میرے دل میں کسی طرح کا بھی احساسِ تفاخر نہیں ہے بلکہ صرف اورصرف جذباتِ تشکّر ہیں کہ ربِّ لوح وقلم نے میری اور 'نعت رنگ' کے قلمی معاونین کی مساعی کو قبول فرمایا۔ سچی تو یہ ہے کہ اس فضا کو بنانے میں ہمارے لکھنے والوں کی بڑی خدمات ہیں بلکہ قربانیاں ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں مذہب سے جڑی ہوئی اصناف پر گفتگو کے دروازے صرف خوفِ فسادِ خلق سے بند ہوں وہاں حمد ونعت کے ادبی پہلوؤں پر شعریت اور شریعت کے حوالے سے اپنا نکتۂ نظر، جرأت، بے خوفی اور استدلال سے پیش کرنا اور پھر اس بات پر مختلف نکتہ ہائے نظر کے تناظر میں ہونے والے اعتراضات واختلافات کو حوصلے اور تحمل سے سننا اور برداشت کرنا صرف اس لیے کہ نعت پر ادبی مباحث کے در کھلے رہیں اور صدیوں سے بند اس ایوان میں تازہ ہوا کے جھونکے آتے رہیں تا کہ ہمیں نعت کی علمی، ادبی، تہذیبی جہات کا علم ہو اور ہم اس کے آداب کا شعور حاصل کر کے نعت کی حقیقی قوت کو جان سکیں اور اس کو بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہی ہمیں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ 'نعت رنگ' میں لکھنے والوں کی ان خدمات اور اس قربانی کو جو انھوں نے اپنی انا اور شہرت کے دائروں سے باہر نکل کر دی ہے، تاریخ ادب میں یقیناً یاد رکھا جائے گا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے، مباحث کی گرمی بعض اوقات اہلِ محبّت کو ملول کر دیتی ہے اور ان مباحث میں کچھ ناروا باتیں بھی در آتی ہیں لیکن یہ عوامل مباحثے کا حصہ ہیں کہ اس کے بغیر آپ درست اور نادرست کا فیصلہ نہیں کر پاتے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے ان مباحث کی گرمی کو بروقت محسوس کر کے اپنے مضمون میں کچھ مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے اور چند مشورے بھی دیے ہیں، امید ہے ہمارے محترم لکھنے والے اس مضمون کا مطالعہ سنجیدگی اور کشادہ دلی سے کریں گے۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اور 'نعت رنگ' لازم وملزوم ہیں۔ وہ ادب کی ان بڑی آوازوں میں ہیں جو نعت کے ادبی فروغ کی گونج میں ہمیشہ نمایاں رہی ہیں، زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر صاحب نے ماضی کے دریچوں میں جھانک کر ان لمحوں کو آواز دی ہے جو ذکرِ نبی کریم ﷺ سے معطّر ومعنبر تھے، ان

جگنوؤں کا تعاقب کیا ہے، جن سے ہمارے گھروں میں اُجالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خوب صورت تحریر کے آئینے میں محفوظ ہو جانے والا یہ ماحول اور منظر نامہ آئندہ آنے والی تمام نسلوں کو محبّتِ مصطفیٰ ﷺ کی اس مہک سے آشنا کرواتا رہے گا جو ہمارے گھر آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید 'نعت رنگ' کے سنجیدہ مقبول لکھنے والوں میں شامل ہیں، اس مرتبہ انھوں نے بعثتِ نبوی ﷺ سے پہلے کے منظر نامے کو نعتیہ اشعار سے ترتیب دے کر اپنے مخصوص خوبصورت اسلوبِ تحریر کی خوشبو سے مہکایا ہے۔

پروفیسر شفقت رضوی نعتیہ ادب کے تیکھے نقادوں میں گنے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے 'شام وسحر' کے نعت نمبروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جس سے نعت پر اب تک ہونے والے کاموں کے تناظر میں ان نمبروں کی اہمیت وافادیت اور اس کے مدیر کی محنت کا بھرپور اعتراف ہوتا ہے اور مضمون نگار کی محنت اور تنقیدی شعور بھی آشکار ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا کا شمار نعت کے اہم ناقدین اور شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنا تحریری مضمون نعت کی تاریخ، تعریف، فروغ، رجحانات اور تقاضوں کی روشنی میں لکھا ہے، جس میں ان کے خوبصورت اسلوبِ تحریر اور تنقیدی بصیرت نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ 'نعت رنگ' میں بار بار بیان ہونے والے محققین کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے لیے بے حد مفید ہوگا جو مختلف جامعات میں نعت پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں، انھیں تمام ضروری مواد ایک جگہ مل جائے گا۔ ایک اور اہم بات۔۔۔ باوجود اس کے کہ پروفیسر صاحب نعت کا ایک خاص اسلوب رکھنے والے اہم شاعر ہیں لیکن انھوں نے اپنے مضمون میں کہیں اپنے اشعار کا حوالہ نہ دے کر اور اپنا ذکر نہ کر کے اسلاف کی قلمی وضع داری اور ایثار کی یاد بھی تازہ کر دی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی تحقیق کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں، مگر 'نعت رنگ' کی محفل میں پہلی بار شامل ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مضمون میں پہلی مرتبہ غالب کے مشہور شاگرد میر مہدی مجروح کو بحیثیت نعت گو متعارف کروایا ہے۔ یہ مضمون تحقیق کے نکتۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی نے اپنے خوب صورت اندازِ تحریر میں نعتیہ ادب کے حوالے سے ایک پرانی بحث کو خوب صورتی اور استدلال سے سمیٹ لیا ہے۔

راجا رشید محمود تحقیقِ نعت کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کے

اہم موضوع ''سراپا'' کے حوالے سے ایک خوبصورت مضمون پیش کیا ہے، جس سے ان کی اس موضوع سے گہری واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط تنقید وتحقیق کے مردِ میدان ہیں۔انھوں نے اس شمارے میں نعتیہ ادب کے اہم موضوع نور ناموں پر ایک خوبصورت تحقیقی مضمون پیش کیا ہے۔

منصور ملتانی نے اردو میں منظوم سیرت نگاری کے حوالے سے ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے، یہ مضمون ظاہر کرتا ہے کہ وہ تحقیق کے جادۂ دشوار پر سلامت روی کے ساتھ سفر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر افضال احمد انور نعت کے تازہ دم ناقدین میں شامل ہیں۔انھوں نے تنقیدِ نعت کی مثبت جہتوں کی نشان دہی کی ہے جو تنقیدِ نعت کی تحریک اور شعرا کے غیر محتاط رویوں کے تناظر میں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔

محمد فیروز شاہ نے میانوالی کے نعت گو شعرا کا مختصر مگر جامع اور خوب صورت تعارف وتذکرہ پیش کیا ہے جو نعت کے علاقائی جائزوں میں اہمیت رکھتا ہے۔ پروفیسر علی محسن صدیقی، ڈاکٹر سیّد شمیم گوہر اور عزیز احسن کے گراں قدر تبصرے ان حضرات کے علمی مرتبے اور گہرے مطالعے کو ظاہر کرتے ہیں۔

نئے دکھ

گزشتہ دنوں جو وابستگانِ نعت اپنے رفیقِ اعلا سے جا ملے ان میں مسرور کیفی، والی آسی، علی محمد واجد اور مشتاق قادری نمایاں ہیں۔مسرور کیفی نعت کے ان شعرا میں تھے جن کے عشق کی شدت نے ان کی نعت گوئی کو گفتگو کا رنگ دے دیا تھا، ان کی بے شمار نعتیں مقبولِ خاص و عام ہیں۔ان کے چوبیس مجموعۂ نعت شائع ہو چکے ہیں جب کہ دو منتظرِ طباعت ہیں۔ ہندوستان کے مشہور شاعر والی آسی خوب صورت نعتیں کہتے تھے۔ان کی نعتوں کا ایک گوشہ بھی 'نعت رنگ' میں شائع ہو چکا ہے۔انھوں نے ساجد صدیقی لکھنوی کے ساتھ مل کر نعتیہ انتخاب ''ارمغانِ نعت'' بھی مرتب کیا تھا جسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔

علی محمد واجد کا تعلّق ملتان سے تھا، وہ شہر کے نمایاں نعت گو شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ مشتاق قادری کو ان کی نعت خوانی سے عالم گیر شہرت عطا ہوئی۔دعوتِ اسلامی سے وابستہ تھے۔خوب صورت آواز اور گداز دل کے مالک تھے۔مولائے کل ان وابستگانِ نعت رسول ﷺ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۶

ابتدائیہ

''نعت رنگ'' کا شمارہ ۱۶ پیش خدمت ہے۔ باوجود کوشش کے ہم ۲۰۰۳ء میں صرف ایک ہی شمارہ پیش کر سکے، ہم اپنے قارئین سے شرمندہ ہیں۔ مجھے نعت ہی کے سلسلے میں اکثر سفر درپیش رہتے ہیں۔ ''نعت رنگ'' کے لیے اچھے مضامین کی تلاش اور ''نعت رنگ'' کی ہم راہی میں جاری ہونے والے نعتیہ جرائد و کتب کی خدمت و معاونت بھی وقت چاہتی ہے، ''نعت ریسرچ سینٹر'' کا قیام اور اس کے مختلف جامعات سے روابط کی استواری کے نتیجے میں بڑھنے والا کام اور ذمہ داریاں بھی اپنا حق طلب کرتی ہیں، پھر محافلِ نعت اور مشاعروں میں شرکت۔ الغرض مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کے کئی نورانی دائرے مجھ ایسے گناہ گار کو آغوشِ رحمت میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

میں شکر گزار ہوں اپنے رب کا جس نے اپنی رحمت سے مجھے اتنی ہمت عطا فرمائی کہ میں کسی نہ کسی حد تک ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی میں مصروف ہوں۔ مجھے تحدیثِ نعمت کے طور پر بھی اس تفصیل کے بیان پر شرمندگی ہے مگر مقصود صرف اتنا ہے کہ مجھے معذرت کرنی ہے، ان احباب سے جو ''نعت رنگ'' سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر اس کا اظہار اپنے خطوط میں ''نعت رنگ'' کے مشمولات پر تبصروں کی صورت میں کرنے کے بجائے ''نعت رنگ'' کی اشاعتی تاخیر پر برہمی کے تاثر کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں ایسے تمام دوستوں سے اس وضاحت کے ساتھ کہ ''نعت رنگ'' ایک کتابی سلسلہ ہے اور اس کی اشاعت کا کوئی دورانیہ طے نہیں ہے۔ اپنے حق میں آسانیوں کی دعا کا طلب گار ہوں۔

مجھے کئی دوستوں نے خطوط، ٹیلی فون کالز اور بالمشافہ ملاقات پر ''نعت رنگ'' میں شائع

ہونے والے مضامین میں تکرار کی طرف متوجہ کروایا ہے اور ان میں تنوع اور تازگی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میں ایسے تمام دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ نہ صرف ''نعت رنگ'' کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اس کے موضوعات میں وسعت اور تنوع کے خواہاں بھی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ نعت کے آداب اور مسائل کے حوالے سے ہونے والی گفتگو سے لے کر نعت کے تاریخی، تہذیبی اور ارتقائی جائزوں تک ہم نے جو کچھ بھی ''نعت رنگ'' یا کسی اور جگہ تحریر کی شکل میں پیش کیا ہے اس میں تکرار اس وجہ سے سامنے آرہی ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کو نعتیہ ادب پر نثری سرمائے کی کمی کا احساس ہے اور اسی لیے وہ اس موضوع پر لکھتے وقت تاریخی تناظر کو بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قاری کو ایک ہی مضمون میں اجمالی ہی سہی ایک مکمّل خاکہ نعتیہ ادب کے ارتقائی مراحل پر مل جائے۔

یہ مضامین اگر علاحدہ علاحدہ رسائل و جرائد میں شائع ہوں تو شاید یہ بات ان مضامین کا حسن قرار پائے مگر ''نعت رنگ'' یا نعت ہی سے متعلّق کسی بھی جریدے میں اس طرح کی تکرار اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے دشواری پیدا کر رہی ہے، لہٰذا میں اپنے محترم لکھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ تاریخی تناظر کے حوالے سے صرف وہی معلومات پیش کریں جنھیں اضافہ کہا جا سکے ورنہ اب براہِ راست موضوع پر لکھنا ہی مناسب ہے۔

موضوعاتِ نعت کے حوالے سے تنوع کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے اور میرے خیال میں اس کی تلاش میں ہمیں مذاکروں سے مدد مل سکتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہم اپنی گفتگو کی مجالس میں نعت سے متعلّق مختلف موضوعات پر بے تکان بولتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو میں ہم بعض اوقات ایسی فکر انگیز گفتگو سن لیتے ہیں یا کر لیتے ہیں جس کا ہمیں پہلے سے کوئی احساس نہیں ہوتا یا ہمارا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں ہوتا ہمیں اپنی تحریروں کے لیے بیش تر موضوعات اسی طرح کی گفتگو سے مل سکتے ہیں، لہٰذا میں ''نعت رنگ'' کے تمام نمائندگان و محبان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں اور شہروں میں نمایاں ادبی شخصیات کو مدعو کر کے عصرِ حاضر کے بین الاقوامی اور علاقائی مسائل اور تہذیبی رجحانات کے تناظر میں نعتیہ ادب پر مذاکروں کا اہتمام کریں اور اسے تحریری شکل میں ہمیں ارسال کریں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ان مذاکروں کے نتیجے میں ہم بے شمار تازہ موضوعات تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔ (ان شاءاللہ)

''آرٹس کونسل آف پاکستان''، کراچی کا قابلِ فخر کارنامہ

ہمیں خوشی ہے کہ'' آرٹس کونسل آف پاکستان''، کراچی کی نومنتخب کابینہ کے پہلے اجلاس میں کونسل کے اعزازی خازن سیّد اظفر رضوی نے'' آرٹس کونسل'' کی تازہ رکنیت سازی کی مہم کے موقع پر فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں قاری اور نعت خواں کے لیے بھی علاحدہ علاحدہ کیٹیگری کا مطالبہ کیا اور اس مطالبے کو کابینہ نے منظور بھی کرلیا ہے جس کی رُو سے اب'' آرٹس کونسل آف پاکستان'' کی رکنیت کے لیے قاری اور نعت خواں بھی اہل قرار پائیں گے۔

اس عظیم کارنامے میں ہم سیّد اظفر رضوی اور'' آرٹس کونسل آف پاکستان'' کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ملک کے دوسرے صوبوں میں موجود'' آرٹس کونسل'' اور اس طرز پر دوسرے تمام ثقافتی اداروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی مسلم تہذیب وثقافت کے ان شعبوں کو اپنے ہاں نمائندگی دیں۔

نئے دُکھ

گزشتہ دنوں جن شخصیات کی جدائی ہمارے دلوں کا زخم بنی ان میں قائدِ ملتِ اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقیؒ، مفتی عبدالقیوم ہزارویؒ (پاکستان)، مفتی ظفر علی نعمانیؒ (پاکستان)، مولانا سیّد انوار اشرف عرف مُثنی میاںؒ (چھوچھہ شریف)، مولانا سیّد صفی العالمؒ سجادہ نشین خانقاہ شہبازیہ (بھاگلپور)، علامہ شاہ تراب الحق قادری کے بڑے بھائی مولانا شاہ قاسمؒ، ممتاز نعت گو شاعر حفیظ تائب کے والدِ ماجد، معتبر نعت شناس ڈاکٹر ریاض مجیدؒ (پاکستان) اور ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (بھارت) کے جواں سال صاحبزادگان، معروف نعت خواں سیّد فصیح الدین سہروردی کی ہمشیرہ، ممتاز صحافی ونعت نگار خان آصف، ناظم القادری، ماہرِ علمِ عروض اور ثنا گو شارق جمال اور صبا اکبر آبادیؒ کی اہلیہ محترمہ شامل ہیں۔

ادارہ ان تمام مرحومین کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا ہے اور قارئین سے بھی درخواست گزار ہے کہ ان کے حق میں مغفرت اور لواحقین کے حق میں صبر کی دعا فرمائیں۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۷

ابتدائیہ

''نعت رنگ'' کے اجرا کے وقت سے لے کر آج تک میں نے ''نعت رنگ'' کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کے نمائندہ رسالے کے مروّجہ اصول وضوابط کا پابند نہیں رکھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس انداز اور مزاج کے حامل نعت پر کئی جریدے شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ''نعت رنگ'' کو ایک ایسی محفل بنانے کی کوشش کی ہے جہاں مختلف الخیال احباب اپنے اپنے مکتبِ فکر و اندازِ نظر کے ساتھ شریک ہو کر ذکرِ نبی کریم ﷺ کے فکری، مذہبی، ادبی اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کر سکیں، یہی نہیں بلکہ ادب کا عام مگر باشعور قاری بھی اس گفتگو میں اسی اہمیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے جس کا حق ہم صرف لکھنے والوں کو دیتے رہے ہیں۔ ایک ایسے فورم پر جہاں اظہارِ رائے کی آزادی ہو وہاں مباحث کا دائرہ صرف فکری، ادبی، اور فنی نہیں رہتا بلکہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی مسلکی اور فقہی بھی ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے لیے معنی رکھتی ہیں اور ہم اپنے نظریات کو اسی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اختلافِ رائے بری چیز نہیں مگر شائستگی ضروری ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اس کا خیال رکھتے ہیں مگر کچھ احباب اپنی تحریروں پر اُٹھنے والے سوالات سے خاصی حد تک آزردہ نظر آتے ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ''نعت رنگ'' کے معماروں میں ان عظیم ناموں کو دیکھیں جو ادب و مذہب کے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے نعت پر بے لاگ گفتگو کے در وا کرنے کے لیے اپنی تحریروں پر اعتراضات اور سوالات کشادہ دلی سے برداشت کیے اور مسلسل ''نعت رنگ'' میں لکھتے رہے کہ ہم سب نعت پر ایسی

تنقیدی گفتگو کوفروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔

''نعت رنگ'' کے قارئین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور عالمی سطح پر اسے حاصل کرنے والی پذیرائی ہمارے اس یقین کو تقویت عطا کرتی ہے کہ ہمارے قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہماری اس پالیسی کو پسند کرتا ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے اور اس پر ادب، مذہب اور عصرِ حاضر کے تناظرات میں ہونے والی گفتگو کو بڑی توجہ سے پڑھ اور سن رہا ہے۔ مختلف نکتہ ہائے نظر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ کئی لسانی مباحث ہماری آگہی میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ کئی ادق فکری، فقہی اور ادبی مسائل پر پہلی بار ''نعت رنگ'' نے ایسا مواد پیش کیا ہے جس نے نعت کی رسمیات سے بلند ہوکر ہمارے اذہان کو منور کیا اور اس پر بات کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

''نعت رنگ'' کے خدمت گزاروں، لکھنے والوں اور قارئین نے اب تک جو کچھ بھی پیش کیا ہے، نیک نیتی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ''نعت رنگ'' کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی قبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ (الحمدللہ)

''نعت رنگ'' کے زیرِ نظر شمارے میں جو محفل سجی ہے اس میں ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی جو ''نعت رنگ'' کے معماروں میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں، وہ اپنے ماضی کے ان روشن لمحات کو ہمارے سامنے پیش کررہے ہیں جو ذکرِ نبی کریم ﷺ سے منور ہیں۔ اس سلسلے کا یہ دوسرا مضمون ہے خدا کرے وہ اس سلسلے کو دراز کرسکیں۔ ہندوستان میں ''نعت رنگ'' کے محبّین اور خدمت گزاروں میں ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ عربی زبان وادب کے استاد ہیں۔ ان کے دوسو سے زیادہ مقالات عرب دنیا کے رسائل و جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس مرتبہ وہ شوقی کے دو مزید قصائد کا تجزیہ وتعارف لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ان کی توجہ اور محنت سے اردو نعت نگاروں کا ایک بڑا حلقہ عربی زبان کے نامور شعرا کی نعتیہ نگارشات سے آشنا ہوکر رہا ہے۔ ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط بھارت میں اسلامی ادب کی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہیں۔ کے لیے ''نعت رنگ'' ان کی خدمات قارئین سے پوشیدہ نہیں اس مرتبہ مراٹھی زبان میں ذکرِ محمد ﷺ کے سلسلے میں ہونے والے کاموں کے تعارف کے ساتھ حاضر ہیں۔ ان کا یہ مضمون ان کی تحقیقی لگن کے ساتھ ساتھ ورفعنا لک ذکرک کی حقانیت کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ریاض حسین چودھری اور فیروز شاہ اردو نعت کے صاحبِ طرز شعرا میں ہیں۔ ان کا کلام ہزاروں شعرا کے کلام میں علاحدہ پہچانا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں قابلِ ذکر شعرا

ہماری آج کی محفل میں جدید نعت گوئی کے حوالے سے اپنے افکار وخیالات اور نظریات لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے سیرت، نعت اور اعلیٰ ادبی و سماجی اقدار پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ''نعت رنگ'' کے معماروں میں ہیں۔ ان کا مضمون عصرِ حاضر کے نعت نگاروں کو اُن کی کوتاہیوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحِ احوال پر اُکسانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس سے مضمون نگار کی ماحول پر گہری نگاہ اور دردمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے نفس کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین، پروفیسر محمد اکرم رضا نعت پر نثری کاموں کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ''شام وسحر'' کے نعت نمبروں میں سب سے زیادہ قلمی تعاون کرنے والے اکرم رضا ''نعت رنگ'' کی محفل میں کافی دیر سے آئے مگر دیر سے آنے کی تلافی اس طرح کررہے ہیں کہ ان کا کوئی نہ کوئی مقالہ اب ''نعت رنگ'' میں ضرور شائع ہورہا ہے۔ اللہ ربّ العزت ان کی صحت اور قلم کی روانی میں برکت عطا فرمائے۔ ان کا مضمون ہمارے کئی نعت نگاروں کے نظریۂ نعت کو کامیابی سے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ گوہر ملسیانی ہمارے عہد کے نعتیہ منظرنامے پر ایک نعت گو کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکے ہیں مگر ان کی شناخت کا بڑا حوالہ ان کی تذکرہ نگاری ہے۔ ''عصرِ حاضر کے نعت گو'' ان کا ایسا کارنامہ ہے جو بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنا آج وہ ہمیں ضلع رحیم یار خان کے نعت نگاروں سے متعارف کروا رہے ہیں۔ خدا کرے وہ اسی تذکرہ نویسی کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ وسیع کینوس پر جاری رکھ کر نعتیہ ادب کو مزید پُرثروت کریں۔ پروفیسر فیروز شاہ ''نعت رنگ'' کے فعال خدمت گزاروں میں شاندار اضافہ ہیں۔ انھوں نے ''نعت رنگ'' ۱۶ میں شائع ہونے والے اداریے پر ہمدردانہ غور فرمایا اور ہمیں ایک مذاکرہ کروا کے اس کی تفصیلات بھیج دیں۔ اس تعاون پر ہم ان کے ممنون ہیں۔ خدا کرے یہ مذاکرہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو اور ہمارے دیگر ملکوں اور شہروں کے احباب ایسے مذاکرے ہمیں بھیج سکیں جو نعت کے عمومی مسائل کے ساتھ علاقائی رجحانات کو بھی سمیٹ لیں لیکن اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ مذاکرہ ہمیشہ کسی طے شدہ موضوع پر ہوتا کہ اس موضوع پر مختلف دوستوں کا نکتۂ نظر سامنے آسکے اور گفتگو کی کوئی سمت بھی متعیّن ہوسکے۔ پروفیسر جعفر بلوچ ہمارے دیرینہ رفیق ہیں مگر ''نعت رنگ'' میں کسی مضمون کے ساتھ پہلی بار حاضر ہوئے ہیں، اسد ملتانی کی حمدیہ و نعتیہ شاعری پر ان کا مضمون اس موضوع سے ان کی فکری مطابقت اور سنجیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ خدا کرے وہ اس موضوع پر جم کر کام کرسکیں۔

اُردو کے اہم رزم نگار شاعر ملک منظور حسین منظور کی فنی جہتوں کا تعارف ہمارے عہد کے ناموراور تازہ دم نقاد ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے کروایا ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ ہے۔ اردو نعتیہ شاعری کی ایک منفرد آواز رحمان کیانی کی ہے جسے ہمارے عہد کے ممتاز سیرت نگار شاہ مصباح الدین شکیل نے شاعرِ جہاد کہہ کر متعارف کروایا ہے۔ رحمان کیانی کے اسلوب میں ہمیں عربی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حنیف نازش قادری ہمارے عہد کے خوب صورت اور خوش گو شاعروں میں ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام پر پروفیسر غلام رسول عدیم نے خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ حفیظ تائب عصرِ حاضر کے معتبر نعت نگاروں میں تھے۔ ان کے فکر وفن بہت کچھ لکھا گیا اور مزید لکھا جائے گا۔ ان کی شخصیت اور کلام میں عشقِ نبی کریم ﷺ کے رنگ بہت گہرے تھے۔ ان کی وفات پہ ہم ایک مختصر تعزیتی گوشہ پیش کر رہے ہیں جو ان کے شایانِ شان نہیں مگر ''نعت رنگ'' کی کمپوزنگ مکمّل ہو جانے اور محدود ضخامت کے باوجود یہ گوشہ ضروری خیال کیا گیا۔ اس گوشہ میں ان کی زندگی کا آخری انٹرویو بھی شامل ہے جو ان کی حیات و خدمات کا اشاریہ ہے اور عمران نقوی کا مضمون بھی جو ہمیں حفیظ تائب؟؟؟؟؟ پروفیسر قیصر نجفی نقاد کے منصب بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے حاصلِ مطالعہ میں متوازن انداز میں نئی مطبوعات سے ہمیں متعارف کروایا ہے۔ گوشۂ سلیم کوثر میں آپ حرمِ کعبہ میں اذانوں کی گونج بھی سن سکیں گے اور طاہرانِ حرم کے والہانہ پن کا مشاہدہ بھی کر سکیں۔ یہ گوشہ حاضری اور حضوری کے بے شمار روشن لمحوں کی لفظی منظر کشی ہے۔

ہماری اس بزم میں کئی اہم نعت نگار اپنا ہدیۂ عقیدت لیے حاضر ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ نعتیں آپ کو احساسات و جذبات کے عقیدت کی ایک ایسی دنیا میں لے جائیں گی جہاں آپ مدینۃ الرسول کی خوش بو محسوس کر سکیں گے۔ خطوط اب ''نعت رنگ'' کا سب سے توانا حصہ بن گئے ہیں۔ محفل کے اس حصے میں آپ کو ہند و پاک کے متعدد اہم نام نظر آئیں گے۔ ان ناموں میں علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نہایت محنت سے ''نعت رنگ'' کے مشمولات کا جائزہ لے کر اپنے افکار و خیالات سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ کسی حد تک اختلافِ رائے کے باوجود مولانا کو تمام قلم کاروں اور قارئین کی خصوصی توجہ حاصل ہے۔ وہ ادق سے ادق مسائل و موضوعات کو اپنے رواں اسلوب کے باعث پڑھوانے میں کامیاب رہے ہیں۔

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۸

ابتدائیہ

میں ''نعت رنگ'' کا مولانا احمد رضا بریلویؒ نمبر مرتب کر رہا ہوں
اپنے قریبی دوستوں کے سامنے میں نے اچانک اپنی خواہش کا اظہار کیا
''کیوں؟''
ایک دوست کا مختصر سا یہ سوال ایک بہت بڑے استفسار کی صورت میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔
میں نے حیرت سے اس غیر متوقع ''کیوں'' پر اس دوست کی طرف دیکھا اور کہا،

''اعلیٰ حضرت شاہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ ہماری نعت گوئی کی ایک منفرد اور توانا آواز ہیں۔ ایک ایسی آواز جس نے نعت گوئی میں ایک نئے اور مستقل دبستان کی بنیاد رکھی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے قرآن وسنتِ نبویﷺ، آثارِ صحابہ واہلِ بیتِ اطہار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تاریخ و سیر کے موجود مواد سے اپنے شعری حسن کو ایک ایسا علمی نکھار عطا فرمایا ہے جس سے نہ صرف اردو زبان وادب کا نعتیہ سرمایہ باثروت ہو گیا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی اس موضوع اور اس کے علمی وفکری پہلوؤں کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی اور اہم خدمت سرانجام دینے والے نعت گو پر ایک خاص نمبر کی اشاعت کے حوالے سے یہ ''کیوں'' میری سمجھ سے بالا ہے۔''

''ہاں مگر ان کی نعت گوئی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مسلسل لکھا جا رہا ہے اس لیے کیا ضروری ہے کہ ہم ایسی ہی تحریروں کا ایک ڈھیر 'نعت رنگ' میں بھی لگا دیں جب کہ ابھی ہمارے کئی اکابر نعت گو شعرا کا تعارف بھی ہم پر قرض ہے۔'' ایک اور دوست نے بات آگے بڑھائی۔

اپنے دوستوں کے جواب میں شامل الفاظ ''ایسی ہی تحریروں'' نے بطورِ خاص مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور میں سوچنے لگا کہ آخر ''ایسی ہی تحریروں'' سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا کسی اہم اور عہد آفریں شاعر کے تخلیقی رویوں پر گفتگو کو کسی خاص مقام پر جا کر ختم ہوجانا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو ہم میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور اپنے دوسرے بڑے شعرا کی فکری اور شعری عمل کی تہ در تہ معنویت پر کس طرح مسلسل گفتگو کر رہے ہیں اور ہر بار تازہ امکانات کے ساتھ نئے نتائج کی بازیافت کس طرح جاری ہے؟

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعت گوئی جس نے اردو کی نعتیہ شاعری کو اس حد تک متاثر کیا کہ آج اردو کے بیش تر نعت نگاران کی اتباع کو اپنے لیے اعزاز تصور کرتے ہیں پھر ان پر مقالات کی اشاعت کے حوالے سے اُکتاہٹ کا یہ اظہار کیوں؟ اور وہ بھی اس طبقے کی طرف سے جو اعتقادی طور پر ان سے وابستہ بھی ہے۔

کیا واقعی اس صورتِ حال میں ''نعت رنگ'' کے مولانا احمد رضا بریلوی نمبر کا کوئی جواز ہے؟ میرا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔

کسی کام کے آغاز ہی میں اگر اس کام کی افادیت اور جواز پر سوالیہ نشان لگا دیا جائے تو کام کرنے والوں کا جذبۂ عمل سرد پڑ سکتا ہے لیکن میں اپنے ان دوستوں کا ممنون ہوں جن کی اس گفتگو نے مجھے یہ عزم عطا کیا کہ میں اس اُکتاہٹ کا سبب بھی تلاش کروں اور اسے دُور کرنے کی مقدور بھر کوشش بھی کروں۔ ''نعت رنگ'' کا یہ خاص نمبر اسی سلسلے کی ایک ادنیٰ اور ناتمام کاوش ہے جس کے پس منظر میں حتیٰ المقدور علمی خلوص اور ادبی متانت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں اردو کے وہ خوش نصیب اور مقبولِ خاص و عام نعت گو ہیں جن پر بہت لکھا گیا ہے۔ اردو کے کسی اور نعت گو پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا مطبوعہ مواد مولانا پر موجود ہے لیکن مقالات و مضامین کی یہ کثرت ہمارے لیے خوشی کا باعث تو ہوسکتی ہے، اطمینان کا نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ کسی نہ کسی بہانے ایک عظیم نعت گو کی یاد اور اس کے کام کی خوش بو پھیل رہی ہے اور عدم اطمینان اس بات پر کہ اس مطبوعہ سرمائے کی ایک بڑی تعداد سنجیدہ قارئین کو متاثر کرنے کے بجائے یکسانیت اور اُکتاہٹ کا احساس پیدا کر رہی ہے۔

ایسا صرف اس لیے ہے کہ یہ ساری تحریریں ایک دوسرے کی تفصیل و تلخیص معلوم ہوتی ہیں۔ اس ایوان میں فکرِ تازہ کے دریچے کم ہی کھلے ہیں وہی چند موضوعات اور وہی چند حوالے جن کی

بنیاد پر لاتعداد مضامین کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہے پھر ان مضامین کے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مولانا احمد رضا خاںؒ کے ایسے حلقۂ ارادت منداں سے تعلّق رکھتی ہے جو مولانا کی نعت گوئی پر صرف اور صرف مولانا سے عقیدت اور محبّت کے اظہار کی خاطر کچھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب زبان اور زبان سے جڑے مسائل ان کا مسئلہ اور موضوع نہیں۔

نتیجتاً ایسی تحریروں کی تعداد زیادہ ہے جو اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کی تحسین کے نام پر جمع کر دی گئی ہیں اس انبار میں مولانا کی نعتیہ شاعری پر لکھے گئے ایسے سنجیدہ، علمی اور تنقیدی مقالے بھی ہیں جو عصری ادبی میلانات کی روشنی میں لکھے گئے تھے اور جنھیں نمایاں کرنا ضروری تھا، مگر وہ کہیں دب کر رہ گئے۔ ان کی وہ توقیر نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم نے مولانا کی نعتیہ شاعری کو ادبی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور بحیثیتِ شاعر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ خود کی، نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ مولانا کی نعتیہ شاعری اور ان کا شعری عمل خالص ادبی نقطۂ نظر سے ہونے والی گفتگو کا وسیع خیال افزا اور خیال افروز ماحول چاہتے ہیں۔ مگر ہم مولانا کی نعتیہ شاعری کو ان کے دیگر اہم اور وقیع کاموں کے ساتھ ملا کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں وہ بحیثیتِ شاعر محدود تر حوالے سے موضوعِ گفتگو بنتے ہیں اور بحیثیت ایک معروف عالمِ دین اور مذہبی و مسلکی رہنما کی حیثیت سے زیادہ توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ادب کے نقاد یا قاری ان کے کلام پر رائے دینے میں محتاط رویوں کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا پر لکھے گئے بیش تر اہلِ علم کے مضامین پر ایک نظر ڈالیے آپ کو مولانا کی مذہبی خدمات، علمی حیثیت اور عشقِ رسول ﷺ کے تذکرے تو خوب ملیں گے مگر شعری محاسن پر چند جملوں اور چند سطروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ ایسا صرف اور صرف اس لیے ہے کہ ہم اب تک مولانا کو خود بحیثیتِ شاعر موضوعِ گفتگو نہیں بننے دے رہے کہ کوئی لسانی یا ادبی اختلاف سامنے نہ آجائے اور اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو ہم نے اسے مولانا کی شخصیت یا علمی مرتبہ پر حملہ تصور کرتے ہوئے اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارا یہی رویہ مولانا کی شعری عظمت کے وسیع تر اعتراف میں حائل رہا ہے، مولانا کی زندگی میں بھی اور آج بھی اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ ایک عظیم نعت گو شاعر ہماری سنجیدہ اور مرکزی ادبی تاریخ کا حصہ نہ بن سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان کا یوں تذکرہ ہی نہیں چاہتے؟ اس طرح تو ہم خود

اردو کے نعتیہ اور اسلامی ادب میں مولانا کے مقام اور کام کا شمار نہ ہونے کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔ کیا سعدیؒ، رومیؒ اور جامیؒ کی منظومات پر کسی ادبی ولسانی تنقید نے ان کی شخصی عظمت اور علمی مرتبت کی ضیا کم کی ہے؟ ہمیں اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی، اس فضا کو بدلنا ہوگا۔ ہماری یہ جذباتیت کلامِ رضا کی تفہیم کے راستے بند کر رہی ہے۔

عربی، فارسی اور اردو کے حوالے سے تمام بڑے اور محترم نام جو علم و فضل میں درجۂ استناد رکھتے ہیں اور شاعر بھی ہوئے ان پر ہونے والے کاموں پر ایک نظر ڈالیے، کیا ان پر لکھنے والوں کو اظہارِ رائے کی آزادی نہیں دی گئی اور کیا اس کے نتیجے میں ان پر ہونے والے کاموں کی رفتار اور اس کی قبولیت و پزیرائی کے آثار نمایاں نہیں ہیں۔

اگر ہم اپنی سوچ کو کشادہ کر کے اس فضا کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ہم نے اہلِ علم کو سنجیدگی سے کلامِ رضا پر لکھنے کا موقع فراہم کیا تو مجھے یقین ہے کہ کلامِ رضا کی تابندگی اور اس کی عظمت سے نہ صرف ہماری ادبی تاریخ منور ہوگی بلکہ ہمارا وہ قاری جو اس موضوع پر موجود مواد کی یکسانیت کی وجہ سے اُکتاہٹ کا اظہار کر رہا ہے وہ بھی اپنی پوری دلچسپی سے اس طرف متوجہ ہوگا۔ ان شاءاللہ

''نعت رنگ'' کے اس خاص شمارے کو مرتب کرتے ہوئے میرے دل میں بہت سی خواہشات تھیں۔ میں مولانا کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے ان تمام پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ پیش کرنا چاہتا تھا جو ابھی تک موضوعِ گفتگو نہ بن سکے مگر کچھ اپنوں کی بے گانگی اور کچھ مولانا کے نام پر قائم معروف اداروں کی اپنی مخصوص ترجیحات کے سبب عدم تعاون اور ادب سے عدم توجہی کی وجہ سے میری وہ خواہشات پوری نہ ہوسکیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے ہی قائم کردہ معیار کے مطابق اس نمبر کی ترتیب و تدوین و تہذیب نہ کر سکا لیکن کم مائیگی کے اس احساس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے خوشی ہے کہ اس نمبر کی وساطت سے میں کم از کم یہ احساس آپ تک منتقل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا کہ مولانا جتنے اہم اور مقبول شاعر ہیں ان پر اب تک ویسا کام نہیں ہوسکا۔ ممکن ہے اس احساس کی بدولت آئندہ کوئی اعلیٰ کام سامنے آسکے جو ادبِ نبوی کے نئے اور معنی آفریں دریچے وا کر سکے۔

سیّد صبیح رحمانی

نعت رنگ ۱۹

ابتدائیہ

تہذیب کے ابتدائی ادوار میں شاعرانہ اور لغوی صداقت کے درمیان فرق پوری طرح واضح نہ تھا کیوں کہ گفتگو اضطراری علامتوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ ہر بیان استعاروں کی وساطت سے ہوتا تھا اور جب خارجی اشیا اور واقعات یا کسی عظیم شخصیت کے خصائص کے بیان یا ان کی ترجمانی کی ضرورت پڑتی تو تخیّل سے مدد لی جاتی تھی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اخلاقی افکار منضبط اور فلسفیانہ نظام وضع ہو گئے تو قدرتی امر تھا کہ لغوی صداقت کے ابلاغ کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے زبان کا استعمال شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگے۔

سوال کیا جانے لگا کہ اگر شاعری سچ نہ بولے تو کیا وہ اخلاق کے لیے مضر یا کم از کم ناکارہ نہیں؟... تعجّب ہے کہ یہ بات کہ شاعرانہ تخیّل ایک اپنا ہی گنجینۂ حقایق رکھتا ہے۔ تہذیب کے ابتدائی ادوار کے لوگوں کے لیے کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی لیکن تہذیب کی نشو و نما کے بعد ایک معما بن گئی جس کے حل کے لیے ادبی تنقید کی ضرورت پڑی۔ تنقید شاعری کی پوری تاریخ تہذیب کی عدالت میں شاعرانہ تخیّل کی اس الزام سے صفائی کی روداد ہے کہ وہ انسان کے لیے مضر ہے یا کم از کم بالکل بے کار ہے۔

شاعر کی اصل حیثیت ایک بلند نگاہ، معاملہ فہم، لطیف الاحساس اور صاحبِ تخیّل تماشائی کی ہے جو ہر چیز کو حقیقت کے اس رشتے سے منسلک کرتا ہے جس کو دیکھنے اور دکھانے کی صرف وہ استعداد رکھتا ہے اس کا وظیفہ منصبی یہ ہے کہ طبعی و اخلاقی دنیاؤں کی تمام چیزوں، تمام مظاہر، تمام حوادث میں سے ان کا جوہر کشید کرے اور اسے فن کی دنیا میں لے جائے جہاں اس کی تخلیقی قوت اس میں ایک تغیّرِ کلی پیدا کر کے اسے نئی شکلوں میں جلوہ گر کرے گی۔ شاعر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شاعری کو

کسی اجتماعی موضوع یا مفاد کا مطیع ومنقاد بنائے بلکہ اسے شاعری کو ہمیشہ مقدم سمجھنا چاہیے۔شاعر کو جو بات تخلیق پر مجبور کرتی ہے وہ اس امر کی پیہم ضرورت ہے کہ وہ اپنے تمام وجودِ باطنی کے راز کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہے اوراس ضمن میں اپنی طاقت وقدرت کا امتحان لیتا رہے۔

لیکن کیا یہ بات ایک نعت گو شاعر کے لیے بھی معیارِ تخلیق قرار دی جاسکتی ہے؟ دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں تخلیق کیے جانے والے شاعری کے شہ پاروں اوران پر تنقید کا تقابلی مطالعہ ہی اس بات کے جواب کا تعین کرسکتا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب ہم نعتیہ شاعری اوراس سے متعلّق تنقیدی مواد کو بین الاقوامی سطح پر رائج تخلیقی اقدار اور معیاروں کے تناظر میں متعارف کروائیں۔

عالم گیریت (Globalization) کے موجود رجحان اور پھیلاؤ کے پیشِ نظر یہ بات بھی قابلِ توجہ اورضروری محسوس ہوتی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس اورآپ کی نبوت ورسالت کی ہمہ گیریت، جامعیت اور عالم گیریت کو عالمی سطح پر ان کی حقیقی جہتوں کے عین مطابق متعارف کرواتے ہوئے فروغ دیا جائے یہ ہمارا دینی فریضہ بھی اورادبی منصب بھی۔

وماارسلنک الاکافۃ للناس بشیرا ونذیرا ولکن اکثرالناس لایعلمون o

اوراے نبی! ہم نے آپ کوتمام ہی انسانوں کے لیے بشیراور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

مگراکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔(سورۃ السبا۔۲۸)

اس آیتِ مبارکہ کے الفاظ...مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ہمارے اس فرض کواور بھی زیادہ اہم اورضروری بناتے ہیں۔

''نعت رنگ'' کے انیسویں شمارے کی اشاعت پرمیں یہ احساسِ ذمہ داری آپ تک منتقل کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے نعت کے ادبی فروغ کا جوسفر شروع کیا ہے وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ابھی ہمیں نعتیہ ادب کواس کی تمام تر جہتوں کے تناظر میں تنقید کے اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق متعارف کروانا ہے اورصرف یہی نہیں بلکہ دورِ حاضر میں مذہبی انتہا پسندی کے رجحان کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو حقیقی تنوع کے ساتھ...مسلمانوں کی عقیدت، محبّت اور وابستگی کے حوالے سے عالمی ادب کی شعری اصناف مثلاً Epic اور Ode وغیرہ کی وساطت سے روشناس کروانے کی منزل بھی سر کرنی ہے اوراس منزل کوسر کرنے کے لیے ہمیں ضرورت ہے ایک ایسے

ادارے اور پلیٹ فارم کی جو عالمی سطح پر اپنی شناخت اور دائرۂ عمل رکھتا ہو۔
کسی نے کیا خوب کہا ہے:

زمیں تو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
چلو گے تو کوئی رستہ بنے گا...

سو فروغِ نعت کو مزید وسعت دینے کے لیے ہم پہلا قدم اُٹھاتے ہوئے آپ کے سامنے ''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' کے قیام کی تجویز رکھ رہے ہیں اور ''نعت رنگ'' کی وساطت سے دنیا کے تمام براعظموں میں بسنے والے مسلمانوں اور بالخصوص ادیب اور شاعروں سے ملتمس ہیں کہ وہ ''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' کے قیام کے سلسلے میں اپنی تجاویز اور آرا سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔ ''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' فروغِ نعت کے سلسلے میں ان تمام اقدامات کو ممکن بنانے کی کوشش کرے گی جن کا ذکر ہم نے آپ کے سامنے کیا ہے۔ ہم اپنے طور پر فاؤنڈیشن کا ایک خاکہ تیار کر چکے ہیں، تاہم ہماری خواہش ہے کہ مجوزہ ادارے کی ساخت، طریقۂ کار، وظائف اور مالی و انسانی وسائل کی فراہمی کو حتمی شکل دیتے ہوئے آپ کی آرا اور تجاویز بھی ہمارے پیشِ نظر ہوں۔

''گلوبل نعت فاؤنڈیشن'' ہمارا خواب ہے اس خواب کو تعبیر سے ہم کنار کرنا دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فرمانِ خداوندی ورفعنالك ذكرك کے سائے میں ہمارا کارواں منزل تک ضرور پہنچے گا۔ ان شاءاللہ

آپ کا ذکر کبھی کم نہیں ہوگا آقا
آپ کے ذکر کو اللہ نے رفعت دی ہے

نئے دُکھ

''نعت رنگ'' کے شماروں کی اشاعت کا درمیانی وقفہ باوجود کوشش و خواہش کے کم ہونے میں نہیں آ رہا، علاوہ ازیں نعت خوانی کی بڑھتی ہوئی مصروفیات و مسلسل اسفار بھی توجہ کے انتشار کا باعث بنتے ہیں اسی لیے اس اشاعتی وقفے میں جو قابلِ ذکر ستارے آسمانِ نعت سے اوجھل ہو کر موت کی تاریکی میں گم ہو گئے، ان سب کے ناموں کا دمِ تحریر حافظے میں موجود ہونا بھی مشکوک ہے۔ تاہم چند ستارے اوجھل ہو کر بھی اپنے نام اور کلام کی اتنی روشنی چھوڑ گئے ہیں کہ وقت کی گردان کے کارناموں کو دھندلانے میں ناکام رہے گی، ان شاءاللہ

احمد ندیم قاسمی ادب کے تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔نعت گوئی کے حوالے سے ان کا مجموعہ ''جمال'' جدید نعت گوئی کا اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ان کے ہاں نعت ایک ایسی تخلیقی جہت پیدا کرتی ہوئی نظر آتی جہاں حسن،موضوع،جذبے کی صداقت اور تاثیر ایسی اکائی میں ڈھل جاتے ہیں جس سے زندہ رہنے والی نعت وجود میں آتی ہے۔

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے، وہ تنہا تیرا

حنیف اسعدی پاکستان کے ان قادرالکلام اور معتبر نعت نگاروں میں شامل تھے جن کی وجۂ شہرت ہی نعت گوئی ٹھہری۔وہ جدید نعت گوئی کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ان کے دو نعتیہ مجموعے ''ذکرِ خیرالانام'' اور ''آپ'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے اور پسند کیے گئے:

گماں تھے ایسے کہ آثار تک یقیں کے نہ تھے
حضور آپ نہ ہوتے تو ہم کہیں کے نہ تھے

صابر براری کی وجۂ شہرت نعت گوئی اور تاریخ گوئی دونوں حوالوں سے معتبر تھی۔قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جن شعرا کا ذکر بطورِ نعت نگار ہوا،ان میں صابر براری نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے،ذاتِ نبی کریم ﷺ سے اپنے قوی تعلّق کو وہ اپنی شاعری میں منتقل کرنے میں خاصے کامیاب رہے۔

میرے لب پر میرے دل میں میرے تصور میں اے صابؔر
رہتا ہے ہر دم کون محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نعت خوانی کے حوالے سے شہرت کے بامِ عروج کو چھونے والے دو بزرگ ثنا خواں نذیر حسین نظامی اور ثناء اللہ بٹ بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔مجھے دونوں ثنا خوانوں کو سننے کا شرف حاصل رہا۔دونوں نے نعت خوانی کی روایات کو پورے ادب و احترام اور علمی مزاج کے ساتھ قائم رکھا۔عربی،فارسی اور اردو کی نعت کا ایک بڑا ذخیرہ ان بزرگوں کے حافظے میں محفوظ تھا۔

میں ان تمام وابستگانِ نعت کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں اور قارئینِ ''نعت رنگ'' سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

سیّد صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۰

ابتدائیہ

'نعت رنگ' کی ایک طویل غیر حاضری پر معذرت کے ساتھ شمارہ بیس پیشِ خدمت ہے۔

زندگی دن بہ دن دشوار ہوتی جا رہی ہے۔ آدمی اسباب و وسائل کی تگ و دو میں غرق ہو گیا ہے اور ستم یہ کہ یہ اس کا انتخاب بھی نہیں، دو وقت کی روٹی ایک بڑا مسئلہ بن گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مدتوں پہلے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ''جب میں روحانی مسائل کرنا چاہتا ہوں تو زمین میرے قدم پکڑ لیتی ہے۔'' ہمارے دین میں بھی فرائض کے بعد کسبِ رزق حلال کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، سو مجھے بھی اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ دیوارِ رزق کو چاٹنے میں گزارنا پڑتا ہے اور اسی وجہ سے 'نعت رنگ' تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ہم سب کے لیے اس مرحلے کو آسان فرمائے۔ آمین۔

الحمدللہ اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے یہ بات روشن ہو گئی ہے کہ ادبی طور پر یہ صدی نعت کی صدی ہوگی۔ بہت دنوں کی بات نہیں جب سوالیہ انداز میں کہا جاتا تھا کہ کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے؟ اور آج یہ بات پورے یقین سے کہی جاتی ہے کہ نعت ہر صنفِ سخن میں موجود ہے اور خود ایک مستقل صنف ہے۔

اللہ کریم کا فضل و احسان ہے کہ فضا کی اس تبدیلی میں 'نعت رنگ' کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے لیکن اس مرحلے پر اب نعت کے ناقدوں کو بھی اپنے وژن اور فکر میں توسیع کرنی ہوگی۔ کل یہ تنقید کا مسئلہ تھا کہ نعت کو صنفِ سخن کہا جائے یا نہیں۔ آج وہ منزل آ گئی ہے جب ہمیں اپنے اجتماعی لاشعور میں نعت کی جڑوں کو تلاش کرنا ہوگا اور عمرانیات اور سماجیات کے پس منظر میں نعت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس

سلسلے میں 'نعت رنگ' میں کئی وقیع تحریریں شائع ہوچکی ہیں جن میں اس بات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ اردو کے اعلیٰ تدریسی مراحل میں نعت کو ایک موضوع کے طور پر شامل کیا جانا کیوں ضروری ہے اور یہ کہ اس کے بغیر بعض اصناف ادب کا مطالعہ کیا ہی نہیں جاسکتا مثلاً اردو مثنوی کا اسی طرح غزل کے مطالعے کے کئی پہلو نعت کو پیش نظر رکھ کر ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی ایک نیا مطالعہ ہوسکتا ہے کہ نعت کی تفہیم کے لیے کون سا دبستانِ تنقید موزوں رہے گا۔ 'نعت رنگ' کے گزشتہ شماروں میں رشید وارثی نے یہ سوال اٹھایا تھا مگر اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس سلسلے میں میرا موٴقف یہ ہے کہ نعت کا مطالعہ انتخابی تنقید کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ انتکابی تنقید سے میری مراد یہ ہے کہ تنقید کے تمام دبستانوں کے اصولوں کی روشنی میں نعت کا مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی دبستانِ تنقید سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کن حالات اور کن ادوار میں لوگ نعت کی طرف متوجہ ہوئے یا ہوتے ہیں۔ نفسیاتی دبستانِ تنقید کے ذریعے ان رموز کی عقدہ کشائی ہوسکتی ہے کہ شاعروں کی روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کشاد میں نعت نے کتنا اور کس طرح حصہ لیا۔ نعت سے کس طرح شاعروں کا کیتھارسس ہوا ہے اور کس طرح نعت نے معاشرے کو پاکیزہ بنانے میں اپنا کردار ادا کیا، کیوں کہ اعلیٰ درجے کی نعت بلند تر اقدارِ حیات کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی اور اقدار ہی کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی سمت نمائی ہوتی ہے۔ نعت کے مطالعے کے لیے اسلام کا مطالعہ بھی لازمی ہے تاکہ منصب رسالت سے آگاہی ہو سکے اور نعت محض چند رسمی عقائد تک محدود نہ رہے کیوں کہ سرکار کی سیرت کا ذکر نظم میں ہو یا نثر میں انسان کی تعمیر کرتا ہے۔

امید ہے یہ چند معروضات انتخابی تنقید کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گی اور آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ انتخابی تنقید سے میری مراد کیا ہے، علاوہ ازیں ہمیں فن شاعری اور صنائع بدائع کے بارے میں مشرقی علوم اور مغربی زاویہء نگاہ کو بھی برتنے کی ضرورت ہے۔ صنائع بدائع کا خلاقانہ استعمال نعت میں کہاں کہاں کیا گیا ہے اس کی نشان دہی کا فرض ابھی ہمارے ناقدین پر قرض ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ کیا خوب تشبیہ ہے بات نہیں بنتی۔

میں نے چند اشارے کیے ہیں ان کو بڑھانا، ان کو نقد نعت میں ڈھالنا، نعت کے ناقدین کا کام ہے۔ آج جو لوگ نعت پر اپنے نقد و نظر کا مزاج پیش کر رہے ہیں اب ان کو اس منزل سے آگے بڑھنا چاہیے کہ نعت کی صنفی حیثیت کیا ہے۔ نعت ہر صنفِ سخن ہی پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ نعت نے عربی و فارسی کی اصناف کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کی اصناف کے

ذریعے بھی اپنا اظہار کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کی زبانوں کے اصنافِ سخن کو نعتوں سے ایک نیا رنگ روپ ملا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے مختلف اصناف کی فہرست سازی کے بجائے یہ تلاش کرنا ہوگا کہ ان اصناف کی نعت میں کون سے نئے عوامل، موضوعات اور مسائل شامل ہوئے ہیں کیوں کہ اکابرین ادب کے خیال میں ہیئت اور خیال ایک دوسرے سے وابستہ ہیں جس طرح ہر انسانی روح اپنا جسم لے کر آتی ہے۔ اسی طرح ہر خیال اپنا پیکر خود تراشتا ہے۔ یوں ہمارے نعت گو شعرا کو بھی اوّلیت کے چکر میں پڑنے کے بجائے مختلف اصناف کے معنوی پہلوؤں پر نظر رکھنا چاہیے۔ ادبی تنقید میں شماریات سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن کسی شاعر کی نعتوں کی تعداد سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی نعتیں کس سطح کی ہیں۔

نئے دکھ

'نعت رنگ' کی ہر اشاعتی منزل پر 'نعت رنگ' کی محفل سے کچھ لوگ اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں جہاں سے پھر کوئی خبر نہیں آتی، رہ جاتی ہے تو صرف یہ حیرت:

موت نے چپکے سے جانے کیا کہا
زندگی خاموش ہو کر رہ گئی

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفیؒ

کسے خبر تھی کہ 'نعت رنگ' بیس کا اداریہ لکھتے ہوئے میرے ہاتھ اس گرد سے اٹے ہوں گے جو حضرت (ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفیؒ) کی تربت پر ڈالی جانے والی مٹی کا حصہ ہوگی۔ حضرت کو ان کے آخری سفر پر روانہ کر کے اشکبار آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹا تو یہ گرد میرے ہاتھوں سے لپٹ کر میرے ہمراہ چلی آئی، گھر آ کے میں گھنٹوں اپنے ہاتھوں پر موجود اس گرد کو دیکھتا رہا، مجھے اس گرد سے حضرت کی خوش بو محسوس ہوئی۔ لمس کی حرارت محسوس ہوئی بالکل ایسا لگا کہ جیسے میرے ہاتھ پر گرد نہ ہو حضرت کے ہاتھ ہوں اور وہ اپنی روایتی گرم جوشی سے 'نعت رنگ' کی تازہ اشاعت پر خوشی کا اظہار کر رہے ہوں۔ بعینہٖ ویسے ہی جیسے وہ 'نعت رنگ' کے ہر شمارے کی تکمیل او اشاعت پر کرتے تھے۔ خدا میرے ماں باپ کا سایہ تادیر میرے سر پر سلامت رکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے چلے جانے سے مجھ پر کھلا کہ یتیمی کس احساس کا نام ہے۔ دل کا کٹنا صرف محاورہ نہیں ہے۔ بے سائباں ہونا صرف لفظ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے احساس کا ایک جہاں آباد ہے۔ حضرت کی شخصیت مجموعۂ کمالات تھی۔ ادب،

لسانیات، خاکہ نگاری، شاعری، نعت گوئی، تنقید، سیرت نگاری، وہ کون سا شعبہ تھا جہاں آپ نے اپنے کام سے اَن مٹ نقوش نہ چھوڑے ہوں لیکن میری نظر میں عشقِ رسول ﷺ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا حوالہ تھا۔ لوگ ان کی سیرت نگاری، نعت نگاری، نعت شناسی کے ساتھ ساتھ دیگر مذہبی تحریری سرمائے میں ان کا عشق رسول ﷺ تلاش کرنے میں مصروف رہیں گے مگر میرے سامنے ان کی زندگی کے تمام پہلو ہیں جو ان کے عشق کی زندہ گواہی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی اس حسرت کو حقیقت بنادے اور انھیں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی شفاعت سے نوازے۔ آمین۔

اس نام سے وابستہ ہوں، نسبت پہ نظر ہے
عاصی ہوں مگر ان کی شفاعت پہ نظر ہے

آفتاب کریمیؒ

آفتاب احمد خان کریمی غزل کی وادیِ پُر خار سے گزر کر نعت کے چمن زار میں وارد ہوئے تھے اور وہ بھی عمر کے آخری حصے میں، مگر انھوں نے چند ہی برسوں میں اپنی محنت، محبّت اور سچی لگن سے نعت گویانِ عصر میں ایک نمایاں پہچان بنانے میں خاصی کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کے تین نعتیہ مجموعے ''آنکھ بنی کشکول''، ''قوسین'' اور ''ممدوحِ خلائق'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اہلِ علم سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی کتاب ''منہاج العقائد'' (تصوف عقائد کی روشنی میں) منظرِ عام پر آئی تو عصر حاضر کے صاحبانِ تصوف میں خاصی بے چینی پھیل گئی۔ ان پر زبانی کلامی حملوں کی یورش بھی دیکھنے میں آئی مگر کریمی صاحب پوری شرافت اور استقامت کے ساتھ یہ سب برداشت کرتے رہے اور بزبانِ خموشی اعلان کرتے رہے:

توحید تو یہ کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

انھوں نے میری درکواست پر نعتیہ ادب کے ایک سنجیدہ کتابی سلسلے ''سفیرِ نعت'' کا بھی اجرا کیا جس کے پانچ وقیع شمارے شائع ہوئے۔ ان پانچ میں سے ایک شمارہ بطورِ خاص نعتیہ ادب میں ان کی خدمات کی نشانی کے طور پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور وہ ہے ''محسن کاکوروی نمبر'' کریمی صاحب اپنا لکھا ہوا ہر شعر مجھے ضرور سناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بیشتر کلام میرے حافظے کا حصہ بن گیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب ان کے انتقال پر میں ان کے گھر گیا اور ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ان

کے سفرِ آخرت کی آسانی کے لیے دعا کرنے لگا تو میرے ذہن میں ان کا یہ شعر تازہ ہو گیا:

میرے سرکارؐ کریمی کی تمنا ہے یہی
موت جب آئے تو میں آپؐ کا چہرہ دیکھوں

کریمی صاحب کے چہرے پر موجود تبسّم اور اطمینان دیکھ کر میری پلکیں بھیگ گئیں۔ کیا عجب ہے کہ کریم آقاؐ نے اپنے غلام کی یہ التجا قبول کر لی ہو۔

علامہ عبدالحکیم شرف قادریؒ

علامہ عبدالحکیم شرف قادری مرحوم علمائے اہل سنت کی صف میں اپنی علمی خدمات کی وجہ سے نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے احترام کا یہ دائرہ صرف ان کے ہم مسلکوں ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ دیگر مسالک کے علما بھی ان کی علمی خدمات کو سراہتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ علما کے طبقے میں 'نعت رنگ' کی سرپرستی کرنے والوں میں علامہ کوکب نورانی کے علاوہ علامہ عبدالحکیم شرف قادری ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ خطوط کے ذریعے 'نعت رنگ' کے مشمولات پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا، کہیں سراہا، کہیں حوصلہ افزائی کی تو کہیں خبردار کیا۔ جب میں اعلیٰ حضرت نمبر مرتب کر رہا تھا تو حضرت نے بڑی محبّت سے مشوروں سے نوازا اور اپنا ایک مضمون بھی مرحمت فرمایا۔ مجھے حضرت کی شعر فہمی اور ادبی ذوق دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی تھی۔ کیوں کہ فی زمانہ ہمارے علما اس ذوق سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔

الحاج خورشید احمدؒ

صدارتی ایوارڈ یافتہ نعت خواں الحاج خورشید احمد نعت خوانی کے حوالے سے عالمی شہرت کے حامل نعت خواں تھے۔ انھوں نے ایک ایسے وقت میں نعت خوانی کے افق پر نمایاں مقام حاصل کیا جب سیّد منظور الکونین، الحاج سعید ہاشمی، وحید ظفر قاسمی، الحاج صدیق اسماعیل، الحاج یوسف میمن اور مرغوب احمد ہمدانی اپنی پوری آب و تاب سے اپنی کرنیں بکھیر رہے تھے۔ خورشید احمد نے صرف ملک ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ممالک بھی اپنی شہرت اور ثنا خوانی کے دائرے کو وسعت دی اور پھر یہ دائرہ دن بہ دن وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہ پہلے نعت خواں تھے جو ملک سے باہر نعت خوانی کے لیے نکلے اور پھر انھوں نے ایک ایسی فضا قائم کی کہ آج الحمداللہ وطن عزیز کا ہر قابل ذکر ثنا خواں ملک ملک

حضورﷺ کے ذکر کا پرچم اٹھائے پہنچ رہا ہے۔ مجھے بھی خورشید احمد کے ساتھ سفر کا موقع ملا جب میں قاری وحید ظفر قاسمی اور خورشید احمد جامعہ اسلامیہ کینیڈا کی دعوت پہ ڈیڑھ ماہ کے لیے کناڈا گئے تھے۔ اس سفر میں مجھے ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے پیار، ہم سفروں سے شوخی لیکن ادب کے دائرے میں، اکثر کبھی کسی بات پر ناراض ہوئے تو جلد ہی اپنی بے وجہ ناراضگی پر پشیمان ہوئے اور معافی بھی مانگی۔ بعد ازاں بھی ہم کئی جگہ اور کئی محافل میں ایک ساتھ رہے وہ اکثر اپنی خودنوشت (جسے وہ تحریر کرنا چاہتے تھے) کے حوالے سے مجھ سے مشورتے کرتے جس سے مجھے ان کے اندر اپنے تجربات کو دوسروں تک منتقل کرنے کی ایک ایسی خواہش نظر آتی جس کے ذریعے وہ نئے آنے والوں کی دنیاوی مسائل سے روحانی تجربات تک رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ یہ شعور مجھے معاصر نعت خوانوں میں اور کہیں نظر نہیں آیا۔ انھوں نے اپنی پڑھی ہوئی نعتوں کا ایک خوبصورت مجموعہ بھی مرتب کیا جو ان کی یادگار ہے۔ ان کے انتقال پر ان کے گھر والوں کے علاوہ اوّل اوّل پہنچنے والوں میں ڈاکٹر عامر لیاقت حسین اور میں شامل تھے۔ ہم دونوں جب آئی سی یو میں خورشید احمد کو دیکھنے گئے تو ان کے چہرے پر خط بنا ہوا تھا۔ سنتِ رسول سے سجا ہوا اور کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کی پڑھی ہوئی یہ نعت ذہن میں تازہ ہوگئی:

میں سو جاؤں یا مصطفیٰؐ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلی علیٰ کہتے کہتے

دل مانتا ہی نہیں تھا کہ یہ عندلیب گلشنِ نعتِ مصطفیٰﷺ بھی موت کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شاہ انصار الٰہ آبادی

حضرت شاہ انصار الٰہ آبادی درگاہ شیخ العالم حضرت شاہ میر سکندر علی رحمانی رزاقی المعروف سیّد صاحب الٰہ آبادی کے سجادہ نشین تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ آپ کے والد شاہ میر مشرف حسین الحسینی سکندری رحمانی قطب وقت اور سرچشمہ رُشد و ہدایت تھے۔ خانقاہ کا ماحول اور پھر الٰہ آباد کی علمی و ادبی فضا نے شاہ انصار الٰہ آبادی کو شاعرانہ ذوق بھی عطا کیا اور ادبی تربیت بھی کی۔ شاہ صاحب کے اپنے نعتیہ مجموعوں کی تعداد بھی کم نہیں مگر اس سے کہیں زیادہ نعتیہ شعری مجموعے آپ کے تلامذہ کے ہیں جو آپ کی نوجوان نسل کی تربیت کے جذبے اور فروغ نعت میں دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ کراچی کے ابتدائی نامساعد حالات میں آپ نے مولانا ضیاء القادری بدایونی، مولانا عمر

اچھروی، عبدالحامد بدایونی، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا شفیع اوکاڑوی، بابا ذہین شاہ تاجی، جیسے بزرگوں کے ساتھ مل کر کم زور بے سہارا، ناتوں اور لٹے پٹے لوگوں کے دلوں میں عشقِ رسول ﷺ کی شمع روشن کر کے نئی اسلامی ریاست کی تعمیر کا جذبہ پیدا کیا۔ جگہ جگہ میلاد اور نعت گئی کی مجالس منعقد کر کے اس ریاست کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ عقائد کی فصیل کو مضبوط بنانے کی ذمہ داری پوری کی۔

الحمدللہ مجھے شاہ صاحب سے طالبِ علم ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ اپنے در سے وابستہ ہونے والے ہر فرد کو عشق نبی کریم ﷺ کے راستے جنت کی راہ پر ڈالتے تھے سو مجھے بھی اس جادۂ نور پر شاہ صاحب ہی نے گامزن کیا۔ شاعری میں، میں نے کچھ عرصہ شاہ صاحب سے اصلاح لی۔ آپ بزرگوں کی روایتوں کے امین تھے اور آپ کی ساری زندگی ان اعلیٰ اقدار کی حفاظت اور انھیں بہ حفاظت اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کی سعی میں گزری۔ عشقِ رسول ﷺ اور عشقِ اہلِ بیتؓ میں سرشار اس ہستی نے بھی اپنی تمام عمر، اپنا تمام فن، اپنی تمام توانائیاں درِ حضور ﷺ پر نچھاور کر کے اس یقین کے ساتھ رختِ سفر باندھا:

شعر شاعر نہیں فرمانِ کلا م اللہ ہے
ان پہ مرتے ہیں تو مرتے نہیں مرنے والے

سیّد نفیس الحسینیؒ

سید انور حسین خطاطی کی دنیا میں نفیس رقم اور ادبی و روحانی دنیا میں سیّد نفیس الحسینی کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ پاکستان کے بہترین خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دینی و روحانی شخصیت بھی تھے۔ حفیظ تائب صاحب اکثر شاہ صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے تھے اور شاہ صاحب کی شخصیت، شاعری اور رکھ رکھاؤ کا ذکر بڑی محبّت سے کرتے تھے۔ مجھے نام یاد نہیں لیکن غالباً ان کے کسی مرید نے مجھے ان کا مجموعۂ نعت ''نفائس النبیؐ'' ڈاک سے بھیجا تھا۔ یہ ایک مختصر مگر خوب صورت نعتیہ مجموعہ تھا۔ 'نعت رنگ' شمارہ۔۱۹ میں اس پر تبصرہ بھی شائع کیا گیا۔ شاہصاحب کی ایک نعت مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہے۔

اے رسولِ امین خاتم المرسلینؐ، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے تمھیں یہ اپنا بصدق و یقیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

اس نعت کو صاحب زادہ منظور الکونین نے جس خوب صورتی سے پڑھا ہے، وہ بھی قابلِ داد

ہے۔اس نعت میں عشقِ نبی کریمﷺ کا وفور حضور نبی کریمﷺ کی عظمت وشان اس طور رقم ہوئی ہے کہ کوئی بھی گداز قلب اس کی روحانی سرشاری سے محفوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔سفرِ آخرت پر جانے والی اس ہستی کا زادِ سفر دیکھ کر رشک آتا ہے۔

ایک امید شفاعت ہے فقط زادِ سفر
جس سے ہمت سی ہے کچھ گام بہ گام اے ساقی

عابد بریلویؒ

عابد بریلوی،خالد محمود نقشبندی اور میں ایک ہی محکمے یعنی ٹیلی فون سے وابستہ رہے۔اس لیے ہماری محافل نعت کے علاوہ دفتر میں بھی اکثر ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔عابد بریلوی،نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ان کے تین نعتیہ مجموعے''گلشنِ عقیدت''،''جشن آمدِ رسولﷺ'' اور ''کھلتا ہے دل کا گلشنِ سرکارﷺ کی گلی میں''ان کے عشقِ نبی کریمﷺ کی یادگار ہیں۔الحاج خورشید احمد کی آواز میں ان کی ایک نعت:

جشنِ آمدِ رسولؐ اللہ ہی اللہ
بی بی آمنہؓ کے پھول اللہ ہی اللہ

کو میلاد کی محفل میں خاصی شہرت اور عوامی پذیرائی حاصل ہوئی اور یہی نعت دنیائے نعت میں ان کے وسیع تر تعارف کا حوالہ قرار پائی۔

صاحبزادہ شہریار قدوسیؒ

محافلِ نعت میں کمپیئر کی حیثیت عالمی شہرت پانے والے شہریار قدوسی بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔علمی ذوق،مطالعے کا شوق،حافظے کی قوت،آواز کی خوب صورتی،جملوں کا برمحل استعمال اور تلفّظ کی درستگی،ان کے ایسے خصائص تھے جو انھیں اپنے شعبے کے معاصرین میں ایک نہایت ہی ممتاز ومنفرد مقام پر فائض کرتے تھے۔اپنے شعبے میں ان کے کام کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ بعد میں آنے والے کمپیئرز کے انداز میں آپ کہیں نہ کہیں ان کی چھاپ کو نہایت واضح انداز میں محسوس کر سکتے ہیں۔مذہبی مجالس سے لے کر بزمِ یاراں تک وہ ہر محفل میں اپنی خوش گفتاری وخوش اطواری کے سب جانِ محفل ہوتے تھے۔پاکستان میں اور پاکستان سے باہر نعت خوانی کو فروغ دینے میں آپ کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ان کی یاد ہمیشہ اہلِ محبّت کے دل میں تازہ رہے گی۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ان پر ایک تفصیلی مضمون مجھ پر قرض ہے جسے میں ان شاءاللہ جلد اتارنے کی کوشش کروں گا۔

قمر رعینی

قمر رعینی سے میری کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں اسے اپنی بدنصیبی تصور کرتا ہوں اور زندگی بھر مجھے اس کا ملال بھی رہے گا۔ میرے اور ان کے تعارف کا حوالہ ان کے وہ چند فون ہیں جو انھوں نے اکثر 'نعت رنگ' کے اداریوں کی پسندیدگی کے حوالے سے خالصتاً خورد نوازی کے جذبے کے تحت مجھے کیے یا پھر ان کی وہ کتب جو انھوں نے بھائی عزیز احسن کے ذریعے مجھے عطا فرمائیں۔ میں ان کی بڑھتی ہوئی عمر اور بیماریوں کے باوجود میں ان کی تخلیقی زرخیزی اور قلم کی روانی دیکھ کر خوش گوار حیرت سے دوچار ہوتا رہا۔ انھوں نے نعت کی خدمت کی اور خوب کی۔ ان کے نام کو نعتیہ ادب میں زندہ رکھنے کے لیے صرف ان کی شاعری ہی کافی تھی مگر وہ نعت کے ایسے خادم تھے جو نعت کے حوالے سے صرف اپنی ہی ادبی زندگی کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے تذکرے کو بھی تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ سو انھوں نے ایک نہایت عمدہ تذکرہ ''تذکرہ ءنعت گویانِ راول پنڈی و اسلام آباد' بھی مرتب کیا۔ ان کے دو نعتیہ مجموعے 'ولائے رسول'' اور '' آب زم زم'' ان کی یادگار کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی نعت گوئی پر ایک خوبصورت مضمون زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے، اس لیے میں نے ان کی نعت گوئی پر کوئی بات نہیں کی، صرف یہ شعر ملاحظہ فرمائے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے کہ ایسے شعر کا خالق یقیناً ہماری دعا کا حق دار ہے۔

یاد رسولؐ پاک مرے ساتھ ہو گئی
میں سوچ ہی رہا تھا کوئی ہم سفر ملے

محمد فیروزؒ: محمد فیروز شاہؒ اردو کے صاحبِ طرز نعت نگاروں میں اپنی ایک جداگانہ پہچان رکھتے تھے۔ خوبصورت اور کومل جذبوں کو خوبصورتی اور نفاست سے نظم و نثر میں برتنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ ان کے نزدیک عشق فقط عشقِ رسول ﷺ کا نام تھا اور نعت آرزوئے رسول کا۔ وہ 'نعت رنگ' کی تحریک سے وابستہ رہے، 'نعت رنگ' کے لیے مضامین لکھتے رہے، مذاکرے منعقد کرتے رہے، خطوط کے ذریعے حوصلہ افزائی و رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ 'نعت رنگ' کے ۱۹ر شماروں

میں شائع ہونے والی نعتوں کا ایک خوبصورت انتخاب 'نعت رنگ' کے نام سے انھوں نے مرتب کیا۔ ان کا نعتیہ مجموعہ 'باوضو آرزو' جدید نعت نگاری کے حوالے سے ایک اہم اور قابلِ ذکر مجموعۂ نعت ہے۔ التجاؤں، تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشات کو نعت میں سمونے والا یہ خوب صورت نعت گو بھی اس تمنا کے ساتھ جلد سو گیا۔

خواہشِ دیدِ مصطفیٰ لے کر
چشمِ فیروز جلد سو جائے

سیّد اُمید علی نقوی

سید امین علی نقوی ایک صاحب حال وقال بزرگ اور باکمال نعت گو شاعر تھے۔ مرحوم کا نام سب سے پہلے مرے سامنے ڈاکٹر آفتاب نقوی مرحوم نے لیا تھا۔ آپ ڈاکٹر صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے توسط سے میں اور غوث میاں پہلی بار ان کے آستانے (فیصل آباد) پر ان سے جا کر ملے تھے۔ مرحوم بہت کم گو مگر بہت پر گو شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً آٹھ منفرد مجموعہ ہائے نعت و مناقب یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ ان میں ''محمد ﷺ ہی محمد ﷺ'' (اُردو میں غیر منقوطہ کلام)، ''حسن محمد ﷺ'' (عربی غیر منقوطہ کلام)، ''محمد رسول اللہ (بلا الف مجموعہ نعت)، ''عشقِ محمد ﷺ'' (نعتیں)، ''لا نبی بعدی'' (نعتیں)، ''وردالوداعلیٰ قصیدہ البردہ'' کے علاوہ ''من کنت مولا'' (مناقب) اور حسین ہی حسینؓ'' (مناقب) شامل ہیں۔

زاہد الیاس رحمانیؒ

جناب زاہد الیاس رحمانیؒ شاعری کا عمدہ ذوق رکھنے والے نعت خوانوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات مدینہ طیبہ میں ہوئی، جب یہ وہیں مقیم تھے۔ بعد ازاں ایک بار لاہور میں بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میں اور حفیظ تائب مرحوم کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں زاہد الیاس رحمانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ راستے ہی سے ساتھ ہو لیے اور پھر ہوٹل تک ساتھ آ کر اپنی پیاری اور رسیلی آواز میں چند نعتیں سنا کر روانہ ہوئے۔ لاہور کے ثنا خوانوں میں انھیں خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی آواز میں سنی ہوئی حفیظ تائب کی یہ نعت آج بھی روح کو سرشاری عطا کرتی ہے:

حاضر ہے درِ دولت پہ گدا سرکارؐ توجہ فرمائیں
محتاجِ نظر حال مرا سرکارؐ توجہ فرمائیں

باباسیّدرفیق عزیزیؒ

بابا سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر ان کی شہرت، نیک نامی اور علم دوستی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ان سے میرے تعارف کا حوالہ ان کی وہ تحریریں اور کلام تھے جو اکثر و بیشتر مذہبی و ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔ان کی نعتیہ شاعری اکثر شہزاد احمد کے ماہ نامہ ''حمد و نعت'' کراچی اور بعدازاں ان کے ترتیب دیے ہوئے ''منتخباتِ نعت'' میں نظر سے گزرتی رہی اور اس طرح نعت گوئی کے حوالے سے یہ ایک نام اپنے شاعرانہ اعتبار اور عشق کے اظہار کی بنا پر ایسا میرے ذہن میں محفوظ ہوا کہ پھر میں بابا کی کسی تحریر یا کلام سے سرسری نہیں گزر سکا۔بابا کی علمی و ادبی خدمات اور بابا کے شاگردوں سے مزید آشنائی بھائی عزیزالدین خاکی کے رسالہ ''دنیائے نعت'' کے سید رفیق عزیزی نمبر سے ہوئی اور وہیں بابا کی نعتوں کا ایک قابلِ قدر گوشہ بھی نظر سے گزرا۔بابا راہِ سلوک کے مسافر تھے اور تاجیہ سلسلے سے تعلّق روحانی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نعت گوئی میں بھی عارفانہ رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔وہ رنگ جو باطنی روشنی کو سامنے لاکر روحانی سرشاری کی لذت سے آشنا کردے۔

خواجہ کونین کی اک اک تجلّی پہ نثار ایک ہی تصویر پائی سلسلہ در سلسلہ
سرور ہر دوسرا کو دیکھنے والی نظر شکر ہے ہم تک بھی پہنچی سلسلہ در سلسلہ

منصور تابشؒ

عصرِ حاضر میں نعت خوانی کے اُفق پر بہت جلد اپنے منفرد اندازِ ثنا خوانی سے اعتبار حاصل کرنے والوں اور جگہ بنانے والوں میں ایک بہت ہی محترم نام جناب منصور تابشؒ کا بھی ہے۔منصور تابش سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں، مگر ان دو ملاقاتوں کا نقش ذہن پر ایسا محفوظ ہوا کہ جب کبھی ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ان کا ہنستا مسکراتا شفیق چہرہ اور وضع داریاں ذہن پر تازہ ہوجاتی ہیں۔پہلی بار انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں الحاج سعید ہاشمی کے اعزاز میں کراچی میں منعقدہ ایک محفلِ نعت میں سنا اور متاثر ہوئے اس محفل کی ابتدا بغیر کسی طے شدہ پروگرام کے میری نعت شریف سے ہوئی اور یہ کمال تھا ممتاز نقیبِ محفل صاحبزادہ شہریار قدوسی کا کہ انھوں نے اچانک میرا نام پکار دیا۔میں نے نعت شریف شروع کی:

کوئی مثل مصطفیؐ کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رُتبہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے منصور تابش کی گریہ وزاری اوران کا تڑپنا دیکھا۔ دوسری ملاقات کی سبیل انھوں نے خود پیدا کرلی اور وہ اس طرح کہ ۱۹۹۴ء میں ہم کئی نعت نگار جن میں جناب حافظ لدھیانوی، عاصی کرنالی، راجا رشید محمود، مظفّر وارثی، حافظ لدھیانوی اور میں وزارتِ مذہبی امور حکومت پاکستان کی جانب سے منعقدہ سیرت کانفرنس کے موقع پر اسلام آباد میں جمع تھے اور ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ حفظ لدھیانوی صاحب نے منصور تابش صاحب سے فون پر بات کی اور ہمیں حکم صادر فرمایا کہ شام کو منصور کے گھر مشاعرہ ہے، وہاں جانا ہے۔ شام کو منصور تابش صاحب خود تشریف لائے اور اپنے گھر لے گئے۔ ایک خوب صورت شام تھی جو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے ذکر سے عبارت تھی۔ مہمانوں کی تواضع کا ہر طرح سے خیال رکھا گیا اور چلتے وقت تمام شعرا کو نذر بھی پیش کی گئی، غرض ہر عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ منصور تابش کے دل میں نعت نگاروں کا کتنا احترام ہے۔ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کا احترام کیا، محبّتیں تقسیم کیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے ذکر کے حوالے سے جاوداں شہرت عطا کی۔

حکومتِ پاکستان نے انھیں نعت خوانی پر اعلیٰ ترین سول ایوارڈ پرائڈ آف پرفارمینس بھی عطا کیا۔ ہمارے عہد میں کون ہے جو اس نغمے سے سرشار نہیں ہوا جو ان کی آواز میں گونجتا تھا۔

کوئی سلیقہ ہے آرزو کا نہ بندگی میری بندگی ہے
یہ سب تمھارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

میں ان تمام بزرگوں کے لیے حق دعائے مغفرت کرتا ہوں کہ اللہ کریم حضور نبی کریم ﷺ کے صدقے ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام و مرتبہ عطا فرمائے اور قارئین 'نعت رنگ' سے بھی ملتمس ہوں کہ وہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے ان عشاق کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھے۔

ہم ہیں اب تک اسیر دانہ و دام
جو رہا ہو چکے ہیں ان کو سلام

سیّد صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۱

ابتدائیہ

نعت درود و سلام کے پیکرِ شعری کا نام ہے۔ سیرتِ اطہر سے اکتسابِ شعور کا سب سے بڑا وسیلہ، اور اس وسیلۂ جلیلہ سے عطا ہونے والی روشنی کا ہر سطح پر اطلاق اسی صورت ممکن ہے کہ ہم تاجدارِ کائنات ﷺ کی ذاتِ اقدس سے قلبی و روحانی روابط کو فروغ دیں اس طرح ہمارے شب و روز کا دامن خیر کی روشنیوں سے بھر سکتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نعت گوئی کے ارتقا اور ترویج و اشاعت میں خوش گوار پیش رفت ہوئی اور ایسا ہونا بھی تھا کہ ''تحریکِ پاکستان'' اسلامی تشخّص کی تلاش ہی کا دوسرا نام ہے۔

نعت گوئی پر مشتمل تیزی سے سامنے آنے والے شعری مجموعے اور محافلِ میلاد و محافلِ نعت کے وسیع پیمانے پر انعقاد نے نعت کی مقبولیت کو عوامی سطح پر مستحکم کیا لیکن اس مقدس، معتبر اور مقبولِ عام شاعری کو اردو کی شعری اصناف میں کوئی جداگانہ ادبی تشخّص حاصل نہیں ہو سکا جس کی بڑی وجہ اس صنفِ سخن پر تنقیدی زاویے سے کام کا نہ ہونا قرار پائی۔ نعت کو دیگر شعری اصنافِ سخن میں بہ اعتبار صنفِ سخن منوانے اور اس کے ادبی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے جس تنقیدی بصیرت اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والی انتقادی اصابت رائے کی ضرورت تھی اس کی کمی مجھے ۱۹۹۴ء میں بڑی شدت سے محسوس ہوئی اور اس کا اظہار میں نے اسی سال وفاقی وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقدہ سالانہ سیرت کانفرنس کے موقع پر وہاں موجود عصرِ حاضر کے نمائندہ نعت نگاروں اور نعت کاروں کے سامنے کیا جن میں حفیظ تائب، ڈاکٹر عاصی کرنالی، حافظ لدھیانوی، مظفّر وارثی، ڈاکٹر آفتاب نقوی، بشیر حسین ناظم اور سیّد آل احمد رضوی وغیرہ شامل تھے۔

۱۹۹۵ء میں اپنے اس خیال کو کہ ''نعتیہ شاعری کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے''، عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے ''اقلیمِ نعت'' کی بنیاد رکھی، نعت کے ادبی فروغ کے لیے عزمِ سفر میں اس وقت میرے ساتھ میرے دوست عزیز احسن اور انور حسین صدیقی شریک تھے۔

اقلیمِ نعت کے زیرِ اہتمام اپریل ۱۹۹۵ء میں ''نعت رنگ'' کے نام سے ایک کتابی سلسلہ جاری کیا گیا۔ ''نعت رنگ'' نے نعتیہ ادب میں تنقیدی بصیرت کی کمی کو پورا کرنے کی خواہش کے ساتھ اپنے اشاعتی سفر کا آغاز کیا اور اس کا پہلا شمارہ ہی ''تنقید نمبر'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ اردو دنیا میں ''نعت رنگ'' کے اجرا سے قبل، اتنی ہمہ گیر تنقیدی آرا، کبھی پیش نہیں کی گئیں تھیں، اردو کی شعری دنیا پر ''نعت رنگ'' کا طلوع صائبِ افکار کا اُجالا پھیلنے کا سبب بنا اور نعت کی شعری قدر افزائی کے لیے خالص ادبی پیمانوں کے استعمال کی راہیں روشن ہوئیں تا حال اس کے اکیس شمارے شائع ہو چکے ہیں اور وہ کارواں جو نعت کے ادبی فروغ کا جذبہ لے کر روانہ ہوا تھا۔ اب الحمدللہ پوری اردو دنیا کو اپنے حصار میں لے چکا ہے۔

''نعت رنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اقلیمِ نعت نے نعتیہ ادب کے حوالے سے کتب کی اشاعت پر بھی خصوصی توجہ دی جو نعت کے ادبی فروغ کے ساتھ ساتھ تنقیدی و تحقیقی امکانات کو بھی وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ آیئے اک نظر ان مطبوعات پر ڈالیے:

۱۔	حریمِ نعت	(انتخابِ نعت)	رئیس احمد	۱۹۹۵ء
۲۔	آپؐ	(مجموعۂ نعت)	حنیف اسعدی	۱۹۹۶ء
۳۔	آنکھ بنی کشکول	(مجموعۂ نعت)	آفتاب کریمی	۱۹۹۷ء
۴۔	حضوری	(انتخابِ نعت)	عاطف معین قاسمی	۲۰۰۲ء
۵۔	نزول	(مجموعۂ نعت)	شفیق الدین شارق	۱۹۹۹ء
۶۔	نسبت	(مجموعۂ نعت)	سیّد ابوالخیر کشفی	۱۹۹۹ء
۷	وطن سے وطن تک	(سفر نامۂ حجاز)	سیّد ابوالخیر کشفی	۲۰۰۱ء
۸۔	گل ہائے عقیدت	(مجموعۂ نعت)	سیّد حمید الدین حمید	۲۰۰۱ء
۹۔	اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر	(تحقیقی مقالہ)	ڈاکٹر عاصی کرنالی	۲۰۰۱ء
۱۰۔	ارمغانِ حافظ	(مجموعۂ نعت)	حافظ عبدالغفار حافظ	۲۰۰۲ء
۱۱۔	نعت کی تخلیقی سچائیاں	(نقدِ نعت)	عزیز احسن	۲۰۰۲ء

۱۲۔ قوسین	(مجموعۂ نعت)	آفتاب کریمی	۲۰۰۵ء
۱۳۔ کرم ونجات کا سلسلہ	(مجموعۂ نعت)	عزیز احسن	۲۰۰۵ء
۱۴۔ ہنر نازک ہے	(نقدِ نعت)	عزیز احسن	۲۰۰۷ء
۱۵۔ نعت اور سلام	(مجموعۂ نعت)	وحیدہ نسیم	۲۰۰۷ء
۱۶۔ ممدوحِ خلائق	(مجموعۂ نعت)	آفتاب کریمی	۲۰۰۸ء
۱۷۔ خیر البشر	(میلاد نامہ)	نور بانو محجوب	۲۰۰۸ء
۱۸۔ نعت نگر کا باسی	(ڈاکٹر کشفی کی نعت شناسی)	صبیح رحمانی	۲۰۰۸ء

۲۰۰۲ء میں اقلیمِ نعت کے تحت ہی ''نعت ریسرچ سینٹر'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے مقاصد میں ''نعت رنگ'' کی اشاعت کے بعد نعت شناسی اور نعت فہمی کے بڑھتے ہوئے شعور اور ذوق کو تعلیمی اداروں اور جامعات تک وسعت دینا تھا۔ الحمدللہ ہمیں اس ضمن میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئیں اور نعت پر تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے انفرادی سطح پر ٹھوس علمی کاموں کے ساتھ ساتھ جامعات میں ایم اے سے لے کر پی ایچ۔ ڈی کی سطح تک کے کئی اہم مقالے سامنے آئے اور کئی مقالوں پر کام ابھی جاری ہے اور ان کا دائرہ صرف پاکستان ہی تک نہیں بلکہ ہندوستان کی جامعات تک پھیل چکا ہے۔ اس مرحلے پر ضرورت تھی کہ ان طلبا و طالبات کی تحقیقی امور میں معاونت کی جائے، کسی بھی موضوع پر ریسرچ کے لیے سب سے اہم ضرورت مطلوبہ مواد کی فراہمی ہوتی ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم کسی عنوان پر کوئی کام کر سکتے ہیں۔ ادھر نعتیہ ادب کا حال یہ ہے کہ اس موضوع پر نثری کتب کی تعداد بہت ہی کم ہے اور جو کتب ہیں ان کا حصول آسان نہیں۔ ''نعت ریسرچ سینٹر'' نے اس ضرورت کو بروقت محسوس کرتے ہوئے فوری طور پر ایسی کتب کی اشاعت کا پروگرام ترتیب دیا جو محققین کی علمی و فکری رہنمائی کے ساتھ ساتھ حوالہ جاتی ضرورتیں بھی پوری کر سکے۔ چناں چہ ''نعت ریسرچ سینٹر'' نے مطبوعہ نعتیہ مواد کے حصول کی کوششیں تیز تر کر دی ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنی لائبریری میں جمع ہونے والی نعتیہ سرمائے کی وضاحتی کتابیات پر بھی کام شروع کر دیا ہے ساتھ ہی ساتھ اشاریہ سازی پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے کیوں کہ کتابیات اور اشاریوں کی عدم دست یابی تحقیقی کاموں کی رفتار کو سست کر دیتی ہے۔ ''نعت ریسرچ سینٹر'' کے زیرِ اہتمام اب تک جو مطبوعات سامنے آئیں ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ شہ لولاک	(غالب کی زمینوں میں نعت)	محمد امان خان دل	۲۰۰۲ء
۲۔ نعت میں کیسے کہوں	(نقدِ تنقید)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	۲۰۰۹ء

۳۔ نعت اور تنقیدِ نعت (نقدِ نعت) ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی ۲۰۰۹ء

۴۔ غالب اور ثنائے خواجہ (نقدِ نعت) سیّد صبیح الدین رحمانی ۲۰۰۹ء

۵۔ شہپر توفیق (مجموعہ نعت) عزیز احسن ۲۰۰۹ء

۶۔ سرکار کے قدموں میں (کلام صبیح رحمانی کا انگریزی ترجمہ) سارہ کاظمی ۲۰۰۹ء

۷۔ ''نعت رنگ'' اہلِ علم کی نظر میں ڈاکٹر شبیر احمد قادری ۲۰۰۹ء

۸۔ اشاریہ ''نعت رنگ'' (بیس شمارے) سہیل شفیق ۲۰۰۹ء

۹۔ فہرست کتب نعت ریسرچ سینٹر محمد طاہر قریشی ۲۰۰۹ء

۱۰۔ Jada-e-Rehmat (کلام صبیح رحمانی کا انگریزی ترجمہ) ڈاکٹر منیر احمد مغل ۲۰۰۹ء

''نعت ریسرچ سینٹر'' کے دائرۂ کار کو مزید وسعت دینے کے لیے دیگر ممالک میں بھی اس کی شاخوں کے قیام کی کوششیں جاری ہیں اور اب تک ان کوششوں کے نتیجے میں ''نعت ریسرچ سینٹر'' بھارت اور ''نعت ریسرچ سینٹر'' یو کے کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یو کے کے شہر Leeds میں ممتاز نعت گو شاعرہ سمیہ ناز اقبال صاحبہ اس سینٹر کی دیکھ بھال پر مامور ہیں جب کہ بھارت میں زبیر قادری صاحب کی کوششوں سے ''نعت ریسرچ سینٹر'' ناسک میں قائم ہو چکا ہے اور اس سینٹر کے زیر اہتمام ''نعت رنگ'' کے ساتھ ساتھ مطبوعاتِ ''نعت ریسرچ سینٹر'' کی اشاعت اب بھارت میں بھی شروع ہو چکی ہے۔ شمارہ بیس کی وہاں اشاعت کو بھارت کے علمی و مذہبی حلقوں نے بہت سراہا ہے اور اس سے نعت پر گفتگو کا میدان مزید وسیع ہوا ہے۔

انٹرنیٹ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور افادیت کے پیشِ نظر اب ہم نے اس ذریعے کو نعت کے علمی و ادبی تعارف کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور چار ویب سائٹس تیار کی ہیں:

1. www.sabihrehmani.com
2. www.naatresearchcenter.com
3. www.naatrang.net
4. www.visaaleyaar.com

الحمدللہ ان ویب سائٹس پر لاکھوں محبانِ نعت مدحِ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے مختلف علمی و ادبی پہلوؤں سے نہ صرف آشنا ہو رہے ہیں بلکہ تحقیقی امور میں بھی اُن سے مدد حاصل کر رہے ہیں۔

اس ساری تفصیل کے بیاں کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے قارئین اور مستقبل کا ہر مؤرّخ اور محققِ نعت ہماری تحریک کے اس مختصر مگر باوقار اور آبرومندانہ سفر کی

منازل سے بخوبی واقف ہو اور ہماری کامیابیوں پر غور کرتے ہوئے اس کے پیش نظر یہ بات بھی رہے کہ جب اللہ کریم کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب وعلل کوئی مسئلہ نہیں رہتے صرف تیرہ برسوں میں نعت کے ادبی فروغ کا یہ کامگار سفر ہر اس شخص کو عزم وحوصلے کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتا ہے جو ذکرِ نبی کریم ﷺ کے حوالے سے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ میری دعا ہے کہ دنیا کی ہر زبان اور ہر خطے میں ''نعت رنگ'' جیسے جریدے طلوع ہوں اور ''ورفعنالک ذکرک'' کی روشنی پھیلتی چلی جائے۔

''نعت رنگ'' ۲۱، ایک بار پھر تاخیر سے پیش خدمت ہے۔ اس کی تاخیر سے اشاعت کے ضمن میں میرے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ''نعت رنگ'' ۲۱ میں موجود مواد آپ کو اس کاروانِ عشق کی مسلسل نئی منزلوں کی جانب پیش رفت کا احساس دلائے گا۔ نئے عنوانات کی تلاش، نئے امکانات پر غور وفکر اور پھر اس پر قلم کاروں سے لکھوانا سب وقت طلب بھی ہے اور دشوار بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''نعت رنگ'' ایک بار پھر نعتیہ ادب کے نئے پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی رنگوں سے ''نعت رنگ'' ہمیشہ آراستہ ہوتا ہے مگر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو بھی ہم پیش کر سکیں۔ ہمارے تمام لکھنے والوں نے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے اور یہ سب کے سب مضامین ہمارے خصوصی توجہ کے مستحق ہیں مگر گوشۂ نعت شناسی اس اعتبار سے توجہ طلب ہے کہ اردو میں نعت پر لکھنے والوں کی اس طرح پذیرائی کی کوئی مثال اس سے پہلے ہمارے ہاں موجود نہیں تھی اور مجھے اس کا شدت سے احساس تھا کہ جب تک ہم اس موضوع کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے والوں کے لیے احترام اور توجہ کی ایک خاص فضا پیدا نہیں کر لیتے اور ان قلم کاروں کو یہ احساس نہیں دلاتے کہ آپ کے فکری وتنقیدی جائزوں کو علمی دنیا سنجیدگی سے دیکھ رہی ہے اور نہ صرف دیکھ رہی ہے بلکہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ وہ آپ کی علمی، فکری اور تنقیدی خدمات کے اعتراف کو بھی آپ کا حق سمجھ کر ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت تک نعت کے ادبی فروغ کا کارواں سست روی کا شکار رہے گا اور اگر احترام وحوصلہ افزائی کا یہ ماحول بن جاتا ہے تو یقیناً نعت پر کاموں کی رفتار تیز تر ہو جائے گی اور اس پذیرائی سے متاثر ہو کر ہمارے نئے لکھنے والے بھی اس وادیٔ نور میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا گوشۂ نعت شناسی ہمارے مستقل لکھنے والوں کی ادبی حیثیت کے تعین کے ساتھ ساتھ ان میں مزید کام کا نیا عزم اور ولولہ پیدا کرے گا۔ (ان شاء اللہ)

اسی طرح ایک خاص مضمون ''صوبائی اسمبلی پنجاب میں ذکرِ رسولﷺ'' بھی ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ ایک تو یہ بالکل اچھوتا موضوع ہے، دوسرے اس اعتبار سے یہ دو قلم کاروں کا مشترکہ مضمون ہے ادب کے سنجیدہ قارئین جانتے ہیں کہ بین الاقوامی جامعات میں گروپ ریسرچ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس میں ایک سے زیادہ افراد ایک موضوع پر مل کر کام کرتے ہیں، نہ جانے اردو والے ابھی تک ایسا کرنے میں بہت زیادہ کامیاب کیوں نہیں ہو سکے۔ اس طرح کے منصوبوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ کسی بھی موضوع پر کام تیز رفتاری کے ساتھ مکمّل ہوتا ہے اور کئی لوگوں کے اشتراکِ ذہنی سے کام کی افادیت کے لیے مزید کئی پہلو روشن ہونے کے امکانات خاصے بڑھ جاتے ہیں۔ میں ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور ڈاکٹر محمد ارشد اویسی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ''نعت رنگ'' کے لیے اس اچھوتے موضوع پر کام کر کے نہ صرف تحقیقِ نعت کو نئے اِمکانات سجھائے بلکہ محققین کو یہ شعور بھی عطا کیا کہ اگر کام کی رفتار کو تیز تر کرنا ہے تو انھیں گروپ ریسرچ کو فروغ دینا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ ''نعت رنگ'' کے مستقل لکھنے والے بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے اور بالخصوص وہ نعت کار جو نعتیہ ادب کے ضمن میں معلومات کا خزانہ اپنے سینے میں رکھتے ہیں مگر اسے حوالۂ قرطاس کرنے میں انھیں دشواریوں کا سامنا رہتا ہے۔

نئے دُکھ

مستقل رہتا نہیں کوئی فضائے دہر میں
چار نے بستر لگائے چار کے بستر اُٹھے

فضا جلالوی کا یہ شعر کتنی بڑی سچائی کو کس خوب صورتی سے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ حقیقت ہے کہ ابھی ہم گزشتہ شمارے میں لکھے گئے نئے دُکھوں پر کھل کر رو بھی نہیں پاتے کہ بچھڑنے والوں کی ایک اور فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بقولِ شاعر:

رونے کی بھی مہلت نہیں رونا تو یہی ہے

''نعت رنگ'' کا شمارہ ۲۱ تقریباً ایک سال کے وقفے کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس لیے نئے دُکھ کی فہرست کافی طویل ہونے کا امکان ہے لیکن یہاں میں صرف ان شخصیات کا ذکر کر پاؤں گا جو آسمانِ نعت پر بہت نمایاں تھے۔ لیکن قارئین سے یہ درخواست ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں ہر اس شخص کے لیے دعا فرمائیں جو ذکرِ نبی کریمﷺ کے فروغ میں کسی نہ کسی طرح شریک رہا ہے۔

حضرت پیر سیّد نصیر الدین نصیر گولڑویؒ

پیر نصیر الدین نصیر کی شخصیت کا سب سے بڑا اور اہم حوالہ تو یہ ہے کہ وہ خاندانِ گولڑہ شریف کے چشم و چراغ تھے۔ خاندانی نجابت و سیادت کے ساتھ ساتھ انھیں عصرِ حاضر کے ادبی و مذہبی منظر نامے پر خاصی اہمیت حاصل تھی ان کے دیگر علمی کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت کا ایک بڑا حوالہ ان کی نعت گوئی بھی تھا۔ ان کے دو مجموعے شائع ہوئے جس میں پہلا ''دیں ہمہ اوست'' اور دوسرا تضامین (مولانا احمد رضا خاں کے کچھ نعتیہ کلاموں پر تضامین کا مجموعہ) ان کا کلام ان کی عقیدتوں کا خوب صورت اظہار ہے۔ علمی رسوخ، تحقیقی میلان اور مقامِ رسالتﷺ کی نزاکتوں کے احساس نے ان کے کلام کو پُر تاثیر اور پُر بہار بنا دیا ہے۔ مجھے حضرت سے چند ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا ہے۔ کراچی کے معروف تاجر حمزہ داؤد صاحب کی رہائش گاہ پر ہونے والی ایک طویل ملاقات میں انھوں نے اصرار کر کے کچھ کلام مجھ سے سنا اور دعاؤں سے نوازا اور بعد ازاں اپنے کلام سے سرفراز کیا۔ یہ ملاقات خاصی دیر جاری رہی جس میں جناب حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی اور امین راحت چغتائی کا تذکرہ خصوصیت سے ہوتا رہا۔ آدابِ نعت کے حوالے سے چند مباحث بھی گفتگو کا حصہ رہے اس طرح یہ وقت میری زندگی کے یادگار لمحوں میں شامل ہو گیا۔ زیارتِ نبی کریمﷺ کی لگن دل میں لے کر پوری پاکیزگیٔ فکر کے ساتھ دنیا سے ۱۳؍فروری ۲۰۰۹ء کو رخصت ہونے والے اس عاشقِ رسول کا اہتمامِ زیارتِ سرکار علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ملاحظہ کیجیے:

نظر بہ عالمِ پاکیزگی پڑے ان پر
مسافرانِ لحد اس لیے نہا کے چلے

رشید وارثیؒ

رشید وارثی ہمارے عہد کے نعتیہ منظر نامے پر بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ انھوں نے نعت گوئی کے موضوع پر کئی زاویوں سے وقیع علمی کارنامے سرانجام دیے۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق کے دائروں میں نعتیہ ادب پر ان کے کام کو ادب کا کوئی مؤرّخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ وہ ''نعت رنگ'' کے ذریعے جاری ہونے والی نعت کے ادبی فروغ کی تحریک کے اہم رکن تھے۔ بحیثیت ناقد نعت اردو دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ نعتیہ ادب پر ان کے گہرے ناقدانہ و عالمانہ مضامین کو جو گاہے گاہے ''نعت رنگ'' کی زینت بنتے رہے، عصرِ حاضر کے تمام اہلِ علم سے دادِ تحسین وصول

کر چکے ہیں۔

بحیثیت نعت گو شاعر بھی وہ معاصر ادبی منظر نامے پر جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کی انفرادیت اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے علم، معتقدات اور عشق و روحانیت کے ہر جذبے اور تجربے کو تخلیقی یا شعری تجربہ بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ اس ہنر میں ان کی مہارت کا عالم یہ تھا کہ شاعری کی جملہ ہیئتیں اور اصناف ان کی دسترس میں رہتی تھیں کہ وہ جس ہیئت اور صنف میں چاہیں اپنے جذبوں کو ڈھال دیں۔ ان کے نعتیہ مجموعے ''خوشبوئے التفات'' میں موضوعات کی رنگارنگی کے ساتھ ہیئت شعری کی بھی ایسی دھنک نظر آتی ہے جو انھیں اساتذۂ فن میں شامل کرنے کے لیے کافی تھی۔ محمد و آلِ محمد ﷺ کی غلامی پر ناز کرنے والے رشید وارثی ۱۱؍جون ۲۰۰۹ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ خدمتِ نعت پر انعامِ خداوندی کا یقین ان کا توشۂ آخرت بن کر ان کے شعر میں اس طرح سامنے آیا ہے:

لحد پہ ہوتے ہیں مدحت سرا گل و سبزہ
جو زیرِ خاک کوئی مدح خوان ہوتا ہے

دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی نعتیہ خدمات کے صدقے ان کے اس یقین کی لاج رکھتے ہوئے انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے۔ آمین

سیّد حنیف اخگر ملیح آبادیؒ

ممتاز محترم نعت گو شاعر سیّد حنیف اخگر ملیح آبادی بھی ۲؍جون ۲۰۰۹ء کو امریکا کے شہر ڈیلاس میں وفات پا گئے۔ وہ امریکا میں مقیم شعرا میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ غزل اور نعت دونوں میدانوں میں ان کا شہرہ تھا۔ ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی نے ان کا نعتیہ مجموعے ''خلقِ مجسّم'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھیں بجا طور پر نئی دنیا میں اردو کے زندہ نشان کی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ پاکستانیت اور اسلامی طرزِ حیات کی علامت قرار دیا ہے۔ حنیف اخگر سے میری ملاقاتیں پاکستان میں بھی ہوئیں اور کینیڈا میں بھی، بلاشبہ میں نے انھیں انھی اوصاف سے متّصف پایا۔ وہ نعت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خوب صورت ترنم سے نعت پڑھتے تو فضا بنا دیتے۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی (کینیڈا) کی رہائش گاہ پر ایک مرتبہ مجھے جناب حنیف اخگر سے نعت کے حوالے سے گفتگو کا خاصی دیر موقع ملا اور مجھے خوشی ہوئی کہ وہ نعت کے بارے میں اپنا ایک واضح نظریہ رکھتے تھے اور اس کے

اظہار میں کسی جھجک کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اس ملاقات میں انھیں نعت کے حوالے کچھ مزید پہلوؤں پر کام کرنے کی دعوت دی اور الحمدللہ کہ چند ماہ بعد ہی مجھے اردو ٹائمز نیو یارک کی ایک اشاعت میں اخگر صاحب کا ایک مطبوعہ مضمون موصول ہوا جسے انھوں نے شمالی امریکا میں رہنے والے نعت گو شعرا کے تذکرے اور تعارف سے سجایا تھا یہ مضمون شمالی امریکا میں نعت گوئی کے بڑھتے ہوئے رجحان اور مقبولیت کے منظر نامے پر مشتمل تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا۔ میرے دل سے اخگر صاحب کے لیے دعا نکلی آج ایک بار پھر ان کے لیے دعا کو ہاتھ اُٹھے ہوئے ہیں اور ذہن میں ان کا یہ شعر گونج رہا ہے:

دیکھ کر مجھ کو نکیریں کہیں پڑھ کے درود
اس کی پیشانی پہ لکھا ہے غلام ان کا ہے

آئیے اس غلام سیّد لولاک ﷺ کی اس تمنا پر مل کر آمین کہیں۔

نور بانو مجوبؒ

اُردو کے میلاد ناموں میں ''خیر البشر'' ایک خوب صورت اضافہ ہے جسے ۲۰۰۸ء میں اقلیم نعت نے شائع کیا۔ یہ میلاد نامہ نور بانو مجوب کی تصنیف ہے اور اس میلاد نامے میں شامل ان کا اپنا نعتیہ کلام عصرِ حاضر کی خواتین نعت نگاروں میں ان کے مقام و احترام کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ نور بانو مجوب کی شہرت کا بڑا حوالہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ وہ نور بانو مجوب سیتاپوری کے نام سے قیامِ پاکستان سے قبل بھی افسانے لکھتی رہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد وطن کی محبّت میں انھوں نے اپنے قلمی نام میں شامل سیتاپوری کے لاحقہ کو جدا کر دیا اور اپنا قلمی سفر جاری رکھا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا علم بہت کم لوگوں کو تھا، لیکن ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے شاعری اوائلِ عمری ہی میں شروع کی اور اس کی ابتدا بھی نعت گوئی سے ہی ہوئی۔ ۲۱ رجنوری ۲۰۰۹ء کو نور بانو مجوب کراچی میں انتقال فرما گئیں۔ ان کا میلاد نامہ ان کے انتقال سے چند ماہ پیش تر ہی ان کے صاحب زادے اور میرے عزیز دوست اعجاز کلیم اشرف کی خصوصی توجہ سے شائع ہوا اور مرحومہ اس توشۂ آخرت کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ ہوئیں۔ آیئے ان کے اس شعر پہ آمین کہہ کر ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

مرے اعمال بد کی انتہا گر ہو چکی تو بھی
کریم بے بدل اپنے کرم کی انتہا کر دے

چودھری عبدالغفور قمرؒ

چودھری عبدالغفور قمر نعت کا عمدہ ذوق رکھنے والے قاری تھے اور انھیں نعتیہ مجموعوں کے مطالعے کا اس قدر ذوق تھا کہ وہ اسے اپنے لیے آکسیجن تصور کرتے تھے اور وہ کسی حد تک اپنے اس دعوے میں سچے بھی نظر آتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے ایک وقیع انتخاب نعت مرتب کرنا شروع کیا۔ ۱۳ جلدوں پر مشتمل اس انتخابِ نعت میں جس کا نام بھی انتخاب نعت ہے۔ مرحوم نے نہ صرف قدما سے لے کر عصرِ حاضر تک کے نعتیہ گو شعرا کی عقیدتوں کو جمع کرنے کی سعی مشکور کی ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ ان کے اپنے تاثرات بھی شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ اپنے ایک خاص آدرش اور ذوق شعری کے تحت کر رہے تھے اور جہاں جہاں ان کے اس ذوق کی تکمیل احسن طور پر ہوتی نظر آتی تھی وہیں وہ اپنے تاثرات بھی پیش کر دیتے تھے۔ اس انتخاب کے دوران وہ ہر اس شخص کے پاس گئے جس کے بارے میں انھیں علم ہوا کہ وہاں نعت کی کتب موجود ہیں اور یہی تلاش ان کو مجھ تک بھی لائی۔ تقریباً ۱۰۰/کتب روزانہ وہ منگواتے اور اگلے روز انھیں واپس کر کے ۱۰۰/مزید نعتیہ مجموعوں کا تقاضا کرتے۔ ایک دن میرے حیرت کرنے پر انھوں نے کہا کہ یہ میری آکسیجن ہے۔

۱۳/مارچ ۲۰۰۹ء کو اردو ادب کے دامن میں انتخابِ نعت کی ۱۳/جلدیں ڈالنے والا یہ عاشقِ نعت انھی ۱۳/جلدوں کو اپنے دامن میں توشۂ آخرت کے طور پر سمیٹے ہوئے خالقِ حقیقی کی طرف لوٹ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ حشر میں وہ اسی طرح اپنے آقا و مولا کے حضور پیش ہوں گے اور ان سے انعامِ شفاعت پائیں گے۔ کاش یہ منظر ہم بھی دیکھ سکیں۔ بقولِ خالد محمود:

صلہ نعتِ نبی پائے گا جس دن خالدؔ
وہ کرم دیکھنا تم دیکھنے والا ہو گا

ناصر شاہ چشتیؒ

نامور نعت گو شاعر پیر ضیاء الحق شاہ المعروف ناصر حسین ناصر شاہ چشتی بھی ۵ جولائی ۲۰۰۹ء کو ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کا کلام عوامی اجتماعات میں خاصا مقبول تھا۔ ملک کے کئی بڑے ثنا خوانوں نے ان کے کلام کو پڑھ کر ان کی شہرت اور عقیدت کے دائروں کو دنیا کے کئی مما لک

میں وسعت دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں اردو اور پنجابی نعت پڑھی اور سنی جاتی ہے وہاں وہاں ناصر چشتی کا نام اور ان کے کلام کی خوش بو پہنچ چکی تھی۔ ان کا یہ کلام تو بے انتہا مقبول ہوا:

زمیں میلی نہیں ہوتی زمن میلا نہیں ہوتا
محمدؐ کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا

مرحوم کے چھ نعتیہ مجموعے شائع ہوئے جن میں (۱) خیرالوریٰ (۲) حسنِ حبیب (۳) حضور پُرنور (۴) سرور جاوداں (۵) ضیاء مدینہ (۶) حسن کامل شامل ہیں۔ محمد و آلِ محمد ﷺ سے محبّت ان کا سرمایہ زیست تھی اس کا اظہار وہ اپنی اس شعری وصیت میں بھی کر گئے ہیں:

جب بھی ناصر مجھے موت آئے میری تربت کتبہ لگانا
ہے ثناخواں یہ خیرالوریٰ کا پنجتن کا یہ ادنیٰ گدا ہے

اللہ کریم مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

محمد زاہد نیازی نقش بندی مجددیؒ

معروف نعت خواں، نعت گو اور محافلِ نعت کے ناظم محمد زاہد نیازی نقش بندی مجددی بھی ۲۴ رفروری ۲۰۰۹ء کو وفات پا گئے۔ مرحوم ممتاز نعت گو شاعر الحاج ستار نیازی کے صاحب زادے تھے۔ ان کے دو نعتیہ مجموعے ''سرکار کی گلی تک'' اور ''مواجہہ کے سامنے'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے جن میں اردو اور پنجابی میں خوب صورت نعتیہ کلام شامل ہیں۔ مرحوم سے میری ملاقات اسلام آباد میں منعقدہ ایک محفل نعت میں ہوئی جہاں وہ بطورِ نقیب شریکِ محفل تھے۔ اپنا نعتیہ مجموعہ ''مواجہہ کے سامنے'' مرحوم نے وہیں مجھے مرحمت فرمایا اور بتایا کہ ان کا تیسرا مجموعہ ''یہ کوچۂ حبیب ہے'' جلد شائع ہو رہا ہے۔ زاہد نیازی کی کم عمری، شعری صلاحیت اور نعتیہ سرگرمی کے تناظر میں اس کی اچانک موت نے مجھے واقعی صدمے سے دوچار کیا لیکن ''موت سے کس کو رست گاری ہے''۔

بہرحال ہر نعت گو شاعر کی طرح وہ بھی دل میں اُمید شفاعت لیے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

گناہ گار شفاعت سے بہرہ مند ہوں جب
مجھے بھی یاد وہاں پر شہِ اُمم رکھیے

اُمید ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اپنے اس غلام کی اس تمنا کو پورا فرمائیں گے۔

افتخار حسین طاہرؒ

ممتاز محترم نعت خواں افتخار حسین طاہر ۲ ستمبر ۲۰۰۹ء کو گوجرہ میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم نعت خوانی کے حوالے سے عالمی شہرت کے حامل تھے وطنِ عزیز کے علاوہ کئی ممالک اور بالخصوص یو کے میں ان کی مقبولیت کا دائرہَ خاص وسیع تھا۔ محافلِ نعت ان کی پڑھی ہوئی ''ماں کی شان'' کو بے حد پزیرائی حاصل ہوئی اور اس کے اتنے گہرے اور دیر پا اثرات سامنے آئے کہ بعد میں کئی دوسرے ثناخوانوں نے ماں کی شان پڑھنے کو اپنے لیے لازمی قرار دیا۔ اللہ کریم ان کی خدمات نعت کو قبول و منظور فرمائے۔

سیّد صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۲

ابتدائیہ

نعتِ رسولِ اکرم ﷺ کے فروغ کے حوالے سے ''نعت رنگ''، کو جو منفرد سعادت نصیب ہوئی ہے وہ اردو کے کسی اور جریدے کو حاصل نہیں ہوئی۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں اس کا اجراءنعت کے رجحان ساز معیار اور تاریخ ساز اعتبار کا باعث بنا۔ اِس زمانے کو حافظ لدھیانوی نے 'نعت کا زمانہ'، (خدا کا شکر مجھے نعت کا زمانہ مِلا)، اور حفیظ تائب نے اس عہد کو ''بہارِ نعت''، (یہ ان کے انتخابِ نعت کا عنوان ہے)، سے تعبیر کیا ہے۔ اگر چہ نعت کی صنف آغازِ اردو ہی سے اپنی خوشبو کا سراغ دیتی رہی ہے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نعت کی تخلیق، تدوین، تشہیر اور تنقید کا مربوط انداز میں آغاز بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہوا۔[اس سے پہلے پچاس کی دہائی میں سیّد رفیع الدین اشفاق صاحب، کا نعت پر پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''اردو نعتیہ شاعری''، (ناگ پور یونی ورسٹی)، لکھا جا چکا تھا مگر وہ ۱۹۷۸ء کے آخری مہینوں میں اشاعت پزیر ہوا]، اِس آغاز کو ایک مستقل جہت عطا کرنے اور بڑھاوا دینے میں لاہور سے ماہ نامہ ''نعت'' (مدیر: راجا رشید محمود)، اور کراچی سے مجلّہ ''نعت رنگ'' (مدیر: صبیح رحمانی)، کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ اِن دونوں رسالوں نے اپنے ادارتی مزاج کے مطابق نعت کو آگے بڑھایا۔

'نعت' ماہ بہ ماہ باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ اِس کا تسلسل قابلِ رشک ہے۔ اِس رسالے نے مختلف حوالوں سے نعت کی جمع آوری، تخلیق، مختلف نعت گو شاعروں کے احوال اور کلام سے تعارف کے ساتھ مختلف امورِ نعت میں نعت کاروں کو منسلک اور باخبر رکھا ہوا ہے۔ شمارہ بہ شمارہ اس کی خدمات اپنی نوعیت کے حوالے سے لائق تحسین ہیں۔

''نعت رنگ'' کے کچھ مقاصد، آغاز کار ہی سے اور طرح کے ہیں۔تخلیقِ نعت اور تعارفِ شعرا و کتبِ نعت کے علاوہ اس جریدے نے تنقیداتِ نعت کے حوالے سے جو گراں قدر کام پیشِ نظر رکھا ہوا ہے ہمارے رسائل میں اس سے پہلے اس انداز کا تنقیدی کام اس تسلسل سے کہیں اور کبھی نہیں ہوا...''نعت رنگ''، نے اخلاص اور توجہ سے اِس باب میں نہ صرف یہ کہ سنجیدہ تنقیدات کو ایک مستقل فورم مہیا کیا بلکہ تاکید و توجہ سے ایسے مطالعاتِ نعت کو ایک معیار نما صورت بھی عطا کی...''نعت رنگ'' کی اشاعت کا یہ ایک اہم اور اوّلین مقصد تھا جس کا اظہار اس کے پہلے شمارے ہی میں کیا گیا تھا۔ یہ سطریں دیکھیے:

> (نعتِ رنگ)،...فروغِ نعت کے اس عہدِ زریں میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں لیکن نعت نگاری کی طرف رجوعِ عام کے اس اہم دور میں نعت کو رطب و یابس اور شعرا کے غیر محتاط رویوں سے محفوظ رکھنے کی پہلی سنجیدہ اور با قاعدہ کوشش ضرور ہے۔''
> (ابتدائیہ ''نعت رنگ''، شمارہ: ا،تنقید نمبر اپریل ۱۹۹۵ء،ص ۸)

گزشتہ سولہ سالوں میں صبیح رحمانی نے ان ادارتی مقاصد کو اپنی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیا جس کا اظہار آغاز ہی میں کر دیا گیا...یہ ایک بہت بڑا کام ہے...اور ہمیشہ رہے گا کہ نعتِ رسولِ اکرم ﷺ کو ادب و احترام کے جملہ تقاضوں کے ساتھ ساتھ ادب کے اعلیٰ معیارات سے کیسے ہم آہنگ رکھا جائے!''نعت رنگ'' کے گزشتہ ۲۱ شماروں میں چھپنے والی تنقیدات میں سیکڑوں بار اِس عزم کا نہ صرف اعادہ نظر آتا ہے بلکہ بحیثیتِ مجموعی ایک ایسی فضا بھی نظر آتی ہے جس میں اِس صنف کو ''احترام رو، اور فن آشنا''، رکھنے کی سنجیدہ اور مسلسل کوشش نظر آتی ہے۔(احترام ذاتِ رسالت مآب ﷺ کا اور فن...اعلیٰ شاعری کے جملہ اسالیب، محاسن اور معیاراتِ فن کو ملحوظ رکھنے کا...)۔

عقیدت نگاری (Devotional Poetry) کسی بھی زبان، عہد اور علاقے کی ہو اس میں موضوع کی آداب طلب نزاکتوں اور فن کے معیار خواہ تقاضوں کو ملحوظ اور متوازن رکھنے میں بڑے بڑے شاعروں سے سہو ہوا ہے۔ ہمارے ہاں غزل کے پسندیدہ چلن کے سبب ردیف و قافیہ کے التزام سے جہاں موضوعات کی فراہمی اور ان کے سمٹاؤ میں از خود بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں لغزشوں کے امکانات بھی ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ہم قافیہ شکار شاعر جب کبھی خود 'شکارِ قافیہ' ہوتے ہیں تو عقیدت آثار شاعری (حمد، نعت، منقبت، سلام وغیرہ)، میں توازن اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ

رکھنے کے ہمہ پہلو اور ہمہ وقت مطلوب رویوں سے دُور نکل جاتے ہیں... ''نعت رنگ''، میں چھپنے والی تنقیدات کا بین السطور مقصد اِسی شعور کی فراہمی ہے۔ ہم عقیدت نگاروں (نعت لکھنے والوں، نعت کی تحسین کرنے والوں، نعت پر تنقیدی اور اشاعتی کام کرنے والوں، نعت خوانی اور نعتیہ مجالس کے انعقاد کا اہتمام کرنے والوں) کو اس بارے میں محتاط رہنا چاہیے، نیز نعت کو محض ایک موضوعِ کے اظہار کا وسیلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اِس اظہار کو سخن اور فن کا درجہ دینے کے لیے ہمہ پہلو کوشاں بھی رہنا چاہیے اور اس صنف میں بین الاقوامی معیاراتِ فن اور ادبیاتِ عالیہ کے حامل نمونے تخلیق کرنے کی خواہش رکھنی اور اس کے لیے کوشش بھی کرنی چاہیے... مقدور بھر خواہش اور استعداد بھر کوشش... کہ عقیدت نگاری کے راستوں کا رخت یہی خواہش اور کوشش ہے۔ یہ قدرت اور استعداد بھی عطائے ربی کرتی ہے۔ اِس رحمت کے حصول کے لیے اخلاص سے دعا گو بھی رہنا چاہیے۔

صبیح رحمانی کی محنت اور توجہ قابلِ تعریف ہے۔ انہوں نے اپنی استعداد سے بڑھ کر کاوش کی ہے اور اپنی ذات میں ایک ادارے کا کام کیا ہے۔ تنقیداتِ نعت کے باب میں ''نعت رنگ'' کی کارکردگی کو دیکھ کر ان کے لیے دِل سے دعا نکلتی ہے۔ ان کی محنت اور مختلف مسالک سے جڑے ہوئے لوگوں کو ساتھ لے کے چلنے کے شائستہ رویوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تنقیدِ نعت جیسے نازک معاملات و مسائل سے جڑے ہوئے ہیں اور نعت کے فکری وفنی مسائل کے بارے میں مستقل غور وفکر کرتے رہتے ہیں... ''نعت رنگ'' کی ادبی میراث اور اب تک کی کارکردگی کا اندازہ ایک اور طرح بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک لمحے کے لیے سوچئے کہ اگر اس جریدے کا اجرا نہ ہوا ہوتا تو آج ہم تنقیداتِ نعت کی کن کن باریکیوں اور خوش سلیقگیوں سے محروم ہوتے؟

صنعتِ نعت کو ادبی معیارات سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے اس جریدے نے نعت کے امکانات کے حوالے سے مسلسل توجہ طلب فکری جہات اور فنی اطراف کی جس انداز میں نشان دہی کی ہے اور اس صنف میں آداب و احترام اور فکر وفن کے گوشوں کی طرف جس قرینے سے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اِس مبارک کاوش کا صحیح تخمینہ مستقبل کے ناقدینِ نعت ہی لگائیں گے؟

صبیح رحمانی نے ''نعت رنگ''، کے ابتدائیوں میں دوسروں کی گزارشات شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کا ذاتی صفحہ ہوتا ہے، جس میں اب دوسروں کے خیالات ومحسوسات کی آواز بھی سنائی دے گی۔ نعت... موضوعِ محض سے معجزۂ فن تک''، کے چند صفحات اِسی سلسلے کی کڑی

ہیں۔ یہ دراصل ایک خود کلامی ہے۔ اپنے اعتراف عجز کے ساتھ نعت کے حوالے سے کچھ کرنے کی خواہش اور کوشش کا اعادہ۔ اس دعا کے ساتھ کہ:

بجا کہ عمر ہے کوتاہ، طبع ہے سیماب
دعا یہ ہے ترے دیں سے وفا زیادہ ہو!
ہر آتا پل مجھے تیرے قریب کرتا جائے
نفس نفس تری حبِ وِلا زیادہ ہو! (ریاض مجید)

اظہاریہ

نعت... ''موضوعِ محض'' سے ''معجزۂ فن'' تک

میر تقی میر کا معروف شعر ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

بات کو ''شعر'' اور ''سخن'' کو ''فن'' کے درجے تک لے جانا ہی وہ عمل ہے جو لفظوں کے اندر جذبے کی گرمی اور تاثیر کا جادو بھر دیتا ہے یہ پُر اسرار عمل لفظوں کو گویا کرتا ہے جب کوئی ماہرِ فن خونِ جگر سے اپنے جذبوں کو آمیز کر کے کاغذ پر اُتارتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کی تحریر میں سوز و سرور کا اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تاثیر بھی دوام آشنا ہو جاتی ہے علامہ اقبال کا یہ مصرع:

معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے:

اُردو زبان میں نعتِ رسول اکرم ﷺ آغاز ہی سے ہمارے شاعروں کا پسندیدہ موضوع رہی ہے مختلف زبانوں اور علاقوں کے شاعروں نے اپنے اپنے طور پر اس موضوع کو فن بنانے کے لیے مقدور بھر کوششیں کی ہیں لیکن جیسا کہ فارسی کا مشہور ضرب المثل نما مصرع ہے:

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

ایک لفظ کے تصرف سے یوں پڑھیں تو یہ اور زیادہ حقیقت پسندانہ لگے گا:

کارِ مدحت کسے تمام نہ کرد

اپنی تمام تر صلاحیتوں کے اظہار اور فنی استعداد کے استعمال کے باوجود نعت گوئی اور ثنا گری

کا فن ہر زمانے میں اپنے تشکیلی مراحل میں رہے گا۔ یہ ہر دور میں تکمیل رو ضرور رہا ہے مگر اسے فکری کمال اور فنی معراج تک پہنچانے کا دعویٰ کبھی کسی نے نہیں کیا۔ کوئی یہ دعویٰ کر بھی نہیں سکتا اور نہ کسی کو یہ دعویٰ زیب دیتا ہے۔ اِسی حوالے سے مرزا غالب نے کیا خوب صورت اور حقیقت زاد مقطع لکھا ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

نعت کے باب میں اظہارِ عجز کے باوجود ہر نعت نگار کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور محسوسات سے حاصل ہونے والے نتائج، تجربے، زبان و بیان کی بہترین صلاحیتوں سے، اپنی نعت گوئی کے تخلیقی ماحول کو پرتاثیر بنانے کی کوشش کرے اور نعت نگاری کے فکری و فنی پہلوؤں کو ہر زاویے سے نکھارنے اور سنوارنے کے لیے نہ صرف تخلیقی صلاحیت اور دستیاب لسانی و اسلوبیاتی وسائل کو پوری توجہ اور اخلاص سے بروئے کار لانے کی کوشش کرے بلکہ اپنی سعی مشکور خواہ سے اپنے نعت پارے کو ایک معجزۂ فن بنا دے۔ مگر ایسا ہوا کم کم ہے ہماری نعت میں زیادہ تر رسمی تذکارِ سیرت و روایتی اظہارِ محبّت کی تکرار محسوس ہوتی ہے۔

تذکارِ سیرت اور اس کی تکرار بھی ایک مبارک وظیفہ ہے۔ اس کے اثرات و برکات بعض صورتوں میں نعت خوانی اور نعت گوئی سے بھی زیادہ مسلم، موثر، اور یقینی ہیں کہ تذکار میں سادگی اور اخلاص زیادہ ہوتا ہے فن کی طرف آنے میں جو محنت و مہارت ضروری ہوتی ہے اس میں بعض اوقات ان سچے جذبوں (سادگی و اخلاص)، میں نام و نمود کے عناصر بھی غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو بہر حال نہ پسندیدہ ہوتے ہیں اور نہ ان کے نتائج اتنے موثر ہوتے ہیں جتنے اخلاص سرشت ان اوراد و مشاغل کے ہوتے ہیں جنھیں سادگی سے ادا کیا جائے۔

کچھ باتیں اس لیے نہیں کی جاتیں کہ وہ ہوتی نہیں بلکہ اس لیے بھی کی جاتی ہیں کہ وہ ہماری توجہ میں رہیں اور سننے والوں کے ساتھ کہنے والا بھی ان کو دہراتا رہے۔ ہم سب نعت نگاروں کی یقیناً یہ خواہش ہے کہ ہم نعت کے فن میں بہتر سے بہتر تخلیقی کارکردگی کا مظاہرہ کریں اور حضور اکرم ﷺ سے محبّت و عقیدت کے ہر اظہاریئے کو 'معجزہ فن' کے کمال تک لے جائیں مگر اس 'خواہش' کے حصول کے لیے ہم میں سے کئی شاعروں کے ہاں اس کے مطابق کوشش نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں ہم سے غیر محسوس طور پر ایک کوتاہی ہو رہی ہے۔ مجھے اخبارات و رسائل میں چھپنے والی کئی نعتوں میں کہیں

کہیں غیر ارادی طور پر ہی سہی، روا رکھے جانے والے ایک سرسری پن کا احساس ہمیشہ رُلاتا ہے۔

نعت کے فن پر ملنے والے تنقیدی جملوں، مضمونوں مقالوں اور تاثرات سے شروع ہی میں اس بات کو بہ تکرار بیان کیا جاتا رہا ہے کہ نعت محض ایک موضوع نہیں ایک فنی کل (whole) ہے ایک ایسی تخلیقی اور نامیاتی وحدت، جس میں خیال، لفظ، اسلوب ہیئت آہنگ اور دوسرے اسلوبیاتی وسائل اور شعری محاسن، ایک موثر فنی اکائی کی طرح تخلیق یاب ہوتے ہیں نعتِ رسول اکرم ﷺ کا مرکزی ومحوری موضوع آپ کی ذاتِ گرامی سے محبّت کا اظہار اور آپ کی شخصیتِ ستودہ صفات کا تذکار رہے۔ اس موضوع سے ہزاروں مضامین نے جنم لیا آپ کے پیغام، اسلامی شعائر، دینی اقدار سبھی کچھ نعت کے فکری نظام کا حصہ بنے اور اس کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر اُمتِ مسلمہ کے افراد اور مملکتوں کو درپیش امور ومسائل بھی شعری قرینے اور تخلیقی انداز سے نعت کے مضامین میں شاملِ ہوتے گئے خصوصاً حصولِ ثواب اور برکت طلبی کے جذبے کے ساتھ ساتھ مشکلات وآلام اور مصائب وآشوب میں آپ ﷺ کی ذات والا تبار سے استغاثہ اور استمداد کے موضوعات بھی 'عقیدت' کے اس اظہار اور سیرتِ طیبہ کے اس تذکار ہی شامل ہوتے گئے۔

ورڈز ورتھ نے شاعری کو تمام علمِ انسانی کی جان اور اس کی لطیف ترین روح سے تعبیر کیا ہے نعت کی شاعری اہلِ ایمان کے لیے اس سے بھی آگے کی چیز ہے کہ انسانی علوم کے ماحصل کا تخلیقی اظہار اپنے لطیف ترین تلازمات کے ساتھ جملہ فکری وفنی محاسن سے آمیز ہوکر اس صنف میں ظہور کرنے کے جتنے امکانات رکھتا ہے دوسری اصناف میں نہیں۔ ایسا اکثر نہ ہو، مگر عربی فارسی اور اُردو کے علاوہ پاکستان کی دوسری زبانوں میں کہیں کہیں ایسے نمونے ضرور مل جاتے ہیں جو اِن امکانات کا راستہ سجھاتے ہیں علامہ اقبال کی معروف نعتیہ نظم ''ذوق وشوق'' ایسے امکانی اور (ادبیات عالیہ کے حوالے سے) آفاقی عناصر سے لبریز ہے جس میں جذبات عقیدت کے ساتھ تہذیبی، تمدنی اور تاریخی حوالوں کی لو جھلکتی ہے۔ اس نظم کی عمدہ ڈرافٹنگ، بندوار فکری محاسن، ٹیپ کے (باررديف) اشعار کی بلیغ معنی آفرینی جواوپر کے (غیر مردف) اشعار کے سلسلہ ہائے خیالات کو مربوط اور منضبط (sizeable) کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ نظم کے مخصوص آہنگ (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) ...[جس میں مسجدِ قرطبہ کے (مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن) کے جلالی آہنگ کے برعکس] جمالی پہلو نمایاں ہے...'ذوق وشوق'، کو معجزۂ فن کے درجہ پر فائز کردیتا ہے۔

علامہ اقبال ہی کی نعتیہ عناصر پر مشتمل نظموں میں ''حضورِ رسالت مآب میں'' اپنے ڈرامائی اسلوب اور مکالماتی انداز کی حامل ایسی نظم ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنی معنویت اور تکنیک کے لحاظ سے بہت موثر نظم ہے خصوصاً اس کا آخری شعر جس میں نظم کی بلیغ تہ داریت کو ایک بے اظہار مگر واضح استمداد اور استغاثہ کی صورت دی گئی ہے۔اردو نعتیہ شاعری میں یہ مؤثر جذباتی تحرک (emotinal vibration) کی ایک عمدہ مثال ہے جو اپنے استعاراتی بہاؤ اور تلازماتی وسعت میں قاری کو اُمتِ مسلمہ کے ایک اہم تاریخی منظرنامے میں لے جاتی ہے۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

طرابلس کے مکانی ماحول سے ''حضورِ رسالت مآبﷺ'' کی ماورائے زمانہ تک وسیع فضا تک جہاں اقبال یہ مکالمہ کر رہے ہیں ایک جہانِ محسوسات پھیلا ہوا ہے جس کی معنویت یک سطحی (Flat) انداز کی نہیں تلازمہ در تلازمہ بلیغ تہہ داریت کی حامل ہے یہ نعتیہ نظم مختصر ہونے کے باوجود اپنے فکری وفنی محاسن اور سیاسی و تاریخی تلازموں کی اہمیت کے سبب ایک جداگانہ مضمون کی متقاضی ہے۔

علامہ اقبال کی یہ نظم اردو نعتیہ شاعری کے تخلیقی تناظر میں بلاشبہ ایک عمدہ اور مثالی نظم ہے (Vintage poem) ہے جس کا مطالعہ، نعت کے قاری کو مدتوں ایک تمجیدی اداسی (celestial pathos) میں محصور رکھتا ہے...دیکھیے اقبال نعت کے موضوع کو فن کے کس مقام پر لے گئے ہیں؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مادی طور پر بہت ترقی کرنے کے باوجود بھی نہ اپنی مرضی سے کوئی شے یا خیال سوچ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی سوچوں کے خدوخال میں حسبِ خواہش کوئی منفرد ردّ وبدل کر سکتا ہے یہ ایک جبلی اور نفسیاتی جبر ہے کہ وہ وہی کچھ سوچ سکتا ہے جو سوچ رہا ہوتا ہے جس طرح کا مزاج اور ذہنی استعداد اسے قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔اس کے فکر وفن کا سارا سفر اِسی عطا شدہ تخلیقی واسلوبیاتی وسائل کے دائرے میں طے ہوتا ہے علامہ اقبال جیسے بڑے شاعروں اور فنکاروں کا فن عطائے خداوندی میں شمار ہوتا ہے۔محسوسات اور اظہار کے جس مقام پر اقبال کھڑے ہیں وہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔مگر یہ بات بھی درست ہے کہ ریاضت، مہارت، زبان و بیان کے محاسن کے حصول کے لیے مسلسل تگ ودو اور فکر وفن میں تازہ کاری کے لیے کوشاں رہنے کا اپنا صلہ اور اجر ہے جو تخلیق کو کچھ حد تک نکھارتا اور اظہار کو تھوڑا سا سنوارتا ضرور ہے۔میرزا سودا کے

لفظوں میں پتھر کو صیقل کرنے سے پتھر زیادہ سے زیادہ آئینہ بن جائے گا مگر جوہر یا موتی نہیں کہ اس کی اصل اس کی فطرت سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہنر سے دور ہے بد اصل کی فطرت کہ آئینہ
خمیرِ سنگ سے بنتا ہے تو جوہر نہیں ہوتا

نعت کے باب میں ہمیں کس انداز سے کوشاں رہنا چاہیے؟ اس کے لیے کوئی باقاعدہ نظامِ تخلیق تو وضع نہیں کیا جا سکتا ہر نعت نگار کا اسلوب اور اس کی تخلیقی استعداد دوسروں سے مختلف ہوتی ہے مگر یہ بات کبھی کبھار ادا س کرتی ہے کہ نعت کے معاصر منظر نامے میں کئی نعت نگار ایک جیسے موضوعات کے بیانیہ دائرے میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ خیالات، تراکیب، ردیف وقوافی کی تکرار، بحور واوزان کی یکسانیت نے بہت سی نعتیہ شاعری کو ایک جیسا کر دیا ہے نعت کے فن میں موضوعات و مضامین کی یہ یکسانیت کچھ فطری بھی ہو سکتی ہے کہ نعت کا فکری دائرہ جتنا بھی وسیع ہو جائے نعت نگار کا مائل بہ مرکز ہونا اور رہنا اس صنف کا لازمۂ فن ہے۔ یہ مرکز وہ نسبتِ طیبہ ہے جو اس صنف کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کے تذکارِ مبارک سے جوڑے رکھتی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی نعت میں سچے تخلیقی تجربوں کی نادرہ کاری کم کم نظر آتی ہے۔

نعتیہ مضامین کے اظہار میں تازہ کاری کے لیے مقدور بھر کوشاں رہنا ہم سب کے لیے ضروری ہے تازہ تراکیب نئے نئے اسمائے مبارکہ کی تخلیق اور تلاش، آہنگ واوزان کے تجربے، بلیغ اور پُر تاثیر شعری زمینوں کی دریافت، جدید شعری اصناف کو نعتیہ مضامین کے لیے رواج دینے کی کوشش دوسری زبانوں کے نعتیہ کلام کے تعارف وتراجم اور طویل یک کتابی نعتیہ نظموں کی منصوبہ بندی، سیرتِ طیبہ کے تذکارِ مبارک کے ساتھ جدید دور میں اُمتِ مسلمہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے لیے اِس صنف میں ایک پُر تاثیر قرینے سے استغاثہ واستمداد کے مضامین کی آمیزش، ذاتی کردار سازی سے جہاں بانی تک کے پھیلے ہوئے مضامین وموضوعات کو اسلوبیاتی محاسن کے ساتھ نعت سے منسلک رکھنے کی کوشش تخلیقِ نعت کے مراحل میں ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے...نعت کی صنف آج ہم سب سے ہمہ جہت توجہ چاہتی ہے۔

محسن کاکوروی امیر مینائی، مولانا احمد رضا خاں، ظفر علی خاں، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حافظ لدھیانوی، صوفی محمد افضل فقیر، حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد، ابوالخیر کشفی، مظفرؔ وارثی،

عاصی کرنالی... کیسے کیسے نعت کاروں نے خونِ جگر سے اس صنف کی آبیاری کی ہے؟ نعتیہ مضامین کے اظہار کے حوالے سے اِن اکابرینِ نعت کے فکر وفن کا گہرا اور مستقل مطالعہ ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔

محبّت کے جذبے ازلی وابدی ہوتے ہیں...غیر مبدل...مگر ان کا اظہار سچا تخلیقی تجربہ اور تازہ کاری چاہتا ہے کہ اِس سے تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے نعت میں احترام رسالت مآب کا جذبہ ہمہ پہلو اور مسلسل توجہ طلب مسئلہ ہے۔ نعت کے مضامین وموضوعات کے اظہار میں ترجیحات نظرانداز نہیں ہونی چاہیں جذبے کا انہماک مبارک مگر جذبہ اطاعت نثراد اور محبّت تقلید سرشت ہونی چاہیے عقیدت کا اظہار جس بھی والہانہ پن سے ہو اس کا وفور اگر عقیدے کو مسخ کر جائے تو یہ ایسی کوشش اور محنت کس کام کی؟ گفتار و کردار اور قول وعمل کی مغائرت کسی شعبہ حیات میں کبھی بھی پسندیدہ نہیں رہی۔ نعت کے نازک اور مبارک فن میں اچھے ثمرات کیسے پیدا کرسکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم نعت کاروں کو اخلاص کی نعمت اور تخلیقی نادرہ کاری کی صلاحیت سے نوازے۔ آمین!

ریاض مجید

اپنی بات

''نعت رنگ'' ایک بار پھر خاصی تاخیر کا شکار ہو گیا۔ سوچتا ہوں کہاں تک اس تاخیر کے لیے معذرت کے بے جان لفظ تلاش کیے جائیں! حالات وواقعات وہی ہیں جن کا اعادہ وقت کا کوئی مثبت استعمال نہیں ہے۔ غالب نے کہا تھا:

حالِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

''نعت رنگ'' ایک موضوعی جریدہ ہے۔ سواس کے مشمولات میں تنوع پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ''نعت رنگ'' میں ہر بار تازگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا سامنے آتا رہے جس میں قارئین کا تجسّس برقرار رہے۔ کچھ عرصہ قبل ہم نے ''نعت رنگ'' میں جاری دیگر سلسلوں کے درمیان نعت شناسی کو شامل کیا تھا اور اسے خاصی اہمیت دی تا کہ نعت پر مستقل کام کرنے والے پزیرائی اور حوصلہ افزائی کی اس فضا میں تازہ دم رہیں اور نئے نعت کار بھی اپنے بزرگوں کے

محنت، لگن اور قبولیت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ رہتے ہوئے اپنے سفر کا آغاز کریں۔ ہمیں خوشی ہے "نعت رنگ" نے معاصر نعت شناسوں کی حوصلہ افزائی کا جو سلسلہ شروع کیا اسے پسند کیا گیا۔

زیرِ نظر شمارے سے ہم ایک اور نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جس میں ہر شمارے میں ایک مہمان مدیر کو بطورِ خاص "نعت رنگ" کی محفل میں شامل کیا جائے گا اور ان سے درخواست کی جائے گی کہ وہ "نعت رنگ" کے اب تک کے سفر کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری رہنمائی فرمائیں کہ نعت گوئی پر تنقید، تحقیق اور تخلیق کے کارواں کو مستقبل میں کن بلند منازل کی جانب پیش قدمی کرنی چاہیے کون سے مسائل ہماری فوری توجہ چاہتے ہیں اور کن پہلوؤں پر خصوصی توجہ سے نعت فہمی کا دائرہ مزید وسیع کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں خوشی ہے ڈاکٹر ریاض مجید ہماری اس محفل میں مہمان مدیر کی حیثیت سے شریک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ہمارے ادبی مناظر نامے کی ایک اہم اور توانا آواز ہیں بلکہ بطور نعت شناس بھی نہایت معتبر اور قابلِ احترام ہیں۔ انھوں نے عصرِ حاضر کے نعت نگاروں کو جن امور کی طرف متوجہ کیا ہے ان پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے نعت کے فنی و فکری محاسن کے دائرے کو وسیع تر کرنا ہماری اوّلین ترجیح ہونا چاہیے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس رہنمائی پر ممنون ہیں۔

"نعت رنگ" کے دیگر سلسلے اور لکھنے والے آپ کے لیے نئے نہیں اس لیے ان کا تعارف یا مضامین کے حوالے سے کسی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ ان تمام قلم کاروں کی صلاحیتوں، حیثیتوں اور کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ ہاں ڈاکٹر شعیب نگرامی "نعت رنگ" کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں، وہ جدہ میں مقیم ہیں اور ایک مذہبی اسکالر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا مضمون "نعتِ نبوی اور توحید و رسالت کے مابین فرق کی اہمیت" ایک خاص مسلک و مکتبِ فکر کی واضح ترجمانی اور بعض مقامات پر سخت بیانی کے باوجود ایک اہم اور توجہ طلب مضمون ہے۔ "نعت رنگ" کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ہم نعت پر ہونے والی گفتگو اور اس ضمن میں چھڑنے والے مباحث کو اُمتِ مسلمہ کے مختلف مکاتیبِ فکر اور مسلک سے تعلّق رکھنے والوں کے درمیان مکالمہ بنا سکیں اور "نعت رنگ" کے شمارے اس امر کے گواہ ہیں کہ ہم اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں سو ڈاکٹر شعیب نگرامی کا مضمون بھی اس حوالے سے ہماری خصوصی کا مستحق ہے۔

''نعت رنگ'' ۲۱ اور ۲۲ کے درمیان اشاعتی وقفہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا اور اس عرصے میں نعت کے منظرنامے سے کئی اہم اور عہد آفریں شخصیات اُٹھ کر موت کی تاریکی میں گم ہوگئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان احباب کی یاد مدتوں دل کا زخم بنی رہے گی لیکن جب نظر ان کے کارہائے نمایاں پر پڑتی ہے تو کچھ حوصلہ ہوتا ہے کہ ان کے کام کی روشنی ہمیشہ باقی رہے گی اور ہمارے لیے رہنما بھی۔ بقولِ اقبال عظیم:

دے گئے اقبال ہم کو زندگی
زندۂ جاوید کچھ مرحوم لوگ

پروفیسر شفقت رضوی (مرحوم)

اُردو کے ممتاز محقق، نقاد، افسانہ نگار اور نہایت اہم نعت شناس پروفیسر شفقت رضوی ۲۸ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کا بنیادی شعبہ تدریس تھا لیکن انھوں نے شروع سے اپنی تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں پر بھی بھرپور توجہ دی۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے لیکن جلد ہی تحقیق وتنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور اتنے انہماک اور دل جمعی کے ساتھ کام کیا کہ مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً چوبیس کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ان میں دکنیات پر پانچ، حسرت شناسی پر آٹھ اور متفرق موضوعات پر آٹھ کتب شامل ہیں جب کہ نعت شناسی کے حوالے سے ان کی کتب ''اردو میں نعت گوئی''، ''اردو میں حمد گوئی'' اور ''نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ'' شامل ہیں۔ شفقت رضوی نہایت منکسر المزاج اور گوشہ نشیں طبیعت کے مالک تھے۔ میری ان سے ملاقات ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ میں نے انھیں ''نعت رنگ'' کے دو شمارے پیش کیے اور پھر ایک تعلّق قائم ہوگیا۔ میں گاہے گاہے انھیں نعت کے حوالے سے کتب فراہم کرتا رہا اور پھر اللہ کی رحمت سے وہ نعت شناسی کی طرف متوجہ ہوئے اور تواتر سے اس موضوع پر لکھنے لگے۔ وہ نہایت غیر جانب دار اور جارح مبصّر و نقاد کے طور پر سامنے آئے جس کے لیے شعبۂ نعت کے اکثر احباب ذہنی طور پر تیار نہ تھے، کیوں کہ یہاں تو دل جوئی کا موسم صدیوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھا سو میں نے اور شفقت رضوی نے کئی دیرینہ دوست کھو دیے انھوں نے ''نعت رنگ'' کے لیے بہت لکھا طویل جائزے، مضامین، تبصرے، دریافت کے عنوان سے کئی اہم اور نادر نعتیہ شہ پاروں کی تلاش اور

تعارف ہر شمارے میں ان کی کوئی نہ کوئی تحریر شائع ہونے لگی اور یوں نعتیہ ادب کو ایک معتبر اور صاحب الرائے نعت شناس مل گیا۔ ۲۰۰۴ء میں ان کی کتاب ''نعت رنگ کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی جس میں انھوں نے ''نعت رنگ'' کے پندرہ شماروں کے مشمولات کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس جائزے میں تنقیداتِ نعت پر خصوصی توجہ دی۔ ''نعت رنگ'' میں نعت کے فنی اور فکری مسائل پر چھڑنے والے مختلف مباحث پر گہری نظر ڈالتے ہوئے آپ نے فریقین کے موقف کو واضح کیا اور پھر آخر میں تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے بھی پیش کی۔ یوں یہ کتاب نعتیہ ادب میں تنقید پر تنقید کے ادبی وتنقیدی رویوں کو سامنے لاتے ہوئے ایک اہم اور حوالہ جاتی کتاب قرار پائی۔ آخر میں شفقت رضوی نے پندرہ شماروں کا اشاریہ بھی شامل کتاب کیا جس سے کتاب مزید وقیع اور مصنّف زیادہ معتبر ہو کر نمایاں ہوئے۔ کچھ عرصے بعد انھیں اپنے بچوں کے ساتھ امریکا منتقل ہونا پڑا۔ اس تبدیلی کے لیے نہ وہ قلبی طور پر آمادہ تھے نہ ذہنی طور پر، امریکا سے اکثر ان کے خطوط موصول ہوتے رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ وہاں خوش نہیں ہیں۔ زندگی بھر کام کی دھن اور لگن میں وہ قرطاس وقلم سے ایسے وابستہ ہو چکے تھے کہ اب اس سے وقتی جدائی بھی انھیں ناآسودہ کر دیتی تھیں۔ میں اکثر انھیں یہاں سے کتب ارسال کرتا جس پر اپنی رائے کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتے تھے۔ گویا یہ علمی تحفے انھیں وہاں تر وتازہ رکھنے کا کام سرانجام دیتے تھے لیکن وہ وہاں بھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے اپنی یادداشتیں مرتب کرنا شروع کر دی اور اس کے کچھ حصے انھوں نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کو ارسال بھی کیے اور ''نعت رنگ'' کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ برکت اللہ بھوپالی اور حسرت کی صحافیانہ زندگی پر بھی انھوں نے کتابیں وہیں مرتب کی پھر اچانک ان کی طبیعت کی خرابی اور وطن واپسی کی خبر آئی۔ ڈیفنس میں اپنے ایک دوست پروفیسر انیس زیدی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وطن کی محبّت انھیں واپس کھینچ لائی ہے اور یہاں رہ کر مزید کام کرنے کے آرزومند ہیں۔ مجھ سے کہا کہ کوئی موضوع دو، میں حج پر جانے والا تھا میں نے انھیں کافی مرادآبادی کی کتب کی عکسی نقول دی اور کہا اس پر کام کریں۔ بخوشی راضی ہو گئے کوئی بیالیس دن بعد میں واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ طبیعت بہت خراب ہے اور آئی سی یو (ICU) میں ہیں۔ ہسپتال گیا مگر ملاقات نہ ہو سکی گھر چلا آیا، اسی رات یہ اطلاع آ گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اپنے کسی خط میں انھوں نے مجھے ایک شعر لکھا تھا جو آج ان کے نصب العین کے طور پر ذہن میں تازہ ہو رہا ہے:

کچھ ایسے کام کرلو جو تم کو زندہ رکھیں
صدیاں کشید کرلو لمحوں کی زندگی سے

شفقت رضوی اپنے اس نصب العین میں کامیاب رہے اس کا گواہ صرف میں ہی نہیں ہماری پوری ادبی دنیا ہے۔

مظفّر وارثی (مرحوم)

مظفّر وارثی اُفقِ نعت پر اپنے والہانہ پن، اپنی مترنم بحور اور خوب صورت اور تازہ کار شعری اسلوب کی وجہ سے ایک جداگانہ شناخت رکھتے تھے۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے انھوں نے اپنے شعری وجود کو منوانے کے لیے غزلیں کہیں، فلمی گیت لکھے، قطعات کہے ہر وہ کوشش و کاوش جو ایک شاعر وادیٔ حرف و لفظ میں زندہ نقش قائم کرنے کی تمنا میں کرتا ہے مظفّر وارثی نے بھی کیں، لیکن قدرت ان کے اس سارے شعری سفر کو راستہ بنا کر منزلِ ذکر نبی کریم ﷺ کو قرار دیا اور یہیں سے مظفّر وارثی کی خوش بختی نمایاں ہوتی چلی گئی۔ انھیں مدحت مصطفیٰ ﷺ کے لیے چن لیا گیا تھا اور اس کے اشارے انھیں خواص و عوام کے انداز پذیرائی سے ملنا شروع ہوئے تھے۔ وہ بہت جلد ہی اس شعور کو پا گئے کہ نعت ہی ان کے قلم کی آبرو ہے۔ ۱۹۷۲ء میں مظفّر وارثی نے خود کو نعت کے لیے وقف کر دیا اور قدرت نے عزت، شہرت، نیک نامی اور مقبولیت کی نعمتوں سے ان کا دامن مالا مال کر دیا۔

غزل میں بھی مظفّر وارثی حق بات کہتے تھے
مگر پھر بھی ہماری نعت غزلوں کی تلافی ہے

اس خلوص اور یقین نے ان کے اندازِ ثنا گوئی کو مزید نکھار عطا کیا اور انھوں نے بابِ حرم نورِ ازل، الحمد، کعبۂ عشق، دل سے درِ نبی تک، میرے اچھے رسول، صاحب التاج اور اُمی لقبی کے نام سے اپنے کئی شعری نذرانے کتابی صورت میں پیش کر کے اپنی عقیدتوں کو نمایاں کیا۔ ان کی نعت گوئی نعتیہ ادب میں بیان کی تازگی، عشق کی سرشاری اور والہانہ پن کے باب میں ہمیشہ حوالہ بنتی رہے گی۔ ان کی آواز کی مٹھاس اور مخصوص و دل نشیں ترنم ان کی نعت کے وسیع تر ابلاغ میں معاونت کے ساتھ ساتھ مقبولیت میں اضافے کا باعث بنا اور ان کی آواز میں ان کی نعتیہ نظمیں اور نعتیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ حکومتی ایوانوں سے لے کر اسکولوں اور کالجوں تک ان کی گونج سنائی دیتی تھی خواص اور عوام میں مقبولیت اور پزیرائی کی کوئی ایسی دوسرے مثال ہمارے سامنے نہیں۔

''نعت رنگ'' سے انھیں خاص محبّت تھی اور اس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ تحریری طور پر بھی کیا اور اکثر خطوط میں اپنی محبّتوں، مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازتے رہے۔ جب میں بطورِ پروڈیوسر کیوٹی وی (Qtv) میں آیا تو میں نے عصرِ حاضر کے بارہ مقبول نعت گو شعرا پر پروگرام ریکارڈ کرنے کا ارادہ کیا، اسی سلسلے کا ایک پروگرام مظفّر وارثی صاحب کے ساتھ بھی ریکارڈ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ باوجود علالت کے اس پروگرام میں تشریف لائے اور آخر تک موجود رہے۔ یاد کرتا ہوں تو اس محفل کا تقدس اور روحانیت آج بھی قلب پر سکینت بن کر برسنے لگتے ہیں۔ ساری محفل میں سرشاری کی ایک فضا قائم تھی۔ مظفّر وارثی صاحب نعت خوانوں سے اپنی نعتیں سن کر خود بھی اشکبار ہوتے رہے اور حاضرین وسامعین کو بھی رُلاتے رہے۔ پروگرام کے اختتام پر جب میں ان سے ملا تو وہ دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میری طرف دیکھتے رہے۔ گویائی سلب ہو چکی تھی لیکن آنکھوں کی نمی اور چہرے کا اطمینان مجھ سے مخاطب تھے۔

لکھی ہے ہر ورق پہ محمدؐ کی داستاں
پڑھتا رہے گا وقت جسے وہ کتاب ہوں

میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں، پھر ۲۸ر جنوری ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد میں خبر ملی کہ باغِ رسالت کا یہ خوش نوا عندلیب اس یقین کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔

مجھ کو نہ کر سکے گی جدا ان سے موت بھی
دریائے کائنات ہیں وہ میں حباب ہوں

پروفیسر جعفر بلوچ (مرحوم)

دوستو جشنِ تعیّش میں نہ لے جاؤ مجھے
مجھ کو فقرِ شہِ والا سے حیا آتی ہے

وادیٔ نعت میں اس طہارتِ فکر ونظر اور نازک خیالی کے ساتھ داخل ہونے اردو کے ممتاز اور پختہ کار نعت گو جعفر بلوچ ۲۷ر اگست ۲۰۰۸ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ بیعت ان کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جسے جدید اردو نعت کے نمائندہ مجموعوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں بے ساختگی، ردیفوں کی ندرت، قوافی کی جدت گہری اور معنی خیز رعایتیں اور تراکیب کی تازہ کاری انھیں ایک صاحبِ اسلوب شاعر کی حیثیت سے نعتیہ منظر نامے پر نمایاں کرتی ہیں۔ جعفر بلوچ بطورِ نعت

شناس بھی خاصے فعال رہے، اس حوالے سے ان کے اکثر مضامین ''شام وسحر'' کے نعت نمبروں، سیارہ کی مختلف اشاعتوں اور ''نعت رنگ'' کے صفحات پر آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ''نعت رنگ'' سے بھی ان کا گہرا تعلّق رہا۔ انھوں نے ''نعت رنگ'' میں اور ''نعت رنگ'' پر بہت کچھ لکھ کر ہمیشہ اپنی محبّتوں سے نوازا۔ آج بھی ان لمحات کو یاد کرکے آنکھیں بھر آتی ہیں جب ڈاکٹر تحسین فراقی، پروفیسر حفیظ تائب، پروفیسر جعفر بلوچ اور میں، لاہور میں اکٹھّے ہو کر کہیں کھانے پر جاتے اور گھنٹوں ''نعت رنگ'' اور نعت کے فروغ کے امکانات پر گفتگو رہتی۔ تب کھلتا کہ جعفر بلوچ کی تنقیدی نظر بھی اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کتنی گہری ہے۔ نعت کا یہ عظیم خدمت گزار جاتے ہوئے کتنی خوب صورت تمنا کو زادِراہ کے طور پر ساتھ لے گیا، اللہ اکبر!

میرا ہو یہی سرورق نامہ اعمال
نعت آپ کی مجھ کو علم فتح مبیں ہو

ڈاکٹر عاصی کرنالی (مرحوم)

اس شہر میں ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں صدیاں
اک لمحہ گزر جائے اگر بے خبری کا

مدینۃ الرسول کے ادب پر مبنی یہ نازک سا شعری احساس ہر بار حاضری کو ادب کی نئی لطافتوں سے ہم کنار کرتا ہے اور یوں عاصی کرنالی حضوری کے تجلّی آثار موسموں میں چھپکے سے میرے ہمراہ ہو لیتے ہیں کسی نعت گو کے لیے یہ انعام کم نہیں کہ وہ اپنے شعر کے ساتھ سفر کرتا ہوا آقا کریم ﷺ کی بارگاہ میں زائرین کے دل ودماغ میں موجود رہ کر حاضری دینے لگے۔

عاصی کرنالی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل کٹتا ہے، کتنے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی تھے جو ایک بار ان سے مل لے ان کا ہو جاتا تھا۔ شوخی، ذہانت، جملے بازی، خوش اخلاقی اور دل جوئی جیسے اوصاف نے مل کر عاصی صاحب کو باغ و بہار شخصیت بنا دیا تھا۔ تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، سفرنامہ، غزلیں، مناقب، مراثی، انھوں نے جس طرف رُخ کیا اپنے جوہرِ تخلیق سے گلستاں آباد کیے مگر نعت ان کے مزاج میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ ان کے سرمایہ تخلیق کا غالب حصہ ہمیں نعت ہی پر مشتمل نظر آتا ہے۔ ''مدحت''، ''نعتوں کے گلاب''، ''حرفِ شیریں'' اور ''آوازِ دل'' ان کی نعتوں کے مجموعے اور ان کی عقیدتوں کا شعری منظرنامہ ہیں۔ تقریباً سو سے زیادہ کتب نعت پر ان مقدمے،

مضامین اور فلیپ موجود ہیں۔ معاصر رسائل و جرائد میں نعتیہ ادب پر ان کے مضامین گاہے گاہے شائع ہوتے رہے۔ ''نعت رنگ'' کے آغاز ہی سے وہ اس تحریک کا حصہ رہے اور قلمی سرپرستی کرتے رہے۔ ان کے کئی مضامین ''نعت رنگ'' میں بھی شائع ہوئے۔ شعبۂ تدریس سے وابستہ تھے، مگر نعت سے اخلاص دیکھیے کہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ''اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ مقالہ ''اقلیم نعت'' نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ ۲۰ر جنوری ۲۰۱۱ء کو اپنی تخلیقی زرخیزی سے نعتیہ شاعری سنوارنے اور نکھارنے والا یہ خوب صورت اور صاحبِ اسلوب شاعر اپنی نعت گوئی کو اپنی عاقبت کا توشہ بنا کر یقین کی اس روشنی کے ہمراہ قبر کی تاریکی میں جا سویا:

کفن میں رکھ لیا تھا ایک کاغذ نعتِ روشن کا
یہ کاغذ قبر کی ظلمت میں عاصیؔ میرے کام آیا

عبدالعزیز خالد (مرحوم)

عبدالعزیز خالد بھی ۲۸ر جنوری ۲۰۱۰ء کو ہم سے جدا ہوگئے وہ اردو کے منفرد شاعر تھے۔ کئی زبانوں سے واقفیت اور کئی تہذیبوں کے گہرے تاریخی اور سماجی مطالعے نے ان کے شعری اسلوب کو ایک ایسا منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا تھا جس کی مثال ہمیں اردو کے شعری سرمائے میں اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ انھوں نے عوامی مقبولیت اور حصولِ شہرت کے لیے کسی خارجی معیار کی پروا نہیں کی وہ موضوع بھی اپنی مرضی کا تلاش کرتے تھے اور اظہارِ خیال کا اسلوب اور لہجہ بھی اپنا ہی رکھتے تھے۔ نعت گوئی کے حوالے سے بھی عبدالعزیز خالد کا کام خاصا وقیع ہے۔ انھیں اس موضوع سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کے نعتیہ شعری مجموعے فارقلیط، ماذ ماذ، منحمنا، حمطایا اور عبدہ اردو نعت کے کینوس کو وسیع تر کرنے کی کامیاب کاوشیں ہیں۔ عبدہ میں انتساب کے نام سے شامل ایک طویل نظم میں سے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

میں نے لکھا ہے مجبوب اس کتابِ نعت کو:

اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ محبّت کے لیے — اہلِ دانش اہلِ درد اہلِ درایت کے لیے
اہلِ نور اہلِ شعور اہلِ شہادت کے لیے — اہلِ حق اہلِ یقیں اہلِ امانت کے لیے
سرفروشانِ وقارِ آدمیت کے لیے — عاشقانِ حسن و احسان و صداقت کے لیے

داعیانِ دعوت احیائے اُمت کے لیے　　وارثانِ ورثہ توحید و طاعت کے لیے
گشتگانِ نام و ناموس رسالت کے لیے　　ہے یہی فردِعمل مری قیامت کے لیے

پیش کرتا ہوں جیسے مہر نبوت کے لیے
ازرہِ تصدیق تم بھی دستخط اس پر کرو

آیئے ہم سب اُردو کے اس منفرد نعت کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے ان کی اس خواہش کو پورا کریں۔

شبنم رومانی (مرحوم)

کریں زیارت سرکار کی دعائیں ہم　　مگر وہ ہاتھ وہ آنکھیں کہاں سے لائیں ہم
بس اک لباس ہمارا لباس عشق رسول　　رتوں کے ساتھ بدلتے نہیں قبائیں ہم

بس ایک راہ ہماری، صراط مصطفوی
کبھی بھٹک کے نہ جائیں گے دائیں بائیں ہم

جب بھی شبنم بھائی یاد آتے ہیں ان چند شعروں کی گنگناہٹ مجھے اپنی روح میں محسوس ہوتی ہے۔شبنم رومانی جتنے خوب صورت اور نازک احساسات کے شاعر تھے اتنی ہی خوب صورتی اور نفاست ان کی شخصیت اور کردار میں تھی نوجوان شعرا کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی انھوں نے خود پر فرض کر لی تھی اور یہ فرض وہ اپنے ادبی رسالے ''اقدار'' سے آخری عمر تک ادا کرتے رہے۔تمام عمر رومانی غزلیں لکھیں لیکن پیر فاروق رحمانی مدظلہ کی صحبت اور قربت نے انھیں نعت کی طرف بالالتزام متوجہ کیا۔نعت وہ پہلے بھی کہتے تھے مگر رحمانی سلسلے میں بیعت ہونے کے بعد ان کی نعت فکری سطح پر مزید گہری اور فنی سطح پر اور زیادہ روشن ہوگئی تھی۔انھوں نے غزلیہ انداز میں بھی خوب صورت نعتیں لکھیں مگر ان کی نعتیہ نظموں نے مجھے ہمیشہ زیادہ متاثر کیا۔۱۹۹۵ء میں شبنم بھائی، محسن بھوپالی، عزیز احسن، شمس وارثی، وضاحت نسیم اور مجھے ایک ساتھ حج کی سعادت ملی اور مکہ مکرمہ میں ایک خصوصی مشاعرے میں ہم سب نے نذرانہ نعت پیش کیا۔سب شعرا نے اپنی باری پر کلام پیش کیا، شبنم بھائی صدر مشاعرہ تھے انھوں نے بحثیت صدر مشاعرہ کلام پیش کرنے سے پہلے ایک بار پھر مجھے پڑھنے کا حکم دیا اور دیر تک مجھ سے نعتیں پڑھواتے رہے، درحقیقت یہ ان کا چھوٹوں سے پیار اور ذکر نبی کریم ﷺ سے ایک تعلّق کا اظہار تھا، وہ بعد میں بھی کئی مقامات پر اس محبّت کا اظہار کرتے رہے۔اکثر مجھ سے اپنے

نعتیہ مجموعے کی اشاعت پر بات کرتے جس کا نام انھوں نے ''عطر خیال'' سوچا ہوا تھا۔ میں نے ان کی نعتوں کا ایک گوشہ ''نعت رنگ'' شمارہ۲ میں شائع کیا گیا تھا جسے بہت پسند کیا گیا خدا کرے ان کے متعلقین ان کے نعتیہ سرمائے کو جلد شائع کروانے کی سعی فرمائیں۔ ۱۷رفروری ۲۰۰۹ء کو شبنم بھائی ہم سے جدا ہوئے خدا کرے انھیں ان کے مرشد کی یہ بشارت منزل نجات تک پہنچادے۔ آمین

کہا یہ مجھ سے مرے مرشد گرامی
کہ جا! یہ نعت ہی پروانہ نجات ہوئی

راغب مراد آبادی (مرحوم)

راغب مراد آبادی کا شمار عصرِ حاضر کے قادرالکلام شعرا میں ہوتا تھا۔ مختلف اصنافِ شاعری میں ان کا بہت سا کام سامنے آتا رہا مگر ان رُباعی گوئی اور عروض دانی کا ایک زمانہ معترف تھا، نعت ان کا محبوب موضوع رہی۔ سو نعتیہ اشعار (۱۹۷۸ء) مدحت خیر البشر (۱۹۷۹ء) غالب کی زمینوں میں نعتیں) مدحِ رسول (۱۹۸۳ء صنعت غیر منقوطہ میں نعتیں اور رُباعیاں) بحضور خاتم الانبیاء (۱۹۸۶ء) بدرالدجیٰ (۱۹۹۱ء) ایک انتخابِ نعت ''محمدؐ'' (۱۹۹۳ء) جس میں ۱۶۷ شعرا کی نعتیں شامل ہیں اور جادۂ رحمت (۱۹۹۳ء منظوم سفر نامہ حرمین۔ رباعیات) آپ کی وہ کتب ہیں جو نعتیہ ادب کے فروغ میں آپ کی خدمات کی یادگار کے طور پر ہمیشہ روشن رہیں گی۔ ۱۹رجنوری ۲۰۱۱ء کو ہم سے جدا ہونے والے راغب مراد آبادی کا یہ شعر انھیں ہم سے کبھی جدا نہیں ہونے دے گا:

میں کہ اے راغب انھی کا ہوں غلام کمتریں
ان کے قدموں سے لپٹ جاؤں تو ٹھکرائیں گے کیا

خواجہ شوق (مرحوم)

عظمت آقا کا قد ہے کتنا اونچا دیکھنا
عمر بھر دیکھا کیے پھر بھی نہ آیا دیکھنا

یہ خوب صورت شعر حیدرآباد دکن بھارت کے معروف نعت گو شاعر خواجہ شوق کا ہے جو حیدرآباد، دکن کے اساتذہ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاعری کی فنی، ادبی اور تہذیبی اقدار پر ان کی گہری نظر تھی ان کی غزلوں کا مجموعہ چشم نگراں (۱۹۸۴ء) میں شائع ہوا لیکن جلد ہی وہ نعت نگاری کی طرف مائل ہو گئے وہ اسی کو اپنا فن اور زندگی بنالیا۔ ۱۹۹۵ء میں ان کا پہلا مجموعہ نعت ''صل علیٰ'' شائع

ہوا جب کہ دوسرا مجموعہ ''سلموا تسلیما'' ۲۰۰۸ء میں زیورِطبع سے آراستہ ہوا۔ ۱۵؍مارچ ۲۰۱۱ء کو یہ نہایت اہم نعت گو اہلِ محبّت کو شعور کی یہ روشنی تقسیم کرتا ہوا۔ دنیا سے رخصت ہوا:

روح میں ان کی محبّت کا اُجالا بھر لو
ایک دن جسم کو مٹی میں فنا ہوتا ہے

نوراحمد میرٹھی (مرحوم)

نوراحمد میرٹھی کو علم وادب سے گہرا شغف تھا، وہ میدانِ تحقیق وتالیف کے اَن تھک مسافر تھے ان کی ترتیب وتالیفات پر مبنی کئی کتب منظرِعام پر آچکی ہیں لیکن نعتیہ ادب پر تذکرہ نگاری کے حوالے سے ان کے کام کو تاریخ ادب کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ انھوں نے پہلے ''نورِسخن'' کے نام سے غیر مسلم شعرا کے نعتیہ کلام کا ایک انتخاب ۱۹۸۸ء میں پیش کیا پھر تذکرہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے اور ''بہرزماں بہرزباں'' کے نام سے غیر مسلم نعت گو شعرا کا ایک عالمی تذکرہ مرتب کیا جو پہلی بار ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا جب کہ اس کا دوسرا ایڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ ۲۰۰۶ء میں سامنے آیا جو ایک ہزار آٹھ (۱۰۰۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ''گلبانگ وحدت'' (غیر مسلموں کی حمدیہ شاعری کا تذکرہ اور انتخاب) ۲۰۰۷ء میں اور ''بوستانِ عقیدت'' (غیر مسلم شعرا کا رثائی کلام وتذکرہ) ۲۰۰۷ء میں زیورِطبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس طرح دینی شاعری کے حوالے سے تذکرہ نگاری نوراحمد میرٹھی کا ایسا اختصاص بن جاتی ہے جس کی کوئی اور مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔ نور میرٹھی نے متعدد نعتیہ کتب کی اشاعت میں معاونت کے ساتھ ساتھ کئی مجموعہ ہائے نعت پر دیباچے اور فلیپ بھی لکھے جس سے آپ کی تنقیدی بصیرت بھی نمایاں ہوئی، بلاشبہ نوراحمد میرٹھی نے جو کام کیا وہ اداروں کا تھا مگر وہ کام آپ نے تن تنہا سرانجام دیا نعتیہ ادب کے فروغ میں نوراحمد میرٹھی کے نام اور کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انور مسعود کا شعر یاد آتا ہے:

انورؔ مرے دیوان میں ہے نعت پیمبر
کیا توشۂ عقبیٰ ہے مرے رختِ سفر میں

نوراحمد میرٹھی بھی اسی توشۂ آخرت کو لے کر ۱۸؍جون ۲۰۱۱ء کو اس سفر پر روانہ ہوئے جو ہم سب کا نصیب ہے۔

ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی (مرحوم)

مدح نبی میں شعر کا کہنا آسان بھی دشوار بھی ہے
جوشِ عقیدت بھی غالب ہے حد ادب دیوار بھی ہے

ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کا یہ خوب صورت شعر نہ صرف ان کی دلی کیفیت کا آئینہ نہیں بلکہ ہر عہد کے نعت نگاروں کا اعتراف ہے لیکن یہ اعتراف ڈاکٹر صاحب کے ہاں جس خوب صورتی، سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ سامنے آیا ہے اس پر داد دینی ہی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی متعدد شعری کتب شائع ہوئیں جن میں ''وحدت و مدحت''، ''المدثر'' اور ''الرحمٰن'' حمد و نعت کے مجموعے ہیں۔ نعت گوئی سے ڈاکٹر صاحب کو دلی لگاؤ تھا، اسی لیے وہ نہ صرف خود حمد و نعت کی روشن فضاؤں میں رہتے تھے بلکہ انھوں نے اپنے دوستوں اور متعلّقین کے لیے بھی ایک ایسا سلسلہ شروع کیا تھا جس کی وجہ سے ان نورانی فضاؤں کا دائرہ دن بہ دن وسیع ہوتا رہا۔ ''مجلس احبابِ ملت'' کے نام سے ڈاکٹر صاحب نے اور ان کے احباب نے ایک بزم قائم کی جو گزشتہ تقریباً ۲۵ سالوں سے سالانہ نعتیہ مشاعروں کا اہتمام کرتی ہے اور ان مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلاموں کو ایک گلدستہ کی شکل میں جمع کر کے ''انوارِ حرم'' کے نام سے شائع کر دیا جاتا تھا۔ ''انوارِ حرم'' کے ۱۹ شمارے نعت ریسرچ سینٹر میں محفوظ ہیں جس میں کراچی کے نامور شعرا کے بے شمار نعتیہ کلام جمع ہیں اس طرح ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف خود اپنی نعت گوئی کے ذریعے فروغِ نعت میں حصہ ڈالا بلکہ مجلس احباب ملت کے نعتیہ مشاعروں کا انعقاد کر کے ہزاروں شعرا کی عقیدتوں کو محفوظ کرنے کا سامان بھی کیا۔ ۹ مئی ۲۰۱۱ء کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا۔

شکر ہے کہ نعت گو میں نام اپنا ہے جمیل
مغفرت کا آخرت میں قیمتی سامان ہے

سجاد سخن (مرحوم)

سجاد سخن ایک طویل عرصے تک اپنی نظموں اور غزلوں کی دل آویزی اور قادر الکلامی کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ میں نے اپنے شعری سفر کے آغاز میں جن مشاعروں میں سجاد سخن کے ساتھ پڑھا، اساتذہ کو بھی ان کا احترام کرتے دیکھا لیکن اس احترام کے باوجود سجاد سخن کی درویشانہ طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، انھیں کبھی مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کے معاملے میں الجھتے نہیں

دیکھا گیا۔ان کا نام جہاں پکارا جاتا وہ پڑھتے اوران کے پڑھنے سے احساس ہوجاتا کہ کوئی ہے جس کے پاس کہنے کوبھی بہت کچھ ہے اور بیان کا سلیقہ بھی،سو وہ مشاعرے میں اپنے حصے کی داد سمیٹتے رہے۔ادھر چند برسوں پہلے دبستانِ وارثیہ کے نعتیہ مشاعروں اوراختر لکھنوی وقمر وارثی کی صحبت نے ان کے اندر ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔رومانوی نظمیں لکھنے والا شاعر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں اپنے اشعار کے ذریعے حاضری کی لذت سے آشنا ہونے لگا اور یہ حاضری حضوری میں بدلنے لگی:

ایسا لگتا ہے ہر اک نذرانہ مدحت کے بعد — مجھ پہ طیبہ کی مسافت کے دریچے کھل گئے
اے سخن فیض درود و مدحت سرکار سے — مجھ پہ خود میری حقیقت کے دریچے کھل گئے

اوران دریچوں سے آنے والی روشنی نے سجاد سخن کو جادۂ رحمت کا مسافر بنا دیا۔''رنگ روشنی خوشبو''(۱۹۹۵ء)،''ربّ العالمین''(۲۰۰۱ء)اور''حاضروحضوری''(۲۰۰۸ء)ان کے حمدیہ ونعتیہ شاعری کے مجموعے سے ہیں جو ایک کے بعد ایک سامنے آنے لگے اور وہ جادۂ رحمت پر سفر کرتے ہوئے یقین کی اس منزل تک آپہنچے:

مشتمل ہے ذکر آقا پر کتابِ زندگی
وقت نے کتنا بدل ڈالا نصابِ زندگی

۱۷رجون ۲۰۱۱ءکواچانک سجاد سخن کے انتقال کی خبر ملی۔معلوم ہوا کہ ان کا کوئی تازہ حمدیہ مجموعہ بھی اشاعت کے لیے تیار ہے جسے وہ مکمّل کر چکے تھے۔سجاد سخن کے جانے کا ملال تو زندگی بھر رہے گا مگر خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اپنا توشۂ آخرت تیار کر چکے تھے۔

مدحت سرکار کا زادِ سفر رکھتا ہوں ساتھ
جانے کب پرواز کر جائے عقابِ زندگی

ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی (مرحومہ)

ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی نے ۱۹۸۰ء میں''اردونعت کے جدید رجحانات''کے موضوع پر ڈاکٹر نجم الاسلام کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو ۲۰۱۱ء میں سیّد معراج جامی نے بزمِ تخلیق ادب پاکستان کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔انھوں نے بطورِ نعت شناس اپنے تحقیقی مقالے کو پوری ذمہ داری اور محنت سے مکمّل کیا اوراس مقالے کی اشاعت سے بلاشبہ تحقیق نعت کی راہیں مزید منور ہو

گئی ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مرحومہ کا یہ مقالہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا لیکن ان محنت کی اجر انھیں اللہ کریم کی بارگاہ سے ضرور ملے گا۔ ۲۶ رمئی ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے مقالے کی اشاعت پر ہم ان کے اہلِ خانہ اور سیّد معراج جامی کے ممنون ہیں۔

نعت کے ان عظیم خدمت گزاروں کا یہ مختصر تذکرہ صرف اطلاعی نوعیت کا ہے۔ ورنہ ان میں سے ہر ایک کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان پر علاحدہ علاحدہ نمبر مرتب کیے جانے چاہئیں۔ اُمید ہے کہ مستقبل میں کوئی صاحب ہمت اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ گلزار بخاری نے کیا خوب کہا ہے:

جانے والوں کی کمی پوری کبھی ہوتی نہیں
آنے والے آئیں گے پھر بھی خلا رہ جائے گا

یقیناً یہ خلا کبھی پُر نہ ہوگا۔ آیئے ہم سب مل کر ان تمام نعت کاروں کے حق میں دعائے مغفرت کریں۔

نعت رنگ ۲۳

ابتدائیہ

نعت کا سفر کائنات کا سفر ہے۔ وجہ وجود کائنات ہی تو جوہر کائنات بھی ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ کا مقام اور قابہ قوسین کا کلام، از کراں تا کراں حدیث تخلیق کائنات ہے۔ کائنات کی تخلیق رازِ قدرت الٰہی کا سرنامہ اور کاروبارِ کائنات کی تنظیم مظاہر الٰہی کا آئینہ ہے مگر اس پُراسرار، تہہ در تہہ تخلیقی رازوں سے آراستہ، پرت در پرت کرشمہ کاری سے پیراستہ کائنات کی تفہیم حقیقی کا نصاب سرورِ کونین ﷺ کی ذات ہے اور اس ذات والاصفات کے ہمہ رنگ نکات کے استحسان کا منبعِ انوار نقدِ نعت ہے۔

نعت کے حوالے سے نئی تحقیق نے اس حقیقت کو سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ عرب کے معاشرے میں جہاں اعلانِ نبوت کے وقت صرف سترہ افراد اصطلاحاً خواندہ تھے وہیں یہ بھی تاریخ کی سچائی ہے کہ کم و بیش ہر فرد شعر گوئی کا فطری رجحان و میلان رکھتا تھا اور اس وقت وحی کے نزول سے قبل ہی آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ کا نام نامی اپنے شعر میں تعریف کی صورت میں استعمال کیا تھا اور اسی تعریفی استعمال کو دراصل عربی لغت کے اعتبار سے نعت کہتے ہیں جو آگے چل کر حضور اکرم ﷺ کی صفات کے بیان کے لیے مخصوص ہو کر ایک صنفِ ادب کی صورت اختیار کر گئی۔ اسی طرح جدید مستند تحقیق کی روشنی میں خواتین میں سب سے پہلے آپ کا لفظ تعریفاً آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی آمنہ نے اپنے شعر میں استعمال کیا تھا بلکہ اس سے بھی قبل آپ کی سات پشتوں پہلے کنانہ اور چودہ پشتوں پہلے کعب نے آپ کے نام کو اشعار میں استعمال کیا جب کہ آپ ابھی ظاہری طور پر دنیا میں تشریف بھی نہیں لائے تھے۔ نبوت کے اعلان کے بعد تو حضرت ابو طالب نے بھی، پھر معروف شعرائے وقت بشمول حضرت حسان بن ثابت اور دیگر اکابر صحابہ نے نعتیں کہیں جن میں

خلفائے راشدین اور اُمہاتُ المومنین شامل ہیں۔ خصوصیت سے جن کا تذکرہ ہے ان میں حضرت عائشہ صدیقہ اور آپ کی دختر خاتونِ جنت حضرت فاطمہ الزہرۃ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نعت کے اس سفر نے ہر منزل پر نئے پڑاؤ کے ساتھ نئی اصناف کو اپنے جلو میں اس طرح لیا کہ مشام جانِ ادب معطّر و معنبر ہی نہیں محتشم اور محترم بھی ہوتی رہی۔

البتہ فارسی زبان میں ابتداً شعرا کی توجہ اس جانب مبذول نہ ہوسکی اور اہلِ فارس بادشاہوں کے قصائد میں الجھے رہے لیکن جب ان کی توجہ نعت گوئی کی جانب مبذول ہوئی تو گویا دبستاں کھل گیا۔ پھر تو فارسی شعرا نے عجمی ہوتے ہوئے بھی ادب کے منصب پر ایسا اعتبار قائم کیا کہ اہلِ عرب ششدر و حیراں انھیں دیکھا اور سنا کیے۔

جہاں تک اردو میں نعت گوئی کے آغاز اور بتدریج ارتقائی عمل سے گزرنے کا تعلّق ہے تو بقول ڈاکٹر طلحہ رضوی ''اردو کو دیگر زبانوں کے درمیان یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ یہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی مومنہ اور کلمہ گو رہی ہے۔ صوفیائے کرام اور مبلّغین اسلام کے ہاتھوں دینِ مبین کی ترویج و اشاعت کے لیے یہ پروان چڑھی اور شروع سے ہی اس کی توتلی زبان پر حمد و ثنا اور نعتِ رسولِ مقبول ﷺ جاری ہوگئی'' (اردو کی نعتیہ شاعری، ص5) بقول حفیظ تائب خواجہ بندہ نواز گیسودراز (المتوفی ۸۲۵ ہجری) کے کچھ اشعار کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ کے حوالے سے اردو نعت کا اوّلین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ گیسودراز کے فرزند سیّد محمد اکبر حسینی (المتوفی ۸۲۳ ہجری) سے منسوب اشعار میں بھی ایک نعتیہ شعر ملتا ہے تاہم اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے مقدمے میں تفصیلی بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (جسے ۸۲۵ تا ۸۳۸ ہجری کے زمانے کی تصنیف تسلیم کیا گیا ہے) میں حمد کے بعد آنے والے نعتیہ اشعار کو اردو نعت کا پہلا مستند نمونہ سمجھا جانا چاہیے۔ اس کے بعد عہد بہ عہد اردو زبان جس طرح نعت کے ذخائر سے متمتّع ہوئی اس کی مثال کسی اور زبان میں موجود نہیں اور اس سفر کو ''نعت رنگ'' کے پڑاؤ پر یہ کہہ کر دیکھا جاسکتا ہے کہ گویا آگے چلیں گے دم لے کر۔

کبھی ہم نے سوچا کہ صدیوں کے اس سفر میں جس طرح قرآن پاک کی تفسیر میں عہد بہ عہد عرفان کی جہتیں وا ہو رہی ہیں ایسے ہی وقت کی رفتار کے تقاضوں سے ہم آہنگ تفہیمِ نعت کی نئی منزلیں بھی ہمارا نصیب بن رہی ہیں، جی ہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ خداوندِ عزوجل نے اپنے کلام

کی حفاظت خود اپنے ذمہ لی ہے جس کی حقانیت کا ثبوت آج اس پورے الہامی کلام کا کامل و اکمل وجودِ غیر مبدل ہے۔ اور اسی کلام کے متن میں یہ بات بھی تو ہے کہ ''وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ'' اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے اپنے محبوب کے ذکر کے بلند کر دینے کی نوید، سرنامۂ حیاتِ کائنات ہے اور جب یہ ہے تو پھر یہ بھی ہے کہ ہر نئے عہد میں آپ کے ذکر کی بلندی کے نئے سامان، نئے انداز، نئے پیرائے، نئے قرینے، نئے سلیقے، نئے ہنر، نئے جوہر، نئے رنگ اور نئے آہنگ سامنے آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے، ان ہی رنگوں میں ایک رنگ ''نعت رنگ'' ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کا آہنگ سب سے جدا، اچھوتا، انوکھا، البیلا اور دلربا ہے۔ اس تخصص اور امتیاز کا سبب اب بیان کا محتاج نہیں بلکہ حلقۂ یاراں ہو یا گروہِ نقاداں... ہر ایک نے اس کے انداز کی یک تائی کو اب تسلیم کر لیا ہے۔

مانا کہ اب سے پہلے نعت کے حوالے سے جریدے اور شمارے اپنے اپنے انداز میں اشاعتوں کے سنگھاسن پر استحسان کی ترازو میں معیار کا حوالہ بنتے رہے ہیں، مگر نعت کی تشکیل کے ساتھ اسے ادبی نقد و نظر میں گزارنے کی قابلِ قدر کاوش، نعت پر تحقیق کرنے والوں کی مدد اور معاونت، نعت کے تعلّق سے منعقد ہونے والی محافل، جامعات میں نعت چیئرز کے قیام کی کوشش، فنِ نعت کے تقاضوں سے ہم آہنگ پیمانوں کا تعین، نعت گو شعراء کرام کی بہبود کا سامان، نعت پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے متعلّقہ موضوع پر مواد کی فراہمی کا التزام، نعت کے حوالے سے دنیا بھر میں ہونے والے کام کے درمیان ربط و ارتباط کا اہتمام اور مشرق و مغرب میں اقلیم نعت اور نعت ریسرچ سینٹر ز ٹرسٹ کے قیام کا عملی اقدام... ایسی جہتیں ہیں جو ''نعت رنگ'' ہی سے عبارت ہیں۔ ان ہی ممتاز کنایوں سے ''نعت رنگ'' کو محض کتابی سلسلہ کہنا یا ادبی مجلّہ گردانا مناسب نہ ہوگا بلکہ اس استعاراتی تصویر میں موجودہ کام کو تحریک کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کتابی سلسلے پر پی ایچ۔ ڈی اور ایم فِل کے لیے بھی کام ہو رہا ہے اور طلبہ نے اس موضوع کو چن کر اس کے مقام کا اعتراف کر لیا ہے اور اسے بطور تحریک بھی تسلیم کیا ہے۔

اس تحریک کا اب تقاضہ یہ ہے کہ بات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک ٹرسٹ کا قیامِ عمل میں لایا جا رہا ہے جس کے مقاصد میں شامل ہے کہ نعت فہمی، نعت گوئی، نعت شناسی اور نعت خوانی کو موجودہ فضا سے آگے بڑھایا جائے اور باقاعدگی سے اسکولوں، کالجوں، جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں میں مؤثر التزام اور انضباطی اہتمام کے ساتھ نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں کے طور پر

رائج وراسخ کیا جائے۔ یہ بات اب تسلیم کی جا چکی ہے کہ نعت خوانی کی محفلوں میں نوجوانوں کی شرکت اور اس میں ان کی دلچسپی ماضی قریب کے مقابلے میں زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ تاہم یہ غیر رسمی اجتماعات میں ہی اپنی شمولیت کا احساس دلاتے ہیں مگر ان کے اپنے تعلیمی اداروں میں ابھی تک نعت کے حوالے سے کام اور پروگرام کو رسمی سا مقام حاصل ہے۔ بعض ادارے ایسے ضرور ہیں جو سالانہ پروگرام کے تحت نعت کی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام کرتے ہیں مگر ان اداروں کے باضابطہ نظام الاوقات میں نعت شناسی اور نعت فہمی کو ابھی تک کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے۔ خصوصاً کلیات اور جامعات میں اگر سیرتِ مبارکہ کی تفہیم کو نعت کے حوالے سے ممکن بنایا جائے اور اس کے لیے داخلی نظام جائزہ مرتب کیا جائے تو اس کا خاطر خواہ اثر دیکھنے میں آئے گا۔ میں یہ بات اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ ماہرین تعلیمی نفسیات نے زور دے کر کہا ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم اور نظم کے مقابلے میں مترنم طرزِ ادا کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ غالباً ''شاہ نامۂ اسلام'' کی تصنیف کی غایات میں سے ایک غایت یہ بھی تھی اور اسے شاعرِ ''شاہ نامۂ اسلام'' نے لکھا بھی ہے کہ تاریخ کو خشک سطروں کی بجائے ترنم سے سنا جائے تو یہ یاد بھی رہتی ہے اور اثر بھی دکھاتی ہے۔ اس تناظر میں سیرت کی تفہیم کے لیے نعت کے مترنم طرزِ ادا سے نئی نسل کی ذہنی تطہیر اور فکری تعمیر کا اہتمام ہم سب کے لیے آخرت کا زادِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اس بات کی ایک اور جہت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے تعلیمی اداروں میں درسی کتاب کی تدریس کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اسے ٹکے بندھے اصول کے تحت امتحان پاس کرنے کا ذریعہ گردانا جا رہا ہے جب کہ ہمارے شان دار ماضی کے مقتدر تعلیمی اداروں، محتشم تعلیم دانوں اور محترم اساتذۂ کرام کا شیوہ یہ رہا تھا کہ وہ تدریسِ کتب کے ساتھ شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل کا فریضہ بھی ادا کرتے تھے اور اس کے لیے Supplementary Reading Material اور اضافی کتب بینی کی ترغیب کے ساتھ خود کو بھی رول ماڈل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ آج کے کشاکش اور بے یقینی کے ماحول میں بوجوہ اس نوعیت کا اہتمام موجود نہیں ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے متذکرہ بالا امور کو حرزِ جاں بنا لیا جائے تو ہم ایک اہم Missing Link کی تلاش کر سکیں گے اور یوں فکری فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت ممکن ہو سکے گی۔

اس غرض سے مجوزہ ٹرسٹ کے مقاصد میں نعت شناسی کے حصول کے لیے تمام قانونی، اخلاقی، معاشرتی اور نصابی ذرائع کو استعمال کرنا شامل ہے جس کے ذریعے تحقیق کے نئے امکانات کی

دریافت، ان کی اشاعت اور اس غرض سے مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیمینار، کنونشن، ورکشاپس اور کانفرنسوں کا انعقاد، ذرائع ابلاغ کے موجودہ منظر نامے میں نعت شناسی کے حوالے سے تبدیلی کے اقدامات، رسمی تعلیمی اداروں اور مدارس کے درمیان پائی جانے والی فکری بُعد کی دوری کے لیے کاوشیں جیسے امور شامل ہیں۔

اس سارے سفر میں جس اہم شخص نے نعرۂ مستانہ لگانے والے کا کردار ادا کیا ہے اس کا حوالہ ضروری ہے اور یوں بھی جب اس تحریک کا ذکر ہو تو مقطع میں سخن گسترانہ بات آ ہی پڑتی ہے اور ''نعت رنگ'' کے ساتھ اسی رنگ میں رنگ جانے والے اس خوش نصیب کا نام زبان پر آ ہی جاتا ہے جو نعت گو بھی، نعت خواں بھی، ادیب و ناقد بھی، پارکھ و گوہر شناس بھی، مدیر و ناشر بھی اور فکر منداور دردمند قسم کا دانش مند بھی... یعنی صبیح الدین صبیح رحمانی جو جداگانہ آدرش کے ساتھ نعت کو اور عشقِ رسالت مآب ﷺ کو یک رنگ بنا کر کہتے ہیں:

ہوش و خرد سے کام لیا ہے
ان کا دامن تھام لیا ہے

مجھے کہنے دیجیے کہ متعدد دانش وروں نے عشق کو ہوش و خرد سے بالا قرار دیا ہے... اقبال نے تو اس مضمون کو بطور خاص برتا ہے۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

یا یہ کہ:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لیکن جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے، وہ عشق جو دل کے ساتھ ہوش و خرد کو بھی اپنے دام میں لے لے، اسی کا نام تو عشقِ رسالت مآب ﷺ ہے، اس تناظر میں پھر دیکھیے یہ شعر معانی کے نئے جہانوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔

ہوش و خرد سے کام لیا ہے
ان کا دامن تھام لیا ہے

اس دیوانے، فرزانے نے ''نعت رنگ'' کوسجا کر کیا رنگ جمایا ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں اس کتابی سلسلے کا ۲۳ر واں شمارہ ہے۔ ہر شمارہ اپنی خوبی، سلیقگی، حسن کاری اور نفاست شعاری کا آئینہ...مگر اس کے مدیر کی سیماب صفت اور معیار پسند طبیعت کا یہ خاصہ کہ وہ ہر شمارے کے بعد نئے شمارے کی تزئین و آرائش کے لیے اس فکر میں غلطاں کہ بقولِ حالی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

میرا خیال ہے کہ حفیظ جالندھری اپنی جاوداں تخلیق ''شاہ نامۂ اسلام'' نہ لکھ پاتے اگر ان کے سامنے اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ کا آئینہ نہ ہوتا اور شاید اقبال اپنی اس شہرۂ آفاق تخلیق کو یہ رنگ نہ دے پاتے اگر ان کے سامنے حالی کی معرکتہ الآرا (معرکہ آرا) تخلیق مدو جزرِ اسلام (مسدس حالی) نہ ہوتی... چراغ سے چراغ جلنے کے اس عمل کو ارتقائی عمل کہیے یا تدریجی سفرِ فکر وفن، مگر یہ ہے اس بات کی دلیل کے ہر عہد کے تقاضوں کے تناظر میں قدرت ذکر رسالت مآب ﷺ کے بہانے ڈھونڈ نکالتی ہے اور پھر عصرِ متعلّقہ کے زخموں کی مرہم پاشی کا سامان ہو ہی جاتا ہے۔ مملکتِ خداداد پاکستان کی تشکیل کے فوراً بعد ہی یہاں سرخ اور سبز رنگوں کی آندھیوں نے فضا کو اپنے حصار میں سمونا چاہا تھا اور اس فکری تناؤ نے شدت کی منزل پر آکر نئی مملکت کی اساس ہی کو متنازع بنانے کی تحریک شروع کردی تھی مگر بھلا ہوا ان جریدوں کا جو علمی، فکری اور ادبی محاذوں پر نظریات کی حفاظت کا سامان کر رہے تھے ایسے میں اچانک ''نعت رنگ'' نے اپنا تعارف کروایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے عشقِ رسالت مآب ﷺ کے رنگ میں اپنے پڑھنے والوں کو اس طرح رنگ لیا کہ جیسے:

اپنی سی رنگ لی نی موسے نیناملائے کے

کوئی مانے یا نہ مانے... مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس پرچے نے تحریکی انداز میں ان عناصر کی ہمت شکنی کی ہے جو مذہب سے دوری یا عشق رسالت کے بغیر مذہب کے تقاضوں کی تکمیل میں دلیلیں دے کر اپنی ترقی پسندی کی دھاک بٹھاتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی سامنے لانا ضروری ہے کہ آج بھی گلوبلائزیشن کی چھتری تلے ایسے عناصر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں جو مذہب سے دوری کو روشن خیالی سے تعبیر کرتے ہیں تاہم انھیں اس بات کا شدت سے ادراک ہے کہ اللہ کی کتاب کو اس طرح نہیں بدلا جا سکتا جس طرح اور الہامی کتابوں کو بدل دیا گیا ہے، اس

لیے ان عناصر کی اب یہ کوشش ہے کہ وہ دین پر چلنے والوں کے دل سے شمعِ رسالت کی لو کم کر دیں تو ان کا کام بن جائے گا۔ اس مقصد کے لیے عالمی سطح پر بہت سے ایسے منصوبے اب سامنے آ چکے ہیں جن کو ان کی اپنی تحریک کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔ اس فکر کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی فکری تحریک کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو نعت کے پُر تاثیر میڈیم کے ذریعے ہی مؤثر بنایا جا سکتا تھا۔ یہ کام جس طور سے ''نعت رنگ'' نے کیا ہے وہ قابلِ قدر بھی، قابلِ تحسین بھی، قابلِ فخر بھی اور قابلِ رشک بھی۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہنے پر مجبور ہوں کہ ''نعت رنگ'' کے ابتدائی شماروں میں سے ایک یعنی کتابی سلسلے کی تیسری کڑی میں مدیر ''نعت رنگ'' نے یہ کہا تھا:

> ''نبی اکرم ﷺ کی محبّت اساسِ ایمان ہے لیکن یہ محبّت ہر موسم میں ہمارے معاشرے اور کردار کا اساسی حصہ بننے کی جگہ مجالس نعت و سیرت تک محدود ہے اور یہ بھی ربیع الاوّل کے مہینے میں۔ نعت گوئی اور نعت خوانی کا ذوق عام ہے مگر نعتیہ مجموعے ناشر کی دکان یا شاعر کے گھر میں مدتوں رکھے رہتے ہیں۔ اس کا سبب عام کتب فروشوں کا رویہ بھی ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں سیرت کی کتابوں نعتیہ مجموعوں اور رسالوں کے لیے کم سے کم ایک معقول مرکز ہو۔ ان حالات اور اس پس منظر میں ''نعت رنگ'' کی مقبولیت اور اہل دل کے ساتھ ساتھ اہلِ ادب اور اہل نظر کا التفات... ہم اسے اللہ تعالیٰ کا کرم اور نبی محترم ﷺ کی عنایت سمجھتے ہیں اور یہ خیال ہمارے ذہن میں اس وعدۂ الٰہی سے پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دیتا۔''

میں صبیح رحمانی سے کہوں گا کہ یہ ٹھیک ہے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں ہونے دیتا، مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ بھی ایقان ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تیسرے شمارے سے اُنیس ویں شمارے تک آتے آتے صبیح رحمانی کے مدیرانہ احساس نے کیا مقام پایا ہے۔ آئیے ذرا اسے بھی دیکھتے چلیں تا کہ تیئیس ویں شمارے تک آتے آتے ہم استحسان اور انتقاد دونوں کسوٹیوں پر ''نعت رنگ'' کی تحریک کا معروضی جائزہ لے کر کوئی رائے قائم کر سکیں۔

جی ہاں اُنیس ویں شمارے کے اداریے میں مدیر ''نعت رنگ'' لکھتے ہیں:

> ''نعت رنگ'' کے انیسویں شمارے کی اشاعت پر میں یہ احساسِ ذمہ داری آپ تک منتقل کرنا

چاہتا ہوں کہ ہم نے نعت کے ادبی فروغ کا جو سفر شروع کیا ہے وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ ابھی ہمیں نعتیہ ادب کو اس کی تمام تر جہتوں کے تناظر میں تنقید کے اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق متعارف کروانا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ دورِ حاضر میں مذہبی انتہا پسندی کے رجحان کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو حقیقی تنوع کے ساتھ، مسلمانوں کی عقیدت، محبّت اور وابستگی کے حوالے سے عالمی ادب کی شعری اصناف مثلاً Epic اور Ode وغیرہ کی وساطت سے روشناس کروانے کی منزل بھی سر کرنی ہے اور اس منزل کو سر کرنے کے لیے ہمیں ضرورت ہے ایک ایسے ادارے اور پلیٹ فارم کی جو عالمی سطح پر اپنی شناخت اور دائرۂ عمل رکھتا ہو۔''

دیکھا آپ نے... ''نعت رنگ'' کا یہ اچھوتا، انوکھا رنگ جو اسے ایک مجلّے، ایک شمارے، ایک کتابی سلسلے سے بہت آگے لے جا کر ایک تحریک، ایک منصوبے، ایک مشن، ایک مقصد اور ایک آدرش کا روپ دے رہا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا تعین بھی کر رہا ہے کہ نعت کاری کے لیے سادہ کاری کی ضرورت ہے نہ پُرکاری کی۔ یہ تو عبادت گزاری، عشق کے ذریعے عالم آرائی کا منصب ہے جسے شاعر اپنے عمومی رنگِ شاعری سے ہم آہنگ یا مملو نہ سمجھے۔ غزل، نظم یا رباعی کو محض صنف کی صورت برتا جائے تو یہ کاوش ذات سے کائنات کا سفر ٹھہرے گی، مگر نعت خواہ وہ غزل کے اسلوب میں کہی جائے یا نظم، رباعی، قطعہ بند، مخمس، مسدس، ہائیکو، ثلاثی یا کجری کے روپ میں اس کا سفر کائنات سے اٹھ کر ذات تک آنا چاہیے۔ تفسیرِ ''الکتاب'' سے تفہیمِ سیرتِ پاک کی بڑی اکائی عشق کے سانچے میں ڈھل کر ذات کے کوزے میں قطرہ قطرہ اترے تو معراج کی حقیقت معراجِ ذات کی صورت بن جاتی ہے۔ اسی کو اسلوب ''نعت رنگ'' کہیے جو رنگ نعت بن کر قلوب پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے رنگوں میں تاریخ بھی ہے اور ادب بھی۔ تاریخ ان معنٰی میں کہ نعت کے میدان میں اب تک کیے گئے کاموں کا حوالہ اور جائزہ بھی ہے اور اس مضمون کے تحت نئے امکانات کا پتا بھی۔ تمام مسالک سے نباہ کرنا اور وہ بھی ایک خصوصی عنوان کے تحت مشکل کام تھا جسے اس پرچے نے خوب نبھایا ہے۔ اس کے انداز میں جہاں ہر شمارے کو کسی نابغۂ روزگار شخصیت کے نام سے منسوب و معنون کرنا ہے تو وہیں ابتدائیے کے اختتامیے میں ''نئے دُکھ'' (وفیات) کے ذیلی عنوان سے میدان شریعتِ حسان سے اٹھ جانے والوں کو خراج پیش کرنے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ

صوری حسن پرچے کا خاصہ، کتابت ومضامین کا معیار اس کا اختصاص نظر آتا ہے۔

''نعت رنگ'' کے اس تحریکی سفر میں جو بات بار بار سامنے آتی ہے وہ نعت کے حوالے سے ہونے والی الوہی، ادبی کاوشیں ہیں اوران کے سہارے دل وذہن میں ابھرنے والی وہ تحریک جو عشقِ رسالت ﷺ سے مملو ہوکر پیغامِ خداوندی پر عمل کی تصویر بنتی جارہی ہے۔ اسی لیے میں اس کارِ عظیم کو کوہکن کا کاروبار کہنے کی بجائے کوہ ودمن کا منصبِ باوقار کہنے کی جسارت کررہا ہوں اور وہ بھی اس لیے:

ہے نامِ محمد ہی نعتِ محمدؐ
میں لکھ کر محمد قلم رکھ رہا ہوں

پروفیسر انواراحمد زئی

اپنی بات

الحمدللہ! ''نعت رنگ'' کے ذریعے نعت کے ادبی فروغ کے لیے دیکھے جانے والے سارے خواب آہستہ آہستہ تعبیر سے ہم کنار ہوتے جارہے ہیں۔ ''نعت رنگ'' صرف ایک کتابی سلسلہ نہیں بلکہ ایک ادبی تحریک کی طرح رواں دواں ہے جس نے نعت کے بنیادی مقاصد یعنی اسلامی تعلیمات کے صحیح خدوخال کو شاعری میں اجاگر کرنے، ختمی مرتبت ﷺ کے جمالِ صوری وحسنِ سیرت کو متنِ شعر بنانے اور گروہِ بولہبی کے گستاخانہ پروپیگنڈے کے مقابلے میں دفاع وتحفظِ ناموسِ رسالت ودفاعِ اسلام کے لیے شعری تخلیقات کے بھرپور استعمال کے شعور کو شعراء اور عوام میں عام کرنے کے ساتھ ساتھ عصری ضرورتوں کے تناظر میں نعت شناسی اور نعت فہمی کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے لیے جو اہم اقدامات کیے ہیں وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آج نعت کے علمی آفاق کی تسخیر سے لے کر نعتیہ شاعری کی پرکھ کرنے والوں کے تحریری سرمائے کی قدر افزائی تک کی جو فضا ہمارے سامنے ہے اس میں ''نعت رنگ'' کا بڑا حصہ ہے۔ ''نعت رنگ'' کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے پیغام کے پھیلاؤ میں روز افزوں وسعت، تائیدِ ربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں، سوجذباتِ تشکّر کے ساتھ ''نعت رنگ'' ۲۳ پیشِ خدمت ہے۔

نعت ریسرچ سینٹر انٹرنیشنل نے بہت کم وقت میں نعتیہ ادب پر کام کی تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حوالہ جاتی کتب کی اشاعت کا خاطر خواہ کام سرانجام دیا۔ صرف چند برسوں میں چالیس

سے زیادہ کتب کی اشاعت جن میں تحقیقی مقالہ جات، کتابیات، اشاریہ سازی اور نعتیہ ادب کی دیگر جہتوں پر علاحدہ علاحدہ مطالعاتی جائزوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں جس سے تنقید و تحقیق کے مزید زاویوں پر کام میں تیزی کے امکانات نمایاں ہو رہے ہیں۔

اس مرحلے پر میں اپنے قارئین کو یہ خوش خبری بھی دینا چاہتا ہوں کہ نعت ریسرچ سینٹر، اب پاکستان اور برطانیہ میں بحیثیت ٹرسٹ رجسٹرڈ ہو چکے ہیں اور بہت جلد دوسرے ممالک میں بھی اس کی شاخیں قائم کرنے کا پروگرام ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہم اردو نعتیہ ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے اور اس کی وسیع پیمانے پر اشاعت کے اپنے دیرینہ خواب کو بھی تعبیر سے ہم کنار ہوتے ہوئے دیکھیں گے، ان شاء اللہ! ہم درخواست گزار ہیں ان صاحبانِ عشق سے جو اردو نعتیہ سرمائے میں تخلیقی اعتبار سے شاہکار عقیدتوں کو بحیثیت مترجم دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ آگے آئیں اور ہمارے اس عظیم مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہماری مدد فرمائیں!

نعت ریسرچ سینٹر نے پاکستان کی مختلف اہم جامعات کے شیوخ سے بذریعہ خط اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی جامعات میں نعت چیئر کے قیام کو ممکن بنائیں اور نصاب میں نعت کو بطورِ صنفِ ادب وہ جگہ دیں جس کی وہ حقدار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری استدعا کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس اقدام کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے جامعات کے شیوخ نے اس درخواست کو سنڈیکیٹ میں پیش کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جامعات کے دیگر اربابِ حل و عقد بھی اس اہم مسئلے پر سنجیدہ سے غور فرمائیں گے!... کیوں کہ یہ صرف ہماری دینی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ ہماری ادبی و تہذیبی ضرورت بھی ہے۔

''نعت رنگ'' کے اس شمارے میں ہمارے مہمان مدیر پروفیسر انوار احمد زئی ہیں جو پاکستان کے ممتاز ماہرِ تعلیم، ادیب، دانش ور اور ہر دل عزیز مذہبی و سماجی شخصیت ہیں۔ ان کے اداریے میں ہمارے نظامِ تعلیم کے حوالے سے جن امور کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے وہ دراصل نعت ریسرچ سینٹر کے اہداف اور مقاصد کا آئینہ ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ پروفیسر موصوف نعت ریسرچ سینٹر کے پہلے صدر نشین ہیں۔ ''نعت رنگ'' سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے لیکن اب ہمیں ان کی رہنمایانہ قیادت میسر ہے جس سے یقیناً نعت ریسرچ سینٹر کو اپنی عملی قوت کو بڑھانے اور اسے ہمارے تعلیمی نظام سے مربوط کرنے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ وہ ''نعت رنگ'' میں بحیثیت لکھاری پہلی بار

شریک ہوئے ہیں ہم انھیں خوش آمدید کہتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ مسلسل لکھیں گے۔

نعت شناسی کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریروں کا تسلسل آپ اس شمارے میں بھی پائیں گے۔ علاوہ ازیں ہم نے چند حمدیں اور نعتیں عربی فارسی کے اصل متن اور جناب مہر وجدانی کے منظوم ترجمے کے ساتھ پیش کی ہیں۔ اس ضمن میں بھی آپ کی رائے ہماری حوصلہ افزائی کا سبب ہوگی!

اس بار ہماری خواہش اور کوشش کے برعکس کچھ مضامین و خطوط ایسے بھی شائع کیے جا رہے ہیں جن میں سخن گسترانہ بات کچھ زیادہ ہی گھن گرج کے ساتھ سنائی دے گی!... لیکن علمی موضوعات پر گفتگو کرنے سے پہلے کوئی لکھاری اپنے مبلغِ علم کی حدود سے واقفیت حاصل کرلے تو شاید بعد کی پشیمانی سے بچ سکے! علمی موضوعات پر مکالمات کے جنم لینے سے علمی آفاق کی تسخیر کا عمل تیز تو ہوسکتا ہے لیکن لہجوں کی تلخی سے ہمیں آبگینہ ہائے قلوب کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ بھی رہتا ہے! کاش اہلِ قلم ہماری محدودات اور موضوع کی متانت کا خیال رکھ سکیں!!!

وفیات

عدم کے راستے پر آنکھ میچے
کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے (مجید امجد)

''نعت رنگ'' کی اشاعت میں حائل طویل وقفے، مسلسل بیرونی اسفار اور ملازمتی ذمہ داریوں کے باعث اکثر باتوں کا علم یا تو ہوتا ہی نہیں یا بہت تاخیر سے ہو پاتا ہے۔ مجھے یقیناً ہے کئی نعت کار ''نعت رنگ'' کے اس اشاعتی وقفے میں ہم سے جدا ہوئے ہوں گے مگر کیا کیا جائے کہ دمِ تحریر صرف چند نام ذہن میں تازہ ہوسکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (مرحوم)

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی ۱۶/اگست ۲۰۱۱ء میں ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ہندو پاک کے مذہبی حلقوں میں ایک قد آور علمی شخصیت کے طور پر وہ اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتے تھے۔ بطور ماہر رضویات پوری دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ نعتیہ ادب کے حوالے سے بھی ان کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات پاکستان نعت اکیڈمی اور اس کے روح و رواں ادیب رائے پوری کی منعقد کردہ عالمی نعت کانفرنس میں ہوئی۔ موصوف تقریر و تحریر دونوں

میدانوں کے شہسوار تھے۔کانفرنس میں ان کی خطابت کانقش دل پر قائم ہوابعدازاں ان کی خوب صورت تحریریں اوران کا ذوقِ نعت میرے اوران کے درمیان گہرے روابط کی وجہ بنے۔وہ ''نعت رنگ'' کی سرپرستی کرتے رہے ان کے کئی مضامین اور خطوط ''نعت رنگ'' میں شائع ہوئے جو ''نعت رنگ'' سے ان کے تعلّق کی گواہی کے طور پر محفوظ ہو چکے ہیں۔نعتیہ ادب پر ان کے کئی مضامین شائع ہوئے مگر ان کی دو کتابیں ہمیشہ انھیں اس شعبے میں یادرکھنے کے لیے کافی ہیں۔(۱) اردونعت گوئی اور فاضلِ بریلوی (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی) (۲) محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری۔کیا ہی اچھا ہو کہ ہندوستان کے صاحبانِ علم میں سے کوئی دوست ڈاکٹر صاحب کے نعتیہ ادب کے حوالے سے لکھے گئے دیباچوں، مضامین، مقالات اورفلیپ کو جمع کر کے ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کردے تاکہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت پر مشتمل یہ کتاب نعت کے ادبی کارواں کو مزید ارفع منازل کی طرف لے جانے میں معاون ثابت ہو۔نعت ریسرچ سینٹر، پاکستان، کی جانب سے ایسی علمی کاوش کی اشاعت کا بندوبست بھی کیا جاسکتا ہے۔

ضیاء نیر (مرحوم)

ضیاء نیر خوب صورت انسان اورخوب صورت شاعر تھے۔''سفرِنور'' اور ''ثنائے کریمین'' ان کے نعتیہ مجموعے ہیں۔میری ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔پہلی ماہ نامہ'' کاروانِ نعت''، لاہور کے پہلے مدیر اور میرے رفیق دیرینہ شوکت علی مغل کی رہائش گاہ پر، لاہور میں اور دوسری ملاقات تحریک منہاج القرآن کے مرکزی دفتر لاہور میں۔ان دونوں ملاقاتوں میں مجھے ان کی شخصیت، صلاحیت اورنعت سے وابستگی کے بارے میں کئی باتیں ایسی معلوم ہوئیں جو ہمیشہ ان کے لیے دعا پر اُکساتی رہیں گی۔ حفیظ تائب نے ان کے بارے میں خوب کہا تھا:

> ضیاء کا نیر تخلّص اختیار کرنا اور بالآخر سفرِنور کو مقصودِ حیات بنالینا محض اتفاق نہیں۔یہ ان کے فکر وعمل کی ارتقائی صورتیں ہیں جو فطری انداز میں نمو پزیر ہیں۔اس خوب صورت انداز سے زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے والا نعت گو، ضیاء نیر، ۲۶ رستمبر ۲۰۱۱ءکو اپنی زندگی کا سفر مکمّل کر کے ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کا زادِراہ لیے سفرِ آخرت پہ روانہ ہوگیا۔

نیر ہے بس ہمارے لیے ذکرِ مصطفیٰ
رکھتے ہیں زاد راہ یہ رختِ سفر میں ہم

اقبال باہو (مرحوم)

عصرِ حاضر میں اقبال باہو کی آواز اور کلام باہو کے سوز وگداز کی یک جائی نے ایک ایسا روحانی کیف پیدا کر دیا ہے جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ اقبال باہو کی مدھر، رسیلی اور تاثیر و تاثر سے مسحور آواز نے کلامِ باہو میں معرفت اور اسرار و رموزِ ہستی کے متلاشیوں کے لیے منزل تک پہنچنا کتنا آسان کر دیا تھا اس کا احساس صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو اس راستے کا مسافر ہو۔

اقبال باہو سے میری پہلے ملاقات حفیظ تائب صاحب نے کروائی تھی۔ مجھے نہایت سادہ طبیعت کا یہ فن کار انکساری اور محبّت کا مجسّمہ معلوم ہوا۔ پھر کئی محافلِ نعت میں انھیں سننے کا موقع ملا۔ نہایت عقیدت اور نیاز مندی سے محفل کا حصہ بننے والا اقبال باہو جب بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں مدح سرا ہوتا تھا تو پورے وجود سے نعت سرا ہوتا تھا۔ ادبِ رسالت اور احترامِ نعت کا یہ انداز مجھے بعض اوقات ان ثنا خوانوں میں بھی نظر نہیں آیا جن کی شناخت ہی صرف نعت نبی کریم ﷺ ہے۔ بہر حال وطنِ عزیز کا یہ اہم فن کار جس نے اپنے فن کو عقیدت سے ہم آمیز کر کے اپنے لیے ایک احترام کی جگہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر لی تھی، ۲۴/ مارچ ۲۰۱۲ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن (مرحوم)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنے والد سیّد وحید الحسن ہاشمی کی طرح ادبی دنیا میں مذہبی اقدار کی نمائندگی میں مصروف رہے وہ بحیثیت ناقد، محقق اور ادیب متعدد کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے باوجود نہایت منکسر المزاج اور ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ جو ان سے رابطہ کرتا اور کسی کام میں مدد چاہتا وہ فوراً اس کی مدد پر کمر بستہ ہو جاتے۔ مذہبی اصناف کے حوالے سے انھوں نے خوب جم کر کام کیا۔ حمد و نعت، مرثیہ پر ان کے کئی مضامین، کئی دیباچے اور فلیپ یادگار ہیں۔ ابھی چند روز قبل ہی ان کی کتاب ''وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' (حمد و نعت اور مرثیہ کے حوالے سے) میری نظر سے گزری یہ کتاب سیّد وحید الحسن ہاشمی کی مذہبی شاعری کے حوالے سے نہایت عالمانہ اور سنجیدہ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کا یہ چراغ وطنِ عزیز میں چلتی مسلکی تعصّب کی آندھی نے ۱۹/ مئی ۲۰۱۲ء کو لاہور میں بجھا دیا۔

آصف بشیر چشتی (مرحوم)

آصف بشیر چشتی کی خدمات پر نظر ڈالیے تو ان کی خوش بختی پر رشک آتا ہے۔ ایک ایسے خاندان کے فرد جس کا روحانی حوالہ ہی عشقِ نبی کریم ﷺ ہو، ایک ایسے آستانے کے سجادہ نشین جہاں کی تعلیمات میں عشقِ نبی کریم ﷺ درسِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہو۔ مجلس معین ادب کے ذریعے برسوں علم و ادب اور تہذیب کے چراغوں کو روشن رکھنے کی کوشش و کاوش اور بالخصوص نعت کے اہم اور یادگار مشاعروں کا اہتمام۔ پھر فیصل آباد کے نعت نگاروں کی تخلیقات پر مشتمل نہات اہم اور خوب صورت انتخاب نعت ''شہرِ نعت'' کی ترتیب و تدوین۔ فیصل آباد میں نعت ریسرچ سینٹر کی شاخ کا قیام۔ شہرِ نعت کے نام سے نعت کے ادبی فروغ کے لیے ایک وقیع جریدے کا اجرا اور پھر اپنی عقیدتوں کو جمع کر کے ایک مجموعہ نعت ''خلدِ نعت'' کے نام سے پیش کرنا۔ یہ سب وہ اعزازات ہیں جو دل میں غلامیِ مصطفیٰ ﷺ کی خواہش رکھنے والے کو عطا ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی عمر بھر کی اس خواہش کا اجر پائیں گے اور ''خلدِ نعت'' لے کر داخلِ خلدِ بریں ہوں گے... ان شاء اللہ!

علامہ بشیر حسین ناظم (مرحوم)

ابھی یہ سطور لکھی جارہی تھیں کہ اسلام آباد سے آصف اکبر نے عزیز احسن کو علامہ بشیر حسین ناظم کی رحلت کی خبر دی۔ وہ ہفتہ ۲۵ر رجب، مطابق ۱۶ر جون ۲۰۱۲ء کی شب میں کسی مشاعرے سے نعت پڑھ کر گھر آئے اور راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ انا للّٰہِ و انا الیہِ رٰجعون

مرحوم سے میرے ذاتی مراسم بھی تھے جو ''نعت رنگ'' کے حوالے سے زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ بھائی عزیز احسن جب اسلام آباد گئے تو ان کے توسط سے علامہ کے شب و روز کے احوال معلوم ہوتے رہتے تھے۔ مرحوم سے حرمین شریفین میں بھی میری اور عزیز بھائی کی ملاقاتیں رہی تھیں!

علامہ بشیر حسین ناظم کو اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور پنجابی زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ ان سب زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اسلام آباد سے نکلنے والے بعض اخباروں میں کالم بھی لکھتے تھے۔ اسلام آباد کی بیشتر ادبی تنظیموں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ''بزمِ حمد و نعت'' کے صدر تھے۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام المصطفیٰ ویلفیئر ٹرسٹ کے دفتر میں ہر ماہ کے دوسرے جمعے کو نعتیہ مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ ان مشاعروں میں ان کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ وہ زبان کے معاملے میں ذرا

سخت گیر تھے۔ اردو کے ہر لفظ کو اس کے اصل ماخذ سے منسلک کر کے دیکھتے تھے اور جس زبان کا لفظ ہوتا ان کی کوشش ہوتی اسی زبان کے رائج تلفّظ کو اختیار کریں اور لوگوں کو اپنے اس موقف پر قائل کریں۔ نعت کے ضمن میں ان کی خدمات حکومتی سطح پر بھی سراہی گئی تھیں انھیں ''پرائڈ آف پرفارمینس'' کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وزارتِ مذہبی امور کے زیرِ اہتمام سیرت و نعت کی کتب کے مقابلوں میں منصفین کی صف میں بھی، برسوں بشیر حسین ناظم کا نام نمایاں رہا۔ علامہ ناظم متعدد کتابوں کے مصنّف اور کئی دیگر کتب کے مترجم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معروف سلام کا انھوں نے انگریزی میں منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جس کو اہلِ علم نے بڑا سراہا تھا۔ غالب کی زمینوں میں مکمّل دیوان ''جمالِ جہاں فروز'' کے نام سے شائع فرمایا تھا۔ اسی دیوان سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

زندگانی میں سزاوارِ ملامت ناظم
مرگ آئی تو بڑا صاحبِ عرفاں نکلا!
چلا سرائے جہاں سے درود خواں ناظم
گیا بہشت میں کس نیکی و ثواب کے ساتھ

پروفیسر آفاق صدیقی (مرحوم)

وفیات کا حصہ ابھی تکمیل کے مرحلے میں تھا کہ معروف محقق، ادیب اور شاعر جناب آفاق صدیقی کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی۔ وہ بھی ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب (۱۷رجون ۲۰۱۲ء) عالم فانی سے عالمِ بقا کو سدھارے۔ انا للّٰہ و انا الیہ رٰجعون

مرحوم اردو سندھی روابط کو مستحکم کرنے کے حوالے سے فعال رہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا انھوں نے منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ چالیس سے زائد کتب کے مصنّف تھے۔ کئی اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھاتے رہے۔ اندرونی سندھ سے کراچی میں ان کی نقلِ مکانی کے بعد اکثر محافل میں ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ ''نعت رنگ'' میں مضامین لکھ کر بھی انھوں نے اپنے تعاون کا احساس دلایا اور ویسے بھی ''نعت رنگ'' کی سرپرستی فرماتے رہے۔ آفاق صدیقی خلق و مروت کا نمونہ تھے۔ آخری عمر میں انھیں زمانے کی ناقدری کا احساس شدید ہو گیا تھا... سچ ہے اس علم بیزار اور اقدارِ شرافت سے تہی معاشرے سے ہر حساس انسان کو شکایت ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا (مرحوم)

۲۵ رجون ۲۰۱۲ء کو نعت کے منظر نامے سے ایک اور اہم روشن ستارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوکر موت کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ نعت کے اس عظیم خدمت گزار کو علمی اور دینی حلقے پروفیسر محمد اکرم رضا کے نام سے جانتے تھے۔ وہ بحیثیت ادیب، شاعر، محقق، نقاد اور مقرر، ہمارے ادبی اور مذہبی حلقوں میں بہت احترام اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ستر کی دھائی سے مسلسل نعت کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں بے شمار مضامین لکھے ہیں اور یہ سلسلہ تا دم مرگ بھی جاری وساری رہا۔ پاکستان سے شائع ہونے والے تمام رسائل وجرائد میں ان کے مضامین کی شمولیت اس بات کی غماز ہے کہ انھوں نے فروغِ نعت کے لیے نکلنے والے ہر جریدے کی قلمی سرپرستی کی۔ ''نعت رنگ'' سے ان کا تعلّق کئی شماروں کی اشاعت کے بعد قائم ہوا جس کا ملال اکثر ان کی گفتگو میں سامنے آتا رہا۔ مگر اس تاخیر کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ نعت رنگ کے ایک شمارے میں ایک سے زیادہ مضامین پیش کیے اور ان کی اشاعت پر اپنی خوشی کا ظہار کیا۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ مجھے ''نعت رنگ'' کی تحریک میں شمولیت پر فخر ہے۔ ان کی نثری کتب نعتیہ ادب کے مطالعاتی جائزوں کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔ کاروانِ نعت کے حدی خواں، مہرِ عالم تابِ نعت، تاجدارِ ملکِ سخن، قافلۂ شوق کے مسافر اور ان کے انتقال سے صرف چند روز قبل شائع ہونے والی کتاب ''نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش'' فروغِ نعت میں ان کی بے مثال خدمات کا آئینہ ہیں جسے وقت کی گرد کبھی دُھندلا نہیں سکے گی۔ ان کا شعری مجموعہ ''توفیقِ ثنا'' بھی ان کے توشۂ آخرت کے طور پر اسی سال شائع ہوکر محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ گزشتہ کئی سال سے اپنی ضعیف العمری اور اس کے حوالے سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے نبرد آزما تھے۔ مگر عزم، حوصلے اور کام سے لگن کا یہ عالم تھا کہ اکثر راتوں کو فون پر مضامین لکھنے کے حوالے سے مختلف موضوعات وعنوانات پر دیر تک گفتگو کرتے تھے اور ان کی تکمیل کے لیے مطلوبہ مواد کی فراہمی پر اصرار کرتے تھے۔

اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کے حوالے سے ان کی برق رفتاری سے صاف ظاہر تھا کہ ایک مسافر، سفر پر جانے کی تیاری میں مصروف ہے اور اسے اس بات کا شعور ہے کہ اس سفر پر جو توشہ ساتھ لے جانا ہے اس میں غلامی و عشقِ نبی کریم ﷺ کی سند اور

دستاویزات ضروری ہیں۔

نعت سرکار مرے دور کی پہچان بھی ہے
میری بخشش کا سرِ حشر یہ سامان بھی ہے

مجھے یقین ہے کہ دنیا میں نعت جس طرح ان کی پہچان اور شناخت کا حوالہ رہی ہے حشر میں بھی ان کی بخشش کا سامان ہو گی! ان شاء اللہ!

ان مرحومین کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن زخم اتنے تازہ اور اچانک ہیں کہ حواس قائم نہیں ہیں... کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے:

آیا نہیں پلٹ کے کوئی بھی گیا ہوا
میں خود ہی جاؤں گا اب انھیں ڈھونڈتا ہوا

سیّد صبیح الدین صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۴

ابتدائیہ

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ادب میں نعت نگاری نے بطور ایک باقاعدہ صنفِ سخن اپنی ایک مستقل جگہ تو بنالی ہے لیکن ایک طویل وصبر آزما کوشش اور ایک شعوری و غیر شعوری جدو جہد کے بعد۔ اس ضمن میں اوّلاً نعت نگاری کی ایک طویل و دیرینہ روایت نے شاعرانہ اور ادبی اسلوب میں سیرتِ طیبہ کی جزوی یا مربوط و غیر مربوط مثالیں تخلیق کیں۔ خصوصاً پیدائش، واقعۂ معراج اور وفات وغیرہ پر منحصر رکھ کر طویل یا مختصر نظمیں یا مثنویاں تخلیق کیں، جو میلادنامہ (مولود نامہ، تولد نامہ)، شمائل نامہ، معراج نامہ اور وفات نامہ جیسی اصناف یا منظومات کی صورت میں مسلمانوں کی قریب قریب ہر ترقی یافتہ زبان میں لکھی گئیں۔ اردو زبان اور اس کے ادب کی تاریخ بھی ایسی اصنافِ ادب کی نمائندہ اور عمدہ مثالوں سے انتہائی باثروت ہے اور اس میں شک نہیں کہ شاعروں نے آں حضرت ﷺ کی بارگاہ میں اپنے عقیدت مندانہ اور والہانہ جذبات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس صنف میں سیرت کے جستہ جستہ یا جزوی پہلو بھی پیش کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی اپنی جگہ محلِ نظر ہے کہ اس عمل میں ان میں سے بعض شاعروں سے بے احتیاطی بھی روا رہی ہے۔ اس عمل کا بظاہر ایک تاریخی و تہذیبی سبب نظر آتا ہے جو اپنی جگہ ناقابلِ فہم نہیں اور اسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اس کے باوجود وقت کے ساتھ ساتھ اس طرزِ اظہار نے عقیدت و محبّت کی ایک صورت نعت نگاری کی شکل میں اختیار کر لی اور ادب میں اپنی ایک مستقل و مستحکم روایت کے فروغ کا سبب بن گئی جو بعد میں رفتہ رفتہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

سیاسی تبدیلیوں اور اصلاح و بیداری کی تحریکوں کے دوران اور پھر معاشرتی تقاضوں کے

تحت اوران سے کہیں بڑھ کر مغربی علوم اور جدید فکر و فلسفے اور علمی و تعلیمی تصورات کی آمد نے جہاں ہمارے ادب کو نئی اور مفید اصناف سے متعارف کرایا وہیں اظہار کے متعدد قدیم اور روایتی اسالیب بتدریج اوجھل ہو کر اب اپنا وجود قریب قریب معدوم کر چکے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے باعث زبان کے مزاج اور اظہار کی صورتوں میں بھی بہت نمایاں تبدیلی آئی ہے اور جہاں گیت، بارہ ماسے اور دوہے جیسی عام اور پسندیدہ اصناف کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی ہے وہیں مسلمانوں میں قومی و ملّی احساسات کے فروغ اور بیداری کی تحریکوں اور مذہبی مسالک کی باہمی کش مکشوں اور تنازعات کے نتیجے میں بھی، جس میں مقامِ رسالت پر بحث و مباحثہ بھی شامل ہے، نعت نگاری نے، ماضی یا عہدِ وسطیٰ کے مقابلے میں، عہدِ حاضر میں بتدریج زیادہ توجہ اور مقبولیت حاصل کی ہے۔

ہند اسلامی تہذیب کے مظاہر و اثرات میں ہم اردو زبان کے مزاج و اسالیب کو بھی شمار کر سکتے ہیں جو موضوعات ہی نہیں الفاظ اور آہنگ کی تبدیلیوں اور خیالات اور جذبات و احساسات کی بدلی ہوئی صورتوں میں نمایاں ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اصناف و اسالیب جو وسطِ ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کی مسلم تہذیب سے مستعار ہیں، یعنی قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی وغیرہ اور ساتھ ہی اپنے موضوع کی مناسبت سے نعت بھی، ہیئت و اسلوب میں ان تبدیلیوں سے، جو معاشرتی اور سیاسی حالات یا مغربی علوم و تصورات کے اثرات کا نتیجہ رہی ہیں، بہت کم متاثر ہوئے ہیں اور ان میں بھی غزل اور نعت کے علاوہ دیگر روایتی اصناف کی مجموعی نوعیت بھی ہندوستانی ماحول سے بہت کم متاثر ہوئی ہے، لیکن غزل اپنے فن کے بنیادی مزاج و موضوع کو ہند اسلامی تہذیب و تصورات سے ایک حد تک محفوظ نہ رکھ سکی اور نعت نگاری بھی، جس کے اصل موضوع و مزاج کو، اپنے فطری تقاضوں کے تحت، مقامی اثرات سے متاثر نہ ہونا چاہیے تھا، قدرے خود کو بچا نہ سکی۔ چناں چہ نعت میں، حیاتِ مبارکہ و سیرتِ طیبہ کو اپنا موضوع بناتے ہوئے، شعرا حضرات اپنے بے پناہ والہانہ اور عقیدت مندانہ جذبات کے تحت غلو کی حدود تک، جہاں شرک بھی ہم آمیز ہو جاتا ہے، پہنچتے اور حدِ اعتدال کو پار کرتے نظر آتے ہیں۔

اسی ذیل میں اردو نعت نگاری میں ایک اور منفی صورت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس میں ہندو عقائد یا ہندوستانی مقامی اثرات بھی کافی در آئے ہیں، جو محلِ نظر ہیں۔ جس طرح اسلامی تہذیب نے برعظیم میں آنے کے بعد ایک عرصے کے معاشرتی اختلاط کے نتیجے میں ہند اسلامی تہذیب کی صورت اختیار کر لی تھی، ادبی اصناف میں سے نعت نگاری نے، دیگر ادبی اصناف جیسے غزل، قصیدہ،

مثنوی اور رباعی وغیرہ کے مقابلے میں، مقامی اثرات کو زیادہ قبول کیا۔ دیگر اصناف میں نفسِ مضمون کے علاوہ ہیئت میں تبدیلی کے جزوی امکانات تو تھے، جو دیکھنے میں بھی آئے، مگر ان کے بنیادی لوازمات اور فن میں تبدیلی کا کوئی امکان اور سبب نہ تھا، چناں چہ فن اور ہیئت کے لحاظ سے ان میں کوئی واضح اور بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ان کے برعکس نعت کے ساتھ یکسر ایسا نہ ہوا۔ عربی اور فارسی نعت کے مضامین، مطالب اور جذبہ و احساس کے بنیادی و اساسی اشتراک کے باوجود اردو نعت نگاری، قدرے اور جزوی ہی سہی، مقامی اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ یوں عربی و فارسی نعتوں اور اردو نعتوں کے درمیان صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

نعت یوں تو محض اظہارِ وصف و توصیف کے مفہوم سے عبارت ہے لیکن ادب میں یہ ایسی صنف سے متّصف اور مخصوص ہے جس میں شاعر آں حضور ﷺ کی ذات وصفات سے اظہارِ عقیدت و محبّت پر مبنی اپنے دینی احساسات اور عقیدت مندانہ جذبات نظم کرتا ہے۔ اپنی اس تعریف کے مطابق نعت میں فی الحقیقت جو موضوعات اور مضامین نظم ہونے چاہییں، ان کا محور رسالت، عبدیت، محبوبیت، رحمت اور فضیلت کے گرد ہی استوار رہنا چاہیے۔ آں حضور کی ذات وصفات اور حیثیت و مرتبے کے یہی وہ لوازم ہیں جن کی سند قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ سے ملتی ہے اور یہی وہ حدِ توازن ہے جس سے نعت کو تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ چناں چہ عربی و فارسی اور اردو کی نمائندہ اور عمدہ نعتوں میں جو مضامین اور احساسات و جذبات نظم ہوئے ہیں انھیں بالعموم ان سے مختلف اور الگ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایسی نعتوں سے قطع نظر متعدد شعرا نے نعت کو تخلیق کرتے ہوئے اپنے شدید اور والہانہ جذبات سے مغلوب ہو کر مذکورہ حد سے تجاوز بھی کیا ہے۔ اس عمل یا رویے میں شعرا نے غلو سے بھی کام لیا ہے اور ایک حد تک شرک سے بھی وہ لاشعوری طور پر اپنی نعت کو مملو ہونے سے بچا نہ سکے۔ یہاں ان کے اس عمل سے قطع نظر نعت اور اس کے مضامین میں مقامی اثرات کی کارفرمائی پر ایک نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اگر چہ غلو اور شرک کو بھی مقامی اثر کے تحت شمار کیا جا سکتا ہے مگر ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ یہ نعت میں صرف اردو زبان میں لکھی گئی نعتوں سے مخصوص نہیں، دیگر زبانوں کی نعتوں میں بھی یہ خیالات وعناصر موجود ہیں، یہاں مقامی اثرات کے ذیل میں محض ان اثرات کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے جو دراصل وہ ہندو عقائد وتصورات ہیں جن کو اردو شعرا نے یقیناً اپنی سادگی میں اور غیر شعوری طور پر اپنی نعتوں کے مضمون کے طور پر باندھا اور اپنے تئیں ایک حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں نے برِعظیم میں آکر جس تہذیب وتمدن کو دیکھا اس میں مقامی زبانوں، خصوصاً سنسکرت زبان کے ادب کو، جو اگر چہ اس وقت کے معاصر یورپی و یونانی ادب سے، بقول گستاؤ لی بان، کم تر درجے کا تھا، خاصہ پُر کشش پایا۔ شاعری اور اس میں گیت، کیرتن اور بھجن ہندوؤں میں اس قدر مقبول تھے کہ عبادتوں کا لازمی حصہ تھے اور صبح کا آغاز وہ بھجن گا کر کرتے تھے جن میں دیوی دیوتاؤں کی مدح کی جاتی تھی۔ ہندو مذہب میں چوں کہ اعتقادات غیر معین اور غیر محدود ہیں اس لیے تخیّل آزاد اور لا محدود ہے۔ ان میں بیان کردہ خیالات میں توحید اور شرک کی کوئی قید نہیں اس لیے ان میں فرق قائم نہ رہتا تھا۔ شاعری میں ایہام ایک عام رجحان تھا، جس میں الفاظ کا مفہوم ایک نہیں رہتا، کئی کئی معنی پیدا ہو سکتے تھے۔ فرق اور تضاد ان کے لیے اہم نہ تھے۔ ایک لمحے میں وہ جس دیوتا کو عظیم قرار دے کر اس کی مدح سرائی کرتے، دوسرے لمحے وہ کسی اور دیوتا کو برتر قرار دیتے اور پھر اس کی مدح سرائی کرتے۔ بھجن گانے والے اپنے جوش اور جذبے میں جو لفظ چاہتے استعمال کر دیتے اور خیالات پر غور نہ کرتے۔ ہندو عقائد پر مبنی طویل نظمیں: ''مہابھارت'' اور ''رامائن'' دیوتاؤں کی عظمت اور قوت کو پیش کرتی ہیں مگر یہی دیوتا گاہے راکشسوں سے مات بھی کھا جاتے ہیں یا راکشس ان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ایک دیوتا وقتی طور پر قادرِ مطلق کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے لیکن ہمیشہ یہی دیوتا قادرِ مطلق بھی نہیں رہتا۔ اس طرح ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور محض خیالی اور تصوراتی نظر آتا ہے۔ ہاں جس وقت جس دیوتا کا بھجن گایا جاتا ہے اس وقت وہ افضل اور برتر ہوتا ہے۔ قدرت اور طاقت کی مناسبت سے دیوتاؤں کی کثرت نے جو تصور عام کیا اس کا ایک نتیجہ وحدت الوجود کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عقیدے نے ہندو ویدانت اور اس کے زیر اثر ہند اسلامی تصوف میں ایک مستقل اور مضبوط مکتبِ فکر کی حیثیت اختیار کی جو شاعری کا بھی ایک مقبول موضوع بن گیا۔ اکثر اردو شاعروں نے اپنے کلام میں اسے جگہ دی اور نعت نگاروں نے نعت میں بھی ایسے مضامین باندھے جو اس نظریے کے قریب ہیں اور اسی رجحان کا اثر ہے کہ بعض نعت نگار شاعروں کے لیے عبد اور معبود، خدا اور رسول ایک وجود بھی ہو جاتے ہیں۔ نعت میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جو عام مطالعے میں رہتی ہیں۔ وحدت الوجود کے نقادوں، اور اسی مناسبت سے نعت کے نقادوں نے اس نظریے کو شرک کا مماثل قرار دیا ہے اور نعت میں ایسے مضامین کو بھی شرک کی صف میں شمار کیا ہے۔

ہندو عقائد کے تعین میں منظومات کا مجموعہ 'رگ وید' اور ان کی طویل منظوم کتابیں: 'مہابھارت'

اور 'رامائن' بہت نمائندہ اور معاون ہیں۔ ان میں سے 'رگ وید' میں شامل بھجنوں کا موضوع عالمِ فطرت سے متعلّق دیوتاؤں: اندرا اور اگنی وغیرہ کی مدح میں ہے، جب کہ 'مہابھارت' میں دیوتاؤں، رشیوں اور حکمرانوں کی داستانیں اور ان سے منسوب معجزات اور خرقِ عادات کارنامے بیان کیے گئے ہیں اور 'رامائن' میں فوق الفطرت طلسمی ماحول، غیر حقیقی کردار، بھوت پریت وغیرہ کی قوت اور طاقت کے کرشمے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو قدیم ہندوستان کے ادب میں اوتاروں، دیوتاؤں اور راکشسوں کے قصے شامل ہیں جو اپنی فوق الفطرت قوتوں سے دشمن پر فتح پاتے ہیں۔ اس سارے ادب کا انحصار فوق الفطرت قصوں اور طلسماتی ماحول پر ہے، جس میں شخصیت پرستی کے عنصر یا رجحان نے مذہب کے حوالے سے مدح سرائی کو جزوِ ایمان کی حیثیت دے رکھی ہے اور جسے عبادتوں میں شامل کرلیا گیا اور مدحیہ گیتوں (بھجنوں) میں اس طرح جگہ دے دی گئی کہ مبالغہ آرائی اور غلو نے جزوِ لازم کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس رویے کے تحت کم تر حیثیت کے دیوتا کو بھی، مدح سرائی کے جوش میں طبقۂ بالا بلکہ اعلیٰ ترین، قادرِ مطلق کے درجے پر پہنچا دیا گیا کہ پھر قادرِ مطلق کی حیثیت برقرار نہ رہی اور اس کی حقیقی مدح کا حق ادا نہ ہوسکا۔

اس بات کو مزید وضاحت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے اس زمانے میں کہ جب ہندوستان میں بھگتی تحریک کا اثر پھیل رہا تھا اور تصوف اور ویدانت کے پیروکار مذہب کا نام لے کر عوام میں مذاہب کے باہمی اشتراک اور رام اور رحیم کے ایک ہونے کا پیغام دے رہے تھے، ہندوؤں نے مسلمان فاتحین اور حکمرانوں کی رضا اور خوشنودی کے لیے حمد، نعت اور سلام و مرثیے اور منقبتیں لکھنی شروع کیں، فارسی زبان کو اختیار کیا، قران کے منظوم ترجمے کرنے لگے اور صوفیہ اور بزرگوں کی محفلوں میں شرکت اور ان کے مزاروں پر حاضری دینے کو خود اپنے لیے حاجت روائی اور نجات کا وسیلہ سمجھنے لگے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے رام، کرشن اور شیوا اور گنگا جمنا پر نظمیں لکھنی شروع کیں، ڈھولک کی تھاپ پر درگاہوں اور خانقاہوں میں سماع اور قوالی کو ثواب سمجھ کر اپنا لیا اور بسنت کی تقریبات اہتمام سے منائی جانے لگیں۔ مسلمان حکمرانوں نے رام لیلا اور دسہرے کے تیوہار کو عوامی انداز میں سرکاری سطح پر رائج کیا۔ جو لطف انھیں بھگتی تحریک کے زمانے میں کیرتن اور بھجن کے عوامی ناچ گانوں میں آتا تھا وہ اب دلی اور لکھنؤ کے امام باڑوں اور کربلائے معلّیٰ میں سوز خوانی کی محفلوں اور تعزیہ نکالنے میں ملنے لگا۔ اسی زمانے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی

شادیاں، تیج تیوہاروں میں باہمی شرکت اور ہولی دیوالی مشترکہ طور پر منائی جانے لگیں تو باہمی مہر ومحبّت انھیں اور قریب تر اور آگے تک کیوں نہ لے جاتی۔ چناں چہ مسلمان صوفیہ نے ہندو پنڈتوں سے سنسکرت زبان اور الٰہیات کے درس لینے شروع کر دیے اور ہندو جوگیوں کی پیروی میں رہبانیت کو نجات کا راستہ سمجھ کر اسے اختیار کرنے لگے تو ان کی تہذیب وثقافت، تمدن، اور فکر وعمل یہاں تک کہ ان کے عقائد کیسے متاثر نہ ہوتے۔ چناں چہ اس وقت کے صوفیہ میں حد درجہ تعظیم کے احساس کے تحت آں حضور کی ذات کے مافوق الفطرت ہونے کا خیال بھی عام ہو گیا تھا۔ اسی طرح تصوف کے زیرِ اثر دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری نے عہدِ قدیم کے ہندوستانی ادب سے ہر سطح پر اثرات قبول کیے اور اس بنیاد پر اردو نعت بھی ان خیالات ومضامین سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی جو اس وقت کے ہندوستانی ادب اور کیرتن اور بھجنوں میں پیش کیے جاتے تھے۔

اسلام کے بنیادی عقیدے میں اللہ کی وحدانیت، لا الٰہ الا اللہ کا اقرار اصلِ ایمان ہے جس کے ساتھ محمد رسول اللہ کا اعلان آں حضور ﷺ کے اللہ کے رسول یا پیغمبر ہونے سے مخصوص ہے، جو 'عبدیت' کی حیثیت میں اپنے اس انتہائی عروج پر ہیں کہ جو دوسرے انسانوں سے افضل و برتر ہے۔ ''اسری بعبدہ'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے آں حضور کی حیثیت ومرتبت کو واضح فرما دیا ہے۔ لیکن متعدد شعرا نے عشقِ محمدی سے مغلوب ہو کر مقامِ رسالت ورفعتِ عبدیت کے اظہار میں توازن کو پار کرنے میں تکلّف نہ کیا۔ اس کی یہاں محض ایک مثال حروف اور الفاظ کی قطع برید میں دیکھی جا سکتی ہے، جب نعت کے سب سے معروف وممتاز شاعر محسن کاکوروی نے اپنے ایک شعر میں میم کے پردے کو ہٹا کر عرب کے عین کو لفظ سے جدا کر کے احمد کو احد اور رسولِ عربی کو عرب سے بڑھا کر رب کی شان میں جلوہ گر دکھانے کی کوشش کی ہے۔

عینیت غیر رب کو رب سے   غیریت عین کو عرب سے
ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا   سایہ کیا میم تک جدا تھا

اردو شاعروں کے کلام میں یہ اور اس طرح کے مضامین بکثرت نظم ہوئے ہیں۔ یہ جرأت عبد اور معبود کو ایک جتانے اور ایک سمجھنے میں بھی ظاہر ہوئی ہے، جیسے:

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

ایسے مضامین کئی صورتوں میں بیان ہوئے ہیں:

اے آرزوے خلد کہیں اور چلی جا
رہتی ہے مرے دل میں تمنائے مدینہ

اور اس سے بڑھ کر عبد کو معبود سے بھی سوا ظاہر کرنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے ہندو عقیدے کے تحت رام کو تمام دیوتاؤں سے برتر قرار دینا۔ چناں چہ ذیل کے شعر میں بیان کردہ احساس کو کیا کہا جا سکے گا؟

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

اس سے بھی آگے بڑھ کر شاعر نے یہاں تک کہنے سے بھی بلکہ اس حد تک غلو سے بھی گریز نہ کیا کہ خالقِ حقیقی تو دراصل رسالت مآب کی ذات ہے:

وہ نغمۂ کن جس سے مرتب ہوئے کونین — اللہ کے پردے میں محمد کی صدا ہے
زبانِ شمع رسالت اگر نہ ضو دیتی — قسم خدا کی خدا یوں خدا نہیں ہوتا

خدا اور بندے کے درمیان جو مماثلت شاعروں نے دیکھی ہے ایسی ہی مماثلت اور یکسانیت شاعروں نے رسالت مآب اور اولیائے کرام میں بھی تلاش کر لی ہے اور اس کی مثالیں کچھ کم بھی نہیں بلکہ ان کی مدح سرائی اس عقیدت و محبّت کی شان سے کی ہے کہ انھیں نہ صرف آں حضورﷺ کے مماثل قرار دے دیا ہے بلکہ خدائی تک کے اوصاف بھی ان میں تلاش کر لیے ہیں اور انھیں خدا تک کہنے سے گریز نہ کیا۔ ان کا اس حوالے سے یہ عمل بالکل اسی طرح ہے جیسے ہندو شعرا بھجنوں میں ایک دیوتا کی مدح سرائی اس طرح کرتے ہیں کہ دیگر سارے دیوتا اس کے مقابل کم حیثیت ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس عمل کی تحریک ان روایتوں اور رواجوں سے ملی ہے جو انھوں نے یہاں آ کر دیکھیں کہ کس طرح 'رامائن' کے اشلوک یا اجزا، جن میں ان کے دیوتاؤں کے احوال اور قصے شامل ہیں، یہاں کی مجلسوں اور تقریبات میں پڑھے جاتے تھے۔ اس ضمن میں گوتم بدھ کی پیدائش اور کرشن کی پیدائش کے وقت کے مناظر مذہبی شاعری میں بہت مقبول رہے ہیں۔ چناں چہ خاص طور پر میلاد ناموں اور معراج ناموں کو شاعروں نے ان ہی کے طرز پر لکھنا شروع کیا اور پڑھنے کا انداز بھی وہی اختیار کیا۔ ان منظومات میں تاثیر پیدا کرنے اور محفل پر ایک اثر قائم کرنے کے لیے آں حضورﷺ کی

ذات وشخصیت اور احوالِ زندگی کے متعلّق خلافِ واقعہ، غیر عقلی، معجزاتی یہاں تک کہ طلسماتی واقعات بھی نظم کیے جانے لگے۔ آغاز میں یہ عمل اور طریقہ ممکن ہے اس خیال و مقصد سے اختیار کیا گیا ہو کہ وہ لوگ جو ہندو دیوتاؤں کے فوق الفطرت کارناموں اور محیر العقول واقعات کو سن کر ان کے تابعِ فرمان بن جاتے تھے، آنحضور کی عظمت و فضیلت ان کے دلوں پر بھی ثبت ہو جائے اور وہ اسلام قبول کر لیں یا اگر مسلمان ہیں تو ہندوؤں کے اثر میں نہ جائیں اور اسلام سے قریب رہیں۔ نور نامے اور شمائل نامے اس تاثیر میں مزید اضافے کا سبب بنے۔ نیت اور مقصد چاہے جتنا بھی مثبت ہو لیکن اس کا ایک منفی نتیجہ بہر حال یہ بھی سامنے ہے کہ متعدد غلط روایات اور حکایات نے جگہ پائی اور عوام ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ سب ان میں سے اکثر کے عقیدے کا جز و بھی بن گئے۔ یہاں منظومات میں آں حضور ﷺ کی ذات سے منسوب تصوراتی معجزوں پر اس قدر زور دیا گیا کہ عمل اور جہد و جہاد پسِ پشت رہ گئے۔ اسی طرح معراج ناموں میں آسمانوں کی سیر کے حیرت انگیز واقعات اور طلسماتی ماحول نے مسلمانوں میں غلط روایات کے عام کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملی اور فکری سطح پر حقیقت پسندی سے دور کر دیا۔ نور نامے، معراج نامے، میلا د نامے اور شمائل نامے جیسی منظومات نے مبالغہ آرائی کو فروغ دیا اور خیال و خواب کی دنیا میں پہنچا دیا۔ پھر دلچسپ صورتِ حال یہ بھی رہی کہ جس کسی نے بھی ایسے تصورات اور عقائد کا اظہار کیا اس نے بالعموم اسے 'طریقۂ محمدیؐ' کا نام دیا۔ اس عمل میں صرف سیدھے سادے مسلمان نہیں بلکہ ان کے پیشوا اور رہنما بھی شامل رہے ہیں۔

اس قسم کی مذہبی شاعری میں اظہارِ عقیدت و محبّت میں شاعروں سے مبالغہ آرائی، جزئیات نگاری اور حقائق کے مقابلے میں تصور و تخیّل کی کارفرمائی کچھ غیر متوقع نہیں اور فطری طور پر شاعروں کے لیے مقامی اثرات کو قبول کرنا بھی بعید نہیں، لیکن ان اثرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر میں جاذبیت اور زور و اثر شامل کرنے کے لیے شاعروں نے واقعیت، سچائی اور حقیقت بیانی کا لحاظ نہ رکھا اور مذہبی عقائد کے معاملے میں بے نیازی برتنے سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ خصوصاً نعت لکھنے والوں نے سیرت و شمائل بیان کرتے ہوئے تلاش و تحقیق اور حقیقت بیانی سے زیادہ اپنے حسنِ ذوق اور زورِ بیان کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس مقامی رجحان کا اور اس تناظر میں دیگر اعتقادی اثرات کا سیرتِ طیبہ کے تعلّق سے نعت میں شامل ہونا مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ پھر اس تناظر میں کہ سیرت پر ایک کتاب کے قارئین کا دائرہ اتنا وسیع شاید نہ ہو جتنا کہ کبھی کبھی ایک عمدہ شاعر کی ایک منتخب نعت کا ہو

سکتا ہے۔ اس لحاظ سے نعت کو اپنے مطالب میں صحت اور واقعیت سے الگ نہیں ہونا چاہیے اور ایک نعت گو شاعر کو، اپنی نعت کے حسن، اور اس میں جاذبیت اور تاثیر پیدا کرنے کی خاطر اپنی نعت کے مطالب و مضامین کو حقیقت سے دُور نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہ ہمارے اصلِ ایمان اور فکرِ راسخ کا تقاضا ہے۔

قدرے اطمینان کی بات یہ ہے کہ اب یہ احساس اور شعور ہمارے نعت گو شعرا میں کچھ فروغ پا رہا ہے اور نعت کے چند نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے بھی ایسے پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے کہ جس کے تحت وہ نعت کے حقیقی مفہوم کے مطابق تخلیق ہونے والی نعتوں کے مطالعے و جائزے میں کہیں گرفت اور کہیں حوصلہ افزائی سے کام لے رہے ہیں۔ اس کے باوجود اب بھی اکثر نعت گو شعرا میں نعت کے حقیقی مفہوم کی ترویج کرنے اور انھیں اپنی نعت کو بدعتوں اور مقامی اثرات سے دُور کرنے کا شعور عام کرنے کی ضرورت موجود ہے۔ متعدد نظریاتی اور مسلکی مسائل، ہماری قوم کے عمومی مزاج اور جذبات اور عقیدے کی نوعیت کے سبب یہ کچھ آسان تو نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ اب نعت کو ایسے نقاد میسر آگئے ہیں جو اس ضمن میں اپنا مثبت اور مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں، اور میرے مطالعے کی حد تک ''نعت رنگ'' ایسے نعت نگار شعرا کی حوصلہ افزائی میں اور اس کے چند مقالہ نگار اس عمل میں سنجیدہ اور پیش پیش ہیں۔ اس حد تک تو یہ قابلِ اطمینان ہے لیکن ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اس عمل کو ایک تحریک کی صورت دی جانی چاہیے کہ تخلیقِ نعت کو مستند اسلامی شعائر اور مسلمہ حقائق و واقعات سے فروتر یا دور نہیں ہونا چاہیے کہ نعت کا تقدس متاثر یا مجروح ہو۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

اپنی بات

نعت رنگ ۲۴ پیشِ خدمت ہے۔ کسی بھی جریدے کے مدیر یا مرتب کی ادارتی ذمہ داریوں میں یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اپنے لکھنے والوں سے کس طرح رابطے میں رہتا ہے اور انھیں اپنی ضرورت کے مطابق اور منصوبوں کے تحت مقالات کی تکمیل پر کس طرح آمادہ کرتا ہے۔ اس عمل میں مدیر کی گرفت جہاں ذرا ڈھیلی پڑتی ہے، جریدے کا معیار اور اشاعتی رفتار دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

گزشتہ ایک سال بغرضِ ملازمت میرے ملک سے باہر رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نعت رنگ کا اشاعتی وقفہ بھی طویل ہوا اور لکھنے والوں کو جگائے رکھنے کا عمل بھی متاثر ہوا۔ لے دے کے ڈاکٹر عزیز احسن ہی تھے جو میری خیریت دریافت کرنے کے لیے گاہے گاہے مجھ سے رابطہ کرتے تھے اور میں ان کے ذمے کوئی نہ کوئی کام لگا دیتا تھا۔ جسے وہ حسبِ روایت میری دل جوئی کے لیے خوش اسلوبی سے پورا کرتے رہے۔ اس لیے نعت رنگ ۲۴ میں آپ کو ان کی تحریری شمولیت کا تناسب کچھ زیادہ محسوس ہوگا۔ اور کئی مستقل لکھنے والے اس شمارے میں غیر حاضر بھی دکھائی دیں گے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے بحیثیت ڈائریکٹر، نعت ریسرچ سینٹر، اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مقالات کی سنجیدہ تنقیدی فضا سے اہلِ علم اور بالخصوص نعت پسند حلقہ یقیناً فکری دریچوں سے آتی ہوئی شعور کی روشنی سے مستفیض ہوگا۔ جو درحقیقت نعت رنگ کا مشن ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، گوہر ملسیانی، ڈاکٹر اشفاق انجم، پروفیسر انوار احمد زئی، ڈاکٹر افضال احمد انور، ڈاکٹر سراج احمد قادری، مولانا اسید الحق قادری اور ڈاکٹر شہزاد احمد کے نام قارئینِ نعت رنگ کے لیے نئے نہیں۔ ان کے علمی مقام و مرتبے اور نعت شناسی کے تناظر میں ان کی نعت رنگ میں موجودگی ہی نعت رنگ کے رنگوں میں اعتبار کے رنگوں کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر محمد آصف، ڈاکٹر بشیر عابد، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اور منظر عارفی کے نام نعت رنگ کے افق پر اس شمارے سے طلوع ہوئے ہیں۔ مگر یہ نام اہلِ علم کے لیے نئے نہیں ہیں۔ میں ان نئے دوستوں کا نعت رنگ میں خیر مقدم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل ہماری علمی اور تحقیقی دنیا کی قد آور شخصیات میں شامل ہیں۔ آپ نے نعت رنگ کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں بحیثیت مہمان مدیر انھوں نے اپنے اداریے میں نعتیہ شاعری میں جن عمومی بے احتیاطیوں کی طرف اشارہ فرمایا اور نعت رنگ کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا نعت رنگ کی تحریری سرپرستی کرنا ہی ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔

دنیا بھر کے نعت پسندوں کے لیے یہ خبر بھی یقیناً مسرت کا باعث ہوگی کہ نعت ۲۳ اور ۲۴ کے درمیانی اشاعتی وقفے میں جامعہ کراچی، سے ہمارے تین اہم دوستوں نے نعت پر پی ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ جس میں ڈاکٹر عزیز احسن کا مقالہ ''اردو نعتیہ ادب

کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ'' نعت ریسرچ سینٹر نے شائع کر دیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر شہزاد احمد کا مقالہ ''پاکستان میں اردو نعت'' حمد و نعت ریسرچ فاؤنڈیشن، کراچی، اور ڈاکٹر طاہر قریشی کا مقالہ ''ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر''، قرطاس، کراچی کے تحت زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ میں ان تینوں دوستوں کو مقالات کی تکمیل اور اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نعت رنگ ۲۳ اور ۲۴، کے اشاعتی وقفے میں کئی اہم نعت نگار اور نعت گو ہم سے جدا ہوئے۔ مگر دمِ تحریر ان سب کے نام ذہن میں تازہ نہیں۔ صرف ڈاکٹر فرمان فتح پوری، علامہ اسید الحق قادری بدایونی، صوفی رہبر چشتی، مہر وجدانی اور سجاد مرزا ہی یاد آرہے ہیں۔ ان احباب کی خدمات اور شخصیات پر لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ لیکن اس وقت کسی تفصیلی تذکرے سے گریز کرتے ہوئے صرف دعائے مغفرت پر اکتفا کرتا ہوں... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَo...تا کہ نعت رنگ مزید تاخیر کا شکار نہ ہو۔

سیّد صبیح الدین صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۵

اپنی بات!

الحمدللہ! نعت رنگ اپنی اشاعت کی پچیسویں منزل سر کرنے میں کامیاب وکامران ہوا۔ تقریباً بیس سال پہلے نعت کی تخلیقی رؤ کو نئے شعور سے ہم آہنگ کرنے' نعتیہ ادب کو ادب کے مرکزی دھارے سے ملانے اور اس کی فکری اور تنقیدی جہتوں کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ادب کے بامعنی سرمائے کا حصہ بنانے کے لیے جو سفر آغاز کیا گیا تھا اس نے کامیابیوں کی کتنی منازل طے کیں؟ اس کا اندازہ کرنا تو مستقبل میں ادب کے مؤرخین کا کام ہے سو اسے ان ہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مگر اس مرحلے پر مجھے نعت رنگ کی ابتدا سے لے کر آج تک اس کے تمام قلمی معاونین کے ساتھ ساتھ زیرِ نظر شمارے میں شامل ان تمام دوستوں کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے نعت رنگ کو اپنے افکار کی رنگا رنگی سے خوبصورت اور فکر انگیز بنایا۔ ان تمام دوستوں اور بزرگوں کے تعاون اور قلمی معاونت کے نتیجے میں نعت رنگ کے گذشتہ شماروں میں صنفِ نعت کی تنقید وتحقیق کے حوالے سے جو کام ہوا ہے وہ اردو زبان وادب کی تاریخ کے حوالے سے عقیدت نگاری کے باب میں اب تک کی جانے والی متفرق کوششوں کو ایک واضح اور منفرد جہت عطا کرتا ہے۔

شمارہ ۲۵ تک آتے آتے نعت رنگ کا شعری، ادبی، تخلیقی اور تنقیدی اثاثہ اس اہمیت کا حامل ضرور ہو گیا ہے کہ آئندہ صنف نعت پر کسی بھی کام کے لیے اسے لازمی حوالے کی حیثیت حاصل رہے گی۔ یہ سب ربِّ کریم کی تائید وتوفیق کے ساتھ ساتھ نعت رنگ کے قلمی معاونین کی مخلصانہ اور پُرخلوص کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔

کاش نعت رنگ کی اشاعت کے تسلسل اور اس کی ہمہ جہت خدمات اور مقبولیت کے وسیع ہوتے ہوئے دائرے کو اس سلور جوبلی شمارے کی صورت میں دیکھنے کے لیے آج ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، ڈاکٹر عاصی کرنالی، پروفیسر شفقت رضوی، پروفیسر حفیظ تائب، ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، مظفرؔ وارثی، رشید وارثی، پروفیسر محمد اکرم رضا، حنیف اسعدی، ادیب رائے پوری، تابش دہلوی، شبنم رومانی، سرشار صدیقی، پروفیسر جعفر بلوچ، شفیق الدین شارق، جمال پانی پتی، پیرزادہ محمد اقبال فاروقی، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، مولانا اسید الحق قادری، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر نجم الاسلام اور آفتاب کریمی جیسی شخصیات ہمارے درمیان موجود ہوتیں جنہوں نے ہر مرحلے پر نعت رنگ کو اپنی توجہ، پسندیدگی، رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے نوازا۔ دمِ تحریر ان میں سے ہر ایک کا مسکراتا چہرہ میرے سامنے ہے اور میرا حوصلہ بڑھا رہا ہے بالکل اسی طرح جس طرح نعت رنگ کی ہر نئی اشاعت پر ان کی محبّتیں میرے عزم کو مستحکم کرنے کا باعث بنتی تھیں۔ نعت رنگ کے رنگوں میں اعتماد اور اعتبار کے جتنے بھی رنگ ہیں وہ اس کے قلمی معاونین اور سرپرستوں کی حوصلہ افزائی ہی سے نمایاں ہوئے ہیں۔ دُعا ہے کہ ربِ کریم ان مرحومین کو اس خدمت کا اجر اپنی شان کے مطابق عطا فرمائے اور جو حیات ہیں انہیں تادیر صحت و سلامتی کے ساتھ ذکر نبی کریم ﷺ کے سائبان میں رکھے۔

زیرِ نظر شمارے کی تیاری میں میری کوشش رہی ہے کہ نعت رنگ اپنے تشکیلی دور سے نکل کر ایک رجحان ساز اور تاریخ ساز تکمیلی دور میں داخل ہوتا نظر آئے۔ یقیناً یہ مشکل کام تھا اور ایک مشترکہ جدوجہد چاہتا تھا سو تمام قلمی معاونین اس خصوصی شمارے کے حوالے سے بھی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنی عقیدت اور فن کے تال میل اور شعور و ادراک کی ہم آہنگی سے نعتِ رسول ﷺ کی پوری تخلیقی اور معنوی کائنات پر غور و فکر کے نئے زایوں اور نئے امکانات کو پیش کرتے ہوئے اس شمارے کو ادب نبوی ﷺ کے فروغ میں فکرافروزی کی ایک عصری دستاویز بنا دیا ہے۔

منہاج القرآن یونیورسٹی میں نعت چیئر کا قیام

فروری ۲۰۱۵ میں ماہ ربیع النور کے سلسلے میں میلاد النبی ﷺ کے اجتماعات میں شرکت کی

غرض سے دو ڈھائی ماہ کینیڈا میں قیام رہا مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر طاہرالقادری صاحب بھی کینیڈا ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الحق رازی جو ڈاکٹر طاہرالقادری کے تحقیقی امور میں معاون و مددگار کے طور پر ڈاکٹر صاحب کے قریب ہیں، ان سے خواہش کا اظہار کیا کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ رازی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ڈاکٹر طاہرالقادری صاحب نے باوجود علالت کے مجھے خصوصی طور پر ملاقات کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح ایک معینہ وقت پر میں اور میرے نہایت عزیز دوست سید نہال احمد، ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے ڈاکٹر صاحب کی صحت کے مسائل ان کے چہرے سے عیاں تھے پھر بھی نعت کے تعلّق سے انہوں نے ہمیں خاصا وقت دیا۔ میں نے انہیں نعت ریسرچ سینٹر کے قیام، مقاصد اور منصوبوں کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کیا اور اس کے تحت شائع ہونے والی چند مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کیں۔ ساتھ ہی منہاج القرآن یونیورسٹی میں نعت چیئر کے قیام کے لیے درخواست بھی پیش کر دی۔ اور انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے پاکستان کی تمام بڑی جامعات کو اس سلسلے میں خطوط لکھے تھے۔ مگر اس کے جواب میں مجھے یہ طریقِ کار بتایا گیا کہ نعت چیئر کے لیے یونیورسٹی کو پانچ کروڑ روپے کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ سے میری گزارشات کو سنا مطبوعات کو دیکھا اور اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے نعت ریسرچ سینٹر کی خدمت کو سراہا اور ساتھ ہی منہاج القرآن یونیورسٹی میں نعت چیئر کے لیے بھرپور آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''اگر منہاج القرآن یونیورسٹی میں نعت چیئر قائم نہ ہوسکی تو اس ادارے کے وجود کا جواز ہی نہ رہے گا''۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے منہاج القرآن یونیورسٹی کے حوالے سے اپنی ترجیحات اور توقعات کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا جسے جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان کی نظر یونیورسٹی کے نصاب، نصب العین، نظم و انتظام کے ساتھ تعلیمی اور تحقیقی معیارات کے تمام زاویوں پر بھی بہت گہری ہے۔ وہ منہاج القرآن یونیورسٹی کو دنیا کی عظیم الشان جامعات کے مقابل ایک نمایاں حیثیت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور اپنے اس خواب کو تعبیر سے ہمکنار کرنے کے لیے انہوں نے اپنے دونوں صاحبزادگان ڈاکٹر حسن محیّ الدین قادری اور ڈاکٹر حسین محیّ الدین قادری کو ذہنی، علمی اور فکری طور پر جس طرح تیار کیا ہے وہ ان کے منصوبہ ساز ذہن اور قائدانہ صلاحیتوں کا عکاس ہے۔ جو لوگ قوموں کی زندگی میں تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں وہ اپنے رہنمایانہ کردار کو عملی زندگی میں اسی طرح شعور اور سلیقے سے ظاہر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی

گفتگو میں نعت کے تنقیدی زاویوں پر بھی بات کی اور محافلِ نعت میں در آنے والی اکثر بے تمیزیوں کی طرف اِشارے بھی کیے۔ جس سے ان کے گہرے تنقیدی شعور اور شاعرانہ ذوق کا اظہار بھی ہوا۔

یہ ملاقات میرے لیے کئی حوالوں سے بڑی اہم ثابت ہوئی ایک تو ڈاکٹر علامہ محمد طاہرالقادری صاحب جیسی ہمہ جہت علمی و دینی شخصیت سے ہم نشینی اور دوسرے اپنی درخواست کی قبولیت (نعت چیئر کا قیام) یہ دونوں باتیں میرے لیے روحانی سرشاریوں کا باعث بنیں۔ خدا کرے منہاج القرآن یونیورسٹی میں نعت چیئر کا جلد با قائدہ قیام عمل میں آئے اور امت اس کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو۔ آمین

فروغِ نعت کے نئے آفاق

فروغِ نعت کے نئے آفاق پر گفتگو کرتے ہوئے مجھے نعت رنگ کے ابتدائی اداریے یاد آ رہے ہیں جن میں اکثر میں نے صنفِ نعت سے اربابِ ادب کی عدم توجہی کا گلہ کرتے ہوئے ان خواہشات کا اظہار کیا کہ نعتیہ ادب کو بھی ادب سمجھ کر قبول کیا جائے اور اس کے محاسن اور ادبی پہلوؤں کا جائزہ بھی اتنی ہی سنجیدگی سے لیا جائے جتنی سنجیدگی سے ادب کی دیگر اصناف کو دیکھا جاتا ہے۔ نعت رنگ کو نعت شناسی کی ایک تحریک کا رنگ دیتے ہوئے یہ بات ہمیشہ میرے پیشِ نظر رہی ہے کہ نعت صرف ایک صنفِ سخن ہی نہیں ہے بلکہ اس کا موضوعِ عظیم نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اسی لیے نعت گوئی ہمارے لیے محض تہذیبِ نفس یا تطہیرِ نطق کا وسیلہ نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کی تعمیر، اصلاح اور دینِ اسلام کی تبلیغ و توسیع کا ذریعہ بھی ہے۔ درحقیقت نعت رنگ کا سارا سفر اسی شعور کو عام کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔

یہ بات خاصی خوش آئند ہے کہ نعت کے ادبی فروغ کے لیے ''نعت رنگ'' کی بیس سالہ جدوجہد کے نتیجے میں نعت کی ادبی مقبولیت کا اب ایک ایسا ماحول بن گیا ہے کہ معاصر ادبی منظر نامے پر نعت کے تخلیقی وفور کی ایک تازہ لہر نظر آتی ہے جس میں اردو کے نامور شعرا کے دوش بدوش نو آموز شعرا بھی نعت گوئی کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ نعت رنگ میں تنقیدی مباحثوں اور مکالموں کے روشن ہونے سے آدابِ نعت گوئی کے باب میں شعرا کا احساس ذمہ داری بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نعت کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے میں جو اندیشے مانع تھے وہ دور ہوئے ہیں اور علمی، لسانی، عروضی

اور تنقیدی زاویوں سے بے لاگ گفتگو کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی ہے جس ادبی سطح پر نعت کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے نعت کو دانستہ یا نادانستہ نظرانداز کرنے والے حلقوں میں بھی اس کو بطورِ صنفِ سخن دیکھنے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس عمل میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ادبی ادارے اب خاصے فعال نظر آرہے ہیں۔ بقول مجازؔ کچھ اس طرح کا منظرنامہ بن رہا ہے :

زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں	ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، ادھر دیکھا تو ہے	کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے

جشنِ نعت، حیدرآباد دکن

۲۰۰۲ میں ادارۃ الانصار اور سالارِ جنگ میوزیم حیدرآباد دکن کے زیرِ اہتمام دوروزہ عظیم الشان کل ہند سیمینار بعنوان ''جشنِ نعتِ رسول ﷺ'' منعقد ہوا۔ ہندوستان بھر سے اہم ادبی شخصیات نے اس سیمینار میں شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔ انھی مقالات پر مشتمل ایک مجموعہ ''مقالاتِ نعت'' میرے پیشِ نظر ہے جسے اسد سنائی (جو خود بھی دکن ایک معتبر نعت گو ہیں) نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، دکن نے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے دسمبر ۲۰۱۳ء میں شائع کی ہے۔ مقالات کے اس مجموعے میں ڈاکٹر شاہ خسرو حسینی، ڈاکٹر قاضی جمال حسین، سلیم شہزاد، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر مصطفیٰ شریف، ڈاکٹر سید طلحہٰ رضوی برق، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس، سکندر احمد، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر عبدالحمید، ڈاکٹر راہی فدائی، ڈاکٹر مظفّر شہ میری اور ڈاکٹر سید شاہ محمد حسیب الدین حمیدی کی تحریریں شامل ہیں۔ نعت کے ایک خدمت گزار کی حثیت سے یہ بات میرے لیے نہ صرف بہت اہمیت رکھتی ہے بلکہ خوشی کا باعث بھی ہے کہ اس مجموعے کے تمام مقالہ نگار بھارت ہی سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب پاکستان کی طرح بھارت میں بھی نعت شناسی کی فضا بن رہی ہے۔ بھارت کی جامعات میں نعت پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالات سے قطع نظر اب اس طرح کے ادبی اداروں کا وہاں نعتیہ ادب پر سیمینار منعقد کرنا اور ان میں پیش کیے گئے مقالات کا سرکاری اداروں کے تعاون سے شائع ہونا، نعت شناسی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب

جناب وہاب اشرفی کے رسالے ''مباحثہ'' میں کچھ پرانے ترقی پسندوں اس تعصّب کے برملا اظہار کی گونج سنائی دے رہی تھی کہ ادبی رسائل میں حمد و نعت کے شائع ہونے سے اردو جیسی سیکولر زبان کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ مقالاتِ نعت کی اشاعت کے اور ادبی رسائل و جرائد میں نعت کی شمولیت باعثِ اطمینان ہے۔ نعت رنگ (ہندوستانی ایڈیشن) اور جہانِ نعت (مدیر: غلام ربانی فدا) جیسے نعتیہ جرائد کا بھارت سے اشاعت پذیر ہونا، ادبی پرچوں کا نعت کو اپنی اشاعتوں کی اپنی زینت بنانا اور نعت نمبروں کی اشاعت کا اہتمام کرنا وہاں کے ادبی منظر نامے پر ایک مثبت تبدیلی کی علامت ہے۔

عالمی اُردو کانفرنس اور نعت

۱۹/اکتوبر ۲۰۱۴ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام ساتویں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار نعت پر بطور صنفِ سخن ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس کا عنوان ''اُردو زبان اور نعتیہ ادب'' تھا۔ یہ اجلاس جن حالات میں منعقد ہوا اور جیسی بے توجہی کا شکار رہا اس کے باوجود، آرٹس کونسل کے اربابِ حل و عقد کو مبارکباد پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا جب نعت کو بطور صنفِ سخن پہلی بار کسی عالمی اردو کانفرنس میں جگہ ملی۔ اس اجلاس کی صدارت افتخار عارف نے کی اور اظہارِ خیال کرنے والوں میں پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر عزیز احسن، گوہر اعظمی، شوکت عابد، احمد شاہ، محمود احمد خان اور راقم الحروف شامل تھے۔ آرٹس کونسل کے سیکریٹر جنرل، جناب احمد شاہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ آئندہ آرٹس کونسل کے زیرِ اہتمام ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں نعتیہ شاعری پر ایک اجلاس ہمیشہ منعقد کیا جائے گا۔ ہم نعت ریسرچ سینٹر کی جانب سے آرٹس کونسل، پاکستان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے نعت شناسی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

انجمن ترقیٔ اُردو اور نعت

۱۷/جنوری ۲۰۱۵ کو انجمن ترقی اردو، کراچی نے پہلی مرتبہ ایک مذاکرہ بعنوان ''صنفِ نعت، ادبی اور ثقافتی ورثہ'' منعقد کیا۔ جس میں شیخ الجامعہ اردو یونیورسٹی جناب ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈاکٹر پیر زادہ قاسم رضا صدیقی، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر انوار احمد زئی، ڈاکٹر عزیز احسن، محترمہ شائستہ زیدی، طاہر سلطانی، صاحبزادہ عباس وغیرہم نے مقالات پیش کیے اور ڈاکٹر فاطمہ حسن نے بحسن و خوبی اس اجلاس کی نقابت کے فرائض انجام دیے۔ اس مذاکرے میں مقررین اور مقالہ

نگاروں کے علاوہ شہر کے کثیر اہلِ علم نے شرکت کی۔ اس کاوش پر انجمن ترقی اردو کے اربابِ بست وکشاد ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق، کراچی

۲۲ جولائی ۲۰۱۳ء کو آرٹس کونسل کراچی میں، حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقیدی نشست کا اہتمام ہوا جس میں ڈاکٹر عزیز احسن نے ''نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ بعدازاں اسی حلقے کی ایک اور تنقیدی نشست منعقدہ اتوار ۶ جولائی ۲۰۱۴ء میں ڈاکٹر عزیز احسن کو ''آزاد نظم میں نعتیہ اقدار'' کے موضوع پر گفتگو کی دعوت دی گئی اور انہوں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ہم حلقۂ اربابِ ذوق، کراچی کے احباب کی نعت سے دلچسپی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جناب عقیل عباس جعفری اور ان کے رفقاء کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اس ادبی فورم پر انہوں نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح نعت کو بھی اہمیت دی اور تنقیدی نشست میں اس پر گفتگو کا اہتمام کیا۔

سنڈے میگزین، روز نامہ ''جسارت'' کراچی اور گوشۂ نعت

ڈاکٹر عزیز احسن (ڈائرکٹر نعت ریسرچ سینٹر) کو سنڈے میگزین، روز نامہ جسارت، کراچی کے میگزین اڈیٹر جناب اجمل سراج نے متعدد بار دعوت دے کر ان سے نعتیہ ادب پر کئی مقالات لکھوائے جو میگزین کے ادبی حصے کی زینت بنتے رہے۔ مقالات کا یہ سلسلہ جلد ہی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ تب اجمل سراج ایک دن نعت ریسرچ سینٹر کے دفتر تشریف لائے اور بڑے خلوص سے یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ جسارت سنڈے میگزین اب اپنا ایک خصوصی صفحہ نعتیہ ادب کے لیے مختص کرنا چاہتا ہے، آپ اس کے لیے کوئی نام تجویز کر دیں۔ الحمدللہ! اسی وقت یہ طے ہوا کہ ''نعت کائنات'' کے عنوان سے ایک صفحہ مختص کیا جائے گا جو ادبی صفحات میں ایک جداگانہ تشخّص اور تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔ اب اس صفحے پر ڈاکٹر عزیز احسن اور منظر عارفی سمیت دیگر نعت شناسوں کے مضامین اور مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے نعتیہ مشاعروں کی رپورٹیں قارئین کی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔

جسارت سنڈے میگزین کی اس کاوش کو اسلامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک بڑے حلقے نے بالخصوص اور ادبی حلقوں نے بالعموم اپنی پسندیدگی سے نوازا اور اسے مدح نبی کریم ﷺ کے

ذریعے ایک خوبصورت اسلامی معاشرے کی تشکیل کی کوششوں کا حصہ بھی قرار دیا۔ہم ''نعت کائنات'' کی کامیاب اشاعتوں پر جناب اجمل سراج اور ان کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا!

سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد کا نعت نمبر

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ایک سرکاری ادارہ ہے جو پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ادب اور ادیبوں پر مختلف حوالوں سے کام کرتا رہتا ہے۔ سہ ماہی ادبیات، اسی ادارے کے تحت شائع ہونے والا ایک ادبی جریدہ ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد اس ادارے کی توجہ نعتیہ ادب کی جانب بھی مبذول ہوئی۔ ادبیات کا شمارہ ۱۰۱، جنوری تا جون ۲۰۱۴ء نعت نمبر کی صورت میں منصّۂ شہود پر آیا۔ ہم اس ضمن میں اکادمی ادبیات پاکستان اور سہ ماہی ادبیات کی مجلسِ ادارت کو اس اہم پیش رفت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ادارہ ادبیاتِ پاکستان' مستقبل میں نعتیہ ادب کے فروغ میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے نعت نمبروں کے ساتھ اور نعتیہ شاعری کے جامع انتخاب کی اشاعتوں کے اہتمام کی طرف بھی توجہ کرے گا۔

نئے دکھ

نعت رنگ کے ہر شمارے میں تحریر کی ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب میرا قلم وفیات کی وادی میں اترتا ہے ان ساعتوں میں دل کا عجب عالم ہوتا ہے ہزار ضبط کے باوجود بچھڑنے والوں کا غم اشکوں کے سیل رواں کی صورت امنڈ آتا ہے کئی راتیں ایسی گزرتی ہیں جن میں مرحومین کی یادوں کا ہجوم جاگتا ہے اور جگاتا ہے۔ (ذوقی مظفرنگری)

اشکِ غم و الم سے ہیں آنکھیں بھری ہوئی
پھرتا ہوں کشتیوں میں سمندر لیے ہوئے

ایسی حالت میں حواس پر قابو رکھنا اور کچھ لکھنا کہاں ممکن رہتا ہے! مگر میری خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ اسم محمد ﷺ کے سائبان میں زندگی گزارنے والے ان خوش نصیبوں کا کچھ نہ کچھ تذکرہ مدح نبی کریم ﷺ کی اس عصری دستاویز میں محفوظ ہو جائے۔ یہ ہماری تہذیبی ضرورت ہے ورنہ ان کے غلاموں کو ہمارے تذکرے کی ضرورت نہیں وہ جس ذکر سے رشتہ قائم کر چکے ہیں وہ ذکر ہی ان کی

دائمی زندگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے بقول شاہ انصار الہ بادی:

ع   ان پہ مرتے ہیں تو مرتے نہیں مرنے والے

شفیق احمد فاروقی المدنی (مرحوم)

ممتاز و محترم روحانی پیشوا اور خوبصورت نعت گو شاعر قاضی شفیق احمد فاروقی کراچی سے تعلّق رکھتے تھے۔ ناظم آباد میں خانقاہ گلزار سعیدیہ ان کا اور ان کے سلسلے کا باعظمت نشان ہے ہم ایک ہی شہر کے باسی تھے مگر عجیب بات یہ ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات دیارِ حبیب ﷺ میں ہوئی میرے ایک محترم دوست ریاض احمد جو بن لادن کمپنی میں بحیثیت سول انجینئر عرصہ ۳۵ سال سے ملازمت کر رہے ہیں اور مکہ المکرّمہ میں مقیم ہیں اور تعمیرات حرمین شریفین میں تکنیکی معاونت فراہم کرنے پر مامور ہیں انہوں نے کئی بار شفیق احمد فاروقی صاحب کا ذکر کیا اور ملاقات کے لیے دعوت دی چند برس پیشتر جب میں بغرض ملازمت جدہ منتقل ہوا تو یہ مرحلہ بھی ان کی رفاقت ہی میں طے ہوا اور ہم دونوں ایک دن شفیق صاحب سے ملنے گئے جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ شفیق صاحب کو میں نے اسم بامسمّٰی پایا۔ شفقت، دل جوئی اور مہمان نوازی ان کی شخصیت کے ایسے عناصر تھے جو ان سے ملنے والے اشخاص پر چند ہی لمحوں میں واضح ہو کر ایک دائمی نقش قائم کر لیتے تھے اس ملاقات کے بعد ان سے ایک ایسا تعلّق خاطر پیدا ہوا جو ان کی زندگی تک قائم رہا اکثر فون پر بات ہوتی وہ اپنے نعتیہ اشعار سناتے اور کئی بار بذریعہ برقی ڈاک اپنا کلام ارسال کرتے جواباً جب میں انہیں فون یا ملاقات پر ان کلاموں کے حوالے سے اپنے تاثرات سے آگاہ کرتا تو وہ دعاؤں سے نوازتے۔ نعت رنگ، میاں محمد طبیب، اور ان کے محبوب خلیفہ اور نعت ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عزیز احسن اکثر ہماری گفتگو کے مشترکہ موضوعات میں ہوتے۔ شفیق صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں رنگ عشق نبی کریم ﷺ کا رنگ تھا جو انہیں کراچی سے اٹھا کر مدینہ طیبہ لے آیا تھا مجھے ایسے کئی بزرگوں کی صحبت نصیب رہی ہے جو دنیا کے مختلف حصوں سے اٹھ کر مدینہ طیبہ میں آ گئے کہ انہیں اس عارضی زندگی کے بعد دائمی زندگی کا ہر لمحہ حضور علیہ الصّلوٰۃ السّلام کے قدمین میں نصیب ہو۔ شفیق صاحب کو بھی میں نے انھی کیفیتوں اور اسی جستجو میں دیکھا بقیع میں آباد ہونے کی حسرت ان کی زندگی کا سرنامہ اور ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی۔

تمنا دل میں رکھتے ہیں کہ موت آئے مدینے میں
یہیں پر دفن بھی ہوں ہم تمنا دل میں رکھتے ہیں
تمنا ہے نہ نکلیں ہم کبھی باہر مدینے سے
رہے جاری کرم پیہم تمنا دل میں رکھتے ہیں

بالآخر اس منزل تمنا کو انہوں نے اگست ۲۰۱۴ء میں پالیا اور بقیع میں آباد ہوئے (انا اللہ وانا الیہ راجعون) ان کے صاحبزادے ضیاء فاروقی صاحب نے جب مجھے یہ خبر دی تو میرے ذہن میں ان کی خوش بختی کے حوالے سے نعت کا یہ شعر تازہ ہو گیا۔

شکر صد شکر کے موت آئی در آقا پر
اب مدینے سے کہیں جانے کا امکان گیا

کیف رضوانی (مرحوم)

کھو جانا اپنی ذات میں اک عام بات ہے
انساں وہی ہے جس کو غم کائنات ہے

اس خوبصورت شعر کے خالق اور ممتاز مزاح نگار کیف رضوانی ۲۸ ستمبر ۲۰۱۴ء کو کراچی میں وفات پا گئے (انا اللہ وانا الیہ راجعون) ان کا اصل نام سید فخر الحسن تھا ان کے کالموں کا مجموعہ ''کانا پھوسی'' اور شعری مجموعہ ''سحر گذیدہ'' کے نام سے شائع ہو چکا تھا وہ اشتہار سازی کے ادارے سے منسلک رہے۔ کئی فلموں کے نغمات بھی کیف رضوانی کی شہرت کا ذریعہ بنے اور مزاح نگاری میں بھی ان کا نام خاصا نمایاں رہا مگر مجھے یہ کیف رضوانی ایک درویشانہ رنگ میں ملے جس کا نقش اب تک میرے ذہن پر قائم ہے ایک محفل نعت کے اختتام پر ایک بزرگ مجھ سے ملے۔ روشن نورانی چہرہ جس پر خوبصورت ریش مبارک اپنی بہار دکھا رہی تھی متانت وجاہت اور گہری سنجیدگی ان کی شخصیت کے حسن کو مزید نمایاں کر رہی تھی میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت دھیمے اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولے میرا نام کیف رضوانی ہے اور پھر ایک لفافہ تھماتے ہوئے بولے اس میں میری ایک نعت ہے جو میں نے آپ کے ایک کلام سے متاثر ہو کر لکھی ہے آپ کے لیے لایا تھا۔ میں نے شکریہ کا اظہار کیا اور وہ لفافہ لے لیا پھر چند لمحوں میں کیف صاحب حاضرین کے ہجوم میں کہیں گم ہو گئے بعد ازاں ان کا مجموعہ کلام دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری کا ہر پہلو اور ہر موضوع اس امر کا مظہر تھا

کہ وہ اپنے گرد و پیش کی سیاسی، سماجی اور اس میں سانس لینے والی اجتماعی زندگی کے بناض و ترجمان ہیں ان کی عطا کردہ نعت نے بھی مجھے روحانی سرشاریوں سے ہم کنار کیا۔ انہوں نے عشقِ رسول ﷺ کے شدید اور سچے جذبے کو شعری معیارات کے ساتھ نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیے اور ان کے لیے دعائے مغفرت میں میرے ہمنوا بن جائیے۔

تقدیر سنور جائے سرکار کے قدموں میں
یہ جان اگر جائے سرکار کے قدموں میں
اک بار رکھوں اُن کے قدموں میں یہ سر اپنا
پھر عمر گزر جائے سرکار کے قدموں میں
یہ کیفؔ کی حسرت ہے ڈھل جائے وہ خوش بو میں
اور جا کے بکھر جائے سرکار کے قدموں میں

ابھی میں یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ جناب شوکت عابد صاحب جو کیف رضوانی کے دیرینہ رفیق کار تھے تشریف لائے۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں کیف رضوانی پر کوئی تعزیتی نوٹ لکھ رہا ہوں تو انہوں نے ایک ایسا واقعہ سنایا کہ مجھے کیف رضوانی کے کلام میں کیفیت اور وارفتگی کی اصل وجہ معلوم ہوگئی بقول شوکت عابد، کیف رضوانی نے انہیں ایک دن بتایا کہ ان کے کوئی دوست عمرہ پر تشریف لے گئے تو انہیں روضہ نبی کریم ﷺ سے آواز آئی کہ کیف رضوانی سے کہو کہ نعت لکھے اور یہ بات بتانے کے بعد کیف رضوانی زار و قطار رونے لگے انہوں نے کریم آقا ﷺ کے اس پیغام کے بعد غزل گوئی ترک کر کے نعت گوئی شروع کی۔ اپنے خوبصورت ترنم سے شاعروں کو لوٹنے والے کیف رضوانی حکم سرکار کے کیف میں ایسے گم ہوئے کہ صرف اور صرف نعت ہی کے ہو کر رہ گئے۔ یہ بات سن کر میرے دل میں یہ خیال مزید راسخ ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کا اپنے اُمّتیوں سے تعلّق کس درجہ قوی ہے جس پر ان کی چشم عنایت پڑ جائے اسے نعت گوئی کی توفیق مل جاتی ہے مگر نعت گوئی کا حکم کیف رضوانی کو تو بہت واضح اور حکمیہ انداز میں ملا تھا۔ مجھے اُن کی قسمت پر رشک آ رہا ہے۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کے جائے ہے!

کاش ان کے اہل خانہ کیف رضوانی کے قلمی سرمائے سے ان کی نعتوں کو علیٰحدہ کر کے شائع کرنے کا اہتمام کرسکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج (مرحوم)

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج ۱۹۶۰ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔حفظ قرآن،قانون، صحافت اور مطالعات اسلامی میں تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے بعد انہوں نے قرآن مجید کے آٹھ منتخب تراجم کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔قرآن فہمی ان کے ذوق اور شوق کا محور رہی۔سو(۱۰۰) کے قریب تحقیقی مقالات اور پندرہ چھوٹی بڑی فکر انگیز کتابیں ان کا تحریری اور علمی اثاثہ ہیں۔التفسیر کے نام سے ایک خالص علمی و تحقیقی جریدہ بھی نکالتے رہے۔جامعہ کراچی کے شعبۂ مطالعات اسلامی کے صدر شعبۂ ڈین اور سیرت چیئر کے ڈائریکٹر تھے۔ایک متحرک، فعال اور وسیع النظر اور وسیع القلب شخصیت جس نے کراچی کے خون آشام ماحول میں ظلم تعصّب تفرقہ بازی اور جہل کی تاریکی کو علم کے چراغوں سے کم کرنے کے کوشش میں اپنی زندگی صرف کی بالآخر ۱۸ستمبر ۲۰۱۴ء کو اس جہاد میں جام شہادت نوش کر کے اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔(انا اللہ وانا الیہ راجعون) موصوف کو شاعری سے بھی شغف رہا۔چند نعتیں بھی ان کے سرمایۂ علمی سے فراہم ہوئی ہیں ان کی ایک نعت ۲۰۱۲ء میں نعت رنگ شمارہ ۲۳ کی زینت بنی جوان کے نصیب العین جذبۂ عمل اور عشق کا اعلامیہ تھی اس میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ان کے نام پاک پر مر جائیے ۔۔۔ موت کو فخر شہادت کیجیے
مزرع اسلام کو پھر سینچ کر ۔۔۔ قلبِ کافر پر قیامت کیجیے
حق پرستی کی سزا کیونکر ملے ۔۔۔ آگے بڑھیے اور جرأت کیجیے
حق نے باطل کو مٹایا جس طرح ۔۔۔ پھر اسے زندہ حقیقت کیجیے
فیصلہ کن انقلاب آنے کو ہے ۔۔۔ پیش دعوے پر شہادت کیجیے

موت کو فخر شہادت بنا لینے والے اس باعمل عالم اور نعت گو کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی۔

ڈاکٹر مظفّر حسن عالی (مرحوم)

ڈاکٹر مظفّر حسن عالی یکم مئی ۱۹۵۹ء میں بہار میں پیدا ہوئے۔میرا ان سے ابتدائی تعارف سہ ماہی الکوثر سہسرام کی وساطت سے ہوا جو مجھے جناب مولانا ملک الظفر سہسرامی کی طرف سے گاہے گاہے ملتا رہا۔ان شماروں میں مجھے جناب مظفّر حسن عالی کی تحریروں نے خصوصی طور پر متاثر کیا ان کی تحریر کا اسلوب اور ان کا اندازِ فکر دونوں اس بات کو ظاہر کرتے تھے کہ وہ ادب کے نئے فکری زاویوں

اور جدید مسائل سے آگاہ بھی ہیں اور ان پر گفتگو کا شعور بھی رکھتے ہیں یہ بات بھی اہم تھی کہ وہ ادب اور زندگی دونوں میں روایات کے احترام کو بھی برقرار رکھتے ہوئے ہر قسم کی فکری اور فنی بے راہ روی سے اجتناب برتنے کے قائل تھے۔اس توازن نے ان کی تحریروں کو قابل توجہ بنا دیا تھا ان کا ایک مضمون اردو کی نعتیہ شاعری کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ جب میری نظر سے گزرا تو مجھے خوشی ہوئی کہ ادب کے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ فن نعت گوئی پر بھی ان کی گہری نظر تھی یہ مضمون ان کی کتاب ''نغمہ وحدت کا شاعر ساحر شیوی'' میں شامل تھا جو ساحر شیوی صاحب کے مذہبی کلام کے حوالے سے لکھا جانے والا ایک اہم مقالہ ہے۔۱۶ جون ۲۰۱۴ء کو ڈاکٹر مظفّر حسن عالی اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے (انا اللہ وانا الیہ راجعون) ان کی رحلت کی اچانک اطلاع نے خاصا آزردہ کیا کاش وہ کچھ اور وقت زندہ رہتے اور مزید کچھ ایسے وقیع مضامین صنف نعت پر لکھ سکتے۔سچ کہا نذیر فتح پوری نے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

چوہدری فضل حق (مرحوم)

نعتیہ کتب کے مطالعے کا ذوق مجھے بچپن سے رہا نعتیہ کتابیں تلاش کرنا اور انہیں جمع کرنا میری روحانی تسکین کا سبب بنتا رہا اوائل عمری ہی میں جن لوگوں کے نام نعت گوئی کے حوالے سے تواتر سے سامنے آتے رہے ان میں ایک نام فضل حق کا بھی تھا۔اردو اور فارسی میں ان کی نعتیں اپنے استادانہ رنگ و آہنگ اور شاعرانہ حسن کی وجہ سے الگ پہچان رکھتی ہیں۔نثر و نظم دونوں شعبوں میں ان کا کام قابلِ قدر ہے وہ ۱۹۲۳ء کو ضلع گجرات کے گاؤں مرالہ میں پیدا ہوئے۔ڈسٹرکٹ بورڈ کھاریاں سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور میٹرک مسلم زمیندار ہائی اسکول گجرات سے کیا جب کہ بی۔اے زمیندار کالج گجرات سے کیا۔فوج اور پولیس کے محکموں میں ملازمت کی اور پولیس میں انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی پائی۔ریٹائرمنٹ سے پہلے کچھ عرصہ وزارت داخلہ میں سیکرٹری بھی رہے ایک قومی روزنامے میں بھی آپ کے کالم ''گاہے گاہے باز خواں'' کے نام سے شائع ہوتے رہے۔مطبوعہ کتب میں آہنگ حجاز، مہر عرب، غم صحرا، سوئے حرم، خار مژگان اور سورج شامل ہیں ان کی ایک نعت کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں اور ذات رسالت مآب ﷺ کے حوالے سے ان کے عشق کی

حدت کومحسوس کریں:

پھر مہرباں ہوا ہے غمِ فرقتِ رسول ‌ طے ہو گا اب کے مرحلہ مدحتِ رسول
جاں کو بہم کروں سرِمژگاں کو نم کروں ‌ تب جا کے نقش ہو گا خطِ عظمتِ رسول
بے اذن لب کُشا ہو کسے اختیار ہے ‌ نعت رسول ہے اثرِ شفقتِ رسول
ہنگامِ عرضِ غم مجھے درکار ہے فقط ‌ اِک موجِ نیم تیری یمِ رحمتِ رسول
خواہش بھی جس میں، ڈر بھی ہو جس میں یقیں بھی ہو ‌ ہے وہ غمِ لطیف فقط نعمتِ رسول
اس کے لیے قبول ہے دل کا زیاں مجھے ‌ جاں سے عزیز تر ہے مجھے حسرتِ رسول

۲۰۱۴ء میں یہ اہم نعت گو شاعر ہم سے جدا ہو کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔(اناللہ وان الیہ راجعون)

سرشار صدیقی (مرحوم)

سرشار صدیقی کا شمار عصرِ حاضر کے معروف شاعر، ادیب اور کالم نگاروں میں ہوتا تھا ان کا اصل نام اسرار حسین محمد ارمان تھا۔ وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کو کان پور میں پیدا ہوئے۔ پتھر کی لکیر، زخم گل، ابجد، بے نام، خزاں کی آخری شام، ہجرت پہ مامور ہیں ہم، تشکیلِ سرشار صدیقی، باز دید اور اعتبار، ان کے شعری مجموعے ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔ نثری کتب میں حرف مکرر، شنیدہ، اجمال، رفتگاں، واحد متکلّم اور ہراول دستہ، شائع ہو چکی ہیں جب کہ نعتیہ ادب کو انہوں نے دو خوبصورت شعری مجموعے عطا کیے جن میں اساس اور میثاق شامل ہیں ان دونوں مجموعوں میں شامل نعتیہ غزلوں اور نظموں میں عصری حسیت اور شاعرانہ شعور نے مل کر نعت کے موضوعات اور اسالیب کو مزید وسعت آشنا کیا ہے۔ پایانِ عمر میں حرمین شریفین کی متواتر حاضری نے ان کے کلام اور زندگی میں حضوری کی کیفیت کو خاصا گہرا کر دیا تھا۔ نئی اردو نعت کے کسی بھی ادبی جائزے کو سرشار صدیقی جیسے تازہ کار اور باشعور نعت نگار کے ذکر کے بغیر مکمّل کرنا یقیناً دشوار ہو گا۔

۲۰۱۴ء کو سرشار صدیقی بھی ایک کامیاب ادبی اور روحانی زندگی گزار کر یقیں کی اس روشنی کو ساتھ لیے ہوئے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے: (انااللہ وانا الیہ راجعون)

مجھے خدا کی زمیں پر کہیں بھی دفن کرو ‌ میں خاک پائے رسالت میں گردِ راہِ حرم
وہ ارض شوق مری جنتِ یقیں ہو گی ‌ میں روزِ حشر جہاں سے اٹھایا جاؤں گا
وہ سرزمین مدینے کی سرزمیں ہو گی

جاوید احسن خان (مرحوم)

معروف شاعر و ناقد جاوید احسن کا تعلّق ڈیرہ غازی خان سے تھا ان کی پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۸ء تحصیل تونسہ میں ہوئی وہ زندگی بھر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے ڈیرہ غازی خاں میں نیشنل سینٹر کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بھی رہے ان کی مطبوعہ کتب میں جمالِ صحرا، لوح شفاعت اور چشم ِغزال شامل ہیں جب کہ نثری کتب میں سرائیکی ثقافت اور فی احسن تقویم شامل ہیں۔ جاوید احسن صاحب سے میرا تعلّق اس وقت قائم ہوا جب ان کی کتاب فی احسن تقویم (نعتیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ) شائع ہوئی۔ یہ سات ابواب پر مشتمل ۱۴۴ صفحات کی کتاب ہے جو اختصار، سادگی، دردمندی، صدق نیت اور حب رسول کی غیرت کے اجزا سے مملو ہے وہ نعت رنگ کے با قاعدہ قاری تھے۔ ''نعت نامے''، مرتبہ: (ڈاکٹر محمد سہیل شفیق مطبوعہ ۲۰۱۴) کے صفحہ نمبر ۶۲۱ پر ان کا ایک خط میرے نام موجود ہے جس میں نعت رنگ کے بارے میں ان کا اظہار پسندیدگی اور نعت سے شغف دونوں نمایاں ہیں ''لوح شفاعت'' ان کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والا یہ خوبصورت مجموعہ ان کے عشق اور فنی ریاضت کا آئینہ ہے۔ ۵ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو یہ خادم نعت اپنا توشہ آخرت ''لوح شفاعت'' لیے ہوئے اپنے رب کی طرف کوچ کر گیا۔ (انا اللہ و انا الیہ راجعون)

رب جہاں ہے شانِ جلالت لیے ہوئے
نکلا ہے آفتاب قیامت لیے ہوئے
جاوید ! بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں
روز حساب'' لوحِ شفاعت'' لیے ہوئے

محمد عبدالقیوم خان طارق سلطان پوری (مرحوم)

شعر و ادب کی دنیا میں طارق سلطان پوری کے نام سے متعارف' محمد عبدالقیوم جنوری ۱۹۶۱ء کو حسن ابدال کے شمال میں ایبٹ آباد سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر وادی ہرو میں سلطان پور نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان حسن ابدال سے پاس کیا بعد ازاں دورانِ ملازمت کراچی سے منشی فاضل، فاضل اردو کے امتحانات پاس کیے اور پھر کراچی یونیورسٹی ہی سے گریجویشن کے بعد ۱۹۷۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وہ نیشنل بینک کراچی میں برانچ منیجر کی حیثیت سے تقریباً بیس سال تک اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے

ان کا سلسلہ ارادت گولڑہ شریف سے جڑا ہوا تھا۔ان کی ادبی خدمات کا دائرہ نصف صدی کو محیط ہے ''ماہ طیبہ'' کوٹلی لوہاراں کے پرانے شمارے اس بات کے گواہ ہیں کہ طارق سلطان پوری کب سے نعت کے دامن سے وابستہ تھے ان کی اکثر ایمان افروز نعتیں جو اکثر مولانا احمد رضا خاںؒ کی زمینوں میں ہیں ان شماروں میں نظر آتی ہیں''ماہ طیبہ'' کے مدیر مولانا ابوالنور محمد بشیر اپنے رسالے میں اکثر طرحی مصرعے دیتے جس میں زیادہ تر مصرعے مولانا احمد رضا خاںؒ فاضل بریلوی کے ہوتے تھے اور یوں اس وقت کے نامور شعرا کلام رضا پر نعتوں کے چمن زار سجاتے رہے کاش کہ کوئی صاحب ہمت ''ماہِ طیبہ'' کی فائلوں سے عقیدت ومودت کے ان گلابوں کو جمع کر کے گلدستہ کی صورت میں مرتب کر سکے۔

طارق سلطان پوری کے شعری اظہار پر فکر اقبال واحمد رضاؒ کی چھاپ بہت واضح دکھائی دیتی ہے انہوں نے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاںؒ کی زمینوں میں درجنوں نعتیں تخلیق کی ہیں اعلیٰ حضرت سے ان کی عقیدت کا ثبوت ان کی ایک نعت میں اس طرح بھی سامنے آیا ہے:

موج زن جذبہ تقلید رضا ہے دل میں
اسی جذبہ سے لکھا ہے یہ قصیدہ ترا

طارق سلطان پوری کی قدرت کلام اور زود گوئی دونوں ہی متاثر کن تھیں ایک طرف نعت کے معاصر منظر نامے پر ان کی نعت گوئی ان کے تعارف کا قوی حوالہ بن چکی تھی اور دوسری طرف مادہ ہائے تاریخ نکالنے میں ان کی مہارت نے انہیں بطور تاریخ گو درجہ استناد پر فائز کر دیا تھا انہوں نے اپنے کثیر نعتیہ کلام کے سرمائے کے علاوہ مادہ ہائے تواریخ کا ایک بڑا خزانہ بھی اپنے پیچھے چھوڑا ہے جو عصری شخصیات، مطبوعات اور اہم واقعات کے حوالے سے یقیناً حوالے کی چیز ہے ہم عصر نعت نگاروں کی کتب اور ان کی تاریخ وفات وتقاریب اجرائے کتب وغیرہ کے حوالے سے اگر کوئی سلطان پوری کی کہی ہوئی تاریخوں کا جائزہ لے تو نعت کا پورا عصری منظر نامے سامنے آجائے گا۔ یقیناً نعت سے الفت اور نعت کی خدمت کے جذبے کو نمایاں کرنے کے لیے ان کا یہ کارنامہ کافی ہے۔ڈاکٹر شہزاد احمد نے مجھ سے ان کی تین نعتیہ تضمینوں کا ذکر کیا جو سلام رضا پر لکھی گئی ہیں میرے خیال میں یہ اعزاز بھی اردو کے کسی اور شاعر کو شاید ہی حاصل ہوا ہو کہ اسے سلام رضا پر تین تضمین کہنے کی سعادت نصیب ہوئی ہو مگر میرے پیش نظر ان کی دو مطبوعہ تضمین ہیں ایک ''بارانِ رحمت'' اور دوسری ''برہانِ رحمت''، یہ دونوں تضمین علیحدہ علیحدہ کتابچوں کی صورت میں ایک ہی سال یعنی ۲۰۰۵ء میں

رضا اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی ہیں ان کے علاوہ مرحوم کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری اتنی طویل مدت تک نعت کے گلستاں کو اپنے خون جگر سے سینچنے والے قادرالکلام شاعر کے نعتیہ کلام کا شائع نہ ہونا عصرِ حاضر میں فروغ نعت کے دعوے داروں کے اجتماعی رویے پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

صابر شاہ بخاری نے ماہ نامہ نعت کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء ضلع اٹک کے نعت گو شعرا میں ان کی درج ذیل غیر مطبوعہ کتب کا ذکر کیا ہے کاش یہ سرمایہ جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر محفوظ ہو سکے:

(۱) علایق بخشش (نعتیہ کلام) (۵) تاریخ راج (کتب ورسائل پر تاریخی قطعات)
(۲) چادر بخشش (نعتیہ کلام) (۶) ربابِ تاریخ (ممتاز علما مشائخ کرام کے وصال پر قطعات)
(۳) مضراب (غزلیات) (۷) خیابان عقیدت (مناقب)
(۴) آوازہ حق (سیاسی نظمیں) (۸) چادر رحمت (قصیدہ بردہ شریف کا منظوم اردو ترجمہ)

۱۸/اپریل ۲۰۱۵ء کو یہ اہم نعت نگار اس جہانِ فانی سے اس یقین کے ساتھ کوچ کر گیا۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون)

جلوۂ روئے محمد کا ہے واصف طارق
اس کی تربت میں اجالے ہی اجالے ہوں گے

نصرت نعیمی (مرحوم)

مولانا رجب علی خان نعیمی المتخلّص نصرت نعیمی ایک مستند عالم دین، شعلہ نوا خطیب خوش فکر نعت گو اور خوش آواز نعت خواں تھے۔ مولانا کی پیدائش ۱۵ مئی ۱۹۴۶ء کو کراچی میں ہوئی ان کے اجداد کا مسکن اجمیر شریف تھا مولانا ابتدا میں بطور نعت خواں محافلِ نعت میں شرکت کرتے رہے مگر جب علما کی صحبت میسر آئی تو علم دین سیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا اور آپ نے جامع مسجد اللہ والی لائنز ایریا میں دارالعلوم قادریہ نعیمیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۴ء میں سند حاصل کی۔ مولانا کی مقبولیت اور تعارف کا دائرہ نعت خوانی کی وجہ سے شروع ہی میں خاصا وسیع ہو چکا تھا کیونکہ وہ بیک وقت عربی، فارسی، پنجابی، گجراتی اور اردو میں نعت پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر جب بحیثیت عالم دین انہوں نے جوشِ خطابت کے جوہر دکھانے شروع کیے تو انہیں اہلِ سنت والجماعت کے اکابر علما کی محبّتیں اور سرپرستی بھی حاصل ہوئی اور یہیں سے مولانا کی تبلیغی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ انہیں علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ شاہ فریدالحق سمیت دیگر جدید علما کی قربت اور رفاقت نے مزید مستعد اور فعال کیا اور یوں مولانا عقیدہ

وعقیدت کے تحفظ کے لیے ان اکابر علما کے ساتھ مصروفِ عمل رہے نعت سے مولانا کے شغفِ نعت نے انہیں نعت خوانی سے نعت گوئی تک کا سفر کروایا جب ان کا مجموعہ کلام ''سعادت کے موتی ۱۹۹۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تو مجھ سمیت کئی احباب خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے زبان و بیان کے ساتھ شائستگی اور تخلیقی شعور نے ان کے کلام میں عشق نبی کریمؐ کی روشنی کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ مولانا شاعری میں افسر صابری کے شاگرد تھے ۲۲ فروری ۲۰۱۵ء کو یہ اہم عالم دین اور باشعور نعت نگار نہایت خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا میں ملک سے باہر تھا واپس آیا تو یہ خبر جناب منظر عارفی کی وساطت سے مجھ تک پہنچی۔ نہ کسی اخبار میں کوئی خبر دیکھی نہ اہلِ سنت والجماعت کے حلقوں میں کوئی نمایاں ذکر سامنے آیا۔ افسوس کہ اپنے درمیان زندگی کی علامت بن کر رہنے والے لوگوں کو ہم کتنی جلدی فراموش کر دیتے ہیں آئیں مولانا کے کچھ نعتیہ اشعار پڑھ کر ان کے لیے دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہیں:

جب لیا نام مصطفیٰ میں نے — پا لیا دل کا مدعا میں نے
زندگی کو قریب سے دیکھا — آپ کو یاد جب کیا میں نے
ہو گئیں ساری مشکلیں آسان — یا نبی دل سے جب کہا میں نے
توشۂ یادِ مصطفیٰ کے سوا — کچھ نہ زادِ سفر لیا میں
شافعِ روزِ حشر کے صدقے — بخشوائی ہے ہر خطا میں نے
دامن شاہِ دیں میں اے نصرت — رحمتِ حق کو پا لیا میں نے

چند مرحوم ثنا خواں رسول ﷺ

پچھلے دنوں ہم سے بچھڑنے والوں میں بعض اہم نعت خواں حضرات بھی شامل ہیں جو ایک طویل مدت تک اپنی مترنم آوازوں میں ذکر نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے ہمارے معاشرے کو معطّر کرتے رہے ان کا عشق نبی کریم ﷺ کی تبلیغ میں ثنا خوانی کے ذریعے مصروف رہنا ان کی محبوبیت اور مقبولیت کا سبب رہا ایسے محترم ثنا خوانوں میں سید اوصاف علی شاہ ۶/ اگست ۲۰۱۴ء کو لاہور میں، حافظ محمد حسین کسووال ۱۲/ اپریل ۲۰۱۵ء کو کسووال میں، معروف نعت گو اور نعت خواں عبدلستار نیازیؒ کے بڑے صاحبزادے اور معروف ثنا خواں محمد شاہد نیازی یکم/ مئی ۲۰۱۵ء کو لاہور میں جبکہ کراچی سے تعلق رکھنے والے سینئر ثنا خواں مجیب الرحمٰن صدیقی ۱۲ فروری ۲۰۱۵ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔

(اناللہ وانا الیہ راجعون) دمِ تحریر ان تمام ثناخوانوں کی آوازوں میں ان کے مختلف نعتیہ کلاموں کی بازگشت میری سماعت کو آسودہ کررہی ہے مگر مجیب الرحمٰن صدیقی کی پڑھی ہوئی منور بدایونی کی اس نعت کی صدا ان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

نعتِ محبوب داور سند ہو گئی ــــ فردِ عصیاں مری مستند ہو گئی
مجھ سا عاصی بھی آغوش رحمت میں ہے ــــ یہ تو بندہ نوازی کی حد ہو گئی
عمر بھر میں نے دنیا میں نعتیں پڑھیں ــــ میری بخشش یہیں مستند ہو گئی
جو تجلّی منور مرے دل میں تھی ــــ وہ پسِ مرگ شمعِ لحد ہو گئی

رب کریم اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کے ان تمام ثناخوانوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین

نعت رنگ ۲۶

ابتدائیہ

ادب وتہذیب کے جملہ مظاہر انسانی فکر وشعور کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اس امر کو بھی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ افراد کے فکر وشعور کی تشکیل وتعمیر میں ان کے انفرادی ذوق وجستجو کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی، سماجی اور گروہی خواہش وکاوش کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ادب وتہذیب کا کام اپنے اظہار میں بے شک فردیت رکھتا ہے، لیکن اس کی صورت گری میں سماجی رجحانات اور گروہی رویے بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیب، شاعر یا کوئی بھی تخلیق کار خلا میں جی سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اظہار کی معنویت کا سراغ پا سکتا ہے۔ اسے اپنے معاشرے میں جینا ہوتا ہے اور یہیں اس کا فن جلا پاتا ہے اور معنویت سے ہم آغوش ہوتا ہے۔

افراد کی بلندی یا پستی کا اندازہ اُن کے مقصدِ حیات سے کیا جا سکتا ہے، اسی طرح کسی تہذیب اور کسی عہد کے لیے تخمین وظن کا کام یا اس کی سرافرازی اور قدر ومنزلت کا جائزہ بھی اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر لیا جا سکتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو جدید دور گہرے المیے سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس کے افراد اپنے اپنے انفرادی دائرے میں اور اس کا سماج اپنی مجموعی صورت میں بڑی حد تک روحانی اور اخلاقی اقدار سے برگشتہ جب کہ مادّیت اور تعیّش پسندی کا دل دادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر فرد وسماج کے باطن میں ذرا سا جھانک کر دیکھا جائے تو دور تک گہری ہوتی ہوئی تاریکی کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ نام نہاد ترقی، خوش حالی اور روشن خیالی کے اس دور میں ظلمت پسندی کا یہ رویہ انسانی آزادی اور ارضیت پسندی کے نام پر فروغ پا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی خود اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق گزارنے کا حق ہے۔ اس حق کا مطالبہ گزشتہ

ادوار کے اخلاقی ضابطوں، تہذیبی فلسفوں اور نفسِ انسانی کی تربیت کرنے والے مذاہب کے خلاف اعتراضات کا غلغلہ بلند کرتے ہوئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں زور دے کر کہا جاتا ہے کہ فلسفے اور مذہب نے انسان کو جکڑ بندیوں میں ڈالا اور اس کی آزادی سلب کی ہے۔ اسے آسمان کے خواب دکھائے ہیں اور زمین سے لاتعلق ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اب اُسے ان خوابوں سے نکل کر اپنی خواہشوں اور زمینی حقائق کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ صرف اسی صورت میں وہ ایک آزاد، خودمختار، پسندیدہ اور بامعنی زندگی بسر کرسکتا ہے اور اسے خوشی نصیب ہوسکتی ہے۔

ان نظریات پر بحث کا یہ محل نہیں، اس لیے میں یہ قصہ نہیں چھیڑوں گا کہ یہ باتیں کتنی درست اور کس حد تک غلط ہیں۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس ارضیت پسندی نے آج کے انسان کا رشتہ آسمان سے منقطع کردیا ہے۔ بہت سے لوگ اسی فکر کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں اور جو ابھی نہیں ہوئے، ان کو بھی اسی راہ پر لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی سمت سے کوئی آواز آسمان کے حق میں یا اُس کی طرف سے آنے والی روشنی کے اثبات کے لیے آتی ہے تو اُس پر واشگاف الفاظ میں ردِعمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دورِ حاضر کی مقتدر قوتیں انسانیت کو مذہب سے لاتعلق دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ اپنے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہر ممکن اقدامات کررہے ہیں۔ دنیا میں لادینیت کو آزادی کا عنوان دے کر آگے بڑھایا جارہا ہے۔ اس کے فروغ کے لیے باقاعدہ پالیسیاں بنائی جارہی ہیں اور انھیں الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے ذریعے مختلف حربوں سے پھیلایا جارہا ہے۔ ان نظریات کو قبول نہ کرنے والے لوگ مطعون گردانے جاتے ہیں اور انھیں مسترد کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ذرا دھیان دیں تو اپنے اطراف کے حالات اور روزمرہ کے معمولات ہی میں کسی نہ کسی صورت میں ان رویوں کا تجربہ آپ کو اور مجھے بھی ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک تجربہ پچھلے دنوں ہمیں اُس وقت ہوا جب ''نعت رنگ'' کے سلور جوبلی نمبر میں ہمارے عہد کے نامور ادیب اور نقاد مبین مرزا کا مضمون مہمان اداریے کے طور پر شائع کیا گیا۔

اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی کے مترادف ہوگا کہ مبین مرزا نے اپنے اس مضمون میں جس زاویۂ نظر سے بات کی ہے اور جو مقدمہ بنا کر اردو شاعری کی تہذیب پر نظر ڈالی ہے وہ ہمارے نعتیہ مطالعات ہی میں نہیں بلکہ اردو تنقید کی روایت میں بھی ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مضمون میں اردو شعر و ادب کی تہذیب کے حوالے سے کچھ ایسے فکر افروز نکات

اٹھائے گئے ہیں جو اس سے قبل ہمیں اپنی تنقید کے دامن میں نظر نہیں آتے۔ ان نکات کی رُو سے دیکھا جائے تو اپنی شاعری اور اس کے مزاج کے بارے میں ہمارا تأثر ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم مضمون ہے اور ہمارے تنقیدی شعور کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔ اس کا کسی نہ کسی انداز میں اعتراف پاک و ہند کے ان سب اہلِ نظر کی طرف سے کیا گیا جو ادب اور تنقید میں تازہ کاری کو اہمیت دیتے ہیں اور ادب و مذہب کے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات آپ اور ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے مضامین جہاں ایک طرف داد و تحسین کے مستحق گردانے جاتے ہیں وہیں دوسری طرف ردِّعمل کا ہدف بھی بنتے ہیں۔ ردِّعمل اور اختلافِ رائے کا اظہار ادب میں منفی نہیں، بلکہ مثبت رویہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکر کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ مبین مرزا کے مضمون کے سلسلے میں یہ ہوا کہ اس کی ستائش کی گئی، لیکن وہ لوگ جو مذہب سے بیگانے ہیں یا اس کی طرف ایک منفی رویہ رکھتے ہیں، انھوں نے اس مضمون پر نہ صرف اپنے منفی ردِّعمل کا اظہار کیا، بلکہ کھلے لفظوں میں کہا کہ یہ ادب کو اسلامیت کے زیرِ اثر لانے کی کوشش ہے اور ہم ایسی ہر کوشش کو رد کرتے ہیں جو ادب کی سیکولر حیثیت کو ختم کرتی ہو۔

مبین مرزا نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ادب و مذہب کا رشتہ آج کا نہیں، بلکہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ اس سے پہلے کے ادبی تناظر میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت، جین مت اور دوسرے مذاہب کے حوالے سے مطالعہ کر کے کتنے ہی شواہد با آسانی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو اسلام اور اردو ادب کے باہمی رشتے کے حوالے سے اعتراض کی بھلا کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ایک شخص کی آزادی کے ضمن میں ہم اُسے یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ ادب کو سیکولر یا لامذہب سمجھے تو دوسرے شخص کو یہ آزادی دینے میں کیا امر مانع ہے کہ وہ ادب و مذہب کو ہم رشتہ گردانے۔ اگر بات حقوق ہی کی ہے تو پھر دونوں کو یکساں حقِ آزادی ملنا چاہیے۔ دونوں طرح کے لوگوں کو اپنے اپنے انداز سے ادب تخلیق کرنے، پڑھنے اور سمجھنے کا مکمّل اختیار ہونا چاہیے۔ اسی اصول کے تحت مبین مرزا کے حقِ آزادیِ رائے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

''نعت رنگ'' اپنے اشاعتی سفر کے آغاز ہی سے غایتِ تخلیقِ کائنات کی مدح و توصیف کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہے۔ یہ درحقیقت ایک میڈیم ہے، یعنی ایک ایسا ذریعہ ہے خدا کی اس روشن دلیل کو اپنی عقل، اپنی روح اور اپنے پورے وجود میں بسانے کا جس سے ساری روشنیاں پھوٹتی ہیں،

اور جس سے دُوری یا انقطاع ہی دراصل ظلمات، گمراہی یا تاریکی کا دوسرا نام ہے۔

روشنی کے اس سفر میں ''نعت رنگ'' کا یہ چھبیسواں سنگِ میل ہے۔ اس سفر میں ہم نے اہلِ قلم کو اس ہستی سے جوڑے رکھنے کی کوشش جاری رکھی ہے جس نے خود تو قلم و قرطاس بے شک استعمال نہیں کیے، لیکن اپنی تعلیمات سے قلم و قرطاس کو معتبر گردانا اور نگاہِ اعتبار سے دیکھا۔ جس مبارک ہستی پر اس لافانی کتاب کا نزول ہوا جس میں خدائے ذوالجلال نے قلم کی قسم کھائی اور اپنی محبّت کی واحد شرط یہ بتلائی کہ اگر میرے محبوب کی اطاعت کرو گے تو تم بھی میرے محبوب ہو جاؤ گے، جس کے رب نے اس کے اسم کو اپنے اسم سے اور اس کے ذکر کو اپنے ذکر سے منسلک کرتے ہوئے اس کی رسالت پر ایمان کو اپنی وحدانیت پر ایمان سے مشروط کر دیا ہے۔ وہ فرطِ محبّت سے فرشتوں کے ساتھ اپنے محبوب پر خود بھی درود بھیجتا ہے اور اہلِ ایمان کو بھی اس مبارک عمل کی تلقین کرتے ہوئے قبولیتِ دعا کو بھی درود بھیجنے سے مشروط کرتا ہے۔ اس نے اپنی تمام مقدس کتابوں کو اپنے محبوب کی بعثت کی بشارت سے روشن رکھا ہے۔ یہ تمام حقائق کیا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اللہ کا وہی محبوب غایتِ تخلیقِ کائنات ہے اور جب کائنات انسانوں کے باطن میں اپنی غایت کے انکشاف و اعتراف سے محروم ہو جائے تو کیا وجودِ انسانی کا ظلمت و گمرہی کی بھینٹ چڑھ جانا لازمی نہیں ہو جائے گا۔ ''نعت رنگ'' اسی تاریکی کے خلاف آواز ہ بلند کیے ہوئے ہے، اس گہرے ایمان و ایقان کے ساتھ کہ اس روشنی کی تلاش اور اس سے جڑے رہنے کی صورت ہی میں ہمارا قلبی سکون اور ہماری آخری نجات پوشیدہ ہے۔

چھبیسواں شمارہ پیش کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر تشکّر کے جذبات سے لبریز ہے۔ پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ ''نعت رنگ'' کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ عصرِ حاضر کے نمائندہ نقادوں کا نعت گوئی کے اسالیب اور شعری جمالیات پر تنقیدی شعور کے ساتھ اظہارِ خیال کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہونا خوش آئند ہے، صرف خوش آئند نہیں بلکہ یہ عمل ہماری اس کوتاہی، غیر ذمے داری اور غفلت کا مداوا بھی معلوم ہوتا ہے جو طویل عرصے تک نعتیہ ادب کے ضمن میں ہمارے ہاں فکر و ادب کی دُنیا میں رائج رہی ہے اور جس کے منفی اثرات ہماری تہذیب اور سماج کے تقریباً سب ہی شعبوں میں افسوس ناک حد تک نمایاں طور پر ایک پورے

دور کے حوالے سے دیکھے اور محسوس کیے جاتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تنقیدِ نعت کا شعبہ ایسا ارزاں بھی نہیں کہ کوئی بھی اس میں در آئے۔ بڑے سے بڑا نقاد اور دانش ور بھی یہ کام توفیق من جانب اللہ اور داخلی مطالبے کے بغیر نہیں کر سکتا۔ مبین مرزا کے بقول:

''ادب کی دوسری اصناف کی طرح نعت کا تنقیدی مطالعہ نقاد سے محض علمی وسعت اور تجزیاتی بصیرت ہی کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص سطح کی کشادہ نظری اور فکری متانت بھی لازمی شرائط کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے دیکھا گیا ہے کہ کوئی بھی نقاد تنقیدِ نعت کے شعبے کی طرف اس وقت تک نہیں آتا جب تک یہ اس کا داخلی مطالبہ نہیں بن جاتا اور اس مطالبے کی تکمیل اس کے لیے ایک روحانی داعیے کی صورت اختیار نہیں کر لیتی۔''

اس تناظر میں یقیناً یہ بات خوش آئند ہے کہ حالیہ عرصے میں تنقیدِ نعت کی طرف ادب کے کچھ معتبر، سنجیدہ اور اہم ناقدین متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیا ابھرتا ہوا یہ طرزِ عمل دراصل ہمارے ہاں تہذیبی، فکری، ثقافتی، سماجی اور ادبی سطح پر ایک بڑی انقلابی تبدیلی کا بلیغ اور خوش کن اشارہ ہے۔ وقت کا تغیّر اسی طرح قوموں کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تبدیلی جلد ہی اپنے وجود کا اثبات ہمارے تہذیبی، سماجی اور ادبی رویوں میں واضح طور پر کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ایک ایسی تبدیلی جو ہمارے تہذیبی اور ملی وجود کو نئی معنویت سے ہم کنار کرے گی۔ ہمارے گم گشتہ وقار کی بحالی کا ذریعہ ہوگی اور ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے فکری مبدا اور روحانی ورثے سے وابستہ و پیوستہ کر کے اس کو جینے کے اصل معنی سے سرشار کرے گی۔

زندہ اور فکر انگیز ادب ہمیشہ مکالماتی فضا کو قائم رکھتا ہے۔ ''نعت رنگ'' ادب کی اس کشادگی کا قائل ہے اور اس پر کاربند بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کے صفحات پر ابتدا ہی سے اختلافِ رائے کی گرما گرم محفلیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، جن میں فکری، ذہنی، نظریاتی، علمی اور فنی حوالوں سے خوب خوب گفتگوئیں ہوئیں۔ ہم اب بھی ادب وفکر کے مکالماتی بیانیے کو نیک شگون سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح کے مکالمے ادب وفن کی راہوں پر نئے چراغ روشن کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے اگر کچھ لوگ ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والی کسی بھی تحریر کے بارے میں اپنی رائے یا اختلاف کا اظہار کرنا چاہیں تو ہم ان کو خوش آمدید کہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ بحث علمی وفکری اور ادبی نوعیت کی ہو اور اس کا لب ولہجہ بھی ادبی ہو۔

اس شمارے سے ''نعت رنگ'' کی بزم میں کچھ اور اہم نام پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر محمد اشرف کمال، ڈاکٹر طاہر مسعود، ڈاکٹر افتخار شفیع اور ڈاکٹر نذر عابد وغیرہ شامل ہیں۔ ان احباب کی شمولیت سے بھی ''نعت رنگ'' کی کہکشاں مزید باوقار ہوئی ہے۔

میری دعا ہے کہ ربِ لوح و قلم ہماری اس بزم کو ہمیشہ آباد رکھے۔ اس محفل میں پہلے سے آئے ہوئے اہلِ فکر و نظر میں سے جو لوگ اس عرصے میں ہم سے جدا ہو گئے ان پر ربِ کریم اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور جو حیات ہیں انھیں صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے اور خدمتِ نعت پر مامور رکھے۔

وفیات

زیرِ نظر شمارے میں یادنگاری کے حصے میں چار اہم نعت نگاروں اور نعت کاروں کے بارے میں مفصّل مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے نعتیہ منظر نامے کے اہم نام تھے جو ہم سے پچھلے کچھ عرصے میں جدا ہوئے، ان میں پروفیسر محمد اکرم رضا، خالد شفیق، ماجد خلیل اور عارف منصور شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی اہم نام اس فہرست کا حصہ ہیں۔ میں ایک بار پھر عازمِ سفر ہوں اس لیے جو نام اس وقت ذہن میں آئے ہیں سرِدست صرف ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔

سیّد منظور الکونین

۱۵ر جولائی ۱۹۴۴ء–۱۹ر جولائی ۲۰۱۶ء

صاحبزادہ سیّد منظور الکونین کی ساری زندگی مدحت سرائی میں بسر ہوئی اور پایانِ عمر تک ان کا یہ جوش و جذبہ جوان رہا۔ ان کے آہنگِ ثنا خوانی میں موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہی کی ادب آموز گونج بہت واضح سنائی دیتی تھی، یہی وجہ ان کے نعتیہ منظر نامے پر نمایاں رہنے کی بنی۔ ان کی پڑھت کا انداز، ادائی کا اسلوب اور طرز یں وضع کرنے کا مؤدّب اور باوقار اظہار ان کی محبوبیت کی وجہ بنا۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ چھوڑا جو نعت خوانی کے فن کو ان کے انداز میں اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے اور یہی سیّد منظور الکونین کا کمال ہے۔ ان کی چند نعتیں بھی میری نظر سے گزری ہیں جو ان کے عشق و ادب کی حلاوت اور نسبت و تعلّق کا اعلامیہ بن وقت کے اوراق پر محفوظ ہو گئی ہیں۔

جو مجھ پہ چشمِ رسالت مآب ہو جائے　　ہر ایک لمحہ مرا کامیاب ہو جائے
بروزِ حشر نہیں کوئی حامی و ناصر　　کرم حضور کہ آساں حساب ہو جائے

کوثر بریلوی

۱۹۳۸ء-۲۲ر ستمبر ۲۰۱۶ء

کوثر بریلوی نے نعتیہ ادب کو دو مجموعے عطا کیے۔ ان کا پہلا مجموعہ نعت ''یہ تو کرم ہے ان کا ورنہ'' اور دوسرا ''حصارِ نعت'' کے نام سے شائع ہوا جب کہ ایک مجموعۂ غزل بھی ''حدیثِ محبّت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ کراچی کے ادبی منظرنامے پر کوثر بریلوی خاصے فعال رہے مگر ان کا شعری تشخّص نعت کے حلقے میں زیادہ مستحکم ہوا۔ ان کا ایک شعر:

جتنا دیا سرکار نے مجھ کو اتنی مری اوقات نہیں
یہ تو کرم ہے اُن کا ورنہ مجھ میں تو ایسی بات نہیں

عوامی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا۔

حسین سحر

یکم مارچ ۱۹۴۲ء- ۱۵ر ستمبر ۲۰۱۶ء

اُردو پنجابی کے ممتاز شاعر، نقاد، مترجم اور ماہرِ تعلیم پروفیسر حسین سحر بھی پچھلے دنوں ہم سے بچھڑ گئے۔ ۴۰ سے زیادہ کتابیں اپنے آثارِ علمی کے طور پر چھوڑنے والے حسین سحر کو نعتیہ ادب سے بھی خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کے دینی شاعری کے مجموعوں میں تقدیس (حمد و نعت) دو جگ داوالی (پنجابی نعت)، تنویر (نعت)، سعادت (حمد و نعت)، تطہیر (سلام و منقبت) اور موَدت (مناقب و سلام) شامل ہیں۔

سحؔر یہ نعت ہی کے شعر کو اعزاز ہے حاصل
کہ ظلمت میں ادا یہ نور کا کردار کرتا ہے

عابدہ کرامت

۱۵ر جولائی ۲۰۱۶ء

کینیڈا میں مقیم معروف اُردو شاعرہ عابدہ کرامت بھی اس سال ہم سے جدا ہوئیں۔ وہ متعدد کتب کی مصنّفہ تھیں۔ ۱۲ر جولائی ۲۰۰۵ء کو انھوں نے ٹورنٹو کینیڈا کی ایک ادبی محفل میں مجھے اپنا حمدیہ مجموعۂ کلام ''جبینِ نیاز'' عطا کیا تھا۔ یہ عام حمدیہ شاعری کے مجموعوں سے الگ ایک ایسا جادۂ عرفان محسوس ہوا جس کے مطالعے سے گزرتے راہِ سلوک کی کتنی ہی منازل طے ہو جاتی ہیں اور

پھر ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں زبان خاموش ہو جاتی اور چشمِ نم سے شکر و دعا کے موتی برسنے لگتے ہیں۔ حمدیہ ادب میں اس خصوصی مجموعے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

ترے جلووں کی کوئی حد نہیں ہے — تو کیوں میری نظر محدود رکھی
رگِ جاں سے بھی بڑھ کر قرب ٹھہرا — تو کیوں دُوری مرے معبود رکھی

امجد صابری

۲۳؍دسمبر ۱۹۷۹ء - ۲۲؍جون ۲۰۱۶ء

بعض شخصیتیں ایسی شاداب اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں کہ ان کو مرحوم لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ امجد صابری بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھا کہ اس کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ وہ ایک بہت بڑا فنکار ہونے کے باوجود انتہائی منکسر المزاج اور خلیق دوست تھا۔ ہمیشہ ادب اور نیازمندی کے ساتھ ملنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ایک دل آواز مسکراہٹ والا، سروں کی دنیا میں گم، یہ شخص اپنے وجود میں بھی موسیقی جیسا بہاؤ رکھتا تھا۔ ہم اکثر ساتھ مختلف ٹی وی چینلز پر مقابلۂ نعت میں منصف کے فرائض انجام دیتے اور مختلف محافل میں پڑھتے رہے اور میں نے اسے ہر جگہ ایک ہی رنگ اور کیفیت میں پایا یعنی ''سراپا محبّت''۔ افسوس کہ ساری دنیا میں دینی اقدار کی روشنی کو مذہبی کلاموں کے ذریعے پھیلانے والے اس چراغ کو دہشت گردی کا اندھیرا نگل گیا اور ہماری ریاست اپنی روایتی بے حسی سے دیکھتی رہی۔ اس کا پڑھا ہوا کلام ''جب وقتِ نزع آئے دیدار عطا کرنا'' اس کی وہ عرضی بن گیا جو یقیناً قبولیت سے سرفراز ہوئی ہوگی، لیکن اس کے جانے کے ایک ماہ بعد تک اس کی آواز میں یہ عشق و عقیدت اور طلبِ شفاعت و رحمت میں ڈوبی ہوئی التجا پاکستان کے ہر ٹی وی چینل پر گونجتی رہی اور لوگوں کے عقیدے اور عقیدت کو تازہ کرتی رہی۔ امجد صابری تم چلے گئے مگر تمھارے نام اور کام کی روشنی دلوں کو گرماتی رہے گی۔ (ان شاءاللہ)

نعت رنگ ۲۷

ابتدائیہ

اس عہد میں بعض اہلِ نظر کے یہاں یہ احساس نمایاں طور سے موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے کہ اس وقت تہذیب و روایت کا وہ نظام اور قدریں مکمّل طور سے معرضِ خطر میں ہیں جن کا ذرا سا بھی تعلّق ہمارے مذہبی افکار و تصورات سے ہے۔ یہ خیال غلط نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم دیکھ سکتے ہیں، عصرِ حاضر میں اسلام کا معاملہ بہ یک وقت کئی طرح کی متحارب قوتوں سے ہے۔ ایک طرف وہ مذہب دشمن قوتیں ہیں جو اُسے ہر ممکن مٹانے کے درپے ہیں۔ یہ قوتیں عالمی سطح پر کام کر رہی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ مذہب کو انسانی زندگی سے کسی نہ کسی طرح یکسر نکال دیا جائے۔ اس کے بعد یہ دنیا اُن کے لیے آسان ہدف ہو جائے گی اور دنیا بھر کے انسانوں کو اخلاق و عدل سے عاری نظامِ حیات کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے باسہولت استعمال کیا جا سکے گا۔ ان کے پس منظر میں وہ لوگ اور ادارے کارفرما ہیں جو زرپرست ذہنیت رکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار دنیا کے نمائندے ہیں اور اس کے جال کو بچھانے میں مشغول ہیں۔

دوسری طرف وہ نظریات و افکار ہیں جو زرپرست ذہنیت کو تو بے شک رد کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی کسی گہری بنیادی غلط فہمی کی بنا پر مذہب کو بھی انسانی ترقی اور سماجی مساوات و استحکام کے لیے ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ حالات و واقعات نے اس مفروضے کو اس عہد تک آتے آتے کلیتاً غلط ثابت کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی غلط فہمی کسی طرح رفع نہیں ہوتی، اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ جس مساوات، عدل، استحکام اور خوش حالی کی بات کرتے ہیں، اس کا حصول مذہبی نظام سے ہم آہنگی میں بدرجہا بہتر اور قدرے جلد ممکن ہے۔ اس لیے کہ مذہب تو ان سب امور کو

انسانی سماج کے لیے ایک بنیادی تقاضے کے طور پر اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ مذہب کے حلیف بن کر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صف آرا ہوں تو نتائج دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ تیسری طرف حقیقی روحِ اسلام سے ناواقف مسلمانوں کا وہ گروہ ہے جو اسلام کی اصل تصویر کو ذاتی تاویل و تفسیر کے ذریعے دانستہ نادانستہ مسخ کر رہا ہے اور اس کے تعمیری اور انقلابی پیغام کو غیر مؤثر بنانے میں دشمنوں کا آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے۔

اسلامی افکار و احکام سے صریح دشمنی اور دیدہ دانستہ ہر ممکن ضرر رسانی کی اس فضا میں مذہبی افکار کی حقانیت اور سربلندی کے لیے کام کرنا اور دینی رشتوں سے اپنے آپ کو منسلک رکھنا، توحید و رسالت کا اثبات و اعلان کرنا، محبّتِ رسول ﷺ کے نغمے چھیڑنا معمولی بات نہیں، لیکن دل کشا حقیقت یہ ہے کہ آپ کو مذہبی شعور اور اس کے نظامِ اقدار سے گہری اور پُرخلوص وابستگی کے مظاہر بھی یہاں سے امریکا تک جہاں جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوا ہے وہاں وہاں واضح طور پر نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ مسلمان کی انفرادی زندگی میں ختمی مرتبت نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبّت ایمان کا لازمی جزو ہے تو اجتماعی دائرے میں آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اسلام کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ محبّت اور تقاضا دونوں مل کر ایک ایسی مضبوط اساس اور مستحکم رابطے کی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں جس پر اسلامی عقائد و عبادات ہی نہیں، بلکہ باہمی انسانی اخوت و اخلاص کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے۔ بقول اقبالؔ:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرعِ دیں بت کدۂ تصورات

☆

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

اس تناظر میں ہم ایسے مسلمانوں کی زندگی اور اُن کی شعری تخلیقات پر نظر ڈالتے ہیں جو ساری عمر عشقِ نبیِ کریم ﷺ کو بصد خلوص نہ صرف نبھاتے رہے، بلکہ اپنے افکار و خیالات میں اعلانیہ اپنے ایمان کی اس اساس اور مستحکم سماجی رابطے اور عشق و شوق کے اس تسلسل کا والہانہ اقرار و اظہار بھی غیر مشروط طور پر کرتے رہے۔ یہ وہ خوش بخت لوگ ہیں جو ایک طرف تو اس اقرار و اظہار سے

اپنے اور اُمتِ مسلمہ کے دینی جذبات و احساسات کی تکمیل و تسکین کا سامان کرتے رہے اور دوسری طرف انھوں نے اسلام دشمن قوتوں، تحریکوں اور نظریات کی پھیلائی ہوئی فکری تیرگی کے انسانیت دشمن ماحول میں عشقِ نبی کریم ﷺ کے وسیلے سے عزم و ہمت اور وفاداری و جاں نثاری کے چراغوں کو فروزاں کر کے حقِ غلامی بھی ادا کیا۔ اسلامی تہذیب سے آراستہ معاشروں، ملکوں اور زبانوں میں نعت گوئی انھی جذبات و احساسات کا بلیغ ترین مظہر ہے۔

تاریخِ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد ہر دور کے شعرا نے ہادیِ برحق نبیِ مکرم ﷺ کے اوصاف و مناقب اور جمالِ صورت و کمالِ سیرت کے بیان میں حُسنِ کلام اور حُسنِ عقیدت کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ آپ ﷺ کے حسن و جمال کی بوقلمونی، آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے نقوشِ لازوال، میلاد و معراج کے تذکرے، آپ کا پیغام، تقویٰ، طہارت، عالم گیری و جہاں بانی، آپ کی محبّت میں سوز و گداز، ہجر و وصال، آپ کے قرب کی خواہش، طلبِ شفاعت، آپ کے شہر میں قیام اور موت کی تمنا، آپ کے معجزات و غزوات، آپ کی تعلیمات میں انسان دوستی اور خیر کی روشنی سے معمور معاشروں کی صورت گری ایسے افکار و تصورات نعت گوئی کے عام اور مستقل موضوعات رہے ہیں۔ نعت گوئی کا دامن بھی اسلام کی توسیع کے ساتھ برابر پھیلتا رہا۔ عرب اور اس کے بعد عجمی ممالک میں جب اسلام کا نور پھیلا تو اس میں مقامی رنگوں کی آمیزش نے بھی اس صنف کے موضوعات اور اسالیب کو وسعت دی۔ خصوصاً فارسی نعت گوئی جو طلوعِ اسلام سے کم و بیش تین صدی بعد وجود میں آئی، اس میں جن موضوعات نے جگہ پائی ان میں آشوبِ ذات اور آشوبِ دہر بھی شامل ہوئے۔ اسلامی ممالک میں سیاسی کش مکش، سلطنتوں کی شکست و ریخت اور اقتدار کی جنگ و قتال نے جہاں آبادیوں کو تہ و بالا کیا وہیں لوگوں کے معاشی اور معاشرتی نظام کو بھی زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس قسم کے آشوب و ابتلا میں شعرا نے اپنے مصائب و آلام کے نوحے اور حزن و ملال کے مرثیے لکھے۔ استغاثے اور استمداد کے مضامین سامنے آئے جن سے اُردو نعت کے موضوعات کا دامن مزید وسیع ہوا۔

عربی و فارسی کے بعد اُردو زبان میں بھی نعتیہ شاعری کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ اُردو میں نعتیہ شاعری کی ایک طویل روایت ہے، اور یہ روایت صرف اظہار کے پیرایوں اور پیمانوں کی نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلّق ان آداب اور محتاط رویوں سے بھی ہے جو مضامینِ مدحت کو تخّیلی پیکر دینے اور برتنے میں نزاکتیں پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اُس بارگاہ میں نہ تو بے باکیوں کی گنجائش ہے اور نہ

ہی غیر معتدل مبالغے کی پذیرائی۔ اس لیے نعتیہ شاعری روایتی شاعری سے کہیں زیادہ مشکل ہے، لیکن ان مشکلات اور پابندیوں کے باوجود نعتیہ شاعری کو رسمی طرزِ سخن کے خانے میں رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا، کیوں کہ نعتیہ شاعری گہری ارادت اور عقیدت سے تحریک تو ضرور پاتی ہے، لیکن اسے محض عقیدت و محبّت کا اظہار سمجھنا اس کی فکری و فنی قدر و قیمت کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ غزل، نظم یا کسی بھی دوسری صنفِ ادب کی طرح ایک ایسی صنفِ اظہار ہے جس میں نازک خیالات اور گہرے افکار کو سہارنے کی پوری سکت ہے۔ نعت کا تخلیقی تناظر اس امر کی صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ہمارے عہد تک آتے آتے اُردو میں نعتیہ شاعری عظمت، رفعت، علمی وقار، لسانی بلندی و لطافت کی مقبولیت کی کئی منازل طے کر چکی ہے اور آج یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو شاعری میں ایک امتیازی شان سے جلوہ گر ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں اُردو نعت گوئی میں فکری اور تخلیقی اعتبار سے جو توانا رجحانات سامنے آئیں ہیں، وہ خوش کن ہی نہیں فکر افروز بھی ہیں۔ عصرِ حاضر کے نعت گو شعرا کا نظامِ فکر و وجدان، قرآنی تعلیمات اور اسلامی اقدار و شعائر کے تحت تشکیل پا کر سامنے آتا ہے۔ آج کا نعت نگار اجتماعی، انفرادی اور کائناتی دُکھوں کے مداوے کے لیے سیرتِ اطہر سے روشنی کشید کر رہا ہے۔ یوں ہماری نعت اسلام اور روحِ اسلام، کائنات اور مقصدِ کائنات، رسول ﷺ اور حیاتِ رسول ﷺ کی تفہیم کا ایک وسیلہ بن کر محض عقیدت کا معاملہ نہیں رہی، بلکہ فکری و فنی سطح پر بھی ادب و تہذیب کا معتبر حوالہ بن گئی ہے۔

ہمارا عہد صرف نعت کے تخلیقی امکانات ہی کا عہد ثابت نہیں ہوا، بلکہ اس میں نعت کے تنقیدی رجحان اور مطالعاتی منہاج نے بھی نمایاں طور سے فروغ پایا ہے۔ خصوصاً نعت کی فنی و فکری پرکھ کے لیے برسوں سے مروّجہ روایتی تنقیدی اصولوں کی جگہ نئے تنقیدی نظریات کے تناظر میں مطالعۂ نعت کی ضرورت و اہمیت کا احساس اجاگر ہوا۔ اس ضمن میں معروف نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا یہ اقتباس میری بات کی وضاحت کے لیے کافی ہوگا:

> اُردو نعت کی تنقید اس کے تخلیقی ارتقا کا ساتھ دینے سے قاصر رہی ہے۔ اُردو نعت میں ہیئت، اسلوب اور تکنیک کی سطحوں پر جو ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، انھیں سمجھنے، ان کی فنی حیثیتوں کا مطالعہ کرنے اور نئے تنقیدی نظریات کی روشنی میں ان کی تعبیر کرنے کی کوشش خال خال ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ اُردو نعت کے تنقیدی مطالعات کی کمی نہیں، مگر یہ مطالعات

چند بندھے ٹکے، پامال تنقیدی اصولوں کی روشنی میں کیے گئے ہیں۔ چناں چہ یہ مطالعات اُردو نعت کی شعریات کی گہرائی اور وسعت سے متعلّق ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ دوسری طرف نعت کا تنقیدی مطالعہ دیگر شعری اصناف کے مطالعے سے خاصا مختلف اور کہیں زیادہ ذمے داری کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ ذمے داری صرف ان تلمیحات کے مستند علم اور ان کے سلسلے میں تقدس واحترام سے عبارت نہیں، جن کا تعلّق سیرتِ رسول ﷺ سے ہے، بلکہ اس کا تعلّق اس امر کے انکشاف سے بھی ہے کہ کس طرح مذہبی و مدحیہ و تحسینی تجربہ، ایک شعری تجربے میں منقلب ہوتا ہے اور کس طرح یہ شعری تجربہ وقت کے ساتھ نئے نئے اسالیب میں ظاہر ہوتا ہے۔

(مضمون سے اقتباس مشمولہ نعت اور جدید تنقیدی رُجحانات، مطبوعہ ۲۰۱۶ء، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی)

نعتیہ ادب کی تنقید کے بارے میں اس احساس تک پہنچنے کے لیے ''نعت رنگ'' نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج نعت پر تنقید کا سفر راست سمت میں جاری ہے اور اس کارواں کا ہر قدم اس منزل سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے جس کی تمنا ''نعت رنگ'' کے آغاز میں ہمارے ذہنوں میں بیدار ہو چکی تھی۔ اب ہمارے بیشتر لکھنے والے اسی احساس کے ساتھ اس کارواں میں شامل ہو رہے ہیں۔ اُردو تنقید کے معتبر ناموں کا اس کارواں میں شامل ہونا یقیناً ''نعت رنگ'' کے سفر کو اعتبار عطا کر رہا ہے۔ نعتیہ ادب میں تازہ مکالمے اور نئے بیانیے کی روشنی طلوع ہو رہی ہے۔ ''نعت رنگ'' کا ہر تازہ شمارہ اس بدلتے تناظر کو نمایاں کرنے والا ایک ایسا اُجلا آئینہ بنتا جا رہا ہے جو مستقبل میں بھی اپنے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمایانہ کردار ادا کرنے کے ساتھ حوالہ جاتی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گا۔ (ان شاء اللہ)

''نعت رنگ'' کا شمارہ ۲۷ پیشِ خدمت ہے۔ تائید و توفیقِ الٰہی کے بغیر کسی کامیابی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ''نعت رنگ'' بھی فضلِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اُردو کے اہم لکھنے والے بڑی تیزی سے اس صراطِ خیر کے مسافر بنتے چلے جا رہے ہیں۔ پیشِ نظر شمارے کے مشمولات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہم کو جس راستے کا مسافر بنایا گیا تھا اس پر استقامت اور کامیابی بھی ہمارے ساتھ کر دی گئی تھی۔ ربِ کریم نے شکر ادا کرنے والوں کو مزید نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ سو، میرے ساتھ ''نعت رنگ'' کے تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو بھی اس سلسلے میں

اپنی دعاؤں کو شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمّل اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مکمّل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب، فکر اور تنقید کے لیے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔ اس لیے کہ اس سے خیال کے نئے در وا ہوتے اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کو فکری و نظری سطح پر رہنا چاہیے۔ اسے ذاتی یا شخصی ہرگز نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اسے مخالفت کی سطح پر آنا چاہیے۔ نیا ہو یا پرانا، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر لکھنے والے کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت ہے۔ البتہ پرانے اور بڑے لکھنے والوں کے لیے ہمارے رویے میں زیادہ سنجیدگی، متانت اور لحاظ نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اپنے بڑوں کی عزت و وقار کا خیال رکھتے ہوئے نظر آئیں گے تو یہ دراصل بعد والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہوگا۔ ''نعت رنگ'' نے اختلافات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ اس شمارے میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم آئندہ بے احتیاطی یا بے ادبی کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کسی بھی مضمون کی اشاعت سے انکار کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

اس شمارے میں معروف شاعر، نعت نگار اور نقاد و محقق محترم ڈاکٹر ریاض مجید کا ایک مضمون بھی شامل ہے، جس میں نعت کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات کے لیے بعض موضوعات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ اُن جیسی شخصیت نے نہ صرف اس کام کی ضرورت محسوس کی، بلکہ اس پر قلم بھی اٹھایا۔ گزشتہ برس ہم نے بھی پاکستان اور ہندوستان کی نمایاں جامعات کو ایک مراسلہ بھیجا تھا، جس میں کچھ موضوعات کا تعین کیا گیا تھا۔ اعادے کی غرض سے اُن موضوعات کو یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ نعت پر شرعی تنقیدی افکار کا تنقیدی محاکمہ
۲۔ جدید اردو نعت کا اسلوبیاتی مطالعہ
۳۔ قدیم و جدید نعتیہ شاعری کے اہم رجحانات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۴۔ اردو کے معروف غزل گو شعرا کی نعت گوئی کا تنقیدی مطالعہ
۵۔ بیسویں صدی کے مقبول نعت نگار/ احوال و آثار
۶۔ اردو نعتیہ شاعری میں رزمیہ عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

۷۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ
۸۔ نعت گو شاعرات کی زبان و بیاں کے خصوصی امتیازات
۹۔ اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ
۱۰۔ اردو کے اہم تذکروں میں نعتیہ اشعار کے حوالوں کا تحقیقی مطالعہ
۱۱۔ نعتیہ شاعری میں موضوعِ روایات کا محققانہ جائزہ
۱۲۔ اردو نعت کی شعری جمالیات کا تجزیاتی مطالعہ
۱۳۔ اردو کی قدیم مثنویوں میں نعتیہ عناصر کا تحقیقی جائزہ
۱۴۔ اردو کے قدیم قصائد میں نعتیہ عناصر کا تحقیقی مطالعہ
۱۵۔ اردو نعت پر لکھے گئے تحقیقی مقالات کا تنقیدی جائزہ
۱۶۔ نعتیہ ادب میں تحقیقی مقالوں کے موضوعات اور طریقِ تحقیق کا تنقیدی جائزہ
۱۷۔ اردو میں نعتیہ صحافت کا تحقیقی جائزہ
۱۸۔ نعتیہ تذکرہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
۱۹۔ اسلامی ادب کی تحریک اور فروغِ نعت کے امکانات ——ایک تحقیقی مطالعہ
۲۰۔ اردو میں نعتیہ گیت نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
۲۱۔ اردو کی روایتی اور جدید نعتیہ شاعری کے موضوعات کا تقابلی مطالعہ
۲۲۔ نعت نمبروں کی روایت کا تحقیقی جائزہ
۲۳۔ نعت گو شعرا کے فکر و فن پر لکھی جانے والی کتب کا تنقیدی جائزہ
۲۴۔ اردو نعت اور عقیدۂ ختم نبوت ——ایک تحقیقی جائزہ
۲۵۔ اردو میں نعتیہ گل دستوں کی روایت کا تحقیقی مطالعہ
۲۶۔ جدید اردو غزل میں نعتیہ عناصر کا تحقیقی مطالعہ
۲۷۔ قصیدہ بردہ کے منظوم اردو تراجم کا تقابلی جائزہ
۲۸۔ اردو نعتیہ شاعری میں قرآن و احادیث کی تلمیحات کا تحقیقی مطالعہ
۲۹۔ فتاوائے رضویہ میں نعتیہ نکات کا تحقیقی جائزہ
۳۰۔ نعت میں سراپا نگاری کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
۳۱۔ پاکستان/ بھارت کی علاقائی زبانوں میں نعت گوئی کا تحقیقی جائزہ
۳۲۔ پاکستان میں نعت خوانی کا فن ——فروغ و ارتقا سے مسائل و مباحث تک

۳۳۔ اردو کے اہم نعتیہ انتخابوں کا تنقیدی مطالعہ
۳۴۔ اردو میں نعتیہ دیباچہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
۳۵۔ اردو میں غیر منقوط نعتیہ شاعری کی روایت کا تحقیقی جائزہ
۳۶۔ جدید اردو نعت میں علامت نگاری کے رجحانات کا تنقیدی جائزہ
۳۷۔ اردو نعت میں تلمیحات کا استعمال—ایک تحقیقی مطالعہ
۳۸۔ اردو کے نمائندہ نعت شناس—احوال و آثار
۳۹۔ اردو کے اہم نعتیہ قصائد کا تجزیاتی مطالعہ
۴۰۔ اردو نعتیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحانات کا تحقیقی مطالعہ
۴۱۔ اردو کی متصوفانہ شاعری میں نعتیہ عناصر کا تحقیقی جائزہ
۴۲۔ نعتیہ ادب میں منظوم تراجم کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
۴۳۔ جامعات میں نعت شناسی کی روایت کا تحقیقی جائزہ
۴۴۔ فروغِ نعت میں تعلیمی اداروں کا حصہ—ایک تحقیقی مطالعہ
۴۵۔ فروغِ نعت میں رسالہ ''شام و سحر'' کا حصہ—ایک تحقیقی مطالعہ
۴۶۔ ''نعت نامے'' [مجموعۂ خطوط] کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ
۴۷۔ بیس ویں صدی کے رسول ﷺ نمبر اور نعتیہ ادب—ایک تحقیقی مطالعہ
۴۸۔ نعت رنگ کے تنقیدی مباحث—ایک تحقیقی مطالعہ
۴۹۔ نعتیہ تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر عزیز احسن کا حصہ—ایک تحقیقی مطالعہ
۵۰۔ حفیظ تائب کی دیباچہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ
۵۱۔ ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی اور نعت کے تنقیدی زاویے—ایک تحقیقی مطالعہ
۵۲۔ فروغِ نعت میں راجا رشید محمود اور ان کے رسالے ''ماہنامہ نعت'' کا حصہ
۵۳۔ فروغِ نعت میں پروفیسر محمد اکرم رضا کی خدمات کا تحقیقی جائزہ
۵۴۔ فروغِ نعت میں پروفیسر محمد اقبال جاوید کی خدمات کا تحقیقی جائزہ
۵۵۔ اردو نعت میں شرعی تنقید اور رشید وارثی—ایک تنقیدی مطالعہ
۵۶۔ نعت کا تنقیدی منظر نامہ اور ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی—ایک مطالعہ
۵۷۔ فروغِ نعت میں گوہر ملسیانی کی کاوشوں کا تحقیقی مطالعہ
۵۸۔ نعتیہ تذکرہ نگاری اور نور احمد میرٹھی—ایک تحقیقی مطالعہ

وفیات

''نعت رنگ'' کے ہر شمارے میں بعض رفیقانِ سفر کی جدائی کا ذکر کرتے ہوئے دل کی عجب حالت ہوتی ہے۔ موت ایک حقیقت ہے، مگر جانے والے اور خاص طور پر آپ کے فکری یا نظریاتی رفقا جو نعت کے فروغ میں آپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ مصروفِ عمل رہے ہوں، ان کی جدائی معمولی صدمہ نہیں رہتی:

کتنے رفیق ہم سے اچانک بچھڑ گئے
اب ان کی زندگی بھی بسر کر رہے ہیں ہم (نیاز بدایونی)

''نعت رنگ'' نے نعت کے ادبی فروغ کی جو تحریک شروع کی تھی، اس میں شامل ہر وہ شخص جو آج بہ ظاہر ہمارے ساتھ نہیں، اب بھی شریکِ کار ہے۔ اس لیے کہ ''نعت رنگ'' میں نعت پر مجموعی ادبی گفتگو کی مضبوط و مستحکم ہوتی فضا میں ان کی آوازوں اور تحریروں کا جذب و شوق ہمیشہ شامل رہے گا۔ شمارہ چھبّیس اور ستائیس کی اشاعت کے درمیانی عرصے میں بھی ہمیں ایسے ہی صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ دیکھیے کن کن دوستوں کا زخمِ جدائی روح پر دائمی نقش چھوڑ گیا، کیسے کیسے زخم دل کا گھاؤ بنے، بیان مشکل ہے۔

منیبہ شیخ

نعت خوانی کے اُفق پر چالیس سال سے معیار، اعتبار، عشق و ادب اور تہذیب و شائستگی کی علامت بن کر چمکنے والا نمایاں ستارہ بھی موت کی تاریکی میں گم ہو گیا، مگر اپنے پیچھے نعت خوانی کے اعلیٰ ذوق اور پڑھت کی ایک ایسی مؤدب اور شائستہ مثال چھوڑ گیا جسے نعت کی مجلسی روایت میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ منیبہ شیخ بنیادی طور پر درس و تدریس سے وابستہ رہیں، اس لیے انھوں نے نعت خوانی کے شعبے میں بھی اپنے نظریۂ نعت خوانی اور اندازِ ادائی کی تربیت کا بہت خیال رکھا، جس کی عمدہ مثال ان کی منہ بولی بیٹی تحریم کے اندازِ ثنا خوانی میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن سے اپنے پڑھے ہوئے کلام سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انھیں صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا۔

گوہر ملسیانی (۱۵ جولائی ۱۹۳۴ء - ۲۵ فروری ۲۰۱۷ء)

اُردو کے اہم شاعر، ادیب اور تذکرہ نگار پروفیسر طفیل احمد گوہر ملسیانی بھی اس سال ہم سے

رُخصت ہوئے۔ گوہر ملسیانی نے نہ صرف کئی علمی کتابیں تصنیف کیں، بلکہ اسلامی اصنافِ شعری کی تخلیق میں خصوصی دل چسپی لی اور حمد و نعت لکھنے والے اہلِ سخن کو بھی سنجیدگی سے سراہا۔ ''عصرِ حاضر کے نعت گو'' گوہر ملسیانی کے قلم سے نکلنے والا وہ ادبی شاہکار ہے جس نے ان کی تذکرہ نگاری اور تنقیدی جوہر ہی کو اجاگر نہیں کیا، بلکہ پاکستان کے ادبی منظر نامے پر نعت کے ادبی اسالیب کی چاندنی بھی بکھیر دی۔ ادب کی عمومی جہتوں کے حوالے سے بھی تنقید، تحقیق، شاعری اور نثر نگاری کے شعبوں میں گوہر ملسیانی نے ایسے کئی علمی کام چھوڑے ہیں جن کی روشنی سے علم و ادب کے افق پر اُجالا رہے گا۔

خصوصاً نعتیہ ادب کے لیے گوہر ملسیانی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ''نعت رنگ'' کے ساتھ ان کا تعلّق نہایت گہرا تھا۔ ہر شمارے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ آخری دنوں میں میرے کہنے پر انھوں نے نعت پر اپنے لکھے ہوئے مضامین یک جا کر کے اشاعت کے لیے ''کتاب سرائے'' کو بھیجے تھے۔ اُمید ہے جلد وہ مجموعۂ مضامین شائع ہو کر مطالعاتِ نعت کے سرمائے کو مزید وقیع کرے گا۔ گوہر صاحب کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

اتباعِ صاحبِ قرآن کرنا ہے مجھے	جنت الفردوس کا سامان کرنا ہے مجھے
آپ کا پیغام لے کر مصحفِ قرآن سے	پھر مکمّل نعت کا دیوان کرنا ہے مجھے
پیش کرنا ہے مجھے گوہؔر محبّت کا ثبوت	جان و تن، مال و متاع، قربان کرنا ہے مجھے

بیکل اُتساہی

یکم جون ۱۹۲۸ء-۳ دسمبر ۲۰۱۶ء

شعر و ادب کی دُنیا میں بیکل اتساہی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب اور دل آویز ترنم سے بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے اس اہم شاعر کے تعارف کا ایک معتبر اور وقیع حوالہ نعت گوئی بھی ہے جس میں ان کی پہچان اور اختصاص ان کے پوربی، اودھی اور بھوجپوری زبانوں میں لکھے گئے وہ گیت ہیں جو ماحول کو منور اور سماعتوں کو روشن کرتے رہے ہیں۔ ان کے کئی مختصر مجموعے ۱۹۹۲ء سے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے جن میں ''نغمۂ بیکل''، ''تحفۂ بطحا''، ''خوشئہ عقبیٰ''، ''سرورِ زندگی''، ''پیامِ رحمت''، ''جامِ گل''، ''موجِ نسیم''، ''سرورِ جاوداں''، ''نورِ یزداں''، ''نور کی برکھا''، ''عرش کا جلوہ''، ''نشاطِ زندگی''، ''بزمِ رحمت''، '' آفتابِ نور''، ''حسن مجلّیٰ''، ''موجِ نسیم''،

''کلامِ بیکل''اور''ترانۂ بیکل''وغیرہ شامل ہیں۔۱۹۹۲ء میں ان کا نعتیہ مجموعہ ''والضحیٰ'' شائع ہوا،اور پھر ۱۹۹۷ء میں ''والفجر'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ بیکل اتساہی پاکستان نعت اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ''عالمی نعت کانفرنس'' میں ادیب رائے پوری کی درخواست پر پہلی بار کراچی ۱۹۸۲ء میں تشریف لائے۔ پھر اس کے بعد متعدد عالمی مشاعروں میں اُنھیں کراچی مدعو کیا گیا۔ ان کی مقبولیت اور خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومتِ ہند نے انھیں ''پدم شری ایوارڈ'' سے بھی نوازا۔ یقین کی روشنی سے منور بیکل اتساہی کا یہ قطعہ ملاحظہ کیجیے اور ان کی مغفرت کے لیے دُعا میں شامل ہو جایئے:

چہرۂ گردشِ ماحول نکھر جائے گا
ایٹمی دَور کا انسان سدھر جائے گا
اے نئے دَور تجھے امن کی حاجت ہے اگر
تھام لے دامنِ سرکارؐ ، سنور جائے گا

ڈاکٹر محمد اسلم فرخی

۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء – ۱۵ جون ۲۰۱۶ء

معروف استاد، ادیب، شاعر، خاکہ نگار، محقق، انشا پرداز اور براڈ کاسٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم فرخی علمی و ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ خاکہ نگاری میں ان کے کام نے معیار اور اعتبار کے حوالے سے زندہ رہنے والے نقش قائم کیے۔ تصوف ان کا خاص اور پسندیدہ موضوع رہا۔ ''نظامِ رنگ'' ان کے رنگِ عقیدت کو بجا طور پر ظاہر کرنے والی کتاب ثابت ہوئی۔ شعر بہت عمدہ کہتے تھے۔ میں نے ''نعت رنگ'' کے شمارہ نمبر ۲، دسمبر ۱۹۹۵ء میں ان کی چند نعتوں پر مشتمل ایک گوشہ شائع کیا تھا جسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ بعد ازاں بھی ڈاکٹر صاحب ''نعت رنگ'' کے لیے کبھی کبھی کوئی تحفہ عطا فرماتے رہے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور انھیں علمی و ادبی طور پر متحرک رکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ حوصلہ افزا رویہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گرد ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ آخری عمر تک قائم رہا۔ ان کی نعت کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

مری رفتار کے دیکھو قرینے ۔۔۔ مدینے جا رہا ہوں میں مدینے
براہِ شوق ہوں محتاط اتنا ۔۔۔ بندھے ہوں جیسے پیروں میں نگینے

مرا اعزاز حد سے بڑھ گیا ہے	بلایا ہے مجھے میرے نبی نے
محبّت کی ہوا میں اُڑ رہا ہوں	رواں جیسے سمندر میں سفینے
مدینے پہنچے پھر واپس نہ آئے	کیا ہے قصد اسلم فرخی نے

حسن اکبر کمال

۱۴فروری ۱۹۴۶ء–۲۱جولائی ۲۰۱۷ء

حسن اکبر کمال ایک باکمال شاعر و نقاد تھے۔ غزل، گیت نگاری، حمد و نعت اور سلام و منقبت میں انھوں نے اپنے فن کے کمالات دکھائے اور خوب شہرت کمائی۔ عزت و شہرت اور نام وری کے باوجود اُن کی طبیعت میں انکسار تھا۔ میں نے اکثر انھیں اپنے ایک دوست پروفیسر مختار کے ہاں محفلِ نعت میں جو ہر سال منعقد ہوتی تھی، بڑی نیازمندی اور عاجزی سے شریکِ بزم دیکھا۔ محفل کے اختتام پر ان کا محبّت سے قریب آنا، پڑھے گئے کلام پر اپنی پسندیدگی کا والہانہ اظہار کرنا اور نم ناک آنکھوں سے دعائیں دینا اس حقیقت کو سامنے لاتا تھا کہ وہ اندر سے روشن اور دینی اقدار کو اہمیت دینے والی شخصیت ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد وہ میرے اور قاری وحید ظفر قاسمی صاحب کے پڑھے ہوئے کلام یا ان بحروں میں کچھ نعتیں لکھ کر محفل میں آنے لگے اور ان کی خواہش رہتی کہ ہم ان نگارشات کو محفل میں پڑھیں۔ ہم دونوں نے ان کی چند نگارشات پڑھیں بھی جس پر محفل میں ان کی سرشاری اور اشک باری آج بھی یادداشت کا حصہ ہے۔ چند سال پیشتر ان کا مجموعۂ نعت ''التجا'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ سعادت کا مرقع ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ کو عقیدت اور والہانہ انداز میں یاد کیا گیا ہے۔ ہر صفحے پر حضوری کی کیفیات کا سلیقے اور شائستگی سے اظہار ملتا ہے:

وہ سبز گنبد، سنہری جالی، حرم کا جلوہ جو یاد آیا	تڑپ اُٹھا دل، وہاں سے آکر دیارِ طیبہ جو یاد آیا
حریمِ سرکار میں تھا حاضر، میں بے نوا نعت گو مسافر	عجیب دل نے سکون پایا، وہ ایک لمحہ جو یاد آیا

ریاض حسین چودھری مرحوم

۸نومبر ۱۹۴۱ء–۶/اگست ۲۰۱۷ء

ریاض حسین چودھری کا شمار پاکستان کے ان چنیدہ نعت گو شعرا میں ہوتا تھا جو اپنے اسلوب سے الگ پہچانے جاتے تھے۔ تازہ کاری اور عشق و محبّت کا والہانہ پن ان کے اسلوب کے نمایاں اوصاف تھے۔ جدید نعت کے جتنے موضوعاتی زاویے ہو سکتے تھے، ریاض حسین چودھری کے ہاں

سب کے سب نہایت سلیقے اور توازن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اپنے تخلیقی سرمائے سے نعتیہ ادب کو ثروت مند کرنے والے اس شاعر نے بارہ مجموعے پیش کیے، جب کہ تیرھویں اور چودھویں مجموعے کے مسودے تیار ہیں اور ان پر اہلِ علم سے تأثرات حاصل کیے جا رہے تھے۔ ان کا اسلوب جس طرح شاعری میں منفرد اور جدید تھا اسی طرح ان کی نثر بھی نہایت خوب صورت تھی۔ نعتیہ ادب پر لکھے ہوئے ان کے مضامین اکثر ''نعت رنگ'' کی زینت بنتے رہے ہیں۔ وہ عمر کے آخری حصے میں بھی تخلیقی طور پر نہایت فعال اور متحرک رہے۔ کئی بیماریوں سے نبرد آزما ہونے اور ضعف کے باوجود نعت گوئی کا شغف انھیں تازہ دم رکھتا تھا۔ اکثر فون پر اپنے آنے والے مجموعوں کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے ان کی آواز میں عزم و ہمت کی روشنی صاف محسوس ہوتی تھی۔ کتابوں کے ناموں پر مشورہ، کن احباب سے رائے لی جائے، ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار، غرضے کہ وہ نقاہت اور بیماری کے باوجود کافی دیر تک فون پر گفتگو میں مصروف رہتے اور نعت کے ادبی فروغ کی صورت گری کے خوابوں کو تعبیر میں ڈھلتے دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ انھوں نے اپنی نعت کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے مکالمے کی صورت دے دی تھی۔ دیکھیے لاغر وجود میں ایک توانا روح کس طرح آقا سے التجائے کرم میں مصروف ہے:

حضور کتنے عوارض بدن سے لپٹے ہیں　　قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں رہی آقا
حضور سانس بھی لینا محال ہے اب تو　　کھڑی ہے سر پہ مرے شامِ زندگی آقا

ان کے چار مجموعوں کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ خدا کرے ان کا باقی ماندہ تخلیقی و تحریری سرمایہ بھی شائع ہو کر محفوظ ہو جائے۔

ثاقب انجان مرحوم

۲۴ جولائی ۱۹۲۷ء-۲۴ ر اکتوبر ۲۰۱۶ء

ثاقب انجان کا تعلّق کراچی سے تھا۔ جب جب ان سے ملاقات ہوئی ان کی سادگی اور اخلاص نے متأثر کیا۔ غزل کا مجموعہ ''ریگِ ساحل''، منظوم واقعۂ کربلا ''حدیثِ غم'' اور نعتیہ مجموعہ ''ابرِ کرم'' ان کا علمی و تخلیقی سرمایہ ہے۔ مرحوم کو نعت گوئی سے خصوصی شغف تھا، اکثر نعتیہ مشاعروں میں ذوق و شوق سے شرکت کرتے دکھائی دیتے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری بھی سادگی کا مظہر تھی:

کس کو دُنیا کی خبر ہے ان دنوں
جانبِ طیبہ سفر ہے ان دنوں
ایک جلوہ ، ایک منزل ، اک خیال
فکر کتنی مختصر ہے ان دنوں
خواب و بیداری میں بھی پیشِ نظر
روضۂ خیرالبشر ہے ان دنوں
رہروِ راہِ مدینہ سے نہ پوچھ
زیست کتنی معتبر ہے ان دنوں
کن خیالوں میں ہیں گم انجانؔ آپ
کون منظورِ نظر ہے ان دنوں

احمد صغیر صدیقی

۱۹۳۸ء-۲۰۱۷ء

تھے یہاں سارے عمل ردِّعمل کے محتاج
زندگی بھی ہمیں درکار تھی مرنے کے لیے

احمد صغیر صدیقی بھی چلے گئے، ان کا یہ خوبصورت شعر ان کے شعری مجموعے ''لمحوں کی گنتی'' میں کبھی نظر سے گزرا تھا، آج اس اندوہناک خبر نے ذہن میں یہ شعر تازہ کر دیا۔ احمد صغیر صدیقی بحیثیت شاعر، ادیب، نقاد، کہانی کار اور مترجم کے عصری ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت اور اعتبار کے رنگوں کو گہرا کر چکے تھے۔ ان کی مطبوعہ کتب میں ان کے تراجم کردہ کہانیوں کے چار مجموعے، نفسیات اور پُراسرار علوم پر ان کی متعدد مطبوعہ کتب کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''گوشے اور جالے'' اور چار شعری مجموعے ''سمندری آنکھیں''، ''کاسنی گلپوش دریچے''، ''اطراف'' اور ''لمحوں کی گنتی'' شامل ہیں۔ ہندو پاک کے تمام قابل ذکر رسائل و جرائد میں ان کا کلام اور تحریریں تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ نعت رنگ سے انھیں بے حد محبّت تھی اور وہ مذہبی شاعری کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات اور ان کے جواب میں شائع ہونے والے مضامین کو بہت توجہ اور شوق سے پڑھتے تھے۔ نعت رنگ میں ان کے مستقل خطوط شائع ہوتے رہے ہیں اور ہر خط میں وہ بعض نکات ایسے اٹھاتے تھے جس پر لوگوں کا ردِعمل نعتیہ تنقید میں نئے مباحث کو جنم دیتا تھا۔ میرے نام خطوط کے مطبوعہ مجموعہ ''نعت نامے'' میں ان کے ۴۵ خط محفوظ ہیں اور وہ بھی ایسے کہ ہر خط ایک مضمون معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے نعت رنگ کے لیے بعض مضامین بھی لکھے جو ان کی تنقیدی بصیرت اور جراَتِ اظہار کا آئینہ خانہ ہیں۔ ان کی نعتیں بھی نعت رنگ میں محفوظ ہوتیں رہیں، وہ ہر شمارے کے لیے کوئی نہ کوئی تازہ نعت بھی ارسال فرماتے۔ مجھ سے آخری ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے نعت رنگ کے شمارہ ۲۶ کے مشمولات

پر ایک مضمون لکھا ہے وہ جلد فراہم کریں گے، ساتھ ہی یہ ذکر بھی ہوا کہ وہ اپنے عارضہ قلب کے علاج کے لیے امریکہ جانے والے ہیں، پھر ایک دن مجھے ڈاک سے ان کا مذکورہ مضمون موصول ہوا۔ رسید کے لیے فون کیا تو فون بند تھا، معلوم ہوا کہ وہ امریکہ چلے گئے۔ سنا ہے کہ امریکہ جاتے ہوئے ان کی جہاز میں طبیعت بگڑ گئی اور انھیں امریکہ جاتے ہی اسپتال میں داخل کروانا پڑا جہاں وہ دو ماہ زیرِ علاج رہنے کے بعد گھر منتقل کیے گئے، مگر ان کی صحت سنبھل نہ سکی اور بالآخر ۱۱ستمبر ۲۰۱۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

نعت رنگ کے قارئین اور نعت کے تنقیدی زاویوں پر کام کرنے والے احمد صغیر صدیقی کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ نعت کے ادبی فروغ میں پوری دلچسپی اور ذمہ داری سے جن ادیبوں نے اس عہد میں اپنا حصہ ڈالا اُن میں احمد صغیر صدیقی اور ان کے لکھے ہوئے تنقیدی خطوط کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے دو نعتیہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

آرزو ہے یہی دل میں تری چاہت نہ ہو کم
دور کتنا ہی رہوں لطف رفاقت نہ ہو کم
میرے آقا مجھے دل جوئی کے لفظوں سے نواز
ساری دُنیا میں لٹاؤں مری دولت نہ ہو کم

فقیرِ مصطفیٰ امیر

۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء-۲۲ستمبر ۲۰۱۷ء

محمد امیر نواز اعوان کا قلمی نام فقیرِ مصطفیٰ امیر تھا۔ میانوالی میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کر کے محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی اور وہیں سے بحیثیت سینئر سپرنٹنڈنٹ آفس پولیس پنجاب کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ دُنیاوی طور پر اس منصب تک پہنچنے کے بعد عموماً انسان میں خود نمائی اور فخر کے کئی پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں، مگر میری جتنی بھی بار موصوف سے فون پر بات ہوئی، میں نے انھیں سراپا نیاز پایا۔ شاعری ان کا مشغلہ تھی۔ متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے مگر جب دامنِ ذکرِ رسالت سے وابستہ ہوئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ میری معلومات کے مطابق ان کے چھ نعتیہ مجموعے شائع ہوئے۔ ہو سکتا ہے یہ تعداد زیادہ ہو، ان کی نعت گوئی نبی کریم ﷺ سے ان کی گہری عقیدت اور والہانہ پن کا اظہار ہے۔ انھیں فن سے زیادہ جذبہ صادق کی نمود سے اپنے نعتیہ کلام کو آراستہ کرنے کا ذوق وشوق رہا۔

نعت گوئی سے اپنے پُرخلوص رشتے کے اظہار کے لیے انھوں نے صرف نعت کہی نہیں بلکہ نعت گوئی کے فروغ کے لیے بھی ''انجمن فقیرانِ مصطفیٰ'' جیسے ادارے قائم کیے جو مسلسل نعتیہ مشاعروں کے انعقاد اور اشاعتی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہے۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی ''متاعِ امیر'' اور ''نعت گو'' کے نام سے دو شمارے جاری ہوئے، مگر یہ اپنا اشاعتی سفر زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکے، مگر ان کے چند شمارے بھی فقیرِ مصطفیٰ امیر کے حوصلے، عزم اور لگن کی زندہ گواہی کے طور پر محفوظ ہوگئے ہیں۔ خداوند کریم سے اس خادمِ نعت کی مغفرت کے لیے دُعا گو ہوں:

نعت گو ہوں، کہیں بھی دفن کرو	شہرِ طیبہ کی حد سے اُٹھوں گا
میں تو محشر میں بھی امیر نواز	نعت پڑھتا لحد سے اُٹھوں گا

دُعا ہے کہ ربِّ کریم ان تمام مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

صبیح رحمانی

نعت رنگ ۲۸

ابتدائیہ

مطالعاتِ نعت کے حالیہ منظر نامے پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ پہلو قدرے اطمینان کا باعث بنتا ہے کہ اب اس کام پر ادب کی مین اسٹریم کے لوگ بھی توجہ کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے نام شامل ہیں کہ جو عصری ادبی تناظر میں اپنی ایک مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ نقد و نظر کے شعبے میں ان کی کارگزاری اور پیش رفت کو نہ صرف اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، بلکہ ان کے افکار و خیالات اور تنقیدی منہاج و مباحث دوسروں کے لیے بھی تحریک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے خوشی کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان سینئر لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ نئی نسل کے نقاد بھی اس کام کی طرف اپنے انداز سے مائل ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ساختیات، پس ساختیات، لسانی مباحث اور مابعد جدید تصورات کی روشنی میں بھی نعت کے جائزے اور مطالعات سامنے آنے لگے ہیں۔ اس طرح موجودہ عہد میں مجموعی طور پر نقدِ نعت کی جو فضا بنی ہے، وہ بلاشبہ بہت حوصلہ افزا ہے، اور اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اب تنقیدِ نعت خود اپنی جگہ ایک فکر افروز اور توجہ طلب شعبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یقیناً یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی بخشی ہوئی توفیقات کا معاملہ ہے — اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ جب اس نے خود اپنے محبوب سے فرمایا ہے:

ورفعنا لک ذکرک

(اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔)

نقدِ نعت کا یہ منظر جو آج افکار و تصورات کی روشنی کا سامان لیے ہوئے ذہنوں کو جلا بخش رہا ہے اور دلوں کو منور کر رہا ہے، یہ آپ کے ذکر بلندی کا مظہر ہی تو ہے۔

نعت اور نقدِ نعت کے ایک پرشوق قاری اور نعت رنگ کے مرتب کی حیثیت سے اس باب میں ہونے والی پیش رفت پر مسلسل میری نگاہ رہتی ہے اور میں اس میں ہونے والے ہر نئے کام اور نئے اضافے کے بارے میں باخبر رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے اس شعبے کی اکثر و بیشتر چیزیں میری نظر سے گزرتی بھی رہتی ہیں اور میرا ذہن ان کے حوالے سے اور عصری ادب و نقد کے تناظر میں سامنے آنے والے سوالات و مباحث اور افکار و تصورات کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا رہتا ہے۔ گزشتہ دنوں جو چند نئی تنقیدی تحریریں سامنے آئیں، ان کے مطالعے کے دوران میں دو ایک باتوں کا احساس ہوا۔ ''نعت رنگ'' کے قارئین اور اس دور کے اہلِ نقد و نظر کو میں ان کے بارے میں آگاہ کرنا یا آپ کہہ لیجیے کہ اُن کو بھی اپنے احساس کی اس رَو میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام اس خیال سے بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی بڑی علمی و فکری سرگرمی اس وقت تک نہ تو اپنے نئے رجحانات کے تعین میں کوئی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے اور نہ ہی عہد در عہد آگے سفر کرسکتی ہے، جب تک کہ وہ اپنی تہذیب و روایت کے مرکزی نکتے کو ہمہ وقت ملحوظِ خاطر نہ رکھے۔ یہ مرکزی نکتہ اسی صورت میں ہمہ وقت ملحوظِ خاطر رہ سکتا ہے کہ جب اسے نئے افکار و مباحث کے بدلتے ہوئے تناظر میں مسلسل تازہ کیا جاتا رہے، اور بار بار اس کی طرف توجہ دلائی جاتی رہے۔

رواداری اور وسعتِ قلبی کو ہماری تہذیب و روایت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں سب سے بڑھ کر خود نبیِ کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے روزمرہ امور میں نظر آتا ہے، اور جلوت و خلوت دونوں میں۔ چناں چہ ہماری علمی، فکری اور ادبی روایت بھی اس سے آراستہ نظر آتی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ادب و تنقید میں اختلافِ رائے کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ اہلِ علم و دانش تو اس ضمن میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اختلاف تو ادب کے لیے ایک بابرکت چیز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نئے پہلو سامنے لاتا اور نئے افکار کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تاہم اختلاف کو ہمیشہ اپنے حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اختلاف پھر اختلاف نہیں رہتا، بلکہ مخالفت بن جاتا ہے، جو کہ ظاہر ہے، مثبت نہیں، ایک منفی رویہ ہے۔ ادب و تنقید میں اور خصوصاً مطالعاتِ نعت میں تو ہر صورت میں اس سے مکمّل طور پر گریز کیا جانا چاہیے۔

اس عرصے میں بعض ایسے مضامین و مقالات اور تجزیات سامنے آئے جن کے مطالعے

میں یہ احساس شدت سے ہوا کہ اختلافِ رائے کے حدود کا قطعاً خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جن معاصرین یا متقدمین کی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے، ان کے لیے نامناسب رویے کا اظہار اختلاف کا نہیں، مخالفت کا واضح تأثر دیتا ہے۔ اختلاف کسی بھی رائے، خیال، فکر یا تصور سے کیا جاسکتا ہے، اور اس کے تقابل میں اپنی رائے یا خیال کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام دلائل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ محض کسی کو رد کر دینا یا پھر اس طرح کے کسی موقعے پر عمومی انداز کا مسترد کرنے والا لہجہ اختیار کرنا کافی نہیں ہوتا۔ بات میں وزن پیدا ہوتا ہے دلیل سے اور اس کو مستحکم کرتا ہے متبادل زاویہ، نیا خیال اور نیا بیانیہ۔ ایسا نہ ہو تو محض رد و مخالفت کا منفی احساس ہی سامنے آتا ہے جو نعت، ادب اور تنقید کسی کے لیے کار آمد نہیں ہوتا۔

اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی رائے، خیال یا فکر ادب و تنقید میں حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ اس میں رد و بدل اور اضافے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ بعض افکار و مباحث کی معنویت اور بعض تخلیقی اظہار کے قرینے کسی خاص عہد کے رجحانات اور رویوں کے زیرِ اثر بھی ہوتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے اور خصوصاً ان کا تجزیہ اور محاکمہ کرتے ہوئے، اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اظہار کا پیرایہ تخلیقی ہو یا تنقیدی اس میں شخصی اسلوب، مزاج اور رجحان کا بھی ایک خاص دخل ہوتا ہے۔ اس لیے عمومی انداز سے چیزوں کو مسترد کرنا ادب و نقد کے لیے کبھی مفید اور قابلِ قدر عمل نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ ادب و نقد میں رنگا رنگی اور تنوع کی اپنی ایک جاذبیت اور اہمیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، اس تنوع کا انحصار افراد کی اپنی اپنی تخلیقی اپج اور فکری بصیرت پر ہوتا ہے۔ اگر تنوع نہ ہو تو ادب کا کام بھی ایک مشینی یکسانیت کا شکار ہو کر ساری جاذبیت کھو سکتا ہے۔

ادبی تنقید اور خصوصاً نقدِ نعت میں یہ بات بھی لازماً یاد رکھنی چاہیے کہ یہ فکر و نظر کو روشن کرتی ہے اور ذہنوں کو کھولتی ہے۔ اس لیے اس میں لہجے اور اندازِ بیاں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چوں کہ فکر و فہم کے راستے وا کرتی ہے، اس لیے ہمیشہ دلیل کے ساتھ آتی ہے۔ تنقید کو فتوے کا انداز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ فتووں کا طریقہ اور زبان دونوں الگ ہوتے ہیں اور ادبی تنقید کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تنقید کا مقصد بہتر تفہیم اور نئے زاویے کی تلاش ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ علمی انداز اور تہذیبی رویہ اختیار کرے۔ اس میں سنجیدگی، ذمہ داری اور متانت سے اظہارِ خیال کیا گیا

ہو۔ مہذب انداز میں، دوستانہ طریقے سے اور ہم دردانہ مزاج سے اپنی رائے اور خیال کو اُجاگر کیا گیا ہو۔ تنقیدِ نعت کے لیے تو یہ سب لازمے تقاضے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف استرداد کا رویہ اختیار کرتا ہے اور شدت پسندی کے ساتھ رائے دیتا ہے اور عمومی انداز میں بیانات جاری کرتا ہے تو چاہے وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، ادب و نقد میں اس کی بات کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ اگر ادبی تقاضے پورے نہ ہوں تو کوئی خیال، کوئی رائے، کوئی نظریہ، کوئی تصور اور کوئی فکر ادب و نقد میں جگہ ہی نہیں پا سکتی۔

اس وقت جب کہ نعتیہ تنقید اور مطالعات کا کام ادب کے مرکزی دھارے کا قابلِ قدر حصہ بن چکا ہے، نعت کے ناقدین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ادب میں ہر مکتبِ فکر کی اپنی ایک جگہ اور اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ کسی کو یکسر مسترد کر کے کوئی نیا خیال، کوئی نئی فکر یا کوئی نیا نقاد ادب و تنقید میں قطعاً اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ جگہ صرف اس صورت میں بن سکتی ہے کہ بے شک اختلافِ رائے کا اظہار کیا جائے، مگر تمام تر اختلاف کے باوجود دوسروں کی آرا، تصورات اور افکار کا احترام بھی کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ آزادیِ اظہار کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہاں، اختلافِ رائے کو سامنے لاتے ہوئے ضروری ہے کہ اپنے فکر و نظر پر توجہ مرکوز کی جائے اور اُن کی معنویت کو دلیل و برہان کے ساتھ شائستگی اور سلیقے سے پیش کیا جائے۔ نعتیہ تنقید کا فروغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب ان معاملات اور حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کیا جائے۔

''نعت رنگ'' بنیادی طور پر ایک نعتیہ ادب و تنقید کا فورم ہے۔ یہاں ہر فکر و خیال کے لوگوں کو جو نعت اور آدابِ نعت اور تنقیدِ نعت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوں، خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ کسی مسلک، کسی مکتب، کسی نظریے، کسی فلسفے اور کسی اسلوب کے تخلیق کاروں اور ناقدین کے لیے ہمارے ہاں نہ تو کوئی خاص رعایت اور نہ ہی کوئی پابندیاں۔ ہمارے ہاں اختلافِ رائے کو اہمیت دی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ ادب شائستگی کو ملحوظ خاطر رکھ کر کیا گیا ہو۔ نعت کی تخلیق اور تنقید آپ کا، میرا، ہم سب کا کام ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے انداز سے، لیکن پوری ذمہ داری، سنجیدگی اور متانت سے کام کرنا چاہیے تا کہ ہم اس نعتیہ تنقید کو سلیقے اور کامیابی سے آگے بڑھا سکیں۔

وفیات

نعت رنگ کے ہر تازہ شمارے کی اشاعت پر اپنے مرحوم نعت نگاروں اور نعت کاروں کی

یادوں کو تازہ کرنا ہمارا معمول رہا ہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جو تا عمر ذکرِ نبی کریم ﷺ کے چراغ روشن کرتی رہی ہیں۔ ان سے جڑی یادوں کا ہجوم ان سطور کو لکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنے اطراف محسوس ہوتا ہے۔ کتنے لہجے، فقرے، اشعار اور واقعات یوں تازہ ہوتے چلے جاتے ہیں گویا ملاقات ہو رہی ہو۔ ان عظیم خدمت گزارانِ نعت کی زندگی اور احوال و آثار کا تذکرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ان اچھی مثالوں اور خلوص و محبّت کے حوالوں کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے عہد کی تاریخ کے طور پر محفوظ کر جائیں۔ یہ مثالیں اور یہ حوالے ان نئے رہ روانِ نعت کے لیے عزم و حوصلے کا باعث ہوں گے اور وہ ان سے ایک مقصدی زندگی کا ڈھنگ سیکھ سکیں گے، ان بزرگوں کی راہ پر چلتے ہوئے وہ خود اپنی زندگی کے اختتام کو اپنے بعد والوں کے لیے موت کا نوحہ نہیں، بلکہ ایک بامعنی اور دائمی زندگی کا نغمہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق

۱۴ جنوری ۱۹۱۸ء، امراوتی – ۲۷ نومبر ۲۰۱۷ء، ناگپور

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق اُردو نعت کے پہلے محقق تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خواہش اور تحریک پر ۱۹۴۵ء میں اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو میں نعتیہ شاعری'' کی رجسٹریشن کرائی اور ۱۹۵۵ء میں ناگپور یونیورسٹی نے اس مقالے پر ڈاکٹر صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں یہ مقالہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے شائع ہوا۔ اس طرح ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کے اس وقیع مقالے کے اشاعت سے اُردو میں نعت فہمی کی نہ صرف ضرورت واضح ہوئی، بلکہ اس کے فکری و فنی لوازم کا شعور بھی اجاگر ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح نعتیہ شاعری کو ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت سے دیکھنے میں بھی اس مقالے نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب پہلی اور آخری بار پاکستان نعت اکیڈمی کی سلور جوبلی کی تقریبات میں ادیب رائے پوری کی دعوت پر کراچی تشریف لائے تو پاکستان کے اہم نعت شناسوں کو ان سے ملاقات اور نشستوں کا موقع ملا۔ وہ تہذیب و شائستگی کا مرقع تھے۔ لباس سے طور اطوار تک، صورت سے سیرت تک، ظاہر سے باطن تک محبّت اور مروّت میں ڈھلی ہوئی ایک دل نواز شخصیت۔ گفتار میں حد درجہ ملائمیت، انکسار اور لہجے میں نرمی و لطافت۔ خود کم بولیں اور دوسروں کو زیادہ

سنیں۔ گفتگو میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کے عادی۔ چہرے پہ کوئی منفی کیفیت نہ بیزاری، بلکہ آہستہ آہستہ اپنے دلائل سے مخاطب کو فتح کرنے کی صلاحیت کے حامل۔ ان سے چند روزہ ملاقات میں ادب، زندگی اور تہذیب کے جانے کتنے ہی پہلوؤں پر بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اسی موقع پر حضرت حسان حمد و نعت بُک بینک کے سالانہ مجلّے ''حضرت حسان نعت ایوارڈ'' مطبوعہ ۱۹۹۲ء کے لیے کراچی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو کرنے کی سعادت بھی مجھے اور غوث میاں کو ملی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان آکر یہاں کی دینی سرگرمیوں اور بالخصوص نعت کی ترقی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور تقریباً ہر محفل میں اس حوالے سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مقالے کی تکمیل کے مراحل میں مطلوبہ مواد اور حوالہ جاتی کتب کی کمی کا احوال بیان کرتے تھے۔ اس ضمن میں مزید کچھ جاننے کے خواہش مند افراد مجلّہ اوج 'نعت نمبر' مطبوعہ (۹۳-۱۹۹۲ء) میں شائع ہونے والا پروفیسر حفیظ تائب کا مضمون ''اُردو نعت کے اوّلین محقق'' کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔

اُردو دنیا کو نعتیہ ادب کی طرف متوجہ کرنے والی یہ عظیم شخصیت امراوتی ضلع کے ایک قصبے تلے گاؤں وساسر میں پیدا ہوئی۔ ان کے والد کا نام سیّد عنایت محی الدین تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا (بعدازاں ایم اے فارسی اور اُردو بھی کیا) پھر حیدر آباد دکن ورنگل اور گلبرگہ میں عارضی طور پر مختلف مدارس میں شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو گورنمنٹ ماس کالج ناگپور میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس وقت اس کالج میں منظور حسین شور اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں جیسی شخصیات بھی پروفیسر کی حیثیت سے موجود تھیں۔ یہیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے انھیں نعت پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے تیار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈراما نگاری سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ان کا ایک طویل ڈراما ''کشمکش'' کے عنوان سے سامنے آیا جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ ڈراما برسوں ناگپور یونیورسٹی کے ایم اے اُردو کے نصاب میں شامل رہا بعدازاں ایک اور ڈراما ''زہر و تریاق'' بھی ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

عربی فارسی اور اُردو کے گہرے مطالعے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالے اور دیگر مضامین میں مطالعے کا وسیع تناظر سامنے آتا ہے۔ مقالے میں مختلف شعرا کے فکری اور ادبی تجزیے میں خود ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی آرا بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ آج ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اس خوشی سے بھی اپنے نئے

نعت شناسوں کو روشناس کراؤں جو ڈاکٹر صاحب کو پاکستان میں نعت کے فروغ کے مجموعی ماحول کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اس خوشی میں نعت کے فروغ کے اسباب و وجوہ جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کیں وہ نہایت قابلِ توجہ ہیں:

''مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں نعتیہ ادب کے ہر پہلو پر اس کے فروغ اور اس کی تشہیر کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے، وہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ میں جب موجودہ دور کو دیکھتا ہوں اور ۱۹۴۶ء کو یاد کرتا ہوں جب میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے کام شروع کر رہا تھا تو محسوس کرتا ہوں کہ دنیا بدل گئی ہے۔ پاکستان میں نعت کی ایک نئی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اس تبدیلی کے اسباب پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا خواب دیکھا تھا وہ تو خواب و خیال ہی رہا، مگر یہ وہی جذبہ ہے جو سیاسی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنی تسخیر کے لیے علم و ادب کی دنیا میں آ گیا ہے اور نعت نبی کریم ﷺ کو نظامِ مصطفوی کا بدل بنا لیا۔''

(مضمون سے اقتباس مشمولہ 'بہر زماں بہر زباں'، از نور احمد میرٹھی، مطبوعہ ۲۰۰۶ء، ادارہ فکر و فن کراچی، ص ۹۱)

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کی شخصیت اُردو نعت ہی نہیں، بلکہ اُردو شعر و ادب میں بھی ایک محسن کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان کی وجہ سے اُردو کی ایک عظیم صنفِ سخن جو اُردو کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ سے محروم رہی، اس کا رفیع الشان تعارف ہوا اور سچ پوچھیے تو آئندہ آنے والے ہر زمانے میں اب صنفِ نعت کی تنقید و تحقیق کے ضمن میں جو بھی کام ہو گا تو اس میں ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کا علمی و روحانی تصرف شامل رہے گا اور ادب کے ایوانوں میں نبی کریم ﷺ کے ذکر کے پھلنے پھولنے سے ڈاکٹر صاحب کے درجات بھی بلند ہوتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

پروفیسر عارف رضا

۱۳ستمبر ۱۹۳۵ء - ۱۵/اگست ۲۰۱۸ء

پروفیسر عارف رضا سے اپنے تعارف اور تعلّق کو میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ ان سے میرا پہلا تعارف فیصل آباد میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صاحب کے گھر میرے ہی اعزاز میں منعقدہ ایک محفل میں ہوا تھا۔ اس محفل کا انعقاد ڈاکٹر ریاض مجید نے کیا تھا اور اس کی صدارت حافظ لدھیانوی مرحوم نے کی تھی۔ یہ کسی بھی شہر میں بطور شاعر میرے لیے رکھی گئی پہلی تقریب تھی۔ کسی سے کوئی خاص تعارف نہ تھا۔

بس محفل ہوٹل میں ڈاکٹر ریاض مجید صاحب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے فیصل آباد کے حلقۂ نعت کو ایک جگہ مدعو کرلیا سو ایک ساتھ اپنے عہد کے عظیم نعت نگاروں کی رفاقت میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ اسی مجلس میں پروفیسر عارف رضا سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کی شعر گوئی اور گفتگو دونوں نے مجھے متاثر کیا۔ بعدازاں پھر محفل ہوٹل فیصل آباد میں مجلسِ اقبال کی کسی تقریب میں ایک نعتیہ مشاعرے میں دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس زمانے تک ان کا مجموعہ ''عطا کی خوشبو'' بھی آچکا تھا جو انھوں نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ یوں ان کی شخصیت اور شاعری کے بعض روشن پہلو میری یادداشت کا حصہ بن گئے۔ وہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ جی سی کالج میں نفسیات کے شعبے کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہوئے۔ مجلسِ اقبال فیصل آباد اور پاکستان پروفیسرز ایسوسی ایشن فیصل آباد کے صدر رہے۔ حافظ لدھیانوی اور ریاض مجید کی ہمہ وقتی رفاقت نے عارف رضا کو صراطِ نعت کا مسافر بنایا اور یوں وہ ۱۹۸۳ء میں نعت گوئی کی طرف باضابطہ طور پر متوجہ ہوئے۔

جب سے متاعِ زیست ہے وہ جانِ زندگی — پیدا ہوئے ہیں آپ ہی سامانِ زندگی
تیری عنایتوں کے سبب اے بہارِ دیں — ناواقفِ خزاں ہے گلستانِ زندگی
فیضِ نبی سے ربط ہے یوم الست سے — حاصل ازل سے ہے ہمیں عرفانِ زندگی
یارب ثنائے خواجہ مقدر رضا کا ہو — مہکے نبی کی نعت سے دیوانِ زندگی

☆

نعتِ نبی اثاثۂ عمرِ رواں ہوا — اب اُسوۂ حضور ہی منزل نشاں ہوا
دیدِ رُخِ جمال کی کس کو مجال ہے — خوش ہوں کہ حُسنِ شہرِ نبی عکسِ جاں ہوا
پہنچی درِ نبی پہ رضا کی نوائے شوق — پیدا ہنر میں نور کا طرفہ سماں ہوا

عارف رضا کی شعری ریاضت، شاعرانہ صنعتوں کا شعور، زبان کے لہجوں پہ عبور اور مذہبیت اور اخلاقیات کو شعری گداز میں ڈھالنے کا ہنر انھیں معاصر نعت گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ ابھی نعت کے ناقدین پر عارف رضا جیسے کتنے ہی صاحبِ فن نعت نگاروں کے کلام کا بالاستیعاب ادبی مطالعہ قرض ہے۔

۱۵/ اگست ۲۰۱۸ء کو اپنے دامن میں اپنے دو نعتیہ مجموعے 'عطا کی خوشبو' (۱۹۹۱ء) اور 'ثنا کی خوشبو' (۲۰۰۰ء) لیے ہوئے۔ یہ خوش کلام نعت گو اس یقین کے ساتھ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا:

اُٹھیں گے حشر میں قبروں سے سب درود سرشت
نبی کی ذات پہ پڑھتے ہوئے درود و سلام

ابوالامتیاز ع س مسلم

۸/اپریل ۱۹۲۲ء، ضلع جالندھر - ۵ جون ۲۰۱۷ء، دُبئی

ع س مسلم کا پورا نام عبدالستار مسلم تھا اور کنیت ابوالامتیاز تھی اسی لیے انھوں نے اپنا قلمی نام ابوالامتیاز ع س مسلم رکھا۔ وہ ایک کامیاب تاجر تھے۔ بعض اہم رفاعی اداروں کے قیام وانتظام میں ان کا اہم کردار رہا۔ شعروادب سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ بالخصوص حمد ونعت ان کے محبوب موضوعات رہے۔ ان کی متعدد تخلیقات حمد ونعت کے حوالے سے شائع ہوئیں، مثلاً حمد ونعت (۱۹۸۴ء)، کاروانِ حرم (۱۹۸۸ء)، اللہ و رسول (۱۹۹۳ء)، کعبہ و طیبہ (۱۹۹۳ء)، زمزمۂ سلام (۱۹۹۳ء)، زمزمۂ درود (۱۹۹۳ء)، حمدِ باری تعالیٰ (۲۰۰۸ء)، زبورِ نعت (۲۰۰۰)، واگاں میں ول موڑ (پنجابی کلام نعتیہ کلام، ۲۰۰۸ء) اسماء النبی پیراہنِ شعر میں (۲۰۱۰ء)، اسماء النبی صدف ضمائر میں (۲۰۱۰ء) جبکہ نثری کتب میں سرودِ نعت (مجموعہ مضامین، ۲۰۰۰ء) وغیرہ معروف ہیں۔ مسلم صاحب کی حمد ونعت گوئی کے حوالے سے ایک کتاب ''ع س مسلم کی حمدیہ ونعتیہ شاعری'' مرتبہ پروفیسر حسین سحر (۲۰۱۰ء) بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کے فکر وفن پر عرب دنیا سمیت ہندوپاک کی متعدد جامعات میں تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھے گئے ہیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

مسلم صاحب معاصر نعتیہ منظرنامے میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے کلام میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت بیان کرتے ہوئے اور ان سے محبّت کا اظہار کرتے ہوئے حقیقت پسندی اور آداب واحترام کے ان تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے جو علمی اندازِ نعت کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن وحدیث اور تاریخ کے جو اشارے ان کے کلام میں ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے تبحرِ علمی، عمیق مطالعے اور تحقیق وتجسّس کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کی نعت کا اساسی موضوع دربارِ رسالت میں حاضری و حضوری ہے کہ سفرِ حضوری ہی سے ان کی نعت گوئی کا آغاز ہوا تھا۔

خوش بخت و خوش مآل ہوں شہرِ نبی میں ہوں — اک کیفِ لازوال ہوں شہرِ نبی میں ہوں
وہ سر بہ سر کرم کا ہیں دریائے بے کنار — سر تا قدم سوال ہوں شہرِ نبی میں ہوں
مجھ کو نبی کے باغ کی مسلم لگی ہوا — شاداب ہوں، نہال ہوں، شہرِ نبی میں ہوں

۵ جون ۲۰۱۷ءکو دبئی میں اس اہم نعت گو نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

محمود احمد مفتی

۱۵ مئی ۱۹۶۵ء - ۲۷ راگست ۲۰۱۸ء

محمود احمد مفتی فیصل آباد کے نعتیہ منظر نامے پر بحیثیت نعت گو شاعر ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ ایک خوش اسلوب نعت گو اور خوش آواز نعت خواں کی حیثیت سے ان کی مقبولیت نمایاں رہی۔ اوائل عمری ہی سے نعت کے خدمت گزاروں میں رہے۔ نعت کانفرنس کا انعقاد کیا اور فیصل آباد کو شہرِ نعت کے نام سے پکارنے کی فضا بنانے میں سرگرم رہے۔ ان کا تعلّق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ والد علامہ غلام رسول سمندری والے ایک عالم اور خطیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ بھائیوں میں مولانا محمد مقبول احمد سرور کی شہرت بھی ایک عالم اور خطیب ہی کی ہے جبکہ دیگر بھائیوں میں پروفیسر محمد مسعود اختر بطور شاعر و ادیب اور محمد وجاہت رسول ایک دینی مزاج رکھنے والے نوجوان ہیں۔ محمود احمد مفتی کی قلمی سرگرمیوں کا آغاز اسپورٹس جرنلزم سے ہوا۔ روزنامہ عوام فیصل آباد کے اسپورٹس ایڈیشن کے انچارج رہے۔ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی رہی۔ نسیمِ ادب فیصل آباد کے بھی صدر رہے۔ شعر گوئی کا شوق نوعمری سے رہا خصوصاً نعت ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا سرنامہ رہی۔ ان کا ابتدائی نعتیہ کلام رسالہ 'صاحبِ خلقِ عظیم' میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۵ء میں ان کا نعتیہ مجموعہ ''نعت میرا بھرم'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر بشیر احمد فاروقی جیسے ممتاز نعت شناسوں کی تقاریظ موجود ہیں جنھوں نے ان کی نعت گوئی کو سراہا ہے۔

میں سر نگوں تھا بوجہِ ندامتِ عصیاں
کہی تھی نعت مگر منہ چھپا کے ہاتھوں میں

☆

نوعِ انسان اگر ساری بھی ہو نعت سرا
غیر ممکن ہے ادا حقِ ثنا ہو جائے

۲۷ راگست ۲۰۱۸ءکو فیصل آباد سے تعلّق رکھنے والا یہ پُرعزم ثنا گو، ثنا خواں حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا مگر اس روشن آرزو کے ساتھ:

زندگی نعت کے ماحول میں گزرے مفتی
بعد مرنے کے بھی بس یہ ہی ہنر ساتھ رہے

پروفیسر منیر قصوری

۲ جون ۱۹۴۷ء، امرتسر-۲ جون ۲۰۱۸ء، لاہور

منیر قصوری کا نام تاریخِ خدامِ نعت میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ان کی سرپرستی میں کتابی سلسلہ ''ایوانِ نعت'' کا پہلا شمارہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا گو کہ ''ایوانِ نعت'' اپنا اشاعتی سفر صرف چھ شماروں تک جاری رکھ سکا مگر ان چھ شماروں کو دیکھ کر نعت کے فروغ کے لیے ان کے عزم اور خواہشات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ مختصر مگر معیاری مضامین کے ساتھ نعتیہ شاعری کا عمدہ انتخاب اس کے ہر شمارے میں نظر آتا ہے۔ اس کتابی سلسلے کی مجلسِ ادارت میں منیر قصوری کا نام کہیں نظر نہیں آیا مگر حقیقت یہ ہے کہ روزِ اوّل سے نام و نمود کی خواہش سے دُور اس شخص نے پورے اخلاص سے اس کتابی سلسلے کے ذریعے فروغِ نعت کی کوشش و کاوش کی۔ ان شماروں میں دیگر اہلِ علم کے ساتھ ساتھ منیر قصوری کے مضامین بھی شامل ہوتے رہے۔ وہ عربی زبان و ادب کے اُستاد تھے۔ اس لیے ان کا عربی ادبیات کا مطالعہ بھی گہرا اور وسیع تھا۔ ان کے جو مضامین میری نظر سے گزرے ہیں وہ بیشتر عربی زبان کے نعت گو شعرا ہی کے تعارف اور تذکرے پر مشتمل ہیں۔ منیر قصوری کی شخصیت کا ایک توانا اور روشن حوالہ ان کی شعر گوئی بھی رہا، بالخصوص ان کی نعت گوئی۔ ان کے تین نعتیہ مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں جن میں ''جادۂ رحمت'' (۱۹۸۳ء)، ''سوئے مصطفیٰ'' (۲۰۰۰ء) اور ''شہرِ کرم'' (۲۰۰۷ء) شامل ہیں۔ ان کے کلام کا اپنا ایک جداگانہ رنگ ہے جس کے نمایاں عناصر جذب و مستی اور والہانہ پن ہیں، زورِ بیاں، قادرالکلامی اور رموزِ فن سے بخوبی آشنائی نے ان کے کلام میں مزید حسن اور تخلیقی جمال پیدا کیا۔ انھی اوصاف کی بنا پر ان کی نعت گوئی میں تاثیر اور دل آویزی کی کیفیت شدید ہوئی ہے۔

شہرِ کرم فزا سے ارادت کسے نہیں	ان کے قریب رہنے کی حسرت کسے نہیں
کس کو نہیں درِ کرم آثار کی لگن	اس در سے آرزوے شفاعت کسے نہیں
پھر ٹوٹنے لگا ہے دلوں پر عذابِ غم	پھر احتیاجِ دامنِ رحمت کسے نہیں
کیوں ذاتِ مصطفیٰ کا سہارا نہ لے منیر	تائیدِ مصطفیٰ کی ضرورت کسے نہیں

خود کو ساری عمر ''درویشِ مصطفیٰ مست'' لکھنے اور سمجھنے والا منیر قصوری اپنے گھر کو ''بصیری منزل'' لکھ کر نسبتوں کا فیضان حاصل کرنے والا منیر قصوری ۲ر جون ۲۰۱۸ء کو اپنے فنِ نعت گوئی کا چراغ لیے

ہوئے قبر کی تاریکیوں میں اُتر گیا۔
نوٹ: محمد سلیم چودھری نے ''شعراے امرتسر کی نعتیہ شاعری'' میں منیر قصوری کی تاریخِ پیدائش ۱۰/دسمبر ۱۹۴۷ء لکھی ہے جب کہ ان کے بچوں نے مجھے ۲/جون ۱۹۴۷ء بتائی ہے۔)

قدؔر القادری

۵ مارچ ۱۹۶۳ء، حیدر آباد - ۱۵ جولائی ۲۰۱۸ء، حیدر آباد

مرزا قدیر احمد بیگ کا قلمی نام قدر القادری تھا۔ ایک علم صوفی، ایک حاذق طبیب اور ایک با کمال شاعر کی حیثیت سے آپ کا تعارف علمی حلقوں میں ہوا۔ طبیعت میں اوائل عمری ہی سے دینی رنگ غالب تھا جسے حضرت حاجی سعید احمد شاہ قادری سے شرفِ بیعت و خلافت نے مزید گہرا کیا اور یوں آپ کی زندگی کے روز و شب مخلوقِ خدا کی خدمت اور تربیت میں صرف ہوئے۔ شعر و ادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی مطبوعہ کتب میں ان کے دو نعتیہ مجموعے ''خم خانہ مدینہ'' (۱۹۸۵ء) اور ''عارض چہ عارض'' (۲۰۱۵ء) بھی شامل ہیں۔ جنھیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف کے کلام میں عشقِ نبوی ﷺ، مدینہ طیبہ میں قیام کی آرزو اور سیرت سرورِ دو عالم سے اکتسابِ فیض کی تمنا کے رنگ کتنے گہرے ہیں۔

ظلمت سے نکالا ہمیں کس ماہِ لقا نے — محبوب خدا، صاحب لولاک لما نے
قانون وہ بخشا ہمیں محبوبِ خدا نے — رد ہو گئے قانون زمانے کے پرانے

☆

مشعل راہِ ہدایت ڈھونڈو — یعنی سرکار سے نسبت ڈھونڈو
خواہش خلد بریں ہے تو سنو — قدؔر، طیبہ میں سکونت ڈھونڈو

☆

عشقِ محبوب ربّ ضروری ہے
ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

☆

گنجائش خیالِ زمانہ نہیں کوئی
دل میں مرے خیالِ محمد مقیم ہے

قدر القادری صاحب نے اپنی ایک خانقاہ، مسجد جو مدینہ مسجد کے نام سے معروف ہے، مدینہ ٹاؤن، ہالا ناکہ میں تعمیر کی تھی، ان کے انتقال کے بعد انھیں اسی مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

نعت رنگ ۲۹

ابتدائیہ

ادب وفکر میں اظہار پانے والے خیالات وافکار دراصل اُس شعور کے مظاہر ہوتے ہیں جو کسی قوم کے اجتماعی طرزِ احساس کی تشکیل اوراس کی تہذیب کی تعمیر واستحکام کی بنیاد بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر معاشرے میں اہلِ دانش اپنے ادب وفکر کے دھاروں پر مسلسل نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے رخ اور رفتار سے وہ اُن کے مزاج اور کیفیت کا اندازہ کرتے اوران کی روشنی میں اپنے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی ادب تہذیبی قدر اور فکر واحساس کا ایسا پیمانہ ہے جو ہمیں اپنے داخلی کیف وکم سے بخوبی آگاہ کرتا ہے۔

ادب کے مجموعی منظر نامے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں تنقید کے شعبے اور اُس میں ہونے والی پیش رفت نے تخلیقی ادب جیسا تناظر قائم نہیں کیا۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہی کہ نقدِ ادب کا سلسلہ ہمارے ہاں بہت بعد میں شروع ہوا، اور جب سرسیّد تحریک کے اصلاحی دور میں اس کا آغاز ہوا تو بھی اس کے مقاصد اور اہداف ہی الگ تھے۔ یہ اپنی تہذیب کی تفتیش اوراُس کے احوال سے زیادہ سروکار اس بات سے رکھتا تھا کہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کو یہ سبق دے کہ ان کے یہاں جو کچھ بھی ہے، وہ پراگندہ، بے کار اور لایعنی ہے۔ وہ اگر اپنے بدیسی آقاؤں کے فکر ونظر کا اتباع کریں تو اُن کی دنیا و مافیہا سنورنے کا امکان ہے۔ اب یہ الگ اور تفصیل طلب بحث ہے کہ اُس زمانے کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات وحقائق کی رُو سے یہ احساس کتنا درست اوراس پر عمل کس حد تک ضروری تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بالفرض اس مسئلے پر آج پوری توجہ سے بحث کر کے یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ یہ اندازِ نظر سراسر غلط تھا تو بھی اس سے کچھ

حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اب ہمارا سماج، اُس کی تہذیبی صورتِ حال، ادب اور تنقید اس مرحلے سے بہت آگے آچکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پون صدی میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، سراج منیر، سیّد ابوالخیر کشفی اور جمال پانی پتی ایسے ناقدین ہمارے نقد و نظر کی درست سمتِ سفر کا تعین بڑی حد تک اور واضح طور پر کر چکے ہیں۔ مختلف مکاتبِ فکر اور نظریات کے حامل نقادوں اور دانش وروں کے مابین مجادلے اور مباحث کے مختلف مراحل کے بعد ہمارے اہلِ نقد پر اب یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی ہے کہ کوئی ادب اور اس کی تنقید اپنی تہذیبی اقدار سے روگرداں ہو کر نہ تو اپنی حقیقت کو پا سکتے ہیں اور نہ ہی جریدۂ عالم پر اپنے نقشِ جاوداں کا سامان کر سکتے ہیں۔

آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے نقد و نظر کے باب میں اپنی تہذیبی قدروں کا احساس اور دینی بنیادوں کا شعور اس سطح پر نظر آتا ہے کہ اُس کی نفی کا تو سوال ہی کیا، اسے کسی طرح نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس امرِ واقعہ کے ثبوت کئی طرح پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میں صرف اپنے شعبے، یعنی نعت کے تخلیقی و تنقیدی تناظر کے حوالے سے بھی دیکھتا ہوں تو احساسِ تشکّر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادب کے مرکزی دھارے سے وابستہ اہلِ نقد و نظر آج خصوصی طور سے مطالعاتِ نعت پر اپنی توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ ''نعت رنگ'' کے گزشتہ شماروں میں اس امر پر پہلے بھی حرفِ اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ سنجیدہ اور بلند پایہ اہلِ نقد جس طرح حالیہ دور میں اس حوالے سے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے ان کاموں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، انھیں پوری ذمے داری سے دیکھا جانا چاہیے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ آج خاص طمانیت کا باعث یہ پہلو بھی ہے کہ ان مباحث، سوالات اور نکات پر توجہ دی جا رہی ہے جو ہمارے ادب کے اس وقیع شعبے کے فکری نقوش کو صحیح معنوں میں روشن کرتے ہیں۔

نقدِ نعت کا یہ کام آج ہمارے بعض بڑے ناقدین انفرادی سطح پر بھی کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ جامعات میں اعلیٰ سطح پر بھی نعت کے باب میں نقد و تحقیق کا ایک وقیع سلسلہ جاری ہوا۔ ہے۔ آج اس شعبے کی مختلف معنوی اور فکری جہات کو وہ توجہ حاصل ہو رہی ہے، جس کا یہ بلاشبہ حق دار ہے۔

انتقادِ نعت کے جس سلسلے کو ہم نے ''نعت رنگ'' کے ذریعے اپنے آغازِ کار سے ہی فروغ دینے کی کوشش کی تھی، اس میں اب ''نقد الانتقاد'' کا مرحلہ آن پہنچا ہے۔ یقیناً یہ خوشی اور اطمینان کی

بات ہے۔اس لیے کہ اب اس امر کا جائزہ لینا اور فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ انتقادِ نعت کے تاحال کن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور کون سے گوشے ابھی تک توجہ طلب ہیں۔اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جن پہلوؤں پر جس طرح بات کی گئی ہے وہ ادبی وفکری معیارات کے لحاظ سے کس قدر لائقِ توجہ رہی۔کن سوالات کا جواب کس سطح سے فراہم کرنے کی سعی کی گئی اور کون سے نئے سوالات اٹھائے گئے اور مباحث کا کون سا نیا تناظر قائم کیا گیا۔ادب کی کسی بھی صنف اور اس کے موضوعات کے حوالے سے یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب انھیں ادب وفکر کے مرکزی دھارے میں جگہ مل جاتی ہے۔الحمدللہ، اردو نعت آج یہ مقام حاصل کر چکی ہے۔

سطورِ بالا میں اٹھائے گئے سوالات کی تفتیش سے ہمیں اپنے ادب وفکر کی مسافت کا نہ صرف اندازہ ہو سکتا ہے، بلکہ اس احوال کی روشنی میں آئندہ کے سفر کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ابھر سکتا ہے۔اس معاملے میں بعض ضمنی حوالے یا فروعی اشارے بھی بے حد مفیدِ مطلب ثابت ہو سکتے ہیں۔مثال کے طور پر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے اس مکتوب سے چند سطور نقل کی جائیں جو انھوں نے گزشتہ شمارے کی رسید کے طور پر لکھ کر بھیجی ہیں:

> آپ کا تازہ شمارہ دیکھنے پر بھی وہی تأثر قائم ہوتا ہے جو گزشتہ کتابوں نے قائم کیا تھا۔یعنی رطب اور یابس دونوں کو ماشاءاللہ وافر جگہ ملی ہے۔ہم اردو والوں کی یہ عادت بھی پرانی ہے کہ الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور بات بہت ذرا سی نکلتی ہے، اگر نکلتی ہے۔موجودہ شمارے کے اکثر مضامین کا یہی حال ہے۔بعض لوگوں نے نئی یا گہری بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن ان کے مقدمات محلِ نظر ہیں۔

فاروقی صاحب بڑے آدمی ہیں۔انھیں اپنے انداز سے ادب ونقد پر نگاہ ڈالنے اور ان کے بارے میں اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔اسی طرح کسی بھی دوسرے شخص کو ان کی رائے سے اختلاف کا اختیار حاصل ہے۔تاہم اس وقت ہمارے لیے تو اپنے عہد کے ایک سنجیدہ اور معتبر نقاد کا یہ ایک جملہ بھی خوش کن اور حوصلہ افزا ہے کہ بعض لوگوں نے نئی یا گہری بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے۔اپنے ادبی منظرنامے میں اسی کوشش کو بڑھاوا دینے کے لیے ''نعت رنگ'' کی مجلسِ ادارت ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ایک ایسی صنفِ سخن جس کی طرف ایک طویل عرصے تک نقد ونظر نے التفات کی نگاہ ہی نہیں اٹھائی اور اسے ''شعرِ عقیدت'' کا لیبل لگا کر ہمیشہ مباحث کی فضا سے دور رکھنے کی کوشش

کی گئی، آج وہ اس مرحلے تک آ گئی کہ اس میں نئی بات، نئے نکات کی کوشش کا اعتراف کیا جانے لگا۔ الحمدللہ، ثم الحمدللہ آج وہ اس لائق تو ہوئی کہ اس عہد کا ایک مستند اور معتبر نقاد اسے اس درجہ اہم گردانتا ہے کہ اس کے نکات، سوالات اور مباحث پر وقت اور توجہ صرف کر رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خوش کن بات یہ ہے کہ آج نقدِ نعت کے باب میں اسے کچھ ایسے لوگ بھی نظر آئے کہ جو گہری بات کہنے کے نہ صرف اہل ہیں، بلکہ اس کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔

اب آیئے فاروقی صاحب کی رائے پر۔ اس کے بارے میں یہاں دو باتیں کہنے والی ہیں۔ پہلی یہ کہ جن مقدمات کو شمس الرحمٰن فاروقی نے محلِ نظر گردانا ہے، وہ کلیتاً رد کرنے کے قابل ہیں یا کسی نہ کسی زاویے سے بہر حال لائقِ اعتنا ہیں اور آگے کچھ نئے افکار و مباحث کو پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اس کا فیصلہ فی الفور نہیں ہوسکتا۔ یہ کام تو آنے والا وقت کرے گا۔ فاروقی صاحب کا تنقیدی مقام و مرتبہ اپنی جگہ، لیکن صرف ان کی رائے پر تو ان مقدمات و مباحث کو اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

دوسری بات میں براہِ راست فاروقی صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی ذمے داری کا تعین خود فرمائیں۔ میری رائے یہ ہے کہ محلِ نظر مقدمات کی طرف ان کا اشارہ بھی بہت اچھی بات ہے اور بلاشبہ ان کے مرتبے کا کام بھی ہے، لیکن یہ کافی ہرگز نہیں ہے۔ قابلِ قدر یہ ہوگا کہ وہ اس شعبے کے لیے عملی اقدام کریں اور خود مستحکم مقدمات پیش کریں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ نعت کے سلسلے میں ایسا ہی کوئی کام کریں جیسا انھوں نے میر کے یا پھر داستانوں کے لیے کیا ہے۔ اگر وہ ایسا ہی کچھ کرسکیں تو سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو کم سے کم چند ایک مقالات، ایک آدھ چھوٹی موٹی کتاب تو اس شعبے کو دیں۔ تاکہ کل ہماری تہذیب و ادب کا ناقد انھیں صرف نکتہ چینوں میں شمار نہ کرے، بلکہ یہ اعتراف کرے کہ انھوں نے اپنی تہذیبی ذمے داریوں کو شعوری اور عملی سطح پر ادا کیا ہے۔

اپنی بساط کی حد تک تو میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ نعت کو ادبی پہلوؤں سے دیکھنے اور اس کی فنی اور فکری پرکھ کی طرف اہلِ نقد کو متوجہ کروانا اور خوش وقتی مطالعات کی رسمی و روایتی فضا میں کوئی نئی بات کہنے کی کوشش، کسی گہری بات کو سامنے لانے اور کوئی نیا سوال اٹھانے اور کوئی تازہ مقدمہ قائم کرنے اور کوئی نئی بحث چھیڑنے کی خواہش ہی تو دراصل ''نعت رنگ'' کی اشاعت کا

جواز بنی تھی۔ ابتدا میں تو بے شک اس کا مجھے زیادہ اندازہ نہیں تھا، لیکن آگے بڑھنے پر جب صورتِ حال واضح ہوئی تو میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ کام آسان ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس شعبے میں تو ابتدا، یعنی پہلی اینٹ رکھنے سے ہی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ پھر مزید مشکل یہ کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے تو سب سے پہلے ذہن سازی اور لوگوں کو مذہبی اصناف پر نقد و تجزیہ کے خوف سے نکالنے کے لیے بھی خاصا وقت درکار تھا۔

آج یہ بات میرے لیے گہری طمانیت کا باعث ہے کہ تمام تر مسائل اور طرح طرح کی دقتوں کے باوجود اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے یہ کام کہیں رکا نہیں۔ نعتِ نبی ﷺ کا جو کارواں ایک بار چلا تو پھر الحمدللہ چلتا ہی رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء سے اب تک ''نعت رنگ'' کا ہر شمارہ ہمارے اس سفر کی زندہ گواہی کے طور پر سامنے ہے۔ ''نعت رنگ'' نے اپنے قافلے میں نقدِ نعت کے روایتی تناظر سے تعلّق رکھنے والوں کو ہم راہ لے کر چلنے کے ساتھ ساتھ ایسے ناقدین کو بھی اپنے ہاں لکھنے پر آمادہ کیا جو معاصر تنقیدی منظرنامے میں اپنی تنقیدی متانت اور فکر و بصیرت کے حوالے سے بلاشبہ اہلِ اعتبار میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کے نام اپنی جگہ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ یوں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، مبین مرزا، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، سلیم شہزاد اور ڈاکٹر طارق ہاشمی جیسے ممتاز اہلِ قلم اپنے افکار و نظریات اور تازہ تر سوالات کے ساتھ گزشتہ شماروں میں ''نعت رنگ'' کی بزم کا حصہ بنتے دکھائی دیے۔

یہاں میں گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے ڈاکٹر طارق ہاشمی کے مضمون ''اردو حمد و نعت اور برِصغیر کی فلمی صنعت'' کا بہ طورِ خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ مضمون جیسا کہ اس کے عنوان سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، مطالعاتِ نعت میں ایک نئے پہلو کو سامنے لایا اور توجہ سے پڑھا گیا۔ میرے نزدیک یہ مضمون برِصغیر کی فلمی صنعت میں نعت کے فروغ و ارتقا ہی سے متعلّق نہ تھا، بلکہ ان نعتوں کے تناظر میں مضمون نگار نے بعض اہم سماجی سوالات بھی اٹھائے ہیں اور ساتھ ہی کم زور مذہبی عقائد کی اثر پذیری کے تناظر میں معاشرے کے انفعالی رویوں پر بھی بطورِ خاص بات کی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں شامل دو حضرات کے مضامین کا بھی یہاں ذکر ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ ایک ہے ''مولانا جامی کا سلام'' یہ معروف عالم، ادیب اور شاعر احمد جاوید کا مضمون ہے، دوسرے دو مضامین ''مغرب کا نعتیہ بصری ادب'' اور ''اردو نعت میں تعظیمی بیانیہ'' ڈاکٹر طارق ہاشمی کے ہیں جن میں نعتیہ ادب سے متعلّق

متعدد اہم اور کچھ نئے سوالات قائم کیے گئے ہیں۔

احمد جاوید علم اور تصوف کی دنیا میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ یہ مضمون دراصل احمد جاوید کی ایک گفتگو ہے جسے ٹرانسکرائب کر کے مضمون کی صورت دی گئی ہے۔ اس میں احمد جاوید نے مولانا جامی کے سلام کے حوالے سے مذہب، شاعری اور تہذیب کے سیاق میں بہت اہم نکات بیان کیے ہیں اور ایسی باتوں پر روشنی ڈالی ہے جو علم و فکر کے علاوہ تصوف کی جہت بھی رکھتی ہیں۔ ہمارے ہاں نعت کے مطالعات میں علم و ادب اور فکر و فلسفہ کی متعدد جہات کو تو اس سے پہلے بھی پیشِ نظر رکھا گیا، لیکن تصوف کی جہت کے حوالے سے خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ اس بارے میں راقم الحروف کی احمد جاوید سے کئی بار گفتگو ہوئی اور اُن سے تقاضا کیا گیا کہ وہ اس شعبے کے آدمی ہیں، سو اس جہت پر کام کریں۔ آخری بار جب بات ہوئی تو اُس کے ڈیڑھ دو ماہ بعد انھوں یہ مضمون ہمیں بھجوایا۔ خوشی ہوئی کہ انھوں نے ہماری خواہش اور وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے عملی اقدام کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ہمیں کچھ اور گوہر ہائے فکر و خیال بھی ارسال کریں گے۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی کا اوّل الذکر مضمون مغربی میڈیا سے متعلّق ہے جس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ اُس کے پس منظر میں کارفرما ذہن کی سرگرمیاں اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ کی بابت نہایت ناگوار اور لائقِ استرداد ہیں۔ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر طارق ہاشمی نے مغربی سماج اور میڈیا کے حوالے سے جو نکات اٹھائے ہیں، ان میں ایک الگ نقشہ اور مختلف منظر سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تحریر تہذیبوں کے تصادم اور متحارب بیانیے کے ماحول میں امتزاج اور اتفاق کے نکات کی تلاش کے اقدام کا درجہ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی کا دوسرا مضمون ''اردو نعت میں تعظیمی بیانیہ'' رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے بارے میں بعض سماجی تصورات کو پیش کرتے ہوئے ایک بڑا اہم سوال اٹھاتا ہے یہ کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم اور قدر و منزلت کے بیان کے لیے ان حوالوں، کنایوں اور استعاروں کا استعمال درست ہے جو اہلِ دُنیا کی عظمت کے اظہار و بیاں کے لیے رائج ہو چکے ہیں۔ اس حوالے سے یہ سوال بھی اہمیت کا حامل اور توجہ کا طالب ہے کہ ایک جمہوری دور اور ٹیکنالوجی کے عہد میں ملوکیت کے استعاروں سے ہمارا نعت گو کس طرح باہر آ سکتا ہے؟ یہ سوال اس عہد میں نعت کے نئے ڈکشن پر غور کی دعوت دیتا ہے۔

نعت، رسول اللہ ﷺ کے اوصاف، اعمال، شمائل اور تعلیمات کے بیان سے عبارت ہے، لیکن ہمارے ہاں ایک زمانے سے یہ صنفِ شعر جس طرح محض جذبے اور اظہارِ عقیدت سے مخصوص ہوکر رہ گئی ہے، اس ضمن میں اس خدشے سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری نعتیہ شاعری محض انفعالی رسمی اور سطحی جذبات کا مجموعہ ہوکر نہ رہ جائے۔ اقبال کی نعت گوئی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی اور مبین مرزا نے بعض بڑے بنیادی اور اہم نکات اٹھائے ہیں جو نعت گوئی کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس سلسلے میں ایک مفصّل مضمون میں نعت گوئی کے اس میلان کے حوالے سے اپنے خیالات کا جامع پیرائے میں اظہار کیا ہے جو توجہ طلب ہے۔

''نعت رنگ'' اردو نعت کے ضمن میں نئے مباحث اور نقدِ نعت کے نئے مطالعاتی زاویوں کی تلاش اور عہدِ جدید کے افکار و آثار میں نعت کی تخلیق و تفہیم کے نئے پہلو اجاگر کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا ہے۔ اب اپنی مساعی کی رفتار میں مزید اضافہ کرتے ہوئے ہماری کوشش ہے کہ نعت کے مطالعات اور تنقیدی تحریریں وسعت آشنا ہوں اور ہمارے اہلِ نقد اپنے عہد کے حوالوں اور سوالوں کے ساتھ تخلیق و تنقیدِ نعت کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے سامنے آئیں۔ اس لیے کہ آج یہ صرف ہماری ادبی و فکری ضرورت ہی نہیں ہے، بلکہ ہماری زبان و تہذیب کو درپیش وقت کا تقاضا بھی ہے۔

وفیات

رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے
کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

'نعت رنگ' کے ابتدائیے میں وفیات کے مرحلے تک آتے ہی جہاں دل زخم زخم ہوجاتا ہے وہیں مدحِ نبیِ کریم ﷺ سے وابستہ ان خوش بختوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے اور ان کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے روح سکون بھی پاتی ہے، شاید ہم اسی طرح اپنے احساسِ غم کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیّد اسحاق الدین

یکم جنوری ۱۹۲۹ء ضلع بیڑ حیدر آباد دکن - ۱۷/اگست ۲۰۱۹ء کراچی

۱۷/اگست رات بارہ بجے سے کچھ اوپر کا وقت تھا جب وہ ہاتھ جس کی انگلی تھام کر میں نے زندگی کے راستوں پر کھڑا ہونا، چلنا اور پھر دوڑنا سیکھا، میرے ہاتھوں میں دیکھتے دیکھتے زندگی کی حرارت سے محروم ہوگیا۔ کیسا لمحہ تھا، کیا بے بسی، ہائے ہائے۔ طبیعت تو ان کی کئی برسوں سے خراب تھی مگر پچھلے پانچ برس سے وہ مستقل بسترِ علالت پر رہے، کمزوری اور بیماریوں سے لڑتا جسم روز بہ روز نڈھال ہوتا جارہا تھا، سماعت اور بصارت معدوم ہو چکی تھیں۔ نہ کچھ کہنے کے قابل نہ سننے کے، تاہم ان کے ہونے کا احساس بھی بہت تھا۔ ان کے ماتھے پر بوسے کی حلاوت، ان کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر سہلانے کے عمل سے میسر آنے والی جذبوں کی آسودگی، ان کی کمر اور پیروں کو آہستگی سے دبانے کے سعادت آثار لمحے، ان کو آواز دے کر ان سے کسی جواب کی موہوم سی اُمید۔ ان کے چلے جانے سے اچانک کیا کچھ چھن گیا ہے جیسے کسی نے سر سے آسمان اور پیروں سے زمین کھینچ لی ہو۔ کہیں خلا میں متعلّق سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ گھر جاؤں تو ان کا خالی بستر اور والدہ کی خالی آنکھیں دیکھنا کسی قیامت سے کم نہیں۔ یہ صرف میرا ہی نہیں میرے تمام بھائی بہنوں کا احوال ہے۔ ذہن و دل ویران ہیں اور قلم کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں۔

نظروں میں بھی ہے، دل سے بھی مستور نہیں ہے
نزدیک نہ ہو کوئی مگر دور نہیں ہے

میں اپنے والد کی وفات پر ساری دنیا سے اہلِ محبّت کے تعزیتی پیغامات اور ایصالِ ثواب کی محافل کے انعقاد پر تہِ دل سے ممنون ہوں اور قارئینِ نعت رنگ سے بھی دعا کے لیے التماس گزار ہوں کیونکہ اگر مجھ میں کوئی وصف ہے تو وہ میرے والد کی تربیت کا فیض ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی کامل مغفرت فرمائے اور انھیں شفاعتِ نبیِ کریم ﷺ سے نوازے۔ آمین!

حمایت علی شاعر

۱۴جولائی ۱۹۲۶ء، اورنگ آباد - ۱۵/جولائی ۲۰۱۹ء ٹورانٹو کینیڈا

حمایت علی شاعر کی شہرت اور ناموری کے کئی دائرے تھے جن میں سب سے نمایاں دائرہ شاعری کا تھا۔ انھوں نے زندگی اور ادب و فن کے مختلف شعبوں میں جم کر کام کیا۔ تدریس، صحافت،

ادارت، ڈراما، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے علاوہ تنقید و تحقیق اور تخلیق میں ان کی فعالیت کے کئی روشن نقوش اپنے عہد کی تاریخ کے اوراق میں ان کا حوالہ رہیں گے۔

''آگ میں پھول''، ''مٹی کا قرض''، ''تشنگی کا سفر'' اور ''ہارون کی آواز'' ان کے مطبوعہ شعری مجموعے ہیں جبکہ ان کی منظوم سوانح عمری جسے انھوں نے مثنوی کی ہیئت میں لکھا ''آئینہ در آئینہ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ دو نثری کتابیں ''شیخ ایاز'' اور ''شخص و عکس'' میں بھی ان کے تنقیدی افکار مطبوعہ صورت میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے جو تحقیقی پروگرام پیش کیے اور جس طرح خود ان کے لیے تحقیق و جستجو کے دشوار مراحل سے گزرے وہ ان کے عزم اور جذبہ و لگن کو ظاہر کرتے ہیں۔ شاعر صاحب کی شخصیت اور کارناموں کے سرسری ذکر کے لیے بھی کئی صفحات درکار ہیں لیکن میں اس وقت ان کے سارے علمی سرمائے میں اپنے قارئین کی توجہ ان کے ان نعتیہ تذکروں کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں جو اپنی ایک منفرد افادیت رکھتے ہیں۔ شعبۂ اُردو سندھ یونی ورسٹی نے اپنے مجلّے ''صریرِ خامہ'' کا ایک خصوصی نعت نمبر ۱۹۷۸ء میں پیش کیا۔ اس اہم اور تاریخی نمبر کے مرتب حمایت علی شاعر تھے۔ اس نمبر میں جہاں سندھ یونی ورسٹی کے نامور ادیب و محقق اساتذہ کے مضامین شائع ہوئے وہیں حمایت علی شاعر نے بھی ''اُردو میں نعتیہ شاعری کے سات سو سال'' کے عنوان سے ایک اہم تذکرہ مرتب کیا جو نعتیہ مطالعات میں ایک ''جہت نما'' حیثیت سے سامنے آیا۔ اس میں کلام کا انتخاب شعرا کے کوائف اور مختصر تعارف کے علاوہ قدیم اُردو شعرا کی شاعری میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج ہوئے، جس سے تذکرہ نگار کی اُردو کی کلاسیکی شاعری پر گہری نظر اور لفظیات کی معرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پیش لفظ کے طور پر حمایت بھائی نے ''حرفِ جستجو'' کے عنوان سے جو چند صفحات لکھے، وہ بھی اپنے بیانئے میں کچھ نئے سوالات اٹھاتے تھے جو آج بھی نعت کے مطالعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اور ہماری تاریخ و تہذیب اور تخلیقی رویوں کے بارے میں گہرے تنقیدی شعور کو پیش کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس فکری تحریر کا کچھ حصہ مستقبل کے نعت شناسوں کی توجہ کے لیے ضرور یہاں پیش کروں۔

> ''تاریخ ہمیشہ تحقیق طلب ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ پیش منظر میں جو کچھ ہوتا ہے، پس منظر میں اکثر نہیں ہوتا۔ پیش و پس کا یہ تضاد، حقیقت کی جستجو کرنے والوں کو عموماً پس و پیش میں

مبتلا رکھتا ہے۔ وہ کبھی اپنی آنکھوں کی گرد صاف کرتے ہیں اور کبھی وقت کی۔ لیکن وقت کی گرد ایسی نہیں ہوتی کہ پلکوں سے صاف ہو جائے۔

اس لیے تاریخ کا مطالعہ بین السطور میں کیا جاتا ہے۔ لفظ کا پردہ اٹھا کر معنی کے خط و خال دیکھے اور پرکھے جاتے ہیں۔

اس آئینے میں جب ہم عہد بہ عہد اپنے ماضی کے خطوط دیکھتے ہیں تو ہر خط اپنے مخصوص دور کی کوئی نہ کوئی شکل بناتا نظر آتا ہے۔ یہ شکلیں نقطوں اور زاویوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہیں اور انھیں سے اس عہد کا گراف بنتا ہے۔

نعتیہ شاعری بھی اپنے اپنے عہد کے مذہبی گراف کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس گراف کے محرکات میں جہاں کسی قوم اور کسی ملک کی جغرافیائی خصوصیات شامل ہوتی ہیں وہیں تاریخ کی گود میں پرورش پانے والی تہذیبی اقدار بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مخصوص دور کی وہ سیاسی حکمتِ عملی بھی جو ''رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند'' کے پردے میں کارفرما ہوتی ہے۔

ہمارے عمومی عقائد میں عجمی طرزِ فکر کا نفوذ ہو یا ہندوستانی صنمیت کے اثرات، بنیادی رمز یہی ہے کہ ہمارا معاشرہ تاریخ کے بہاؤ میں اپنی بدلتی ہوئی اقدار کو مقامی روایات سے بالکلیہ جدا نہیں کر سکا (اور شاید یہ ممکن بھی نہیں)۔ ظاہر ہے کہ شاعری جو معاشرے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، کس طرح اس خون سے بے رشتہ ہو سکتی ہے جو صدیوں سے اس کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔

شاعری تو حسنِ تخیّل کا وہ طلسم ہے جو اکثر اپنے عہد کے تنقیدی شعور کو بھی کچھ دیر کے لیے مبہوت کر دیتی ہے اور حواس کی بیداری کے باوجود روح میں درآتی ہے۔ اور جب صورتِ حال یہ ہو کہ دینی مکتبہ ہائے فکر بھی اپنے ذیلی تضادات میں الجھے ہوئے ہوں، شاعری میں ان کا جگہ نہ پانا ایک غیر فطری عمل ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر نعت گو شعرا اپنے عقیدے کے بنیادی مثلّث (triangle) پر ایمان رکھنے کے باوجود ارتفاع اور عمق کی تلاش میں کہیں زاویہ قائمہ کو حادّہ اور کہیں حادّہ کو منفرجہ بنا دینے کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ یہ ارتکاب لاکھ جذباتی سہی مگر توجہ طلب ضرور ہے۔

توجہ طلب یوں کہ اسلام میں خدا، قرآن اور رسول کا مثلّث (triangle) جن حدود کا تعین کرتا ہے وہ اصولِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ فطرت اسی معنی میں مسلمان ہے کہ

ہمیشہ اپنی حد میں رہتی ہے اور اپنے حدود میں رہ کر لامحدود کے امکانات کا سراغ دیتی ہے۔
میں نے اُردو کی سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی کہ تخیّل کی بلند پروازی اکثر مقامات پر حد سے متجاوز ہو گئی ہے۔ مجھ پر چونکہ اس کے محرکات بھی روشن تھے اس لیے حیرت تو نہیں ہوئی۔ البتہ عرفیؔ کا یہ شعر بہت یاد آتا رہا:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

اس گفتگو سے میرا یہ مقصد نہیں کہ جو سوالات میرے ذہن میں اُبھرتے ہیں ان سے آپ بھی اتفاق کریں۔ ہر شخص کا اپنا زاویہ نگاہ ہوتا ہے جو اپنے عہد کی آگہی کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔
میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ہر عمارت ایک بنیاد پر اٹھائی جاتی ہے، اس لیے بنیاد سے ہٹ کر جو بھی تعمیر ہوگی وہ دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر دے گی۔ بنیاد روح کو یقین عطا کرتی ہے اور یقین ایمان کا حرفِ اوّل ہے۔
میرے پیش نظر یہ حدیث بھی ہے کہ:

من کذب علیٰ متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار

(جس نے میرے متعلّق قصداً جھوٹ بات کہی تو وہ جہنّم میں اپنا ٹھکانا بنا لے)

اس کے علاوہ سب سے اہم نکتہ جو قرآنِ حکیم کے مطالعے سے نمایاں ہوتا ہے وہ شخصیت کی عظمت میں 'عبدیت' کا تعین اور اس کی اہمیت پر اصرار ہے۔

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا

(وہ پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے 'بندے' کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہماری برکت نے تاکہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے)۔
یہ 'عبدیت' کا نقطۂ عروج ہے جو 'معراج' کی معرفت 'انسان' کو خدا کے قرب کی عظمت نصیب کرتا ہے۔ یہی عظمت ہمیں 'بشریت' پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس نکتے پر مروجہ مذہبی عقائد کے بجائے سائنسی انداز میں سوچا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اوراس مقام ارتفاع کاادراک حاصل کر کے یہ فیصلہ دیا کہ

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ان کے نزدیک 'عبدیت' بشریت کی اکملیت کا استعارہ ہے۔ وہ مقامِ بندگی میں بھی وہی عظمت محسوس کرتے ہیں جو شانِ خداوندی میں ہے۔ اس طرح وہ دونوں کی فردیت کو متعیّن کرتے ہوئے اپنے اپنے مقام پر محفوظ رکھتے ہیں اور کسی اکائی کو دوسری اکائی میں ضم نہیں ہونے دیتے۔

اکائیوں کے انضمام کا تصور بنیادی طور پر اسلامی نہیں ہے، یہ تو فلاطونیت کے زیرِ اثر وحدت الوجود کے واسطے سے اسلامی فکر کا حصہ بنا اور ہندوستان میں ویدانت سے مصالحت کی راہ ہموار کی۔ بہرحال اسلامی فکر کی نئی تشکیل میں عہد بہ عہد جو بھی عوامل کارفرما رہے ہوں، حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہندوستانی مسلم معاشرے میں ذیلی اور روایتی عقائد کا پھیلاؤ ہوتا گیا اور ''وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا'' کے مصداق نعتیہ شاعری میں بھی انھیں خیالات کا ظہور ہوا اور شاعری کے بادشاہی کے زیرِ اثر پروان چڑھنے کے سبب نعتیہ اندازِ سخن میں بھی قصیدہ نگاری کی بدعتیں پیدا ہوگئیں اور رفتہ رفتہ اسلامی فکر کا وہ مجتہدانہ عنصر پس منظر میں چلا گیا جسے پیش منظر میں قدرِ اوّل کی حیثیت حاصل تھی۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر اکائیوں کے انضمام سے گریز کیا اور فردیت کی بقا کے لیے 'خودی' کی بنیاد فراہم کی۔ لیکن ان کے ہاں خودی کا تصور جامد نہیں بلکہ متحرک اور ارتقا پذیر ہے۔ اس میں یہ ارتقائی عمل دوسری اکائی میں ضم ہونے کے لیے نہیں بلکہ اپنی تکمیل کے لیے جاری رہتی ہے۔ اس طرح قرآنِ حکیم نے 'تسخیرِ کائنات' کا جو فرض انسان کو سونپا ہے اس کی بجا آوری کے لیے وہ مسلسل آگے بڑھتا ہے اور 'عبدیت' کے منصب پر فائز رہ کر حیات و کائنات کے اسرار دریافت کرتا رہتا ہے۔ خدا سے قریب تر ہونے کی کوشش اسے نگاہِ قدرت میں باوقار اور محبّت کے قابل بناتی ہے اور وہ خدا کا 'محبوب بندہ' ہو جاتا ہے یہاں تک کہ

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عالمِ انسانیت میں یہ افضل و برتر مقام صرف آنحضرتﷺ کی ذاتِ بابرکات کو حاصل ہے

اور ہمارے لیے رہنمائی کے چراغ انھیں کے نقشِ کفِ پا ہیں۔
وہ علمِ اوّل جو حضرت آدم کی معرفت خدا نے انسان اور صرف انسان کو عطا کیا ہے، غور کیا جائے تو ''اُمّی تا اقراء'' اسی علمِ اوّل کے استعارے کی بازگشت ہے اور آنحضرت کا سینۂ اقدس (جس میں قرآن اُتارا گیا) اسی علم کا شہر ہے جو دونوں عالم کے لیے رحمت بنا کر ہمارے درمیان آباد کیا گیا تا کہ ہمارے دل و دماغ پر آ گہی کے دروازے کھول دیے جائیں اور ہم عہد بہ عہد اپنی مجتہدانہ فکر اور مجتہدانہ عمل سے (جسے میں سائنسی علوم سے تعبیر کرتا ہوں) بشریت کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں جو 'عبدیت' کا منتہا ہے۔
آنحضرت ﷺ کے فکر و عمل سے یہ نکتہ ہم اسی وقت اخذ کر سکتے ہیں جب ہمیں ان کی شخصیت کی عظمت کا معنوی ادراک حاصل ہو۔
ہمارے بیشتر نعت گو شعرا میں اسی ادراک کی کمی کا احساس ہوتا ہے جو کچھ کہا گیا ہے، اپنی تمام تر محبّت اور عقیدت کے باوجود عموماً رسمی اور سطحی سا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ خود غرضانہ اور جامد فردیت یعنی نفسی نفسی کا شکار ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔
ہمارے عہد کی خوش نصیبی ہے کہ اقبال جیسا شاعر ہمیں نصیب ہوا جس نے مذہبی عقائد پر بھی ہمیں سائنسی انداز میں سوچنے کا حوصلہ دیا اور ایسی نعتیہ فکر عطا کی جو شخصیت کے معنوی ادراک کا دَر باز کرتی ہے اور ہمارے شعور پر رسول اکرم ﷺ کی عظمت کے نئے اُفق روشن کرتی ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب''

مجھے احساس ہے کہ یہ اقتباس طویل ہوگیا ہے مگر آج حمایت علی شاعر کے جانے کے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے مجھے نعت کے تشکیلی دور میں ایسی شخصیات اور ایسی مساعی کو متعارف کروانے کی ذمہ داری پوری کرنی ہے جو ابتدائی نوعیت ہی کے سہی مگر بہت پہلے نعت کے تنقیدی شعور کو نمایاں کرنے کے حوالے سے فکر انگیز اشارے کر گئے ہیں۔
اس اقتباس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حمایت علی شاعر نے نعت نگاری کے لیے نہ

صرف خود مذہبی شعور اور تہذیبی آگہی سے کام لیا، بلکہ انھوں نے اپنے خیالات وافکار کو بھی بہت مرتب انداز میں اور پوری نکتہ آفرینی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان پر غور کر کے ہم اپنے عہد کے تناظر میں نعتیہ فکر کے فروغ کا کام کر سکتے ہیں، بلکہ آنے والے دور میں بھی ان فکر انگیز نکات سے تخلیقِ نعت اور نقدِ نعت دونوں شعبوں میں استفادے کی صورتیں پیدا ہوں گی۔

یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ بعد ازاں ''اُردو میں نعتیہ شاعری کے سات سو سال'' کو پی ٹی وی پر حمایت علی شاعر نے بطور میزبان خود ایک طویل دورانیے کے پروگرام کے طور پر ''عقیدت کا سفر'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے تذکرے سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء ماہر القادری تک مکمّل ہوا۔ جبکہ دوسرا حصہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے شعرائے نعت کے تذکرے پر مشتمل تھا۔ پروگرام کئی سال تک نشر ہوا۔ ایک پروگرام میں چار شعرا کا تعارف اور مختلف نعت خوانوں کی آواز میں ان کا کلام پیش کیا جاتا تھا۔ یوں پی ٹی وی پر اس طویل ترین دورانیے کے پروگرام نے نعت کی معرفت اور ارتقائی مراحل اور عہد بہ عہد سفر کو بہت خوب صورتی سے اور پرتاثر انداز میں عوام الناس تک پہنچایا۔

حمایت بھائی کی نعتیہ شاعری بھی محض عقیدت کی بنیاد پر وجود میں آنے والی شاعری نہ تھی بلکہ اس میں ان کا سماجی شعور اور رسولِ اکرم ﷺ کا بنی نوع انسان کے لیے باعثِ رحمت ہونا اور رہنمایانہ کردار کا حامل ہونا نمایاں رہا۔ ان کی نعتیہ نظم ''محاسبہ'' ایک نہایت فکر افروز اور عصری شعور سے آراستہ نظم ہے۔ چند شعر دیکھئے:

حضور آپ کی امت کا ایک فرد ہوں میں	مگر خود اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں
میں کس زباں سے کروں ذکرِ اُسوۂ حسنہ	کہ اہلِ درک وبصیرت نہ اہلِ درد ہوں میں
میں کس قلم سے لکھوں سرخیِ حکایتِ خوں	کہ رنگ دیکھ کے اپنے لہو کا زرد ہوں میں
سمجھ سکوں گا میں کیا سرِّ نکتۂ معراج	شکست خوردۂ دنیائے گرم وسرد ہوں میں

اُردو کے باکمال اور صاحب اسلوب شعرا اور نعت شناسوں میں حمایت علی شاعر کا نام ہمیشہ روشن رہے گا اور جب جب ان کا ذکر آئے گا لوگ ان کی نعتیہ خدمات کو بھی ضرور یاد کریں گے۔

خالد محمود خالد نقشبندی

۱۳ جون ۱۹۴۱ء چکوال-۷ ادسمبر ۲۰۱۸ء کراچی

خالد محمود خالد نقشبندی کا شمار اُردو کے مقبول ترین نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی نعت گوئی کا عمومی وصف سادگی ہے۔ جذبات واحساسات کی فراوانی نے ایک مخصوص غنایت کے ساتھ مل کر ان کی نعت گوئی کو عوام وخواص دونوں میں پذیرائی و پسندیدگی کا مستحق بنا دیا ہے۔ نبیِ کریم ﷺ سے بے پناہ عقیدت نے ان کے اسلوبِ شعر کو ایک ایسا انداز عطا کیا جس میں تصنّع اور بناوٹ کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ان کی لفظیات، بحور و اوزان اور نعتیہ زمینوں میں دل آویزی کا سبب ان کے لہجے کی یہی سادگی اور اظہار کا یہی فطری پن ہے جو سامعین کے قلوب کو متاثر کرتا ہے۔ان کے بے شمار نعتیہ کلاموں کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔ دنیا میں جہاں جہاں اُردو بولنے اور سمجھنے والے ذکرِ حبیب کی محفلیں سجاتے ہیں خالد محمود خالد نقشبندی کا کلام وہاں ضرور پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ وہ اپنی وضع کردہ دُھنوں میں جب اپنا کوئی نیا کلام اہلِ محبّت کے درمیان پڑھتے تھے تو اگلے ہی دن وہ ہماری مجلسی نعت کا سرنامہ بن جاتا تھا۔ان کے چار نعتیہ مجموعے شائع ہوے جن میں ''قرارِ جاں''، ''قدم قدم سجائے''، ''حسنِ ازل'' اور ''سیلِ تجلّیات'' شامل ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ''حلقۂ ذکرِ حبیب'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے ذریعے نعت خوانی کی محافل کا انعقاد اور نئے نعت خوانوں کی تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ خالد صاحب کو اللہ نے نہایت سوز وگداز اور درد والی آواز عطا فرمائی تھی۔ موسیقی کے رموز سے آشنائی نے انھیں اپنی آواز اور کلام کو مزید بہتر انداز میں سنوارنے کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ یوں ان کی شہرت میں ان کی نعت خوانی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ان کے متعدد شاگرد نعت خوانی اور نعت گوئی کے فن میں آج بھی اپنی اپنی جگہ اپنے ماحول کو منور فرما رہے ہیں۔۷ ار دسمبر ۲۰۱۸ء کو خالد صاحب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ میں اس وقت ملک میں نہیں تھا۔ان کے انتقال کی خبر سن کر مجھے ان کا یہ شعر بہت یاد آیا:

شکریہ اے عشق یہ بھی راز افشا کر دیا
زندگی ملتی ہے بس اُن پر فدا ہونے کے بعد

اللہ جس کو اپنے فضل سے اس حقیقت سے آشنا کر دے پھر اپنے اس بندے کی اس خوش گمانی کو بھی تعبیر آشنا کرنا اس کے لیے بھلا کیا مشکل ہے۔

صلۂ نعتِ نبی پائے گا جس دن خالدؔ
وہ کرم دیکھنا تم دیکھنے والا ہوگا

قمرحجازی

۱۰فروری۱۹۵۲ء-۱۴فروری۲۰۱۹ءاوکاڑہ

قمرحجازی اُردو و پنجابی کے معروف شاعر تھے۔ پنجابی کی کئی اصناف میں ان کا قابلِ قدر تخلیقی اثاثہ محفوظ ہے۔''سی حرفی'' ۱۹۹۳ء،''داستانِ ہیر رانجھا'' ۲۰۰۰ء،''گھڑولی'' ۲۰۰۴ء، ''قصہ دردبھچال'' ۲۰۰۵ء،''کبت'' ۲۰۰۷ء،''تانگھاں یاد دیاں'' (ماہیے) ۲۰۰۸ء،''مہکتے ماہیے'' (اُردو)، ''ہائیکو باہورنگ چوبرگے'' ۲۰۱۶ء،''مثنوی نظر نامہ، وصیت نامہ منظوم'' ۲۰۱۸ء۔ ان کی قادرالکلامی اور ہمہ جہت صنفی محبّت کے ترجمان کتابچے ہیں۔ ان کے دونعتیہ مجموعے شائع ہوئے اُردو مجموعۂ نعت ''ارفع ذاتِ محمدی'' ۲۰۱۸ء اور پنجابی نعتیہ مجموعہ ''چلو میرے نال مدینے'' ۲۰۱۸ء۔ ۱۴رفروری ۲۰۱۹ء کو یہ خوش فکر و خوش خیال شاعر اس یقین کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ ہوا:

بروزِ حشر ہوگا میرے اللہ کا رویہ بھی
قمرؔ مجھ سے رحیمانہ محمد کے وسیلے سے

ذوالفقارعلی حسینی

۴دسمبر۱۹۷۵ء-۳۰جولائی۲۰۱۹ء

اپنے بڑوں کی موت کا دکھ بھی شدید ہوتا ہے مگر اپنے سے چھوٹوں سے جدائی کا دُکھ شدید تر ہوتا ہے۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز دوست، عالمی شہرت یافتہ نعت خواں ذوالفقار علی حسینی کی اچانک موت نے جس صدمے سے دوچار کیا اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ لیکن یہ زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

موت نے چپکے سے جانے کیا کہا
زندگی خاموش ہو کر رہ گئی

ذوالفقار علی حسینی نے نعت خوانی کے فن میں اپنی پڑھت کے منفرد، مؤدبانہ اور غنایت کے باوقار اظہار و انداز سے جو روشن نقوش چھوڑے ہیں وہ ان کی یاد کو ہمیشہ محبانِ محمد و آلِ محمد ﷺ کے دلوں

میں فروزاں رکھیں گے۔ یہی زندگی اصل زندگی ہے ورنہ جسم کو تو فنا ہونا ہی ہے۔ ذوالفقار کی موت پر جس طرح ساری دنیا کے نعت پسندوں میں حزن وملال کی کیفیت سامنے آئی ہے وہ اس بات کا واضح اعلان ہے کہ انھوں نے ذکرِ نبی کریم ﷺ کے ذریعے کس طرح لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا کر محبّتیں سمیٹی تھیں اور اب یہی محبّتیں دعاؤں کی صورت ان کے سفرِ اخروی میں ان کا توشہ آخرت بن کر ان کے ہمراہ روانہ ہوئیں ہیں۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

ذوالفقار علی حسینی نے جس کم عمری میں اُفقِ نعت خوانی پر اپنی ایک منفرد شناخت کے نقوش قائم کیے اس کو جاننا اور سمجھنا بھی نئے نعت خوانوں کے لیے رہنمائی کا ایک دبستان ہوسکتا ہے۔ فن پر مہارت، اسے نکھارتے چلے جانے کا جذبہ، نعت کے آداب اور روایتی اُصولوں کا احساس، اخلاق، نیازمندی، نیکی اور زبان کی حفاظت ذوالفقار نے اپنے ہر عمل سے ظاہر کیا کہ وہ ایک ذمہ دار اور باشعور ثناخواں ہے۔ اسے صرف شہرت نہیں ملی، بلکہ نیک نامی کے ساتھ شہرت ملی ہے اور وہ بھی ان اوصاف سے متّصف ہونے پر۔ اللہ کریم اس کا سفرِ آخرت آسان فرمائے۔ آمین!

نعت رنگ ۳۰

اداریہ

ابتدائیہ

اُردو نعت اور اُس کی تنقید کا معاصر منظر نامہ میرے لیے عجیب اور نکتہ خیز تقویت کا سامان رکھتا ہے۔ گزشتہ کم و بیش تین دہائیوں سے نعت اور اس کے جملہ موضوعات و مباحث میری فکری و ادبی دل چسپی کا بنیادی حوالہ ہیں۔ میں حتی المقدور اس عرصے میں ہونے والی تمام تر نعتیہ ادب کی سرگرمیوں پر غور و فکر کرتا رہا ہوں۔ اس لیے ذاتی سطح پر صرف یہ بات میرے لیے امید افزا اور طمانیت کا باعث نہیں ہے کہ اس وقت نعت کے تخلیقی اور تنقیدی دونوں دائروں میں مختلف افکار، رجحانات اور رویوں کے لوگ بہ یک وقت کام کر رہے ہیں۔ یہ بات تو اپنی جگہ خوش کن ہے ہی کہ اس طرح نعتیہ ادب کا وسیع تناظر ابھر کر سامنے آرہا ہے جس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ نعت اب ہمارے ادب کے مرکزی دھارے کا اُسی طرح حصہ ہے جیسے کوئی بھی دوسری صنفِ ادب۔ چناں چہ بزعمِ خویش جدید نظریات اور روشن خیال تصورات کے لوگ جو نعت کو محض عقیدت کا معاملہ قرار دے کر اس کے ادبی معیارات کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار نہیں کرتے تھے، اب خود ہی خاموش اور لاجواب ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسی طرح یہ حقیقت بھی سنجیدگی سے توجہ طلب ہے کہ نعتیہ ادب کے معاصر تناظر میں مختلف ذہنی رویوں، جداگانہ رجحانات اور مختلف النوع افکار کے حامل افراد کی تخلیقی و تنقیدی کارگزاری ایک ایسا پیراڈائم تشکیل دے رہی ہے جس میں ایک طرف نعت بہ حیثیت صنفِ ادب اپنے نئے اِمکانات کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف اس کے توسط سے ہماری ادبی تنقید میں ایک ایسا فکری ڈسکورس بھی قائم ہو رہا ہے جو نعت کے تجزیے اور تفہیم کے بعض بالکل منفرد پہلو اجاگر کرتے ہوئے خود ہماری ادبی و

تہذیبی جمالیات کے رموز وعلائم کی معنویت کے نئے تناظرات بھی سامنے لا رہا ہے۔

تخلیق وتنقیدِ نعت کا یہ نیا منظرنامہ اس اعتبار سے اردو نعت کی انفرادیت کا مظہر ہے کہ اس کے ذریعے ہم قدری اور جمالیاتی سطح پر اپنے ادب کے جہانِ معنی کو روشن تر ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب ادب بلکہ جملہ فکری اور سنجیدہ سرگرمیاں انحطاط کی صورتِ حال سے دوچار ہیں اور یہ صرف ہمارا ہی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ عالمی سطح پر اس امر کا اظہار ہو رہا ہے، ایسے میں نعتیہ ادب کا روشن سے روشن تر ہوتا ہوا تخلیقی وتنقیدی تناظر ہمارے فکری وجود کے زندہ ہونے کا نہایت وقیع اور معنی آفریں حوالہ ہے۔ از روئے ایمان یہ حوالہ ہماری تقویت کا سب سے محکم سامان رکھتا ہے اور ہمیں احساس دلاتا ہے کہ ہمیشہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسانیت کش ماحول میں بھی ایک بار پھر ہماری بقا اور استحکام کا اہتمام کرتے ہوئے معیشتِ ایزدی ہمیں چشمۂ حیاتِ جاوداں کی طرف لیے جاتی ہے۔ یہ چشمہ اب سے پہلے بھی ابتلا وآزمائش کی ساعتوں میں ہمیں آبِ بقا فراہم کرتا رہا ہے اور اب بھی یہی ہماری سیرابی اور بحالی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

جہاں تک نعت کے تخلیقی مزاج کا معاملہ ہے تو وہ صرف لمحہ موجود میں نہیں، بلکہ ہماری زبان اور ہمارے ادب کے ابتدائی ادوار سے ہی اپنی زرخیزی اور فکرافروزی کا اظہار کرتا رہا ہے۔ اُس میں ایسے موضوعات تخلیقی اظہار وابلاغ کا حصہ رہے ہیں جو نعت کی ادبیت کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی وسماجی اور فکری وعصری معنویت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ نعت میں عشقِ رسول ﷺ سے لے کر استغاثہ اور عصر آشوب تک کے موضوعات پر محض ایک سرسری نگاہ بھی اس امر کا واضح اور وافر ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نعتیہ ادب میں موضوعات کی ایسی رنگارنگی اور وسعت پائی جاتی ہے کہ اس کا اندازہ یوں تو ایک سرسری نگاہ سے بھی کیا جاسکتا ہے، تاہم اگر بالتفصیل اس کا جائزہ لیا جائے تو افکار ومعنی کا ایک وسیع اور جمال آگیں نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے نعتیہ ادب ہمارے مرکزی دھارے کے ادب کی دوسری اصناف میں کسی سے نہ تو پیچھے ہے اور نہ ہی کم تر، بلکہ وہ فکری، اسلوبیاتی اور موضوعاتی ہر لحاظ سے ان کا ہم پلہ نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف ادب کی سطح پر اور تنقید کے دائرے میں اس طرح کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب قدرے وضاحت طلب ہے۔ اس لیے کہ ہمیں متعدد تاریخی وسماجی عوامل کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا اور اُن کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی ارتقا کے مختلف مراحل کو بھی۔ اس

کے لیے ظاہر ہے، ایک الگ دفتر درکار ہے جس کی یہاں گنجائش ہے اور نہ ہی موقع۔ اختصار اور اشارات سے کام لیتے ہوئے بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اردو تنقید نے بیسویں صدی کی جن ابتدائی دہائیوں میں ترقی اور ارتقا کا سفر شروع کیا، اس زمانے میں ادبی منظرنامہ ایسے ترقی پسند اور روشن خیال لوگوں کے زیرِ اثر تھا جو ادب و مذہب کے رشتے کو نہ صرف تسلیم نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس کی ہر ممکن تردید کرتے اور اسے ادب کے لیے مضرت رساں بتاتے تھے۔ ایسے دور میں نعت کے بطورِ صنف ہمارے ادب کے مرکزی دھارے میں جگہ پانے کا کیا سوال رہ جاتا ہے۔ جب نعت کی اپنی صنفی حیثیت ہی اس طرح تسلیم نہ کی گئی تو اُس کے فکری و ادبی امتیازات کا جائزہ اور اُن کی معروضی تخمین و ظن کی بھلا کیا گنجائش۔ محمد حسن عسکری اردو کے پہلے بڑے نقاد ہیں جنھوں نے نعت بحیثیت صنفِ ادب اور نعت نگار بحیثیت تخلیق کار کو قدری مطالعے کا موضوع بنایا۔ یہ کام گزشتہ صدی کے وسط میں آکر ہوا، یعنی کم و بیش ساٹھ پینسٹھ برس پہلے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو نعت کی تنقید کا سارا سفر بہ مشکل تمام چھ سات دہائیوں کو محیط ہے۔ عسکری صاحب کے بعد پھر ایک تعطّل کا سا عرصہ گزرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس عرصے میں تنقیدِ نعت کا کوئی کام ہی نہیں ہوا۔ یقیناً ہوا۔ ایک نہیں، کئی ایک نقاد کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن یہ کام اپنی نہج اور سطح پر اس نوع کا نہیں ہے، جیسا کہ عسکری صاحب کا کام ہے۔ البتہ گزشتہ تین چار دہائیوں میں اس حوالے سے جو کام ہوا ہے وہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے اس سطح پر نظر آتا ہے کہ اُسے ادب کی فکری اور قدری تنقید کے مساوی اور مرکزی ادب کا حصہ باور کرنے سے آج کے نام نہاد ترقی پسند، جدیدیت پسند اور روشن خیال ادیب بھی انکار نہیں کرسکتے۔

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک اور نقطہ بھی غور طلب ہے۔ اردو نعت کے تنقیدی تناظر کو دیکھتے ہوئے اگر اُس کا موازنہ ادب کی کسی دوسری بڑی صنف مثلاً غزل، نظم، افسانہ یا ناول وغیرہ کے سیاق میں ہونے والے تنقیدی کام سے کیا جائے تو یہ دیکھ کر نعت کی صنفی فوقیت کا اعتراف بھی لازم آتا ہے کہ چھ سات دہائیوں کے قلیل عرصے میں جتنے اور جیسے موضوعات و عنوانات ہمارے ادب کی اس صنف کے دامنِ فکر میں سمٹ آئے ہیں، وہ ذرا کم کم ہی دوسری اصناف کے حصے میں آئے ہیں۔ ممکن ہے یہ بات کچھ لوگوں کے حلق سے نہ اُتر پائے۔ اُن کی سہولتِ فہم کے لیے یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ وہ ذرا ایک بار تحمل سے بیٹھ کر یہ دیکھنے اور جائزہ لینے کی کوشش کریں کہ اردو

غزل یا اردو افسانے یا کسی بھی دوسری بڑی صنفِ ادب کے تنقیدی مطالعات کے پہلے ساٹھ ستر برس میں نقد و نظر کا جو کام ہوا ہے، وہ کس نہج کا ہے اور یہ کہ اُس میں مقدار اور معیار کی صورتِ حال کیا رہی ہے۔ اُس صنف کے بڑے تنقیدی سنگ ہائے میل کیا تھے اس کے بعد وہ اُن کا تنقیدِ نعت میں ہونے والے کام سے تقابل کر کے خود اندازہ لگا لیں کہ اس دورانیے میں ہمارے مرکزی ادب کی تنقید و تفہیم کے منظر نامے میں نقدِ نعت کا تناسب اور قدر ری حصہ کیا رہا ہے۔

گفتگو کا آغاز نعت کے عصری منظر نامے کے حوالے سے ہوا تھا۔ یہ منظر نامہ جیسا کہ عرض کیا، بڑی غیر معمولی صورتِ حال کا غماز ہے۔ نئے موضوعات، جدید نظریات، جدید تر تصورات اور بڑے افکار و سوالات سے جس طرح ترتیب پاتا ہوا آج یہ ہمارے سامنے ہے، وہ نعتیہ ادب کی فکری و موضوعاتی وسعت کے ساتھ ساتھ عصری زندگی اور تہذیب کے سیاق میں جس طرح انسانی رشتے اور اس کی معنویت کو بیان کر رہا ہے، اس سے نعت کی انفرادیت تو واضح ہو ہی رہی ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ معاصر ادب اور تہذیب دنوں کے لیے نعتیہ ادب ہمارے عہد کے بنیادی سوال کا تعین بھی کر رہا ہے اور اس سوال کو وہ ادب کا جس طرح فوکس بنا رہا ہے، دراصل وہ بجائے خود عصری تناظر میں اور تہذیبی سطح پر ادب کی ماہیت کی تشکیلِ نو کا عمل ہے۔ تاریخ کے اوراق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایسا ہی کچھ عمل دنیا کی ساری بڑی تہذیبوں میں ایک ایسے وقت پر ہوتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے جب وہ زمانے کے کسی موڑ پر فنا و بقا کے سوال سے پوری قوت کے ساتھ دوچار ہوتی ہیں۔ اس وقت دایاں بازو یا آپ کہہ سکتے ہیں مشرقی تہذیب خواہ وہ آج اپنے اساسی عناصر کے ساتھ دنیا کے جغرافیائی نقشے پر کسی بھی خطے میں بروئے کار ہے، فی الحقیقت ایسی ہی ایک صورتِ حال کا سامنا کر رہی ہے اور اپنی فکری و اصولی بقا کے بنیادی سوال سے دوچار ہے۔

یہ سوال ہے عصرِ حاضر کے انسان کی حیاتِ روحانی کا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عہدِ جدید کی ساری قوتیں انسان کی صرف وجودی زندگی کی بقا اور فروغ سے متعلق ہی نہیں ہیں، بلکہ اس پر اصرار بھی کر رہی ہیں۔ ان کا مقصد انسان کو ایک مشین کی طرح کی زندگی بسر کروانا اور اسی پر قناعت کرنا سکھانا ہے۔ وہ اس کے داخل میں موجود روحانی داعیے کی نفی کے لیے ہر ممکن کوشاں ہیں۔ یہ عمل انسان کا شرف اور اس کی فضیلت ختم کرنے کے مترادف ہے۔ دوسری مخلوقات اور اشیائے کائنات پر انسانی برتری کا جواز اس کا یہی روحانی داعیہ ہے۔ اگر یہ نابود ہو جائے تو اس کا شرف بھی بے جواز ہو

جائے گا۔ یہ ہے وہ صورتِ حال جس کے حوالے سے ہم آج اردو نعت اور اس کے تخلیقی و تنقیدی تناظر کا مطالعہ کر کے اس کی اصل معنویت سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

وفیات

نعت رنگ ۲۹ سے ۳۰ تک کے اشاعتی دورانیے میں اُفقِ نعت سے جو ستارے اپنے فن اور کارہائے نمایاں کی روشنی سمیٹ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ ''وفیات'' ان کی تعزیت کا اظہاریہ ہے، یہاں پہنچ کر الفاظ آنسوؤں کے ترجمان ہو جاتے ہیں۔ موت کی حقیقت سے کس کو انکار ہے، مگر دل کا کیا کیا جائے یہ جانے والوں کے غم سے تا عمر مضطرب رہتا اور رکھتا ہے۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا ، کوئی دم چہچہایا ، اُڑ گیا

جانے والوں کو نہ روکا جا سکتا ہے نہ ان کے ساتھ جایا جا سکتا ہے، مگر ان کو یاد کر کے ان کے لیے دُعائے مغفرت کا اہتمام ضرور کیا جا سکتا ہے۔ سو ان لفظوں کو بھی ان محترم ہستیوں کے حق میں دعائے خیر کا اہتمام ہی سمجھئے۔

پروفیسر انوار احمد زئی

۸ ستمبر ۱۹۴۴ء، جے پور _ ۳۱ مئی ۲۰۲۰، کراچی

ایک زمانہ تھا جب ایسی شخصیات سے بزمِ ہستی آباد تھی جو بیک وقت زندگی کے متعدد شعبوں میں نمایاں نظر آتی تھیں۔ وہ شعر و ادب کی بلندیوں کی ہم راز بھی تھیں، اور حکمت و دانش کا سرمایہ ناز بھی۔ ان کی فکری تدبر آفرینوں سے زمانہ جگمگا تا تھا۔ پھر قحط الرجال نے آلیا اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا جس میں ایسے کثیر الصفات مردانِ کار ڈھلتے تھے۔ اہلِ علم سے خالی ہوتے اس معاشرے میں پروفیسر انوار احمد زئی جیسے لوگوں کا دم غنیمت تھا۔ ان کی شخصیت کے کئی روشن پہلو تھے۔ صاحبِ مطالعہ تھے، ادیان عالم، تاریخ عالم اور ادبیاتِ عالم پر ان کی گہری نظر تھی۔ جس کا اظہار بھی وہ بڑی شائستگی اور اعتماد سے اپنی تقاریر، گفتگو اور مباحثوں میں اکثر کرتے تھے۔ تقریر سے تحریر تک ہر جگہ فکر افروزی و معنی آفرینی کے گلستان کھلاتے ہوئے وہ جس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے یوں لگتا جیسے وہی ان کا بنیادی موضوع ہو، بحیثیت ادیب و دانشور اور

افسانہ نگار و خاکہ نگار، انھوں نے جو علمی اثاثہ چھوڑا ہے وہ بہت اہم ہے۔ نعت ریسرچ سینٹر سے (بحیثیت چیئر مین) ان کی وابستگی ان کے ذوقِ نعت اور شعورِ نعت کا والہانہ اظہار تھی۔ انھوں نے 'نعت رنگ' میں بہت جم کر صنفِ نعت پر علمی مضامین لکھنے کے علاوہ معاصر نعت گوشعرا کے فکر وفن پر اتنا لکھا ہے کہ اگر وہ مضامین جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ محافل نعت اور محافل سماع میں اچھے کلام پر ان کی والہانہ داد و تحسین اور کلام کی معنی آفرینی پر عالمانہ گفتگو محفل کے رنگ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی تھی۔ ان کے جانے سے جہاں شہر کی سماجی، علمی اور فکری نشستوں کی ویرانی بڑھ گئی ہے، وہیں دینی مجالس میں بھی سکوت کا ماحول ہے کہ وہ عندلیبِ خوش نوا، وہ دلنواز مسکراہٹیں بکھیرنے والا خاموش ہوا، وہ چراغِ علم جو اپنے اطراف واکناف میں اُجالے تقسیم کر رہا تھا، اچانک بجھ گیا۔ کیسا سنّاٹا ہے کیسی مہیب تیرگی ہے اور اس اعصاب شکن ماحول میں دُور کہیں سے آتی یہ آواز ان کی جدائی کے رنج کو مزید گہرا کر رہی ہے:

یہ آنے والا زمانہ بتائے گا تم کو
مرا وجود زمیں پہ خدا کی رحمت تھا

خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

اعجاز رحمانی

۱۲ فروری ۱۹۳۶ء، علی گڑھ – ۲۶ / اکتوبر ۲۰۱۹ء، کراچی

سیّد اعجاز علی رحمانی المعروف اعجاز رحمانی صرف ایک شخصیت کا نام نہیں تھا بلکہ وہ اپنے عہد میں ادب وتہذیب کی ایک بھرپور علامت تھے۔ ان کی ساری زندگی اقبال کے جہانِ نو کے خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوششوں سے عبارت تھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک بھرپور اور توانا حصہ دینی اقدار کے پھیلاؤ، عشقِ نبی کریم ﷺ کے خوبصورت ابلاغ اور عظمتِ صحابہ واہلِ بیت کے ترانے رقم کرنے میں صرف کیا۔ وہ اپنی نعت گوئی سے نوعِ بشر کے لیے اسلام کے پیغام کی اہمیت اور اتباعِ سیرت کی برکات کا والہانہ اظہار کرتے رہے۔ ۷۱ء کی دہائی سے اپنی نعت گوئی کا آغاز کرنے والے اس اہم شاعر کا 'کلیاتِ نعت' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا جس میں ان کے پانچ نعتیہ مجموعے، 'اعجاز مصطفیٰ'، 'پہلی کرن آخری روشنی'، 'چراغِ مدحت'، 'آسمانِ رحمت' اور 'آبشارِ رحمت' یکجا ہوئے۔ علاوہ ازیں 'سلامتی کا سفر' (منظوم تاریخ اسلام)، 'عظمتوں کے مینار' (منظوم سوانح حیات خلفائے

راشدین)، اور 'گل ہائے سلام ومناقب' (مناقب اہلِ بیت) جیسے مجموعوں کی اشاعت بھی ان کے دینی مزاج اور عقیدتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی غزل گوئی اور سیاسی نظموں کا ایک الگ دفتر ان کے شعری سرمائے میں اپنی ایک اہمیت وافادیت رکھتا ہے۔ ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو پی ٹی وی کراچی سینٹر میں منعقدہ ایک کل پاکستان نعتیہ مشاعرے میں میری ان سے آخری بار ملاقات ہوئی۔ کافی کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ آواز میں نقاہت کے آثار نمایاں تھے، مگر اپنے مخصوص ترنم میں انھوں نے جم کے اپنا کلام سنایا۔ چند روز بعد میں ملک سے باہر چلا گیا۔ اور ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو ان کی وفات کی خبر آ گئی۔ انھوں نے اپنی نعت گوئی کے ذریعے ملّتِ اسلامیہ کے افراد میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام کا نشاۃ الثانیہ اور افرادِ ملّتِ اسلامیہ کی زندگی کی تجدید اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ آقائے نامدار کی زندگی کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے دلیل اور برہانِ آخری نہ بنائیں۔ ان کی نعتیہ شاعری اسی شعور کی ترسیل کا وسیلہ ہے۔ اللہ کریم ان کی خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مصطفیٰ کا جواب ہے کوئی — کیا رسالت مآب ہے کوئی
سرورِ دیں پہ جو ہوئی نازل — اور ایسی کتاب ہے کوئی
مصطفیٰ سے بڑا زمانے میں — بانی انقلاب ہے کوئی
اُسوہ مصطفیٰ سے بہتر بھی — زندگی کی کتاب ہے کوئی
ان کے در کے سوا زمانے میں — علم و حکمت کا باب ہے کوئی
جو پڑھایا ہے مصطفیٰ نے ہمیں — اس سے بہتر نصاب ہے کوئی
منتخب تو ہیں سب رسول مگر — حاصلِ انتخاب ہے کوئی

فراغ روہوی

۱۶/اکتوبر ۱۹۵۶ء، ضلع نوادہ بہار۔ ۱۳ جولائی ۲۰۲۰، کلکتہ مغربی بنگال

فراغ روہوی کا شمار اُردو کے جانے مانے شعرا میں ہوتا ہے۔ کلکتہ میں اُردو ادب کے فروغ میں ان کا نام اور کام اہم حوالہ ہے۔ انھوں نے غزل، ماہیہ، قصیدہ اور حمد و نعت جیسی اصناف میں ایک قابلِ توجہ تخلیقی اثاثہ چھوڑا ہے۔ کئی فلموں اور ٹیلی فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ معاصر شعرا پر ان کے تنقیدی مضامین ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ نعت رنگ میں بھی ان کے

مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ میرا ان سے پہلا تعارف ان کے نعتیہ مجموعے ''مرا آئینہ مدینہ'' کے ذریعے ہوا، اس خوبصورت مجموعے میں غزل کے فارم میں نعتوں کے علاوہ حمدیہ ونعتیہ رباعیات، دوہے، ماہیے اور ہائیکو کی اصناف میں بھی عشقِ رسول ﷺ کا بھرپور اور والہانہ اظہار نظر آیا اور یہی مجموعہ ان سے میرے تعارف اور پھر دوستی کا وسیلہ بنا۔ کبھی کبھی گفتگو بھی رہتی، جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ بڑھتی ہوئی عمر میں بھی تخلیقی اعتبار سے فعال اور متحرک ہیں۔ انھوں نے متعدد قصیدے بھی لکھے، خدا کرے ان کے قصائد کا مجموعہ جلد شائع ہو۔ گزشتہ دنوں ان کا ایک انتخابِ حمد ''حمد کا عالمی انتخاب'' کے نام سے شائع ہوا، اور اسے خاصا سراہا گیا۔ ۲۰۱۹ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والے اس انتخاب کو مغربی بنگال اُردو اکیڈمی نے شائع کیا۔ بحیثیت مرتب اس انتخاب پر ان کا پیش لفظ ان کی دینی اصناف سے دلچسپی اور ان کے فروغ وارتقا کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہے۔

یہ زادِ عقبٰی بہت ہے ہم عاصیوں کے لیے
''کہ تیرے نام کی رٹ ہے، خدا کے نام کے بعد''

فراغ روہوی اپنا زادِ عقبٰی لیے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ اللہ کریم ان کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین!

پروفیسر منظر ایوبی

۴؍اگست ۱۹۲۲ء، بدایوں۔ ۲ جون ۲۰۲۰ء، کراچی

کراچی کے ادبی منظرنامے پر پروفیسر منظر ایوبی ایک معتبر حیثیت کے حامل رہے۔ وہ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ ان کا کلام اور ترنم دونوں ہی مشاعروں کی فضا کو روشن کر دیتا تھا۔ ادب، شاعری، نثر نگاری، معلّمی اور ریڈیائی خدمات کے حوالے سے ان کا تحریری اثاثہ وکام اہمیت رکھتا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ان کا نعتیہ مجموعہ ''متاعِ آخرت'' شائع ہوا۔ متعدد مجموعہ ہائے نعت پر ان کے تقریظی مضامین اور اُردو میں صنفِ نعت کی روایت پر اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین ان کی صنفِ نعت سے محبّت اور نعت شناسی کے ذوق کی گواہی دیتے ہیں۔

جو اپنی ذات میں خود کائنات ہے منظر
یہ کائنات سجائی گئی اُسی کے لیے

اللہ کریم منظر ایوبی کا سفرِ آخرت آسان فرمائے اور انھیں مغفرت سے نوازے۔ آمین!

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء۔ یکم جولائی ۲۰۲۰ء، حسن ابدال

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں صحت کے شعبے سے وابستہ تھے۔ مگر شعروادب سے شغف اور بالخصوص نعت خوانی اور نعت گوئی نے انھیں اس صراطِ خیر کا مسافر بنا دیا تھا جسے ہم حُبِّ مصطفےٰ کہتے ہیں۔ وہ کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ تھے، مگر ان کا زیادہ وقت ''محفلِ نعت پاکستان''، حسن ابدال کی تنظیمی سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ میری ان سے پہلی اور آخری تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب معروف ناقدِ نعت کاشف عرفان نے اسلام آباد اور راولپنڈی کے بعض اہم ادیبوں اور نعت کاروں سے میری ملاقات کا اہتمام ایک نشست کی صورت اپنے گھر پر کیا تھا۔ اس نشست میں ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش کو دیکھا تو وہ عزم واخلاص کا ایک کوہِ گراں معلوم ہوئے۔ اپنی بیماری اور کسی حد تک معذوری کے باوجود وہ جس جذبے اور لگن کے ساتھ تشریف لائے اور اپنی محبّتوں کا والہانہ اظہار کیا اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شخص اپنے دل میں فروغِ نعت کا کیسا جذبہ رکھتا ہے اور اس عملِ خیر سے جُڑے ہر شخص کے لیے اپنے دل میں کس قدر احترام کے جذبات رکھتا ہے۔ ان کی اچانک موت فروغِ نعت کے لیے، فعال تمام افراد اور اداروں کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔

میں دانش اپنے مقدر پر کیوں نہ ناز کروں
کہ نعت گوئی ہی اب تو مرا حوالہ ہے

خدا کرے یہ روشن حوالہ ان کی آخرت کو بھی روشن کر دے۔ آمین!

سیّد عارف محمود مہجورؔ رضوی

۱۰/ اگست ۱۹۶۰ء۔ ۲۰ جولائی ۲۰۲۰ء

مہجورؔ رضوی ایک خوش گو شاعر تھے۔ انھیں حمد، نعت، منقبت اور تاریخ گوئی کے حوالے سے شہرت ملی۔ ان کی تقدیسی شاعری کے دو مجموعے شائع ہوئے، جس میں عنوان نجات (۱۴۱۷ھ)'' اور ''یارب معاف کر دے (۲۰۰۵ء)'' شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں ان کی کتب کی ایک فہرست بھی شامل ہے جس میں دو حمدیہ و نعتیہ مجموعوں جہانِ حمد، منہاجِ نعت کی جلد اشاعت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کے لواحقین ان کتب کی اشاعت میں دلچسپی لے کر انہیں مصنّف کا توشۂ آخرت

بنانے کی پوری کوشش کریں گے۔

چاہوں میں شفاعت کے لیے آپ کا دامن
مہجور سدا میں نے یہی حق سے دعا کی

اللہ کریم اپنے حبیبِ مکرم ﷺ سے اس ثنا گو کی اس دُعا کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے، آمین!

اقبال حیدر

۸ جون ۱۹۴۵ء، ریاست دیوا، بھارت۔ ۲۵ مارچ ۲۰۲۰ء

اقبال حیدر کا خاندانی نام سیّد اقبال حیدر شاہ تھا۔ انھیں نعت گوئی ورثے میں اپنے والد (معروف نعت گو) سیّد احمد علی شاہ شید اجبل پوری سے ملی تھی۔ انہی کی تربیت سے ان کی شخصیت میں دینی شعور کے رنگ گہرے ہوئے تھے۔ تخلیقی اعتبار سے انھوں نے غزل، نظم اور ہائیکو کے حوالے سے معاصر شعری منظرنامے پر اپنی ایک شناخت قائم کی، مگر جلد ہی ان کے دینی مزاج نے انھیں نعت گوئی سے قریب تر کر دیا۔ ان کا مجموعہ حمد و نعت ''لاریب'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا تھا جو اپنے شاعر کی سچی عقیدتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کا آئنہ ہے۔

جلوہ شہر نبی دل کے نہاں خانے میں ہے
اب بھی وہ صبحیں وہ شامیں دیکھتا رہتا ہوں میں
میں نے جن آنکھوں سے دیکھی ہیں سنہری جالیاں
آئنے میں اب وہ آنکھیں دیکھتا رہتا ہوں میں

۲۰۱۷ء میں میری ان سے آخری تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب انھوں نے امریکہ کے شہر ڈیلس میں اپنے ادبی ادارے ''اُردو گھر'' میں ایک نشست میرے لیے منعقد کی۔ شہر کی ادبی شخصیات کو جمع کر کے اقبال حیدر نے ''اُردو گھر'' کے ذریعے امریکہ میں بھی دینی اقدار کے فروغ اور اُردو کی ترقی کے لیے کام کرنے کے اپنے پرانے جذبے کو زندہ رکھا۔ پچھلے سال معلوم ہوا وہ کراچی تشریف لائے۔ کسے خبر تھی کہ ایک طویل بیماری سے صحت یابی کی طرف لوٹنے کے بعد وہ اپنے ملک اور اپنے شہر کی آخری زیارت اور اپنے احباب سے آخری ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ امریکہ واپسی کے کچھ عرصے بعد ہی ان کی وفات کی خبر آ گئی۔

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اُن کی ایک دعائیہ نظم قارئینِ نعت رنگ کی نذر کروں۔

دُعائے یک شہرِ آرزو

زندگی اتباعِ سنت ہو حاصل اللہ کی محبّت ہو
نیکیوں سے ہمیشہ رغبت ہو سب گناہوں سے مجھ کو نفرت ہو
اپنے اعمال پر ندامت ہو مغفرت کی دُعا ہو، حسرت ہو
کاش! جس دن بپا قیامت ہو میرے آقا کی یوں شفاعت ہو
میرے سر سے عذاب رُخصت ہو
مجھ پہ اللہ کی عنایت ہو

آئیے ہم سب، شاعر کی اس دُعا پر مل کر آمین کہیں۔

سیّد عمران نقوی

۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء لاہور۔ ۳ ستمبر ۲۰۲۰ء لاہور

سیّد عمران نقوی نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کا اجتماعی ورثہ ہی عشقِ نبی کریم ﷺ تھا۔ سیّد امین علی نقوی جیسے اہم صوفی نعت گو شاعر اور ڈاکٹر سیّد آفتاب احمد نقوی جیسے معتبر نعت شناس کے بعد عمران نقوی نے اس خاندان میں اس ورثے کو سنبھالا بھی اور اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے پورے جذبے اور اخلاص سے مصروفِ عمل بھی رہے۔ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھے، ان کی شخصیت اور فن کے روشن پہلوؤں نے انھیں جلد لاہور کے ادبی منظرنامے پر نمایاں کیا۔ وہ بحیثیت صحافی، ادیب اور شاعر ایک اعتبار کے ساتھ اپنے نقوشِ قلم سے اپنی شناخت کو مستحکم کرتے رہے۔ انھیں اپنے بزرگوں سے خدمتِ نعت کا جو جذبہ ملا اس میں بھی انھوں نے اپنی نعت گوئی اور نعتیہ کتب کی تدوین کے ذریعے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ نعتیہ ادب پر ان کی مرتب کردہ دو اہم کتب شائع ہوئیں جن میں ''دلیلِ آفتاب'' (مطالعاتِ نعت از ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، ۲۰۰۱ء) اور ''اک شخص مہکتی چھاؤں سا'' (حفیظ تائب کی شخصیت و فن پر مضامین کا مجموعہ مع انتخابِ کلام ۲۰۰۲ء) شامل ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں ان کے نعتیہ کلام کے مجموعے ''وجب الشکر علینا'' کی اشاعت نے معاصر نعت کے منظرنامے پر ان تخلیقی صلاحیتوں کو خوشگوار مسرتوں کے ساتھ متعارف کروایا۔ ان کی عقیدتوں کا وفور اور تازہ کاری جس ہنرمندی کے ساتھ ان نعتوں میں نمایاں ہوئی وہ قابلِ رشک ہے۔ ان کی نعت گوئی جذبہ والہانہ، فکری عناصر اور تاریخی شعور سے روشن ہے۔

کوئی بھی رُخ ہو مدینے کی مہک آتی ہے　　　اک دریچہ ہے جو اس رُخ پہ سدا کھلتا ہے
اک چٹائی پہ جو مٹی کا دِیا روشن ہے　　　اس کی لَو سے ہی ستاروں کی قبا روشن ہے

دھڑکن بنے نہیں تھے دل کائنات کی　　　مکہ ترے بغیر مدینہ ترے بغیر
انسانیت تھی کب سے ترے انتظار میں　　　محروم رنگ و بو تھا یہ غنچہ ترے بغیر

چند ماہ پہلے عمران نقوی نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ ان دنوں اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں۔خدا کرے وہ اپنا کام مکمّل کر چکے ہوں۔انھوں نے اپنی صحافیانہ زندگی میں ادیبوں، شاعروں کے بہت اہم انٹرویوز کیے جس میں کئی اکابر نعت گو شعرا بھی شامل رہے۔ان انٹرویوز کا کسی ایک جگہ جمع ہو جانا بھی نعت گوئی کی عصری تاریخ کے آثار کو محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہوگی۔ان کے اہلِ خانہ کے لیے یہ کام مشکل بھی نہیں۔اللہ کریم ان کی مغفرت فرمائے (آمین)۔

خورشید بیگ میلسوی

یکم جنوری ۱۹۴۶ء، گڑگاؤں، بھارت۔۱۲/اکتوبر ۲۰۲۰ء میلسی

مرزا خورشید بیگ کا قلمی نام خورشید بیگ میلسوی تھا۔انھوں نے ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ان کی تخلیقات پر مشتمل آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی زیرِطبع ہیں۔مطبوعہ کتب میں چار کتابیں حمد و نعت اور منقبت جیسی اصناف سے ان کی قلبی لگاؤ اور فطری میلان کا روشن حوالہ ہیں۔ ''جمالِ نظر (۲۰۰۴ء)، ''فراتِ وقت'' (۲۰۱۲ء)، ''تو خالق ہے تو مالک ہے'' (۲۰۱۰ء)، ''محرابِ نعت'' (۲۰۲۰ء)، کی اشاعت سے خورشید بیگ میلسوی کا نام معاصر نعت نگاروں کی صف میں ایک اعتبار قائم کر چکا ہے۔وہ طبعاً غزل کے خوش گو شاعر تھے۔جب نعت کی طرف آئے تو اظہار کا قرینہ اور بیان کی لطافت ان کے خوب کام آئی۔محبّت کے ساتھ عقیدت اور جذبے کے ساتھ محنت شامل ہو جائے تو تخلیقی عمل کا لطف و انبساط دو آتشہ ہو جاتا ہے، اس کا احساس خورشید بیگ میلسوی کی حمد، نعت اور منقبت کے مطالعے کے وقت بطورِ خاص ہوتا ہے۔

دین احمد پہ دل و جان فدا کر ڈالوں
موت سے پہلے مرا قرض ادا ہو جائے

ان کی زندگی کے روشن پہلوؤں اور تخلیقات میں پاکیزہ اُجالوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس احساس کو عمل میں ڈھال کر کامیابی کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔

چودھری محمد یوسف ورک قادری

۲مئی۱۹۴۴ء، حافظ آباد–۱۷/اکتوبر۲۰۲۰ء لاہور

ممتاز نعت شناس و نعت کار محمد یوسف ورک صاحب ایک عاشق صادق تھے۔ وہ نعتیہ کتب کی جمع آوری کے شوق و ذوق میں کیسے مبتلا ہوئے، میں نہیں جانتا۔ مگر ان کا جذبہ، محنت اور سرشاری دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انھیں اس کام پر مامور کیا گیا تھا۔ جب اللہ کریم کسی بندے پر مہربان ہوتا ہے تو اُسے کسی ایسے کام پر مامور کر دیتا ہے جو اس کی خوشنودی کا باعث ہو، اور رب کی خوشنودی ہی بندگی کی معراج ہے۔ بابا یوسف ورک بھی پنی عقیدت خالص، اخلاص اور سادگی کے باعث اہلِ محبّت کے محبوب بن گئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر آفتاب نقوی کی سرپرستی میں ''نعت لائبریری شاہدرہ'' قائم کی۔ اس لائبریری کی طرف سے محمد یوسف ورک نے پہلی فہرست کتب نعت ۲۰۰۴ء میں شائع کی، جو ۷۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ یہی فہرست بہت بہتر انداز میں کئی اضافوں کے ساتھ ۲۰۰۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔ جس کا عنوان ''فہرست کتب نعت لائبریری شاہدرہ'' ہے۔ بعدازاں اسی کتاب کے دو مزید ایڈیشن متعدد اضافوں کے ساتھ ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۸ء میں بھی شائع ہوئے۔ ۲۰۱۱ء میں چودھری محمد یوسف ورک قادری صاحب نے ''کشورِ نعت'' کے نام سے ایک اور کتاب مرتب کی جس کے پہلے حصے میں ان کی نعت لائبریری پر مختلف صاحبانِ علم کی رائے، اور ان کی مرتب کردہ فہرست کتب پر تبصرے شامل ہوئے ہیں۔ دوسرے حصے میں ورک صاحب نے مختلف رسائل میں جن حمدیہ و نعتیہ کتب پر خود تبصرے کیے تھے، انھیں جمع کیا گیا ہے اور تیسرے حصے میں محمد یوسف ورک صاحب کا اُردو پنجابی حمدیہ و نعتیہ کلام جمع کیا گیا ہے۔ نعت لائبریری شاہدرہ لاہور کا قیام نعت کے موضوع پر تحقیقی مقالات لکھنے والے طلبہ کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ نعتیہ کتب کی عدم فراہمی ایک مدت سے بڑا مسئلہ رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اس موضوع پر لائبریریوں کے قیام کے ذوق و شوق اور اہتمام نے محققین کی مشکلات کو دُور کیا ہے۔ ان لائبریریوں کے قیام پر توجہ دینے والے صاحبانِ ذوق میں ایک نہایت باوقار نام چودھری محمد یوسف ورک قادری کا تھا۔ وہ دُنیا سے جاتے ہوئے اپنے نامۂ اعمال میں خیر کی ایسی روشنی لے گئے ہیں جو ان کی مغفرت کا سامان ہوگی، ان شاء اللہ۔

مجھے وفیات کے عنوان سے اپنے ابتدائیے کے آخری حصے میں مرحوم نعت نگاروں، نعت کاروں اور نعت شناسوں کے حوالے سے یہ تعزیتی شذرات لکھتے ہوئے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ان لمحات میں ان نفوسِ قدسیہ کے درمیاں ہی کہیں موجود ہوں، ان کے اشعار، ان کے جملے کانوں میں گونجتے ہیں اور اپنی محبّتوں اور رفاقتوں کی خوشبو سے مہکاتے ہیں۔ کاش! وہ مجھے بھی سن سکیں اور کسی طرح اُن تک بھی میری یہ صدا پہنچ سکے!!!

عدم کے جانے والو! آنے والے ہیں وہیں ہم بھی
ہمارا راستہ منزل بہ منزل دیکھتے جاؤ

نعت رنگ ۳۱

اداریہ

ابتدائیہ

زندہ ادب اور باشعور ادیب خواہ اس کا تعلّق کسی بھی فکر یا نظریے سے ہو اور فن کی ماہیت کا کوئی بھی تصور رکھتا ہو، اپنے زمانے کی صورتِ حال اور اُس کے مسائل و سوالات سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ غافل ہو جائے تو اُس کے تخلیق کردہ ادب کی کارگزاری اور اثر آفرینی کا دائرہ سمٹ کر ایک نقطہ بن جاتا ہے جو محض اُس کی اپنی ذات سے عبارت ہوتا ہے۔ اپنے زمانے کے شعور سے ہم آہنگ ادیب کے قلم سے وہ حرفِ روشن نکلتا ہے جو اُس کی ذات سے سماج تک روشنی کی لکیر کی طرح سفر کرتا ہے۔ یہ روشنی دوسروں کو بھی مہمیز دے کر فکر و نظر کے سفر کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مجھے یہ خیال گزشتہ دنوں معاصر جریدے ''مکالمے'' کے اداریے کی وجہ سے آیا۔ اس میں عصری انسانی صورتِ حال کا محاکمہ عہدِ حاضر کے ایک بے حد پریشان کن سوال کے تحت کیا گیا ہے۔ ابتدائی پیرا دیکھیے:

> انسانی سماج میں درندگی کا تناسب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس قدر تیزی سے کہ اس کے بنیادی سبب کی تفتیش ہو پا رہی ہے اور نہ ہی روک تھام کے اقدامات کا تعین۔ حد یہ ہے کہ اس کی نوعیت تک پوری طرح واضح نہیں ہے۔ کہیں یہ مذہبی عصبیت کی صورت میں ہے تو کہیں ثقافتی برتری کے قالب میں۔ کہیں اس کا غالب رجحان سیاسی ہے تو کہیں لسانی۔ کہیں اس کی شکل رنگ و نسل کے تفاخر میں ابھرتی ہے تو کہیں گروہی تعصّب میں۔ غرضے کہ مختلف علاقوں اور حالات میں یہ طوفان مختلف صورتوں میں موج در موج اٹھتا انسانیت اور تہذیب کے ہزاروں برس میں تشکیل پانے والے سارے نظام کو خس و خاشاک کی

صورت بہالے جانے پر مصر نظر آتا ہے۔

اس کے بعد عالمی تناظر میں انسانی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس مسئلے کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے مختلف سماجی، تہذیبی اور سیاسی مظاہر پر گفتگو کے بعد اختتام پر آکر کہا گیا ہے:

> آج اس بات کو بار بار واضح کرنے اور باور کرانے کی ضرورت ہے کہ ٹیکنولوجی، گیجٹس، آرٹی فیشل انٹیلی جینس، معاشیات کی گیمکری اور سیاسیات کی منافقت کے عہد میں انسانی احساس سے اگر کسی کو سروکار رہے یا ہوسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف ادب ہے۔ یہی بات اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انسانی سماج کو ادب کی فی الواقعی ضرورت ہے۔ انسانی احساس، جذبے، فکر، شعور، عقل، خوابوں، امنگوں اور باہمی انسانی رشتوں کی بقا کے لیے۔ درندگی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی روک تھام کے لیے۔ انسان کو انسان اور زندگی کو زندگی کی صورت میں قائم رکھنے کے لیے۔ فی الجملہ کہا جاسکتا ہے کہ ادیبوں پر پیغمبری وقت آیا ہوا ہے۔ انھیں اپنے احساسات اور رویوں کا اظہار اپنے تخلیقی عمل میں اسی نہج پر کرنا ہوگا۔

یہ گفتگو ایک وسیع سیاق وسباق میں اور واضح نکتۂ نظر کے ساتھ کی گئی ہے جو ہماری توجہ اپنے عہد کے ایک بے حد سنجیدہ اور گمبھیر مسئلے کی جانب مبذول کراتی ہے۔ یہ مسئلہ مختلف پہلوؤں کا حامل ہے اور ہمارے لیے دعوتِ فکر رکھتا ہے۔ ادب کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے اور خصوصاً نعتیہ ادب سے اپنی وابستگی کی وجہ سے اس اداریے نے مجھے خاصا مضطرب رکھا، بلکہ میں آپ سے یہ عرض کروں تو غلط نہ ہوگا کہ مجھے تو یوں لگا، جیسے یہ سب باتیں اور خاص طور پر اختتامی نکتہ براہِ راست مجھ جیسے اُن لوگوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے جو نعتیہ ادب سے وابستہ ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عام ادیب وشاعر اپنی اخلاقی وتہذیبی اقدار کا جو بھی شعور رکھتا ہے، وہ اپنی جگہ، اُس کے ادب وشعر میں اس شعور کا اظہار جس سطح پر ہوتا ہے، وہ بھی اپنی جگہ۔ تاہم نعتیہ ادب سے وابستہ ادیب وشاعر تو براہِ راست اس منبعِ حیات اور مرکزِ نور سے فیض پاتا ہے جو اس کائنات کی تخلیق اور روشنی کا بنیادی حوالہ ہے۔ جس نے انسانیت کو بھائی چارے، امن، محبّت اور باہمی رواداری کا سب سے بڑا، وقیع اور دائمی منشورِ حیات عطا کیا اور یہ ضابطہ ہر طرح کی تفریق اور امتیاز کی نفی کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نعت کہنے، نعت پڑھنے اور نعت کے افکار وتصورات پر گفتگو کرنے والے لوگوں کی ان اقدار سے وابستگی اور ان کا شعور دوسروں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ گہرا ہوگا، اور ہونا بھی

چاہیے۔اس لیے کہ وہ سب سے بڑھ کران اقدار کے پاس دار ہیں۔ان اقدار سےاُن کی وابستگی محض فکری وفنی سطح پرنہیں بلکہ انسانی کردار کےٹھوس حوالے سے ہے۔اُن کے سامنےتو آپ کی سیرت و کردار کامکمّل عملی نمونہ ایک منارۂ نور کی صورت میں موجود ہے۔ان سب تخلیق کاروں،نقادوں اور دانش وروں کا فکر وشعوراس نور سےسب سے سے بڑھ کرمستنیر ہے،اوراپنے ادب وفن کے ذریعے وہ اس روشنی کے سفیر ہیں۔لہٰذاان کےتخلیقی رویوں،افکارونظریات اورشخصی اعمال وکردارکوبھی ان اقدار سے آراستہ ہونا چاہیے۔اُن کےشعراورمضمون ہی کونہیں،اُن کی شخصیت کوبھی واقعتاًان اقدارکا آئینہ دار ہونا چاہیے۔علاوہ ازیں اپنے زمانے کی سماجی،تہذیبی اورانسانی صورتِ حال پراُن کی نظر ہونی چاہیے۔کسی بھی ایسے مسئلے کے بارے میں اُن کافکری اورشعوری ردِعمل کسی بھی مصلحت کےبغیر سامنے آنا چاہیے۔

اب اگرایسا ہےتو اس مرحلے پرُرک کرآپ کو، مجھے،ہم سب کواپنی اپنی جگہ خود سے یہ سوال کرنا چاہیے،کیاواقعی فکری وعملی سطح پرہم اس شعور سے بہرہ مند ہیں؟قدرے تأمل کےساتھ ہی سہی اورندامت کےساتھ ہی سہی،اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔افسوس،صدافسوس،نفی میں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنےفکروشعورکواُس ذاتِ گرامی اکےافکارواعمال سے پوری طرح ہم آہنگ ہی نہیں کیا ہوا۔ہم نے اس کا ایک جز ولیا ہے،اوراسی پرمطمئن ہوکراپنے کام میں مصروف ہیں۔ ایک مسلمان کے دل میں حبِ رسول اا یک بالکل فطری چیز ہے۔لیکن کیا اس دولتِ گراں مایہ کو صرف دل میں ہونا چاہیےاورکیااس کا صرف اورصرف فطری ہونا کافی ہے؟نہیں،بالکل نہیں۔ہمیں اس محبّت کوشعور کی سطح پرلانا چاہیے،اسے اپنے افکار کےساتھ ساتھ اپنے کردار کےسانچے میں بھی نمایاں کرنا چاہیے۔اب سوال یہ ہے کہ یہ کام تخلیقِ شعراورادب ونقد کی سطح پرکیسےممکن ہے؟

یہ ایک بے حدسنجیدہ اوراہم سوال ہے جو بظاہرمشکل نظرآتا ہے،لیکن ہماری ادبی تاریخ کے کچھ لوگوں نے اس سے پہلے اس کا جواب اپنے زمانے کے تناظر میں دیا ہے۔اقبال کی شاعری میں،ان سے پہلے حالی کے ہاں اوران کے بعدمولانا ظفرعلی خاں کے ہاں آپ دیکھ لیجیے،شخصی شعورو افکارکس طرح اُس مرکزِ ہدایت ومنبعِ نور سےفیض یاب اوراُس روشنی کے سفرکا حصہ بنے ہیں۔یہاں اوربھی کئی نام لیے جاسکتے ہیں،لیکن میرا مقصد نام گنوانانہیں بلکہ ایک مسئلےکوواضح کرنااوراس کی عملی تعبیرکرنے والے تخلیق کاروں کی جانب اشارہ کرنا ہے۔فکری اوراخلاقی اقدار جب شخصی جوہر سے ہم آمیز ہوکرتخلیقی عمل میں رونما ہوتی ہیں تومعجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے۔آج کا نعت نگارعصری انسانی شعور کی

تشکیل میں دوسروں سے بڑھ کر اہم اور بامعنی کردار اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب اسے اپنی ذمہ داریوں کا مکمّل طور پر ادراک ہو۔نعت میں عقیدے،عقیدت،جذبے اور محبّت کے اپنے معنی ہوتے ہیں،لیکن آج اس کے ساتھ حضور اکرم صلی آعلیہ وسلم کے کردار اور سیرت و اخلاق کے عملی مظاہر پر توجہ کا تقاضا شعورِ عصر کر رہا ہے۔آج نعت کا بڑا، گہرا اور زندہ تخلیقی تجربہ اس ادراک کا حامل ہوکر ہی معرضِ اظہار میں آسکتا اور اپنی اثر آفرینی کا دائرہ وسیع کرسکتا ہے۔

اسی طرح جو صاحبانِ دانش ونقد آج ہمارے ہاں نعت کے مطالعے اور تنقید سے وابستہ ہیں،اُن کی کارگزاری کا یوں تو ہر پہلو اپنی جگہ اہم ہے،لیکن اُن کے لیے بھی یہ سوال بے حد غور طلب اور فکر انگیز ہے کہ وہ اپنے زمانے کے انسانی،سماجی،اخلاقی اور تہذیبی شعور سے کس درجہ آگاہ اور ہم آہنگ ہیں۔اپنے زمانے کے نظریات،افکار اور تصورات پر ان کی کتنی نظر ہے اور وہ معاصر نعت کا مطالعہ، جائزہ اور محاکمہ اُن کے تناظر میں کرتے ہوئے کس حد تک اپنی اقدار کی پاس داری کر رہے ہیں۔اردو نعت کے تخلیقی سفر میں اور فنی وفکری ارتقا میں اُن کا کردار اسی وقت اہم ہوسکتا ہے جب وہ ایک طرف زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھیں،اُس کے سماجی،تہذیبی اور انسانی مسائل کو سمجھیں اور دوسری طرف اپنی اقدار کے گہرے شعور کے ساتھ اپنے نعتیہ ادب کا جائزہ لیں اور اپنے مطالعے کے حاصلات کو عام قاری کے فکر و احساس کا حصہ بنانے کی کوشش کریں۔ہماری فکری،ادبی اور انسانی بقا و استحکام کا صرف اور صرف یہی راستہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ معاملہ ادب کا ہو یا تہذیب کا یا پھر ملک و قوم کا جب بھی بقا اور استحکام کا مرحلہ درپیش ہوگا تو اُس کے لیے اقدار کے شعور اور عصری رویوں کے مابین ہم آہنگی کے ساتھ اقدامات کی ضرورت ہوگی۔آج ہمیں تخلیقی،تنقیدی اور فکری سطح پر اس امر سے نا صرف پوری طرح آگاہ ہونے کی ضرورت ہے، بلکہ اس آگہی کو پوری طرح بروے کار لانا بھی ناگزیر ہے، اور اس کے لیے ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اپنا کام کرنا ہوگا تبھی ہم اپنی تہذیبی بقا کا سامان کرسکتے ہیں۔

وفیات

کرونا کی عالمی وبا نے پوری دنیا کی معاشی اور سماجی فضا کو تہہ و بالا کردیا ہے۔پچھلے چند برسوں میں ہم نے اپنے اطراف میں ایسے ایسے انسانی المیے جنم لیتے دیکھے ہیں کہ جن کی کوئی مثال ہمیں اس سے پہلے تاریخ انسانی میں نظر نہیں آتی۔نعت رنگ ۳۰ تا ۳۱ کے اشاعتی دورانیے میں اس وبا

کے باعث ہر شعبہ حیات کی طرح ہمارے ادب اور ادیب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ نعتیہ ادب سے وابستہ اہلِ قلم بھی اس سے شدید متاثر ہوئے ہیں۔ کئی اموات واقع ہوئیں جو طبعی نہیں تھیں بلکہ اسی وبا کا شاخسانہ قرار دی گئیں۔ شاید اسی لیے ان کے زخم بھی روح پر کچھ زیادہ گہرے محسوس ہوئے اور ان زخموں میں اس تیزی سے اضافہ ہوتا رہا ہے کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔ ہر روز کوئی نئی سناونی آجاتی ہے اور پلکیں خشک ہونے سے پہلے ہی آنسوؤں کی ایک نئی لہر سے نم ناک ہو جاتی ہیں۔

ایک ایک کر کے لوگ بچھڑتے چلے گئے
یہ کیا ہوا کہ وقفۂ ماتم نہیں ملا

کس کس کو روئیں اور کتنا روئیں، جدا ہونے والوں کی ایک طویل فہرست ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ سب کے نام اس وقت حافظے میں روشن ہوں۔ چند ایسے نام جن کی نعتیہ خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ان کی یادوں کے چراغ جلانے کا اہتمام بہر حال ضروری ہے تاکہ مستقبل کے نعت شناسوں کے فکر و نظر کی لَو ان بزرگوں کے زندگی اور کارہائے نمایاں سے جلا پاتی رہے۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اَجل میں آئے

ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب

۱۰ جون ۱۹۳۰ء بریلی۔ ۷ جولائی ۲۰۲۱ء بریلی

ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب کی نعت شناسی کا سفر اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے اپنے دوست میر حسان الحیدری (مدیر ماہنامہ آستانہ ذکریا ملتان) کے اصرار پر ان کے رسالے کے لیے نعت گویانِ اُردو کے نام سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک جاری رہا۔ ۱۹۷۸ء میں کسی ریسرچ اسکالر سے نعت گویانِ بریلی سے متعلق گفتگو نے انھیں ایک بار پھر لکھنے کی تحریک دی اور انھوں نے ایک تذکرہ مرتب کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ۱۹۷۸ء ہی میں انھوں نے یہ تذکرہ ''تذکرہ نعت گویانِ بریلی'' کے عنوان سے مکمّل کرلیا مگر اس پہ نظرِ ثانی کی نوبت ۱۹۸۵ء میں اس وقت آئی جب ان کے داماد اور معروف نقاد و محقق ڈاکٹر شمس بدایونی نے اس کتاب کے مسودے کے مطالعے کے بعد اس کی افادیت کے پیشِ نظر اسے شائع کرنے پر اصرار کیا۔ یوں یہ

کتاب ۱۹۸۶ء میں زیورِطبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر یقیناً ایک کتاب حوالہ کا درجہ رکھتی ہے۔ آستانہ زکریا ملتان کے چند شمارے دیکھنے کا موقع مجھے بیدل لائبریری کراچی میں میسّر آیا جن میں لطیف حسین ادیب صاحب کے صرف نو مضامین میسر آئے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے صرف نعت گو شعرا کے کوائف اور کلام ہی کو جمع نہیں کیا بلکہ ان شعرا کے فکر و فن پہ بات کرنے سے پہلے اس شاعر کو اس عہد کے سماجی اور تاریخی تناظر میں بھی دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اس کی شخصیت و فن پہ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس عمل نے ان کی تذکرہ نگاری میں ایک تنقیدی شان بھی پیدا کر دی اور اہلِ علم نے اسے خوب سراہا۔ میرے نزدیک نعت گو شعرا کے تذکروں کے فروغ میں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کا ایک بڑا اور اہم کردار ہے۔ انھوں نے بطور ادیب ایک فعال اور متحرک زندگی گزاری۔ ان کی مطبوعہ کتب میں 'سرشار کی ناول نگاری' (کراچی ۱۹۶۱ء)، 'ناشاد کانپوری' (لکھنؤ ۱۹۷۶ء)، 'تذکرہ نعت گویانِ بریلی' (بریلی ۱۹۸۶ء)، 'تذکرہ شعرائے بریلی' (بریلی ۲۰۲۰ء) شامل ہیں۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کی ادبی خدمات پر ایک عمدہ تعارفی کتاب 'لطیف نامہ' کے نام سے ڈاکٹر شمس بدایونی نے مرتب کی ہے جو ۲۰۰۴ء میں روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی رامپور سے شائع ہوئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ڈاکٹر صاحب کی خدمتِ نعت کے صلے میں انھیں مغفرت سے نوازے۔ آمین!

پروفیسر جاذب قریشی

۳ جون ۱۹۴۰ء کلکتہ ۔ ۲۱ جون ۲۰۲۱ء کراچی

جاذب قریشی کا نام ادبی حلقوں میں اپنی ایک انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور تنقید دونوں سے معاصر ادبی منظرنامے کو روشن کیا۔ تخلیقی و تنقیدی نوعیت کی متعدد کتب ان کا قابلِ فخر فکری و تخلیقی اثاثہ ہیں۔ نعت کی تخلیق و تنقید میں بھی جاذب قریشی نے اپنی تازہ کاری سے ایک انفرادی اسلوبِ اظہار پیدا کیا اور داد پائی۔ ان کی ایک مختصر مگر بصیرت افروز کتاب ''نعت کے جدید رنگ'' کے نام سے ۲۰۰۴ء میں کراچی سے شائع ہوئی جس میں ان کی جدید تر اظہار و اسلوب میں گندھی ہوئی ان کی تقدیسی شاعری کے علاوہ فنِ نعت گوئی اور معاصر نعت گو شعرا کے اسالیب و فنی محاسن پر فکر انگیز تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں، جو ان کی باشعور عقیدت اور گہری تنقیدی بصیرت کو سامنے لاتے ہیں۔

وہ انقلاب جسے تیری زندگی نے لکھا
میں پڑھ سکوں تو گُل نوبہار ہو جاؤں
میں اپنے عہد کا صحرا ہوں مجھ کو خواہش ہے
ترے حضور گروں آبشار ہو جاؤں
تبسّموں کے اُجالے ، شفاعتوں کے حرم
مجھے بُلا کہ میں تجھ پہ نثار ہو جاؤں

اللہ کریم جاذب قریشی کی عقیدتوں کو قبول فرماتے ہوئے ان کو شفاعتوں کے حرم میں داخل فرمائے۔آمین!

امین راحت چغتائی

۱۵/اکتوبر۱۹۳۰ء رنگون، برما–۲۱ مارچ۲۰۲۱ء اسلام آباد

امین راحت چغتائی کی شخصیت خوبیوں کا مجموعہ تھی۔شاعرانہ لطافتوں،تہذیبی خوبصورتیوں اور اسلاف کی خوبیوں سے آراستہ رنگوں نے انھیں اپنے عہد میں ایک معتبر،منفرد اور قابلِ احترام درجہ پر فائز رکھا۔انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز ہی میں جذبے اور ہنر کاری کے ساتھ طبقاتی بے انصافیوں پر آواز بلند کی جو عمر کے آخری حصے تک ان کے ہاں نظر آتی رہی۔ایک خوبصورت اور مساوات پر مبنی نظام کی آہٹیں ان کی غزل میں ایک تسلسل سے سنائی دیتی رہی ہیں۔شاید یہی تمنّا اُنھیں داعیٔ امن و مساوات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دہلیز تک لے آئی تھی جس کے اشارے ہمیں ان کی شخصیت کے برتاؤ اور اظہار کے تخلیقی زاویوں کے ساتھ ساتھ ان کے نعتیہ مجموعے ''محرابِ توحید'' میں بھی جا بہ جا نظر آتے ہیں۔

یاد آئے تیرے دامانِ کرم کی وسعت
چاندنی رات میں جب دامنِ صحرا دیکھوں

آپ کے لطف خاص سے زندگی معتبر ہوئی
روئے زمیں پہ آ گیا فکر و عمل کا انقلاب

وہ چارہ سازِ غریباں، نوائے موجودات
اسی کو خالق و مالک کا فیضِ عام کہیں

میں غور کرتا ہوں جب بھی بقائے ہستی کی عظمتوں پر
کبھی وہ ایمان بن گیا ہے، کبھی وہ ایقانِ زندگی ہے

امین راحت چغتائی اپنی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی قوت کا اظہار اپنی متعدد کتب نثر و نظم میں کرتے رہے مگر ان کا تنقیدی شعور اور تخلیقی وفور نعت گوئی اور نعت شناسی کے میدان میں ایک انفرادی شناخت کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ نعت گوئی میں ان کا اعتبار، زبان و بیان کی شائستگی اور والہانہ عقیدت کے جذبوں پر استوار ہوا جب کہ نعت شناسی کے باب میں ان کی تحریریں گہرے تنقیدی شعور کی حامل دکھائی دیتی ہیں۔ معاصر نعت نگاروں پر لکھے گئے ان کے کئی اہم مضامین نعت رنگ کے گذشتہ شماروں میں سامنے آتے رہے ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے ۲۵ مارچ کو دی یعنی ان کے انتقال کے تین دن بعد۔ افسوس ہوا کہ اتنی اہم شخصیت کے رُخصت ہو جانے کی خبر اہلِ علم کو اس زمانے کی سہولتوں میں بھی اتنی تاخیر سے ہوئی۔ ناشاد صاحب ہی سے معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ قبل امین راحت چغتائی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات کے لیے گئے تھے۔ اس ملاقات کی خوشگوار یادوں کو گلوگیر آواز میں سناتے ہوئے انھوں نے ایک بات کا ذکر کیا جو میرے لیے زیادہ کشش رکھتی تھی وہ یہ کہ چغتائی صاحب نے انہیں اپنی حمد کا ایک طغرہ دکھایا جسے انھوں نے اپنی قبر کے کتبہ پر آویزاں کرنے کے لیے بنوایا تھا۔ یہ حمد یہ کلام ان کے جذباتِ عبودیت و معرفت اور اَوراد و وظائف میں بسر ہونے والی راتوں سے کشید ہونے والی نورانی کیفیت کا آئینہ خانہ ہے۔ چند شعر دیکھیے:

مرے لب پہ تیری ثنا رہی، تری عظمتوں کا بیاں رہا
میں جہاں رہا ترے ذکر میں، تری رحمتوں کا سماں رہا
میں تو آرزوئے وصال میں،کئی بار جاں سے گزر گیا
تری یاد میں تھی مشک بو، مجھے ذکرِگل بھی گراں رہا
مری خلوتوں میں بھی جلوتیں، ترے لطف خاص کے معجزے
میں نہاں رہا کہ عیاں رہا، میرے ساتھ سارا جہاں رہا
مری جاں کی ساری لطافتیں، تری یاد سے ترے نام سے
یہی جان کر، یہی مان کر، مَیں امین راحتِ جاں رہا

نبیٔ رحمت کا یہ عاشق صادق اپنے توشہ آخرت میں ''محراب'' جیسا نعتیہ نذرانہ لے کر اس اعتماد سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا:

سر جھکا کے آ گیا ہوں شافع محشر کے پاس
میری نظروں میں تو راحت اب کوئی منزل نہیں

اللہ کریم امین راحت چغتائی کو قربِ نبی ٔ رحمت ﷺ کی راحت نصیب فرمائے۔آمین!

راجارشید محمود

۲۳ر اگست ۱۹۲۳ء ڈسکہ ضلع سیالکوٹ۔ ۱۲راپریل ۲۰۲۱ء لاہور

راجارشید محمود کے انتقال کی خبر نے بہت دکھی کیا۔ جادۂ فروغِ نعت کا ایک نہ تھکنے والے مسافر کا سفر زندگی اور اس کی خدماتِ نعت کا روشن باب مکمّل ہوا۔

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

راجا صاحب کے بچھڑ جانے کی خبر سنتے ہی نہ جانے کیوں مجھے اشفاق احمد کے، اِن کے بارے میں لکھے ہوئے چند جملے بہت یاد آئے:

''راجارشید محمود ان خوش بخت لوگوں میں شامل ہیں جن کی زندگی کا دامن اور سانسوں کا رشتہ ثنائے خواجہ سے بندھا ہوا ہے۔''

راجارشید محمود نے نعت کے میدان میں اپنے تخلیقی، تحقیقی اور تدوینی سفر کے آغاز ہی میں کہے گئے ان جملوں کو اپنی آخری سانس تک سچ کر کے دکھایا۔ ان کی نعت گوئی کا وفور، نعت شناسی کا تسلسل اور فروغِ نعت کے لیے ان کی مساعیٔ جمیلہ جن میں ماہنامہ ''نعت'' کی مسلسل اشاعت اور ان کی تدوینی و تالیفی سرگرمیاں، ان کی زندگی کے آخری لمحات تک اپنا دائرۂ کار وسیع کرتی رہیں۔ راجا رشید محمود کی شخصیت و خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ جسے کسی مختصر سے تعزیتی شذرے میں سمیٹنا محال ہے۔ اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی گوشہ ''نعت رنگ'' کے اس شمارے میں شامل کیا جائے۔ میں ڈاکٹر افضال احمد انور اور ڈاکٹر ریاض مجید کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے پُرخلوص تعاون سے نوازا۔

عافیت محمود پائی ہے نبی کے ذکر سے
نعت ہی سے زندگی میری کسی قابل ہوئی

دُعا ہے کہ ربِّ کریم زندگی بھر اس سائبانِ عافیت میں زندگی گزارنے والے اس عاشق صادق کو عرصہ محشر میں بھی اسی سائبانِ عافیت میں جگہ دے اور انعامِ مغفرت سے نوازے۔ آمین!

قمر سنبھلی

۲۲ ستمبر ۱۹۴۲ء سنبھل، یو پی - بھارت - ۱۵/ اگست ۲۰۲۱ء لکھنؤ

قمر سنبھلی کا شمار ہندوستان کے معروف شعرا اور فعال ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ متعدد اہم ادبی رسائل کے مدیر اور معاون مدیر کی حیثیت سے ادبی و تہذیبی اقدار کو روشن کرنے میں مصروفِ عمل رہے۔ ان کا تخلیقی اثاثہ جس میں تقریباً بتیس کتب شامل ہیں ان کی بھرپور علمی فعالیت کا حوالہ بن چکی ہیں۔ نعت گوئی سے انھیں اپنے دینی مزاج کی وجہ سے خصوصی شفقت رہا اور اس صنف میں انھوں نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ ''روشن روشن حرف'' ان کا حمدیہ و نعتیہ مجموعہ ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے اسلوب میں شعری جمال اور مقصدیت کی سنجیدگی نے کلام کی کیفیات کو ایک باوقار رنگ عطا کر دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

حمد

نظر کا حسن بھی، حُسنِ خیال بھی اس کا
مرے ہنر میں ہے سارا کمال بھی اس کا

نعت

بہت پیوند تھے لیکن کوئی دھبہ نہ تھا جس پر
اساسِ زندگی اپنی اسی چادر پہ رکھی تھی

پیامِ حق کو زمانے کے نام کرتے ہوئے
حضور آئے ہیں رحمت کو عام کرتے ہوئے

قمر سنبھلی ۱۵/ اگست ۲۰۱۲ء لکھنؤ میں حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ اپنی آنکھوں میں حسرتِ شفاعت اور شفیع محشر علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی زیارت کے خواب سجا کر جانے والے اس عاشقِ صادق کے پیشِ نظر کیسا اُمید افزا منظر تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ کون آیا شفاعت کے واسطے سرِ حشر
یہ کس کے ہاتھ میں کوثر کا جام روشن ہے

خداوند کریم اس روشن خواب کو تعبیر سے ہمکنار فرمائے۔ آمین!

سعید ہاشمی

۴ مارچ ۱۹۴۷ء متھرا، ضلع یوپی، بھارت۔ ۳ مارچ ۲۰۲۱ء کراچی

مداحِ رسول الحاج سعید ہاشمی کی نعت خوانی کا آغاز ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہوا، جب وہ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ پہلی مرتبہ ان کو کسی بڑے مقابلے میں بطور طالب علم ثنا خواں کے ۱۹۶۶ء میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ مقابلہ جامع مسجد آرام باغ کراچی میں ہوا اور اس کا اہتمام بزمِ نعت و مناقب، ناظم آباد کراچی نے کیا تھا جس کے روحِ رواں شیخ محمد اقبال قادری مرحوم تھے۔ بعدازاں ان کا یہ سفر جاری رہا اور انھوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن کے علاوہ ملک کے طول و عرض اور بیرونِ ملک بھی نعت خوانی کی سعادت حاصل کی۔ ان کا پہلا گراموفون ۱۹۷۲ء میں ای ایم آئی کمپنی کی طرف سے سامنے آیا۔ مجموعی اعتبار سے ان کے سات گراموفون ریکارڈ اور تیرہ آڈیو کیسٹ ریلیز ہوئے۔ اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اکسٹھ سالہ سفر نعت خوانی میں انھوں نے جو کام کیا اس کا ایک مختصر سا تعارف قارئین کے ذہنوں تک منتقل ہو سکے۔ انھوں نے اپنی پڑھت کی انفرادیت اور کلاموں کے انتخاب سے ہمیشہ اپنے سننے والوں کو شاد کیا۔ ان کے پڑھے ہوئے کلام کا تاثر اتنا شدید اور گہرا ہوتا تھا کہ اس کلام کو سعید ہاشمی ہی کے ہی رنگ و آہنگ میں نہ صرف ان کے معاصر نعت خوانوں نے پڑھا بلکہ بعد میں آنے والے ثنا خواں بھی اس طرزِ ادائی کے سحر سے نہ نکل سکے اور کلام کو اسی طرح ادا کرتے ہوئے نعت خوانی کی مؤدّب اور پُر تاثیر روایت کو آگے بڑھاتے رہے۔ فنِ موسیقی کی نزاکتوں اور لطافتوں کی معرفت کی وجہ سے انھوں نے اپنی آواز کی مٹھاس، لطافت اور لفظوں کی نغمگی کے درست استعمال سے ایک ایسا منفرد اسلوب پیدا کر لیا تھا جس کی قبولیت میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ وہ جس قدر خوبصورت نعت پڑھتے تھے اتنے ہی حسین کردار کے مالک بھی تھے۔ شہرت کے بامِ عروج کو دیکھنے کے باوجود میں نے انھیں ساری زندگی عجز و انکسار اور خوش اخلاقی کے اوصاف سے متّصف دیکھا۔ ان کی شہرت نے ان کی نیک نامی کو نمایاں کیا وہ اپنے سے چھوٹوں پر ہمیشہ شفیق رہے۔ ادب ان کی زندگی کا بڑا حوالہ بن گیا تھا۔ بزرگوں سے اپنے معاصرین سے، اپنے بہت بعد میں آنے والوں سے ہمیشہ ان کا رویہ پُر خلوص رہا ہے۔ اکابرینِ اہلِ سنت کے لکھے ہوئے نعتیہ کلام سعید ہاشمی صاحب کی آواز میں نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان بزرگوں کے عشق رسول کو عوامی سطح پر متعارف کروانے کا

وسیلہ بھی بنے۔ایک نعت خواں کو اپنے کردار وعمل میں کتنا شفاف،اپنی پڑھت میں کتنا باوقار،زبان کی نزاکتوں اور ادائی کی لطافتوں سے کتنا آشنا،اور فنی لحاظ سے کتنا سنبھلا ہوا ہونا چاہیے اس کی اگر کوئی بہت مضبوط اور توانا مثال میرے پیش نظر ہے تو وہ الحاج سعید ہاشمی کی ہے۔نعت خوانی کے علاوہ انھوں نے دینی خدمات کو بھی اپنا شعار بنایا۔مسجد و مدرسہ کی تعمیر اور اپنی اہلیہ کی رفاقت میں بچیوں کو دینی علوم سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو محنت انھوں نے کی وہ ان کی نعت خوانی کو حقیقی معنویت سے آشنا کرتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ نعت خوانی ہمارا راستہ ہے اور دین کے پیغام کو پھیلانا ہماری منزل ہے۔عمر کے آخری حصے میں انھیں شاعری سے بھی شغف پیدا ہوا اور چند نعتیں اُن کی تخلیقی صلاحیتوں اور عقیدتوں کا نشان کے طور پر محفوظ ہوئیں اور معروف بھی۔

اگر کوئی اپنا بھلا چاہتا ہے
اُسے چاہے جس کو خدا چاہتا ہے

مجھے اُمید ہے ربِّ محمد ﷺ ان کی جملہ محنتوں،ریاضتوں اور سعادتوں کے طفیل ان کی حتمی مغفرت فرمائے گا۔آمین!

گستاخ بخاری

۲۱ جنوری ۱۹۵۰ء جھنگ _ ۱۴ دسمبر ۲۰۲۰ء ضلع جھنگ

سیّد محمد منیر حسین شاہ کا قلمی نام گستاخ بخاری تھا۔ضلع جھنگ کی تحصیل اٹھارہ ہزاری میں مقیم اس شاعر کا تخلیقی اثاثہ کئی مجموعوں پر مشتمل ہے۔جن میں غزل کے پانچ مجموعے،ساونوں کے بعد۔ملکِ غزل،گردابِ گماں،اسلوبِ بقا اور طوافِ ذات (غزلیہ دیوان) شامل ہیں۔تقدیسی ادب سے گستاخ بخاری کو خاص دلچسپی رہی اور اس حوالے سے ان کی تخلیقی کارکردگی کا دائرہ نسبتاً زیادہ وسیع نظر آتا ہے۔ان کے چار حمدیہ مجموعے شائع ہوئے جن میں صدقِ صمیم،تحمید کردگار (حمدیہ دواوین)، تفسیر لاالٰہ (ایک بحر میں حمدیہ دیوان) اور ارحم شامل ہیں۔جبکہ نعتیہ ادب کو انہوں نے چار مجموعوں سے پُرثروت کیا۔محمد محورِ عالم،مدحِ ممدوحِ خدا (نعتیہ دواوین)،صلّوا علی الرسول (ایک بحر میں نعتیہ دیوان) اور نعت خط شامل ہیں۔مناقب کے باب میں ان کے تین مجموعے سلام اے فاطمہ کے لال،صلوا علی الحسین (سلامیہ دیوان)،اور حسین زندہ باد اُن کے عقیدے اور عقیدت کے باب میں

زندہ وتابندہ گواہیوں کی طرح نمایاں ہوئے۔ان کی شاعری قادرالکلامی، تازگی اور جدید معنویت کا آئینہ خانہ ہے۔ادب کے معاصر منظرنامے پران کی شناخت تقدیسی شاعری کے حوالے سے اپنا ایک مستحکم حوالہ رکھتی ہے۔ان کے محرکاتِ تخلیق حمد ونعت اور منقبت گوئی میں ایسے کثیر جہتی عوامل سے فروغ پاتے ہیں جن کا سلسلہ عمل روحانی حوالہ سے بھی فرد کی باطنی تطہیر سے فکری تہذیب تک اپنا پھیلاؤ رکھتے ہیں۔۱۴دسمبر ۲۰۲۰ء کو یہ منفرد شاعر اپنے توشہ آخرت میں ربِّ کریم کی بارگاہ میں رحمتِ طلبی کی یہ التجا لے کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا:

ندامت ہے مجھے گستاخ ہوں میں
تو اپنی رحمتیں دوچند کر دے

محسن اعظم محسنؔ ملیح آبادی

۳ستمبر ۱۹۳۹ء ملیح آباد، لکھنؤ۔۲۹ جولائی ۲۰۲۱ء کراچی

انسانی معاشرہ لوگوں کے باہمی ارتباط سے تشکیل پاتا ہے۔ضروری نہیں کہ یہ ربط خونی ہو یا قریبی ہو بعض اوقات کچھ ایسے لوگ بھی آپ کے دل میں گھر کر لیتے ہیں جو آپ سے ملے بھی نہ ہوں یا ان سے واقفیت چند ملاقاتوں تک ہی محدود رہی ہو۔محسن اعظم محسنؔ ملیح آبادی سے بھی میرا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا۔میری ان سے صرف ایک ملاقات رہی جو ڈاکٹر عزیز احسن کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔انھوں نے مجھے اپنی کئی کتب سے نوازا۔اس ملاقات میں ان کی شخصیت میں بزرگانہ شفقت اور ان کی عطا کردہ کتب میں ان کی شاعرانہ ہنرمندی نے مجھے متاثر کیا۔ان کے دو نعتیہ مجموعے (نعت رحمۃ للعالمین اور نعت سیّدالمرسلین) میری نظر سے گزر چکے تھے۔یہ مجموعے غالباً باسٹھ تریسٹھ کے درمیان طبع ہوئے تھے۔ان کے ہاں اسلوب کی شائستگی، فن کی پختگی اور خیال افروزی کے ساتھ کہنہ مشقی قابلِ داد تھی۔بعدازاں تقدیسی شاعری پر ان کے ادبی مضامین ایک تسلسل سے نظر سے گزرے جو کسی کتاب کے مقدمے، پیش لفظ یا تبصروں کی صورت میں شائع ہوتے رہے۔انھوں نے نعت گوشعرا کے فکروفن پر جم کر لکھا اور تقدیسی شاعری کی نزاکتوں اور ادب وآداب کے ضمن میں اہم نکات پیش کیے۔یہ مضامین خود ان کا ایک ادبی وتنقیدی حوالہ بن گئے۔خدا کرے ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل وہ ادیب وشاعر جو خود اپنی ایک معتبر ادبی شناخت رکھتے ہیں ان مضامین کی جمع آوری پر توجہ دیں اور یہ

علمی سرمایہ محفوظ ہو سکے۔

عنبر بھرائچی

۵ جولائی ۱۹۴۹ء ضلع بھرائچ – ۷ مئی ۲۰۲۱ء لکھنؤ

عنبر بھرائچی کا اصل نام محمد ادریس تھا۔ بحیثیت ادیب و شاعر وہ اُردو دُنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے تھے۔ ان سے میرا پہلا تعارف ان کی کتاب ''لم یات نظیرک فی نظر'' کے توسط سے ہوا جو انھوں نے مجھے ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو اپنے دستخط کے ساتھ ارسال کی تھی۔ ان کا دوسرا مجموعہ نعت ''روپ انوپ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ''لم یات نظیرک فی نظر'' کو اُردو کی نعتیہ شاعری میں ایک منفرد ادبی کارنامہ قرار دیا جانا چاہیے۔ یہ ایک نظم مسلسل ہے جو تیرہ عناوین کے تحت ایک ہزار چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں شاعر نے حرا سے لے کر فتح مکہ تک کے کچھ اہم واقعات کو قلم بند کیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ شاعر نے سیرت کے ان چنیدہ واقعات کو بیان کیا ہے جن کو بیان کرنے سے پوری سیرت سامنے آجاتی ہے۔ اس طویل نظم کو ایک رزمیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے شاعر نے جن فنی محاسن تخلیقی جمال اور لسانی ہمہ گیری کا مظاہرہ کیا وہ تو اپنی جگہ قابل داد تھا ہی مگر جو دیباچہ مصنّف نے کتاب کے آغاز میں تحریر کیا وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس دیباچے میں عنبر بھرائچی نے رزمیہ کی تعریف، تاریخ اور اُردو و ہندی میں اس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اس کی فنی بُنت پر جو سوالات اُٹھائے وہ خود اہل علم کے لیے فکر و نظر کے نئے دَر وا کرنے کے ساتھ ساتھ مزید مکالمے کی فضا کو روشن کرنے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ایک بڑے کینوس پر لکھی گئی اس نظم میں ارتکاز اور جامعیت کو قائم رکھتے ہوئے اوّل سے آخر تک ایک ہی فضا کو قائم رکھنا اور وہ بھی پابند نظم کی ہیئت میں آسان نہ تھا، مگر شاعر نے اپنی تخلیقی قوت سے واقعات اور تجربات کو اس خوبصورتی سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے کہ اس کی مثال اُردو شاعری میں تلاش کرنا آسان نہیں۔

عنبر بھرائچی کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''روپ انوپ'' بھی اپنے اسالیب اور فکری و شعری تنوع کی وجہ سے نعتیہ ادب میں کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اس مجموعے میں ۳۸ نعتیں ہیں جن میں آٹھ نعتیہ گیت، چند آزاد اور پابند نظمیں اور کچھ قطعات و دوہے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ زبان و بیان کی مٹھاس، فنی التزام اور اپنی مٹّی سے وابستگی کے گہرے احساس کے ساتھ جس تخلیقی غنائیہ کو نمایاں کرتا ہے، اس کی انفرادیت کو ہماری تقدیسی شاعری میں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افسوس! ۷رمئی ۲۰۲۱ء کو کرونا میں مبتلا ہو کر ہمارا یہ باکمال تخلیق کار اور منفرد اسلوب رکھنے والا شاعر ہم سے جُدا ہوا، دُعا ہے ربِّ لوح وقلم اپنے قلم کو مدحت مصطفیٰ ﷺ میں مصروف رکھنے والے اس شاعر کی روح کو اپنے حصارِ رحمت میں لے لے۔ آمین!

ڈاکٹر شوکت اللہ جوہر

۱۹۴۵ء شاہ جہاں پور، بھارت۔ ۳۰ جون ۲۰۲۱ء کراچی

شوکت اللہ جوہر کا نام ادبی حلقوں میں خاصا معروف رہا۔ اُنھوں نے اپنی غزل گوئی اور نعت گوئی سے معاصر شعری منظرنامے پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نمایاں کیا اور مختلف اصنافِ شعر میں ان کا اظہار کیا۔ قصیدہ گوئی سے ان کے مزاج کو خاص مناسبت رہی۔ ایک ایسے دور میں جب قصیدہ گوئی کی روایت دم توڑتی نظر آرہی تھی، شوکت اللہ جوہر جیسے چند اہم لکھنے والوں نے پاک و ہند میں اس صنف سخن کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ ان کے تین مجموعہ ہائے قصائد شائع ہوئے جو نعتیہ ہیں۔ لوحِ عقیدت، ایک طاق دو چراغ، شہرِ رحمت، ان مجموعوں میں حمدیہ و نعتیہ غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ قصائد میں زبان کی صفائی، شستگی، روانی اور رمزیت کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ شوکت اللہ جوہر نے اُردو شاعری میں ظرافت نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھا اور کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی وفات کرونا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کراچی میں ہوئی۔

تمنّا ہے بہ روزِ حشر جوہر کو ملے یارب
علی المرتضیٰ کے ہاتھ پیمانہ محمد کا

کون ہوگا جو میری طرح بھیگی پلکوں سے اس خوبصورت تمنّا کی قبولیت کے لیے دُعا کو ہاتھ بلند نہ کرے گا۔ اللہ کریم شوکت اللہ جوہر کو کامیاب فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی

۵ مارچ ۱۹۳۸ء امرتسر۔ ۱۶ ستمبر ۲۰۲۱ء فیصل آباد

کہتے ہیں کسی بڑے آدمی کو دیکھنا ہو تو اس کا اپنے چھوٹوں سے برتاؤ دیکھو۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی اپنے تمام تر علم و فضل اور مقام و مرتبے کے باوجود جس طرح اپنے چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے اس کی مثالیں آج کے معاشرے میں کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ دنیا انھیں ایک جید عالم، عظیم مدرّس،

ماہرِ تعلیم، بے مثل خطیب اور شعر و ادب کے پارکھ کے طور پر جانتی ہے، لیکن میں نے انھیں ان تمام صفات کے ساتھ ساتھ ایک معتبر اور صاحب علم نعت شناس کے طور پر بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۹۱ء کے آخری ہفتے میں اس وقت ہوئی جب ڈاکٹر ریاض مجید نے مجھ سے پہلی بار فیصل آباد میں ملاقات کے اگلے ہی روز حلقہ اربابِ ذوق کی ایک نشست میرے اعزاز میں رکھ لی۔ میں جب اس نشست میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسحق قریشی صاحب کی رہائش گاہ ہے اس نشست کی صدارت حافظ لدھیانوی نے فرمائی۔ یہ ایک بھرپور نشست تھی جس کے اختتام پر ڈاکٹر محمد اسحق قریشی صاحب نے نعت کی معرفت اور روایت پر ایک مختصر مگر جامع اور پُر تاثیر گفتگو کی۔ اس گفتگو نے مجھے دیر تک اپنے حصار میں رکھا اور یہی گفتگو ڈاکٹر صاحب کے اور میرے گہرے روابط اور تعلق کا وسیلہ بنی۔

میری شاعری کی حوصلہ افزائی سے لے کر نعت رنگ کے آغاز اور اس کے اشاعتی سفر میں ہر ہر مرحلے پر مجھے ان کی سرپرستی اور دل جوئی میسر رہی۔ انھوں نے اپنے قلمی تعاون سے بھی نوازا اور اپنے مشوروں سے بھی۔ مدح نبی کریم ﷺ کی روایت عربی فارسی اور اُردو زبانوں میں جس طرح ان کے مطالعے اور حافظے کا حصہ رہی وہ انہی کا حصہ تھی۔ آپ ان سے جب بھی نعت گوئی کے متعلق کسی پہلو پر کچھ پوچھیں یا گفتگو کی دعوت دیں وہ ان تینوں زبانوں کے شعرا کے کلام سے ان موضوعات پر مثالیں دے کر اتنی جامعیت کے ساتھ بات کرتے کہ خوش گوار حیرت ہوتی۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ اپنے موضوع پر کتاب حوالہ کا درجہ رکھتا ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ وہ ''نفحات نعت'' کے نام سے اپنے مقالات نعت کا مجموعہ جلد شائع کروالیں، مگر بوجوہ اس میں تاخیر ہوتی گئی۔ خدا کرے کہ یہ مقالہ جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو۔ تنقید و تحقیق نعت کے حوالے سے ان مقالات کی گراں قدر اہمیت ہے۔ قرآنیات، سیرت، تصوّف اور شعر و ادب کے گہرے مطالعے نے ان مضامین کو جتنے مختلف پہلوؤں سے ثروت مند کیا ہے اس کی کوئی مثال میرے سامنے نہیں۔ مجھے اُمید ہے ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے جناب امجد قریشی صاحب کی توجہ سے ''نفحاتِ نعت'' جلد سامنے آئے گی اور وہ ہماری نعتیہ روایت کے فکری موضوعات کا ایک وسیع تناظر نعت شناسوں کے لیے محفوظ ہو سکے گا۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ڈاکٹر اسحق قریشی صاحب کی

مغفرت فرمائے۔آمین!

رشید اختر خان

۷جولائی ۱۹۴۷ء، رانی سرائے بھوج پور۔۲۹اکتوبر دھنباء جھارکھنڈ، انڈیا

رشید اختر خاں کا تعارف علمی دنیا میں ایک محقق وادیب کے طور پر اپنی شناخت رکھتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک وہ اپنی ان صفات کے ساتھ ایک نہایت مخلص نعت کار بھی تھے۔ میرا ان کا تعلق ۱۹۹۸ء کے آس پاس اسی حوالے سے قائم ہوا۔ ان کا پہلا خط نعت رنگ کے شمارہ ۸، ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جس میں انھوں نے نعتیہ ادب کے حوالے سے اپنے ذوق وشوق کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کاموں کا تعارف اور مستقبل کے ارادے ظاہر کیے تھے۔ اُنھیں اُردو نعت کے اوّلین محقق ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کی قربت نصیب رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی دعائیں ان کے اکثر مضامین اور ان کی خیریت بھی رشید صاحب کے توسط ہی سے میسر آتے رہے۔ رشید اختر صاحب نے اپنے اخلاق اور اخلاص کی بنیاد پر ہند کے اکثر اہلِ علم کے دل میں جگہ بنائی اور ان سے نعت کے فروغ کے لیے کسی نہ کسی حد تک رابطہ رکھا۔ اہلِ علم کو ہند و پاک میں مراسلات کے نظام میں اکثر خطوط اور کتب وغیرہ کی گم شدگی کی شکایتیں رہیں۔ رشید صاحب کی بھیجی ہوئی اکثر خطوط راستے ہی میں کہیں ضائع ہوئے، جس کا ہم دونوں کو ملال رہا۔ پھر ایک طویل عرصے تک ان سے رابطے میں تعطّل پیدا ہوا۔ ۲۰۱۶ء میں ہندوستان سے ''دبستانِ نعت'' کے اجرا کے بعد ایک بار پھر یہ رابطہ بحال ہوا اور اکثر ان کے خطوط آتے بھی رہے اور فون پر گفتگو بھی ہوتی رہی۔ ان کے بعض بہت اہم مضامین ''دبستانِ نعت'' کے شماروں میں نظر سے گزرے جس سے اندازہ ہوا کہ وہ مستقل ادب کے فروغ کے لیے سرگرداں رہے ہیں اور عمر کے اس حصے میں بھی جب انسان بیماریوں سے لڑتے لڑتے ہمت ہار دیتا ہے انھوں نے اپنے جذبۂ فروغِ نعت کو جوان رکھا۔ وہ جب فون کرتے اپنے آئندہ کے منصوبوں پر نہایت جوش وجذبے سے گفتگو کرتے۔ خواتین کے نعتیہ شاعری کے حوالے سے ان کی ایک تحقیقی کتاب مکمّل ہونے کے قریب تھی۔ ۱۸نومبر ۲۰۲۱ء کو ان کی صاحبزادی نے ان کے فون سے ایک پیغام کے ذریعے ان کے انتقال کی خبر دی۔ نعتیہ ادب کے اس مخلص اور باشعور خدمت گزار کا چلے جانا یقیناً ایک صدمہ جانکاہ ہے۔

اللہ کریم ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین!

شمس الرحمٰن فاروقی

۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ء اعظم گڑھ، بھارت۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۲۰ء الٰہ آباد

اُردو ادب کے ممتاز و معتبر نقاد، افسانہ نگار، ماہرِ لسانیات، شاعر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے انتقال کا غم ادبی دنیا کے لیے کسی بڑے سانحے اور صدمے سے کم نہیں۔ انھوں نے اپنے افکار سے اپنے عہد کے زبان و ادب اور تہذیب پر گہرے نقوش قائم کئے اور ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ تقریباً پون صدی تک ادبی منظر نامے پر ہمہ وجود اور ہمہ شعور شریک و متحرک رہے۔ اُردو دنیا میں ان کی وفات کا دُکھ ہر کسی نے کسی نہ کسی سطح پر ضرور محسوس کیا۔ فاروقی صاحب سے میرا تعلّق ۲۰۰۵ء سے قائم ہوا جب انھوں نے نعت رنگ کی رسید کے طور پر اپنا پہلا خط ارسال کیا۔ اس خط میں انھوں نے نعت رنگ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بعد میں بھی تواتر سے اپنے خطوط میں وہ نعت رنگ کے مشمولات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے رہے۔ مجھے ہر خط سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ نعتیہ ادب پر جم کر کچھ نہیں لکھ سکے مگر ادب کے مطالعے کے دوران اس صنف کی طرف بھی ان کی توجہ رہی اور اسی کی بنیاد پر وہ اپنے تاثرات کے اظہار میں باریک باتوں کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ خط و کتابت کے بعد فون پر گفتگو کا سلسلہ قائم ہوا تو میرا یہ تاثر مزید گہرا ہو گیا۔ وہ ''نعت رنگ'' توجہ سے پڑھتے تھے اور ہر شمارے پر حوصلہ افزائی کے ساتھ اصلاحی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرواتے تھے۔ نعتیہ ادب کی طرف سے ان کی توجہ دیکھ کر میں اکثر ان سے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتا اور وہ اپنی صحت کے مسائل اور عدیم الفرصتی کے باوجود کسی وقت کچھ لکھنے کی نوید سناتے لیکن اپنے خطوط میں انھوں نے مکمّل طور پر اپنا نظریہ نعت اور نقدِ نعت پر اپنے خیالات کا بے باک اظہار کر کے نقدِ نعت کے ضمن میں اہم پہلوؤں کی طرف اشارے ضرور کرتے رہے۔ انھوں نے نعتیں بھی کہیں جو ان کے شعری کلیات میں محفوظ ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں بھی اُن کی ایک نعتیہ نظم کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں انھوں نے میری نعتیہ شاعری اور اسد ثنائی کی نعتیہ شاعری پر مختصر مضامین لکھے، کاش زندگی اتنی مہلت دیتی اور وہ بالاستعاب نعتیہ ادب پر کچھ لکھ پاتے جس کی طرف ان کا ذہن آمادہ ہو چکا تھا۔ ان کی بیماری کے آخری دنوں میں بھی میرا اُن سے فون پر رابطہ رہا۔ کرونا کی تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود ان کے نقاہت زدہ لہجے میں بھی پاکستان آنے کی خواہش اور اپنے نامکمّل کاموں کی تکمیل کی ایک اُمید افزا اُمنگ ظہور کرتی نظر آتی تھی۔

فاروقی صاحب چلے گئے مگر وہ اپنی تحریروں، افسانوں اور ادب کی تعبیر وتشریح کے مختلف حوالوں میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ان کا تحریری اثاثہ اور ان کے افکار آنے والے زمانوں میں ذہنوں کی زرخیزی کا باعث ہوں گے۔ اللہ کریم ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر صابر سنبھلی

۳۰ جولائی ۱۹۴۲ء، سنبھل ضلع مراد آباد – ۲۸ر دسمبر ۲۰۲۱ء ضلع مراد آباد

اُردو کے نامور محقق وادیب، شاعر ونقاد، ماہر لسانیات ونعت شناس جناب ڈاکٹر صابر حسین سنبھلی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم نے ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ غزل، تاریخ گوئی، قطعات، رُباعیات، منظومات، افسانے، کہانیاں، انشائیے، حمد ونعت، پہیلیاں، ڈرامے، دوہے، تضمین، ادب اطفال، تنقید، تحقیق، تحشیہ نگاری، بلاغت، فن شاعری، عروض، تبصرہ نگاری، قوائد زبان، صحافت اور دینیات کون سا موضوع اور کوئی سا شعبۂ تحریر ایسا تھا جس میں ان کے رشحاتِ قلم کے نقوش نہ ملتے ہوں۔ ان کی چالیس سے زائد کتب شائع ہوئیں جن میں 'ادبی تجزیے'، 'تحقیق نما'، 'اوراق العروس'، 'توضیح فنونِ ادب'، 'شعار زبان دانی'، 'نقد ونظر'، 'محامد ربّ' (حمد)، 'دیوانِ صابر' (نعت)، 'بہارستان سخن' (غزل)، 'ادبیات رضا'، 'کنز الایمان کا لسانی جائزہ'، اور 'اُردو تحقیق میں مولانا امتیاز علی عرشی' خاص طور پر بہت نمایاں ہیں۔ ادب اطفال اور درسیات کی کتب کی بھی ایک کثیر تعداد ان کے سرمایہ علمی کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ 'نعت رنگ' سے ان کا قلمی رشتہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا پھر پاک وہند میں خط وکتابت اور ترسیل کتب پر پابندی کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوئی، مگر فون پر ان سے رابطہ رہا۔ وہ ایک علمی مزاج رکھنے والے سادہ لوح انسان تھے۔ نعت گوئی کے موضوعات پر لکھتے ہوئے انھوں نے بہت راست گوئی سے کام لیا اور فنی ولسانی پہلوؤں پر بے باکی سے اپنی رائے دی۔ رضویات ان کے محبوب موضوعات میں سے ایک تھا، اس حوالے سے بھی ان کا کام ہمیشہ اہلِ علم کی توجہ کا باعث رہے گا۔ نعت رنگ میں ان کے مضامین، خطوط اور کلام کی اشاعت نے بھی بطور نعت شناس ان کے تعارف کے دائرے کو وسیع کیا۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی اس آرزو کو پورا فرمائے۔ آمین!

ہے توقع یہ بھی صابر حشر کے دن خیر سے
قبر سے پڑھتا اُٹھے گا، سیّد عالم کی نعت

ڈاکٹر شہزاد احمد

۲۴راکتوبر ۱۹۶۰ء حیدر آباد سندھ - ۱۹ جنوری ۲۰۲۲ء کراچی

ڈاکٹر شہزاد احمد کا نام نعتیہ ادب کے خدمت گزاروں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پاکستان سے ہندوستان تک اہلِ نعت ان کے نام اور کام سے بہ خوبی واقف و متعارف ہیں۔ انھوں نے اوائل عمری ہی میں بطور نعت خواں اور نقیب محافل میلاد و نعت اپنی شناخت کو مستحکم کیا۔ پھر ان کا ذوقِ نعت ان شعبوں کے دوش بدوش انھیں نعتیہ کتب کی جمع آوری اور نعتیہ ادب کے فروغ کی کاوشوں تک لے آیا۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی نعتیہ کتب کی تالیفات سے اپنا سفر شروع کیا جن کی وجہ سے نعتیہ کلاموں کی جمع آوری کے ساتھ اس عہد میں نعتیہ ادب کا اشاعتی منظر نامہ بھی واضح ہوا اور لوگ اس شعبے میں ہونے والے کاموں سے بھی آشنا ہو سکے۔ بعد ازاں انھوں نے اپنے اس ذوق کو تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں تک پھیلایا اور متعدد نعت شناسوں، نعت کاروں اور نعت خوانوں پر سیکڑوں تعارفی مضامین تحریر کیے اور انٹرویوز کیے، جو آج کے محققین نعت کی تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے میں آسانیوں کا سبب بن رہے ہیں۔ کراچی اور حیدر آباد کے نعت گو شعرا پر ان کے تذکرے اپنی اوّلیت اور افادیت کے باعث یادگار قرار پائے۔ جولائی ۱۹۹۰ء میں انھوں نے ماہنامہ حمد و نعت کراچی جاری کیا جس کا اشاعتی سفر کئی سال تک جاری رہا۔ ان شماروں میں بھی انھوں نے نعتیہ ادب کے لکھنے والوں، کتابوں اور شاعری کو متعارف کروانے کی بھر پور کوشش جاری رکھی۔ نعتیہ سرگرمیوں پر اُن کی نظر گہری تھی۔ پاک و ہند میں ہونے والے تنقیدی و تحقیقی کاموں سے وہ بہ خوبی واقف رہتے تھے۔ ان کا رابطہ اس زمانے میں موجود نعت گو شعرا اور ناقدین سے بذریعہ خط و کتابت رہتا اور کسی بھی نئے کام کے بارے میں وہی سب سے پہلے ہمیں آگاہ کرتے۔ ''اُردو نعت پاکستان میں'' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ مرحوم نے اپنے تمام تر ذخیرہ معلومات کو اس مقالے میں اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اب پاکستان میں نعت گوئی کے ارتقا کا کوئی جائزہ لینے کے لیے اس مقالے سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔ اس مقالے کی اشاعت کے بعد ان کی مزید چند کتابیں شائع ہوئیں جن کی اہمیت، افادیت کا اندازہ کتب کے نام ہی سے ہو جاتا ہے۔ 'اُردو میں نعتیہ صحافت (ایک جائزہ)'، 'اساس نعت گوئی' اور 'ایک سو ایک پاکستانی نعت گو شعرا' (تذکرہ، انتخاب نعت) کے علاوہ انھوں نے متعدد معروف شعرا کے نعتیہ کلیات اور بے شمار نعتیہ انتخاب بھی مرتب کیے۔ حال ہی

میں ان کی مجموعی نعتیہ خدمات پر ایک اہم تحقیقی مقالہ (ایم فل) ''ڈاکٹر شہزاد احمد کی نعت شناسی'' شفقت فرید نے لکھا ہے، جو ان کی وفات سے دو ہفتے قبل ہی شائع ہوا ہے۔ یہ مقالہ ان کی تخلیقی، تحقیقی، تالیفی اور اشاعتی کارگزاری کا بہ خوبی احاطہ کرتا نظر آتا ہے۔

شہزاد احمد سے میری رفاقت کا عرصہ چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے انھیں زندگی کے نامساعد حالات میں بھی پُرعزم اور کام میں مصروف دیکھا۔ انھوں نے پورے اخلاص سے ہر نعت کار کی حوصلہ افزائی کی اور اسے سراہنے میں کمی نہیں کی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ عارضۂ قلب کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ بیماری نے زور پکڑا تو بدن کی طاقت اور کام کی رفتار بھی متاثر ہوئی۔ اپنی آخری ملاقات میں انھوں نے مجھ سے اپنی بیماری کے مسائل کا ذکر کرنے کے بجائے اپنے ادھورے تذکرے کی تکمیل کے بارے میں دعا کا کہا جسے وہ ''اُردو کی صاحب کتاب خواتین نعت گو'' کے عنوان سے مرتب کر رہے تھے۔ یہ کام گزشتہ دو برس سے جاری تھا جس کے لیے وہ اکثر نعت ریسرچ سینٹر کی لائبریری میں موجود کتب سے استفادے کے لیے آتے رہے۔ پھولی ہوئی سانسوں اور لاغر وجود کے باوجود آنکھوں میں اس کتاب کی جلد تکمیل کے عزم کی روشنی لیے ہوئے یہ مخلص اور محنتی انسان نعت کار ۱۹ جنوری ۲۰۲۲ء کو زندگی کی جنگ ہار گیا۔ اپنی زندگی میں طویل بیماری اور حادثوں سے گزرنے والا شہزاد اپنی بیماری کے آخری دور میں بھی کافی تکلیف میں رہا۔ اس کے جنازے میں اس کے چہرے کا آخری دیدار کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو:

بس آج چین سے تیماردار سو جائیں
مریض اب نہ کہے گا سحر نہیں ہوتی

شہزاد کے سانسوں کی ڈوری کیا ٹوٹی ہماری چالیس سالہ رفاقت ختم ہو گئی۔ یہ الفاظ لکھتے ہوئے میری نظروں میں اتفاق و اختلاف کے وہ سارے موسم تازہ ہو گئے ہیں جن کے درمیان شہزاد احمد، غوث میاں اور میں نے نعت کی خدمت کے خواب دیکھے اور ان خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار ہوتے دیکھا۔ شہزاد احمد نے زندگی بھر ذکر نبی کریم ﷺ سے وابستہ رہ کر دنیا میں بھی عزّت کمائی اور آخرت کا بھی سامان کیا۔

ان کا شعر دیکھیے:

شہزاؔد میں بھی عاشقِ خیرالانام ہوں
ہاتھوں میں میرے دیکھیے دامنِ نعت ہے

دعا ہے کہ زندگی بھر اس دامن سے وابستہ رہنے والا شہزاد احمد آخرت میں بھی اسی شناخت کے ساتھ حاضر ہو۔ آمین!

سوانحی کوائف/تعلیمی سفر

نام	:	محمد ابرار
قلمی نام	:	ابرار عبدالسلام
تاریخ پیدائش:		۱۶ ستمبر ۱۹۷۳ء (ملتان)
ایم۔اے (اردو)		۱۹۹۷ء
ایم۔فل (اردو)		۲۰۰۵ء
پی۔ایچ۔ڈی (اردو)		۲۰۰۹ء

تدریسی سفر:

لیکچرر:	سنٹرل کالج ملتان	۱۹۹۷ تا ۱۹۹۹ء
لیکچرر:	گورنمنٹ کالج خانیوال	۱۹۹۹ تا ۲۰۱۱ء
اسسٹنٹ پروفیسر:	گورنمنٹ کالج کبیر والا	۲۰۱۱ء
ایسوسی ایٹ پروفیسر:	گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان	۲۰۱۱ تا ۲۰۲۰ء
پروفیسر:	گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان	۲۰۲۰ تا ۲۰۲۱ء
پروفیسر:	ایمرسن یونیورسٹی ملتان	۲۰۲۱ء تا حال

دیگر کتب:

۱۔ آبِ حیات (تحقیق و تدوین) ۲۰۰۶ء
۲۔ تحقیق و تدوین: مسائل و مباحث تقدیم ۲۰۱۲ء
۳۔ تاریخِ ادبِ اُردو ۱۷۰۰ء تک: تحقیق کے آئینے میں ۲۰۱۵ء
۴۔ شعلہ عشق سیہ پوش ہوا ۲۰۱۶ء
۵۔ عارف خستہ کے بغیر ۲۰۱۸ء
۶۔ لطیف الزماں خاں کی تنقید نگاری ۲۰۱۸ء
۷۔ تجھے ہم ولی سمجھتے ۲۰۱۸ء
۸۔ ان سے بھی ملیے ۲۰۱۸ء
۹۔ آزاد کی حمایت میں اور دوسرے مضامین ۲۰۱۹ء
۱۰۔ نعتیہ ادب: مسائل و مباحث ۲۰۱۹ء

زیرِ طبع کتب:

۱۔ اردو میں تاریخ گوئی: فن اور روایت
۲۔ ذکی مراد آبادی کا نایاب رسالہ 'یادگیر' تحقیق و تدوین
۳۔ خطوط مہر الٰہی ندیم بنام لطیف الزماں خاں
۴۔ امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ فرہنگ 'حمائل تاریخ' تحقیق و تدوین

9 789698 918859